The Drinched Book

text fiy book

ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو (ہمایوں)

بیادگار علائے فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

HUMAYUN

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ ایڈیٹر
مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

بزمِ ہمایوں

چار سال ہوئے کہ ہمایوں والدِ مرحوم و مغفور کی یادگار بن کر اُردو ادب کی محفل میں حاضر ہوا۔ اِس مُدت میں اُس سے جو کچھ بن آیا اُس نے پیش کیا اور اس بات سے میں خوش و مطمئن ہوں کہ اُسکی خوبیاں حضرتِ ہمایوں کی یاد کا نتیجہ تھیں اور اُسکی خامیاں جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوئیں میری کمیوں کی وجہ سے ہوئیں اور اسی لئے میری تمنا ہے کہ ان کمیوں اور فرو گذاشتوں کے دیکھ سکنے اور اُنکو دُور کرنیکی توفیق مجھے عطا ہو! جو ہُوا سو ہو چکا کے سنہری اصول پر چل کر اگر میں ناظرین کے سامنے ان غلطیوں کی رام کہانی بیان نہ کروں تو اُمید ہے کہ مجھے معاف فرمایا جائیگا البتہ چند باتوں کا ذکر اس لئے بیجا نہ ہوگا کہ گذشتہ کے اعتراف میں آئندہ کا عزم نظر آجائے۔

اسکا تو شکر ہے کہ چار سال کے اڑتالیس پرچوں میں سے کبھی ایک پرچہ بھی تاریخِ مقررہ کے بعد شائع نہیں ہُوا بلکہ سوائے شاید ایک آدھ دفعہ کے اس سے کم از کم ایک ہفتہ قبل حاضرِ خدمت ہوتا رہا اور خدا کرے آئندہ بھی اسی طرح پابندی کے ساتھ حاضر ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ گذشتہ دو سال سے بعض اصحاب شاکی رہے ہے کہ رسالہ "ضرورت" سے زیادہ خشک ہے۔ اسکی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ بہت سے نئے رسالوں نے "ضرورتِ" وقتی کو مدِ نظر رکھ کر مضامین کا انبار لگا دیا قسم قسم کے اچھے بُرے اخلاق آموز و عُریاں افسانے شائع ہو کر اکثر ناظرین کے مذاق کی تائید کرنے لگے اور کچھ یہ کہ حقیقت میں میں نے اس امر کی طرف توجہ نہ دی کہ "بیمارِ ادب" کے علاج کی دواؤں میں اُسکی تلخیٔ طبع کے رفع کرنیکے لئے کچھ شیرینی بھی لازم ہے۔ آئندہ ہمایوں کا اک حصہ افسانوں کے لئے وقف ہوگا۔ افسانہ نویسوں سے درخواست ہے کہ وہ تربیتِ اخلاق کو جو ہمایوں کا اک کھلا نصب العین ہے اپنی تحریروں میں نظر انداز نہ کریں۔ اگرچہ درستیٔ اخلاق کے سوا حُسن آرائی حقیقت نمائی محاکات جدت طرازی جو موجودہ افسانے کے خاص جوہر ہیں یہ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ علمی مضامین عموماً اصطلاحی گرانباریوں سے پاک ہونگے سنجیدہ و متین تحریروں کو بالخصوص اگر ان کا پیرایۂ بیان دلچسپ بھی ہو بدستورِ سابق عزت و احترام کی جگہ دی جائے گی۔ نئے مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی اب بھی ملحوظ ہوگی لیکن اُسی صورت میں کہ اُنکے مضامین اک اعلیٰ معیارِ ادب پر پورے اُتریں۔ اور پُرانے مشہور لکھنے والوں کی آؤ بھگت صرف اس لئے نہ ہوگی کہ وہ مشہور اور پُرانے ہیں غرض بزمِ ہمایوں میں رنگا رنگ بزم آرائیاں ہونگی جن کا انداز موجودہ پرچے سے عیاں ہے۔

گذشتہ سال جن اہلِ قلم نے ہمایوں کی خاص طور پر اعانت کی اُنکا شکریہ واجب ہے۔ پروفیسر ہارون خان شیروانی (دکن) نے قدیم تاریخِ ہند کو جدید طریقے میں بیان کیا۔ میرے عزیز دوست میاں عبدالعزیز کی فلک پیمائیوں کے

اگرچہ چند در چند ہی کرسکتے ہیں لیکن یہی وہ طبع رسا کی جولانیاں ہیں جن پر ہمایوں کو بجا ناز ہے۔ "پیغامِ عمل" کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ "افلاس ترقی کا ذریعہ ہے"۔ "تکمیلِ مقاصد"۔ "راستبازی"۔ "خدمت"۔ "حقیر چیز درحقیقت حقیر نہیں ہوتی"۔ "صداقت"۔ "فریبِ ضمیر"۔ ایسے مضامین حقیقی معنوں میں محرکِ حیات ہیں اور ہمایوں (مرحوم) کے اُس قول کی تشریح کرتے ہیں جو زینتِ سرورق ہے۔ جدید انشاپرداز و شعراء امین حزیں۔ نظیر نیر۔ راز اثر۔ عطاالرحمٰن۔ شمسی۔ عبدالحی صدیقی، پروفیسر محمد یوسف، عاشق بٹالوی) یہ سب رونقِ بزم بنے رہے۔

آئندہ ان حضرات کے ساتھ بعض ایسے لکھنے والے بھی نظر آئیں گے جنکی روشنیٔ طبع ابھی شبستانِ ادب میں شعاع ریز نہیں ہوئی اور ایسے لکھنے والے بھی دکھائی دینگے جن کے چراغوں کی خوش آئند کرنوں نے ادبیاتِ اُردو کی اندھیری راتوں کو اپنی تابش سے پُرنور کیا لیکن اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ کارکنانِ ہمایوں ان سب کیلئے چشم براہ ہیں اور یقین ہے کہ ناظرینِ ہمایوں بھی انکے لئے گوش برآواز ہونگے!

علاوہ مذکورہ بالا صاحبوں کے جن ادبی و ملکی رہنماؤں کے مضامین آئندہ ہمایوں میں نظر آئینگے اُن میں سے بعض کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:۔

مولنا عبدالحلیم شرر۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ پنڈت برج نرائن چکبست۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ مرزا محمد سعید۔ سید سلطان حیدر جوش۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا وحیدالدین سلیم۔ شیخ عبدالقادر۔ جناب خلیقی دہلوی۔ حکیم احمد شجاع۔ پنڈت شیو نرائن شمیم۔ حضرات گرامی، اعجاز، نیرنگ، طباطبائی، دہستت، تلوک چند محروم۔ میلارام وفا۔ شریمتی سروجنی نائیڈو۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ میاں سر محمد شفیع۔ مولوی محبوب عالم۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسکے ساتھ ہی ہم اُن بیسیوں غیر معروف ادیبوں سے جو ملک کے بعض نامعلوم حصوں میں پناہ گزیں ہیں جو اپنے آپ کو ادیب نہیں کہتے لیکن صحیح معنوں میں ماہرادب ہیں کیونکہ وہ عام فطری باتوں کو اک سادہ اور بعض دفعہ اک انوکھے پیرائے میں بیان کرنا جانتے ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہماری بزم میں قدم رنجہ فرمائیں اور قوم و زبان کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ وہ خیال نہ کریں کہ وہ مشہور نہیں لہذا مقبول نہ ہونگے۔ سبھی مشہور و مقبول لوگ شہرت و مقبولیت کے لائق نہیں اور سینکڑوں گمنام ایسے قابل ہیں کہ انہیں سر آنکھوں پر جگہ دی جائے اگرچہ وہ اس اشتہار بازی کے تمنائی نہ ہوں!

ناظرین! ہمارا نصب العین ہمایوں کو ترقی دیتے رہنا ہے، فرمائیے آپ کا کیا ارادہ ہے؟ خاموشی سے اُسے دیکھتے رہنا لُطف سے پڑھتے رہنا؟ آپ کہیں گے قارئین کا حق بھی یہی ہے کہ دیکھیں پڑھیں اور لُطف اُٹھائیں نہ یہ کہ آپکی چیخ پکار سُن کر متاثر ہوں اور خریدار ڈھونڈھنے کو چل نکلیں! اس پر ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ یہی ناکہ ---- ۵

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک   ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

اِس مُلک میں کارکنوں اور جوہر شناسوں کا بُرا حال ہے۔ ایسے لوگ جو خود کچھ نہیں کرتے نہ کسی کے کئے کو آنکھ اُٹھا کر دیکھتے ہیں نہ کسی کے جی کی سنتے ہیں وہ تو اپنے آپ میں مگن ہیں نہ انہیں کام کی دقتیں درپیش نہ بیکسی کی حالتیں پیشِ نظر نہ واعظ کا جھگڑا نہ سائل کا ٹنٹا۔ اسکے مقابل میں کام کرنیوالوں اور انکے مربیوں مددگاروں کی بڑی گت بنتی ہے۔ جو تھوڑے بہت کام کرنیوالے ہیں وہ کام کی کثرت سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں جو انکے چند مددگار ہیں وہ سیاسی و مذہبی معاشرتی و علمی تحریکوں کیلئے چندے دے دے کر کنگال ہوئے جاتے ہیں لیکن خلقِ خدا پڑی سوتی ہے اور نام نہاد رہنما یا اپنی ہر دلعزیزی میں مگن ہیں یا ریشہ دوانیوں میں مصروف۔ اُردو کے کارکنوں کا اُدھر ملک کی دوسری زبانوں سے اک غیر ضروری مقابلہ ہے اِدھر انہیں اپنی زبان والوں کی سخت بے پروائی و سرد مہری سے واسطہ پڑتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر قومی محبت کے ولولے نہ ہوں تو شاید سبھی کے حوصلے پست ہو جائیں!

ہندی بنگالی والوں کو دیکھئے۔ وہ کس طرح اشاعتِ زبان میں مصروف ہیں۔ ایک شخص کو سیاست سے بہت کم تعلق ہے علم و ادب کا مطلق شوق نہیں لیکن وہ فقط اسی غرض سے تین چار اخباروں اور دو ایک رسالوں کا خریدار ہے کہ اس سے اسکے ملک و قوم و زبان کی اعانت ہوتی ہے اور حقیقت میں یہی وہ باتیں ہیں جن کے ذریعہ سے اِن لوگوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں تھوڑے ہی عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم جہاں تھے وہیں ہیں لیکن ترقی کی دوڑ میں باہمی مقابلے کا معاملہ ہے اور قوموں کے عروج میں سوال اُنکے استقلال کا ہے۔ اُردو یقیناً ترقی پر ہے خدا قائم رکھے عثمانیہ یونیورسٹی کو کہ وہ ہماری علمی کمیاں پوری کر رہی ہے اگرچہ اسکی رفتار شاید ذرا ہلکی ہے اور خدا حوصلہ دے ہمارے ادیبوں اور ادب نوازوں کو کہ فقط اک شوق کی مدد سے ملک میں غالباً سو سے زائد اُردو ادبی رسالے ایک وقت میں جاری رہتے ہیں گو ان میں سے اکثر کساد بازاری کے باعث جلد ہی سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ آپ کی مدد کے بغیر یہ سب دنا نہ بھی ہوں پروان کبھی نہیں چڑھ سکتے۔ ہمایوں بھی انشاء اللہ حضرت ہمایوں کی یاد میں زندہ رہیگا لیکن اُسے آپکی ہمدردی و حوصلہ افزائی درکار ہے ۔۔۔۔۔ یہ کس صورت میں ہو گی اور کب؟ آپ ہی کہئے! جیسد آمیہ جمعہ کر ما دم

بشیر احمد

—•—•—✲—•—•—

جہاں نما

رفتارِ زمانہ۔ کسی مدت یا زمانے کا آغاز نہ معلوم کس لئے مسرت انگیز ہوتا ہے! صبح ہوتے رات کی کلفتیں بھول جانا سردیوں کے بعد بہار سے لطف اٹھانا تو اک قدرتی بات ہے کہ جس تبدیلی سے جسم پر اثر ہو اُس سے دل بھی ضرور متاثر ہوگا لیکن کچھ اسی طرح اک مہینے یا سال یا صدی کے شروع ہونے پر عموماً دل میں جدت کا احساس اور زبان سے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے نہ معلوم کس لئے؟ اک فلسفی شاید کہیگا کہ یہ حسیات مصنوعی خیالات پر مبنی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اسی طرح ملکوں کے تفرقے قوموں کے جھگڑے اور نسلوں کے امتیازات بھی کم و بیش اضافی و مصنوعی ہیں پھر کتنا ظلم ہے کہ ان کا اثر ہماری زندگی پر اس قدر زبردست ہو کہ ہمارے دل و دماغ انکے نیچے دبے چلے جائیں اور انکے ہوتے خدا کی خدائی میں ہمیں اور کچھ نہ سوجھے۔ ظلم ہے تو ہو واقعہ یہی ہے سنہ ۱۹۲۵ء گذر گیا۔ اس کا حساب کیا تھا؟ چین و ہندوستان میں "تقسیم" اسلامی ملکوں میں "ضرب" اور یورپ و امریکہ میں "جمع"!

ہندوستان کی اب یہ حالت ہے کہ "رعایا میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" اس نسخے کی چنداں ضرورت نہیں رہی ہندو مسلمان بلا جبر و اکراہ برضا و رغبت خود بے تکلف لڑتے بھڑتے ہیں۔ صلح و امن کو ملکی زبان میں فراغت اور جنگ و جدل کو قومی مصروفیت کہا جاتا ہے عدم تعاونی تو اب بہت سے دوسرے گروہوں میں بٹ ہی چکے تھے اب سوراجیئے بھی اک دوسرے سے الگ الگ ہو رہے ہیں اور وہ وقت قریب ہے کہ انکے اکثر رہنما وزارت کے قلمدان سنبھالے ارباب حکومت کے دروازوں پر شاید ذرا خودداری سے کھڑے نظر آئینگے۔ اہل ملک و قوم اپنے رہنماؤں کے ہاتھ میں کٹ پتلیاں ہیں جن سے وہ دنیا کو اپنی ہوس پرستی کا تماشا دکھاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ وقت صرف گاندھی جی کے روحانی تجربات کے کہنے سننے کا ہے قومی و ملکی جذبات کے اقرار و اصرار کا نہیں! اور شاید اسی لئے ایک عدالت پیشہ وائسرائے کے بعد اب ہماری طرف اک زراعت پیشہ وائسرائے بھیجا جا رہا ہے"

اسلامی ممالک کی حریت پسندی اب دبائے نہیں دبے گی۔ ترکی میں کمال پاشا۔ ایران میں رضا خاں افغانستان میں امان اللہ نے جو کچھ کر دکھایا ہے اُس سے ظاہر و عیاں ہے کہ مصر میں زاغلول پاشا مراکش میں عبد الکریم اور شام میں دروسی کیا کرنے والے ہیں! روس کی حکومت میں مقامی مسلمانوں کا

دخل و اثر رُوس کی ترک پسند سیاست سے ثابت ہے ۔ عرب میں نجدیوں کی گولہ باریاں قابلِ تعریف نہ سہی لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ اس بادشاہ گردی کا نتیجہ لائقِ نفرت ہی ہو ۔ دُور دراز چین سے یہ خبر آتی ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے جلسے میں یہ تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی کہ آئندہ ابتدائی دراعلیٰ مدارس اسلامی اصول پر قائم کئے جائیں مُسلمان عورتیں بھی دُنیا بھر میں غلامی کی اُن زنجیروں کو توڑ رہی ہیں جو اسلامی احکام کے خلاف صنفِ غالب نے انہیں پہنائیں ۔ یہ درست ہے کہ ترکی میں یہ آزادیاں مناسب حدود سے تجاوز کر رہی ہیں لیکن یہ حد شکنی فقط اک نشانِ تنبیہ ہونا چاہیئے اُنکے لئے جو آزادی کی راہ پر چلیں نہ کہ اک بہانہ اُنکے لئے جو اپنی عورتوں کو ناجائز رسم و رواج کی جکڑ بندیں رکھے ہوئے ہیں ۔ ٹیونس کے ایک جلسے میں ایک عرب خاتون بے نقاب ہوکر اسٹیج پر آتی ہے اور اپنی بہنوں کی کس مپرسی اور بیکسی کی ایسی دردناک تصویر کھینچتی ہے کہ حاضرین دم بخود رہ جاتے ہیں ۔ دولت ابدی خانم برقع پوشی اور خانہ نشینی کو چھوڑ کر ایران میں ایک انجمن "آئندہ کی مائیں" قائم کرتی ہے جس کا مقصد اُس کے نام سے صاف عیاں ہے اور ہمارے مولوی منش مسلمان ان باتوں کو سُن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ اسلامی شرم و حیا کی تباہی کا زمانہ آگیا لیکن وہ یاد کریں اُن صدیوں کے مظالم کو جو مذہب کا نام لے کر درحقیقت اسلام کی خلاف ورزی میں مسلمان عورتوں پر ڈھائے گئے تو ہمارے آزادوں کی افراط آرائی ہمارے صیادوں کی تفریط پسندی ہی کا نتیجہ ہے ۔ لیکن مطمئن رہیئے ۔ کچھ عرصے تک یہ کوتاہ اندیش حریت نواز خود بخود راہِ راست پر آجائیں گے !

انگلستان جسکی قدامت پسندی مہذب دُنیا میں ضرب المثل ہی ہے مزدور جماعت کی مساوات طلبی اور آزاد خیالوں کی جمہوریت پر لات مار کر اب اپنی جبلّی قدامت میں مگن ہے مقبوضات پر فوجی قبضہ ہے محروسات پر جبری سایہ ہے رنگدار قوموں پر بزرگانہ نظریں ہیں غرض حکومت کی مستی نے مدہوش کر رکھا ہے !

فرانس جو کبھی "سرچشمۂ جمہوریت" تھا آج آزادی کے سوتوں کی ناکہ بندی کر رہا ہے ۔ وہ ملک جو دُنیا کے سب سے مشہور سیاسی انقلاب کا بانی مبانی تھا اب شہنشاہیت کا اس قدر دلدادہ ہوچکا ہے کہ دُنیائے اسلام میں جابجا اُس کے خلاف قومی انقلاب بپا ہو رہے ہیں فرانس ذاتی تجربے سے جانتا ہے کہ حُریت کا پھوڑا جتنا دبایا جاتا ہی اونچا اچھل گیا ۔ لیکن اس پر بھی جبر و حکومت کی وہی ضد ہے ۔ کیا کرے اپنی بات اور ہوتی ہے غیروں کی اور ! اے انصاف تو مغرب میں مغرب والوں کے لئے پیدا ہوا اور مشرق میں مشرق والوں پر ظلم کرنے کو آیا !

اطالیہ اور ہسپانیہ میں مسلینی اور پرائمی استبداد کا دور دورہ ہے اور عوام کی آوازیں نعرۂ حکومت کے شور و شغب میں سنائی

نہیں دیتیں ہاں بلند آہنگی کا بے سُرا پن ظاہر ہو رہا ہے۔
رُوس میں بالشوی طرزِ حکومت کی بنیادیں زیادہ اُستوار ہُوئی جاتی ہیں۔ کسان جو کبھی زار سے بیزار تھے آج خود قوت کے نشے میں سرشار ہیں!
امریکہ مزے میں ہے اُسے کسی بات کی فکر نہیں۔ کیوں نہ ہو دُنیا کا سب سے بڑا قرض خواہ ہے!
انجمن اقوام کی ثالث بالخیر ہاں خیر ہی کریں۔ یونان و بلغاریہ تو خیر چھوٹی چھوٹی دولتیں تھیں اُنہیں ذرا دھمکا لیا جرمانہ کر دیا اور بزرگانہ نصیحتیں بھی کہہ دیں لیکن انگلستان و ٹرکی کے جھگڑے میں انصاف ہو تو ہم سمجھیں کہ لیگ صرف زبردستوں کی لکیر کی فقیر نہیں۔
۱۹۲۵ء میں کیا ہُوا؟ زبردستوں کے ظلم اور زیردستوں کی چیخ پکار! اس کا علاج کیا ہے اسکا کیا ہو گا! شاید ۱۹۲۶ء کچھ بتا سکے!

ہندوستان میں غیر مُلکی مصنوعات کی درآمد: ۔ جنگِ عظیم کے دوران میں جب یورپ کی تجارت کا بازار سرد پڑ چکا تھا، جاپان کی تجارت نے بہت ترقی کی تھی ایک تو یوں بھی جنگ میں مشغول ہونیکی وجہ سے تجارت کی طرف یورپ کی توجہ نہ رہی تھی اسکے علاوہ جہازوں کے لئے راستہ نہایت پُرخطر ہو چکا تھا اور انگلستان نے اپنے حریف ممالک سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنیکا اختیار بھی چھین لیا تھا۔

جنگ کے دَوران میں جرمنی کا دیوالہ نکل چکا تھا، لیکن جب معاہدۂ صلح کے بعد اسے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کے حقوق ملے، تو اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش شروع کر دی۔ جرمن صناعوں نے پھر محنت و مشقت میں رات اور دن کو ایک کر دیا، وہ مشینیں جو بیکار رہنے کی وجہ سے زنگ آلودہ ہو چکی تھیں۔ پھر حرکت میں آنے لگیں اور کارخانوں اور تجارت گاہوں میں پھر وہی رونق اور پھر وہی شور و شغب برپا ہونے لگا۔ "انڈین ریویو" کو ایک نامہ نگار کلکتہ سے اطلاع دیتا ہے کہ گزشتہ مہینے جرمن مصنوعات کا ایک سیلاب ہندوستان میں داخل ہُوا، اور جرمنی کے مال کی درآمد کی رفتار پہلے سے کئی درجہ زیادہ تیز ہو گئی ہے، ہندوستان کی طرف مصنوعات کی برآمد کرنے والے ملکوں میں جرمنی نے اس وقت تیسرا درجہ حاصل کر لیا ہے، گو یا جاپان کی جگہ اس سے چھن گئی ہے آئندہ سال جرمن قوم پرستوں کو ہندوستان میں داخل ہونیکا موقع مل جائیگا، اور یہ بات خارج از امکان نہیں کہ وہ پھر وہی رسوخ حاصل کر لیں، جو انہیں جنگ سے قبل حاصل تھا۔ درآمد کرنے والے تاجر جرمنی کا مال خریدنے کو بالکل تیار ہیں،

بشرطیکہ جرمن تاجر قیمت کا مطالبہ فوراً نہ کریں۔ جرمنی والے بھی ہر طرح سے اپنے پرانے گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے تیار ہیں، کیونکہ انہیں اس سے پہلے کوئی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ ہر قسم کا جاپانی مال بالخصوص شیشے کے آلات جرابیں، بنیان، مفلر اور اسی قسم کا تمام دوسرا جاپانی سامان آہستہ آہستہ بازار سے غائب ہو رہا ہے جرمنی کی سرگرمی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اب برطانی تجارت پر بھی جرمن تاجر ہاتھ صاف کیا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کے کاغذ، طباعت کی سیاہی اور مختلف قسم کی مشینوں میں جرمنی نے درحقیقت ایک اجارہ دار کی حیثیت حاصل کرلی ہے"۔ یہ ہیں زندہ قومیں، جن کی زندگی اُن سے موت کا تباہ کار ہاتھ بھی چھین نہیں سکتا۔ کیا ہندوستان اس سے کوئی سبق حاصل کرسکتا ہے؟

سوراج اور والیانِ ریاست۔ سوراج کے حصول کے بعد ہندوستانی ریاستوں کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے، جو آجکل ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں بار بار دہرایا جاچکا ہے۔ اور مختلف اشخاص کی طرف سے اسکے مختلف جواب مل چکے ہیں، حال ہی میں ایک اخبار نے ایک اسی قسم کے سوال کا حل پیش کیا ہے۔ جو زیادہ ممکن العمل معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ سوراج کا حصول بھی ممکن ہو۔ اخبار مذکور لکھتا ہے:۔

"ہمارا نقطۂ خیال ہمیشہ سے یہی رہا ہے، کہ ہندوستانی ریاستوں کی طرزِ حکومت کا سیاسی مطمح نظر ایک "جمہوری ملوکیت"، کا قیام ہونا چاہیئے۔ "جمہوری ملوکیت" کا جملہ بعض لوگوں کو عجیب و غریب معلوم ہوگا لیکن اس قسم کی "تاجدار جمہوریت"، کا بہترین نمونہ ہم انگلستان کے نظام حکومت میں دیکھ سکتے ہیں، جہاں ایک موروثی فرماں روا کا اثر عوام کی طاقت کے قیام و اصلاح کا کفیل بن چکا ہے، والیانِ ریاست کو تخت سے دست بردار کرنیکی نہ ضرورت ہے، نہ ہم یہ کرسکتے ہیں اور نہ ہمیں یہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں محض یہ دیکھنا ہے کہ وہ صرف انہیں اختیارات سے کام لیں جو اُنکے لئے متفقہ طور پر تسلیم کئے جاچکیں۔ اور وہ حکومت کے ہر شعبے میں جمہور کے نمائندوں کے زیرِ ہدایت عمل کیا کریں"۔

سر رائڈر ہیگرڈ کی وصیت:۔ پچھلے دنوں انگلستان کے مشہور ناول نویس سر رائڈ ہیگرڈ کا انتقال ہوا۔ انگلستان کے اکثر بڑے مصنفین کی طرح رائڈر ہیگرڈ بھی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ اُنکی کتابیں کروڑوں آدمیوں کے پُرشوق ہاتھوں میں جاتی تھیں۔ رائڈر ہیگرڈ نے ۶۱۷۲۵ پاؤنڈ کی مالیت کی ایک عظیم الشان جاگیر چھوڑی ہے، اُن کی ذاتی جائداد جس کی قیمت ۵۷۲۸۶ پاؤنڈ ہے، اسکے علاوہ ہے۔ انہوں نے اپنی تمام مطبوعہ

اور غیر مطبوعہ کتابوں کا حق تصنیف اور سٹیج پر لانے کا اختیار اپنی بی بی کو دیدیا ہے، انہوں نے اپنی وصیت میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اپنی بی بی کی منظوری کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ میری تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت اور میری تصانیف کو فلموں کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے سٹیج پر لانے کے متعلق تمام ادبی معاملات میری سکرٹری آنڈا ہیکٹر کے زیرِ نگرانی طے ہوا کرینگے۔ رائڈر ہیگرڈ نے اپنی سکرٹری آنڈا ہیکٹر کے لئے بھی اُس کی طویل اور وفادارانہ خدمات کے معاوضہ میں ۱۰۰۰ پاؤنڈ چھوڑے ہیں۔

اولادِ آدم :- اس وقت روئے زمین پر کل ۱،۶۹۰،۰۰۰،۰۰۰ نفوس آباد ہیں۔ یہ آبادی دنیا کے تمام قطاع میں تقسیم ہو چکی ہے اور غالباً زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں، جسے انسان کے قدم روند نہ چکے ہوں۔ ایشیا میں جو نسلِ انسانی کا گہوارہ تصور کیا جاتا ہے، آجکل ۹۰۰،۰۰۰،۰۰۰ آدمی بستے ہیں۔ یہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے اور بلحاظِ اوسط ہر مربع میل میں ۱۳۵ انسان رہتے ہیں۔ یورپ کی کل آبادی ۴۵۰،۰۰۰،۰۰۰ ہے اور بلحاظ اوسط ہر مربع میل میں ۱۴۰ آدمی آباد ہیں اگرچہ اس بحیثیتِ مجموعی سے یورپ کی آبادی کچھ زیادہ نہیں لیکن جہاں جہاں آبادی ہے، بہت گنجان ہے۔ بلکہ کئی مقامات میں آبادی حدِ مناسب سے تجاوز کر گئی ہے۔ افریقہ کی آبادی تقریباً ۱۴۰،۰۰۰،۰۰۰ ہے اور شمالی وسطی اور جنوبی امریکہ میں ۱۶۰،۰۰۰،۰۰۰ کی آبادی ہے۔ دوسرے مقامات کی آبادی کے مقابلہ میں امریکا کی آبادی کم گنجان اور پھیلی ہوئی ہے آسٹریلیا اور متفرق چھوٹے چھوٹے جزیروں کی آبادی غالباً ایک کروڑ کے قریب ہے آج سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل جب دنیا کی آبادی کا اندازہ ۱،۴۵۰،۰۰۰،۰۰۰ لگایا گیا تھا۔ کچھ اور دلچسپ اعداد و شمار بھی جمع کئے گئے تھے مثلاً انتہائی سفید اور انتہائی سیاہ فام نسلوں میں پانچ اور تین کی نسبت ہے باقی ۷۰۰،۰۰۰،۰۰۰ لوگ سانولے یا گندم گوں ہیں تمام نسل انسانی میں سے ۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ نفوس کپڑے پہنتے ہیں۔ ۲۵۰،۰۰۰،۰۰۰ عادتاً برہنہ رہتے ہیں اور ۷۰۰،۰۰۰،۰۰۰ اپنے جسم کے صرف درمیانی حصے کو چھپاتے ہیں ۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ گھروں میں رہتے ہیں ۷۰۰،۰۰۰،۰۰۰ جھونپڑوں میں اور ۲۵۰،۰۰۰،۰۰۰ ایسے ہیں جنکے پاس سر چھپانیکی کوئی جگہ نہیں۔

تصویر میں مصوّر نے فطرتِ انسانی کی سہ گانہ تقسیم ظاہر کی ہے: دل اور دماغ اور جسم اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کام کر رہے ہیں۔ طالب علم کا دماغ قدرت کے اسرار کے سمجھنے بوجھنے میں مستغرق ہے۔ ماں کا دل اپنے پیارے بچے کی نگہداشت میں منہمک ہے اور نبرد آزما کے جسم و جان ظلم و تعدی کے خلاف جنگ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ راہیں بظاہر مختلف ہیں لیکن منزلِ مقصود فی الحقیقت ایک ہی ہے!

کلامِ ہمایوںؔ

کھڑا ہوں انتظارِ یار میں جوں شاخِ نرگس میں
مجھے حیرت ہے کیوں آنکھیں مری پتھرا نہیں جاتیں؟

یہ کس کے سوز کا ہے بزمِ جاں میں انتظار اے دل؟
کہ آہیں آج سُوئے عالمِ بالا نہیں جاتیں

نگاہیں گر کے مثلِ برق دل کو کیوں جلاتی ہیں
اشاروں میں یہ کیوں مطلب مجھے سمجھا نہیں جاتیں؟

قیامت ہے فلک سے روزِ روشن میں گرے بجلی
مرے ظلمت کدہ پر کیوں گھٹائیں چھا نہیں جاتیں

اُمیدیں جب مری بر آئیں تو ہنس کر لگے کہنے
یہ برسوں قیدِ دل میں رہ کے کیوں گھبرا نہیں جاتیں

ہزاروں جانیں ہر دم پیش کش ہوں خود بخود یا رب!
اجل کو اُن کی کیوں کچھ کچھ ادائیں آ نہیں جاتیں

ہیں اشکِ غم کے موتی بحرِ دل کی تہ میں پوشیدہ
اور آہیں سطح کی جانب حباب آسا نہیں جاتیں

نہیں گستاخ آئینہ مقابل ہے کھڑا کوئی!
یہ حیراں ہے کہ کیوں آنکھیں تری شرما نہیں جاتیں

ہمایوں! تیرا دل بھی گلشنِ حسرت کا غنچہ ہے
خوشی میں بھی تری باتیں وہ غم افزا نہیں جاتیں

⁂

"ہمایوں" (مرحوم ومغفور)

زندگی کی تین راہیں

زندگی کی تین راہیں ہیں جو اُسی ایک کی طرف جاتی ہیں جو سب کا سرچشمہ ہے!

زندگی کی تین راہیں ہیں علم عمل اور عشق!

علم کی راہ ہواہیں ہے عمل کی زمین پر اور عشق کی پانیوں میں!

عالم اُڑتا ہے عامل چلتا ہے اور عاشق تیرتا ہے!

عالم کو فضا کی خاموشیوں اور تنہائیوں کا سامنا ہے، عامل کو ناہموار زمینوں اور دشوار گذار گھاٹیوں سے ہوکر گندرنا ہے، عاشق کو تبزرو دریاؤں اور طوفانی سمندروں کے اُس پار جانا ہے!

علم کیا ہے؟ دوسرے کی سُننا، عمل کیا ہے؟ جی کی کہنا، عشق کیا ہے؟ آپے کو بھولنا!

علم جگ بیتی ہے، عمل آپ بیتی، عشق حق بیتی!

علم کچھ جاننے کی تمنا ہے، عمل کچھ کرنے کی خواہش اور عشق گھُل مل جانے کی آرزو!

علم سے دوسرے کا عمل سے اپنا اور عشق سے اپنا اور سب کا پتہ ملتا ہے!

علم اقرار ہے عمل اصرار اور عشق احساس!

علم اور عمل اور عشق ـــــ کیا الگ الگ ہیں؟ کیا اک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں؟

علم راست وہی ہے جو جد وجہد کی راہ دکھائے اور ہمارے دل میں ہر شخص اور ہر بات کی محبت کا خیال پیدا کرے، عمل صالح وہی ہے جو ہمیں غور و فکر کی عادت ڈالے جو ہمیں دوسروں کے لئے کچھ کرنے کی ترغیب دیتا رہے، عشق حقیقی وہی ہے جو ہمیں سچے علم کا راز بتائے جو ہمیں اچھّے کام کی راہ سجھائے!

علم اور عمل اور عشق ـــــ ان میں کونسی راہ بہترین ہے؟

جب سب راہیں اُسی اک بہترین کی طرف جاتی ہیں تو ہم کس کو کہتر اور کسے بہتر کہہ سکتے ہیں؟

دُنیا میں کسی کو علم کی جستجو ہے کسی کو عمل کا ذوق ہے اور کسی میں عشق کا جذبہ ہے یعنی کسی کو پرواز پسند ہے کسی کو گلگشت اور کسی کو پیراکی و غوطہ زنی ـــــ پھر کون کہہ سکتا ہے ان سب میں سب سے اچھّی کونسی ہے؟ سب سے اچھّی وہی ہے جو سب سے اچھّی طرح ہو!

کوئی علم کا دلدادہ ہے۔ وہ کائنات اور اُسکی باریکیوں سے آگاہی چاہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے یہ کیوں ہوں؟ یہ دُنیا کیا ہے؟ چاند سُورج کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ وہ اکثر سوال کرتا ہے کبھی کبھی جواب پاتا ہے جب جواب پاتا ہے خوش ہو جاتا ہے! خاموش بیٹھا وہ اپنا اپنے گھر کا اپنے گاؤں یا شہر کا اپنی قوم اپنے ملک اور اپنی دُنیا کا پتہ لیتا ہے کہ ان میں کیا کچھ ہے کون رہتا ہے کیا کہتا ہے؟ جو کہنے والے کہہ گئے وہ سُنتا ہے اور وہ کہتا ہے جو سُننے والے سُنتے ہیں۔ وہ چیزوں کو دیکھتا بھالتا ہے باتوں کو سمجھتا بوجھتا ہے لیکن چیزیں ہیں کہ تہ در تہ باتیں ہیں کہ تو بر تو نکلی چلی آتی ہیں۔ دامن پھیلاتا ہے اور جی ہی جی میں مُسکراتا ہے:

کوئی عمل کا کارندہ ہے، وہ دُنیا اور اُسکی مصروفیتوں سے حظ اُٹھاتا ہے۔ وہ چیزوں کی کرید اور باتوں کی دریافت میں اپنا وقت نہیں کھوتا بلکہ کاموں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ "کیا کیا" "کیوں کیوں" نہیں کرتا "وہ تھا" اور "یہ ہوگا" کو جبھی مانتا ہے کہ "نہیں ہے" کر دکھائے۔ گھر بار میں سفر حضر میں اونچ نیچ میں مصروف ہے مشغول ہے منہمک ہے وہ جنبش میں سکون، حرکت میں برکت اور کام میں آرام پاتا ہے۔ شہروں کو اُسی نے بسایا سڑکیں بنائیں باغ لگائے کارخانے چلائے عمارتیں کھڑی کیں عدالتیں قائم کیں پھر ہزاروں ضرورتیں پیدا کیں جس سے کاموں کے لاکھوں سلسلے خود بخود جاری ہو گئے۔ غرض ہماری دُنیا کو اک کارگاہ اور بازی گاہ اُسی نے بنایا!

کوئی عشق کا بندہ ہے، وہ دوسرے میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اُسے جاننے اور کر دکھانے کی پروا نہیں، وہ اپنے تئیں نامکمل سمجھ کر محبت میں تکمیل اور ایثار میں اظہار کا ذریعہ تلاش کرتا ہے، وہ اک جز ہے جو اور اجزا میں مل کر کُل ہونے کا تمنائی ہے۔ اس تلاش و تمنا میں اُسے اپنی جان تک کی فکر نہیں لیکن اپنے سوا ہر شخص اور ہر چیز کی بہبود اُسکے مدِنظر ہے اور یہ اس لئے کہ اُسے اسی کلفت میں راحت اسی دُکھ میں سُکھ اور اسی خود مٹ جانے میں سب کچھ پالینے کا لُطف ملتا ہے، زندگی کی کرن جب اُسکے دل میں ہو کر گذرتی ہے تو قوسِ قزح کی سی رنگینیاں اس میں سے پھوٹ نکلتی ہیں اور دُنیا اُسکے اور سب کے لئے اک جنت گاہ بن جاتی ہے!

زندگی کی ان راہوں پر چلنا اک حد تک آسان ہے کیونکہ فطری ہے لیکن انکا طے کر لینا سخت دشوار ہے اگرچہ پالینے کی آرزو انسان ضعیف کو اکثر دھوکے میں ڈال دیتی ہے کہ بس تُو نے پالیا اور پھر خود غرضی کی فتنہ سامانیاں رہ رہ کر رخنہ اندازی کرتی ہیں اور ایسے ایسے سوانگ بھرتی ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

کتنے اربابِ علم ہیں جو یہ سمجھ کر کہ وہ سب کچھ سمجھ گئے کچھ نہ سمجھ سکے یا جنکے علم وفن کی کارستانیوں نے اک دُنیا کو تباہ کر دیا۔ کتنے کام کرنیوالے ہیں جنکی کارگذاریوں نے زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا اور کتنے والہانِ محبت ہیں جنھوں نے پاکیزہ جذبات کو آلودہ خواہشات کا جامہ پہنایا!

حق یہ ہے کہ نیک نیتی زادِ راہ ہو تو زندگی کی ہر راہ پر چلنے والا اُسی شاہراہ پر جا پہنچتا ہے جسکی منزلِ مقصود خدا کا گھر ہے! خُدا ایک ہے لیکن اُس تک پہنچنے کی راہیں اتنی ہی ہیں جتنی انسانوں کی رُوحیں،،!

بشیر احمد

حقائق و معارف

گرچہ اندیشۂ ما رشتۂ خام است و لے
شمن زنار باندام دو عالم بستند

ہزاراں تازہ ترے خوب ترے می جویند
نقش خوبے کہ شکستند دگر کم بستند

عشق از لذت نظارہ بدیوار جہاں
رخنہ کرد و ز آب و گل آدم بستند

محمد اقبال

ہندی بھاشا کا جدید ادب

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج سے پچیس ۲۵ تیس ۳۰ برس پہلے ہندی ادبیات میں چند مذہبی اور اخلاقی نظموں، چند عشقیہ گیتوں اور تلسی داس جی کی "رامائن" کے علاوہ کوئی گرانبہا خزانہ ادبی تصانیف کا موجود نہ تھا۔ اُس کے بعد جو دور شروع ہُوا۔ اُس کا تذکرہ قدرے معارضانہ روش پر ایک ہندی ناول میں بدیں الفاظ کیا گیا ہے (کہنے والا کہتا ہے کہ:)

"میں نے تو ہندی ادب کا پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ ترجموں کو نکال ڈالئے تو آپ کے نئے ہندی ادب میں ہرِیشچندر کے دو چار ناٹکوں اور چندر کانتا سنتتی" کے سوا اور کچھ رہتا ہی نہیں دُنیا کا کوئی ادب اس قدر پست نہ ہوگا۔ اُس پر طرّہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے دو ایک انگریزی کتابوں کے ترجمے۔ مرہٹی اور بنگالی ترجموں کی مدد سے کر لئے وہ اپنے کو جیّد ادیب سمجھنے لگے ہیں۔ ایک صاحب نے کالیداس کے کئی ناٹکوں کے اناپ شناپ ترجمہ کئے ہیں۔ وہ اپنے کو ہندی کا کالیداس سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگوار نے مِل کی دو ایک کتابوں کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی خود نہیں بلکہ گجراتی مرہٹی وغیرہ کے ترجموں کی مدد سے لیکن وہ اپنے دل میں ایسے مطمئن ہیں۔ گویا ہندی کی غایت اصلاح کردی۔ میرا تو خیال ہوتا جاتا ہے کہ ترجموں سے ہندی کا نقصان ہو رہا ہے۔ اور ایجاد کو پنپنے کا موقعہ نہیں ملنے پاتا"۔ اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس وسطی دور میں چند ناٹکوں اور چند پرانی قسم کی داستانوں کو چھوڑ کر علمی پیداوار کا مدار دوسری زبانوں سے ترجموں پر رہا ہے۔ لیکن گذشتہ دس بارہ برس سے یہ حالت بہت کچھ بدلتی جاتی ہے اور اس وقت ہندی کی ادبی دنیا میں ایک سے زیادہ باکمال ایسے موجود ہیں جن کی تصانیف نہ صرف اپنی زبان میں عقیدت سے پڑھی جاتی ہیں۔ بلکہ اور مُلکی زبانوں میں بھی شوق سے ترجمہ اور نقل کی جاتی ہیں۔ مستقل تصانیف کے علاوہ مخزنوں اور رسالوں کے ذریعہ سے نئے اسلوب کی نثر اور نظم کے ذخیرہ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی اور مرہٹی۔ بنگالی اور اُردو۔ وغیرہ دیگر زبانوں کے ادبی نمونوں کو ہندی لباس میں لانے کی کوشش جاری ہے۔

پیشتر ازیں کہ ہم بعض ہندی تصانیف کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کریں۔ عہد حاضرہ کے ہندی ادب کے چند عمومی پہلو بیان کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل زبان کا مسئلہ قابل توجہ ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ شمالی ہند کی ایک ہی علمی زبان ہے۔ جو کسی قدر اختلاف کے ساتھ دو شکلوں میں اُردو اور ہندی کے نام سے معروف ہے اگر رسم خط کا خار دار سوال درمیان میں نہ ہوتا کہ ہندوؤں کو دیوناگری حروف سے شغف ہے۔ اور مسلمانوں کو عربی

حروف سے تو یہ دونوں زبانیں کبھی کی ایک ہو جائیں۔ اس دوغلی زبان کے لئے بعض منصف مزاج اجنبیوں اور دو ایک محب وطن ہندوستانیوں نے "ہندوستانی زبان" نام تجویز کیا ہے۔ رسم خط کے علاوہ جو اختلاف اُردو اور ہندی میں ہے وہ بعض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے کہ ہندی کے بولنے والے اور لکھنے والے سنسکرت اور اُسکے مشتقات کو غیر مانوس خیالات کے اظہار کے لئے مرجح طور پر استعمال کرتے ہیں اور اُردو کے حامی عربی اور فارسی کے ماخوذ الفاظ کو اسی قبیل کے خیالات کے اظہار کے لئے پسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ ہندی اُردو سے زیادہ قدیم زبان ہے اور یہ کہ اُسکی قدیم صورت یا صورتیں (بعض ماہران علم اللسان نے دو صورتوں کو مستقل مانا ہے یعنی ایک برج بھاشا اور دوسری پوربی) اُردو سے بہت متفاوت ہیں۔ لیکن اُس قدیم ہندی کو جدید ہندی سے وہی نسبت ہے جو اینگلوسیکسن کو انگریزی سے یا پہلوی کو فارسی سے۔ اور شاید یہ کہنا ازالۂ حیثیت عرفی نہ تصور کیا جائیگا۔ کہ بہت سے پڑھے لکھے ہندو جو مروجہ ہندی زبان میں بخوبی نوشت و خواند کرسکتے ہیں۔ پرانی ہندی زبان کے ایجادات کو سمجھنے سے قریب قریب ایسے ہی قاصر ہیں جیسے ہندی سے نابلد مسلمان۔ اس حقیقت کا اعتراف اکثر منصف مزاج ہندی نگاروں نے کیا ہے کہ دراصل ایک ہی زبان ہے جسے ہندو مسلمان دونوں آجکل لکھتے اور بولتے ہیں۔ چنانچہ مقبول عام مصنف مسٹر پریم چند نے اپنے ہندی ناٹک "کربلا" کے دیباچہ میں صاف طور پر لکھا ہے کہ جو زبان انہوں نے اس ناٹک میں اختیار کی ہے وہی ایک زبان ہے جو اس وقت عام طور پر رائج ہے۔ اور جنہوں نے اُس ناٹک کو مطالعہ کیا ہے وہ تصدیق کرینگے کہ جو زبان پریم چندجی نے استعمال کی ہے وہ وہی زبان ہے جو اُردو کہلاتی ہے۔ قصہ مختصر جو زبان[1] آجکل ہندی نثر کا پیرایۂ اظہار ہے۔ اُس کے پڑھنے میں اُردو دانوں کو ناگری حروف سے مانوس ہونے کے بعد کوئی خاص تکلف نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہندی نثر میں بہت سے الفاظ سنسکرت کے ملتے ہیں۔ جو اُردو میں مروج نہیں۔ اور ان کی کثرت (جس کا میلان مصنف کے ادبی مذاق پر منحصر ہے) بعض دفعہ کسی نقرہ یا عبارت کے مفہوم کو ممتنع بنا دیتی ہے۔ سنسکرت الفاظ کا شوق اس کا مانع نہیں کہ عربی اور فارسی کے الفاظ موجود ہوں۔ بسا اوقات ایک ہی فقرہ یا عبارت میں دونوں قسم کے الفاظ کا دلچسپ تقابل بلکہ تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ محتاط لکھنے والے اس طرح کے خلط زبان سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں اور بحد امکان "شُدھ ہندی" لکھنے کی کوشش میں یہ التزام کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی الفاظ کو دُور رکھا جائے۔ لیکن چونکہ یہ کوشش محض آورد ہے اور نیز زبان کے طبعی ارتقا کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے اُس کا نتیجہ چنداں مطبوع خاطر نہیں ہوتا۔ ہندی نظم کا

[1] ہندی کی اس شکل کو عرف عام میں "کھڑی بولی" کہتے ہیں اور یہ برج بھاشا اور ہندی کی دوسری قدیم شکلوں سے مختلف ہے۔

معاملہ نثر سے مختلف ہے + جو نظمیں آجکل لکھی جاتی ہیں اُن میں قدیم اور جدید دونوں رنگ کم وبیش پائے جاتے ہیں + اگر اُن میں سے بعض اُسی قسم کی ہوتی ہیں جیسی زمانہ حال کے اُردو شعراء اپنے لئے مایہ ناز تصور کرتے ہیں۔ تو بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جنکی زبان اور عروض کو اُردو سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی + بہت سی بحریں جو ہندی میں ابتک مقبول ہیں وہ یا تو اُردو میں کبھی رائج ہی نہیں ہوئیں۔ یا اُنکا اِستعمال امیر خسرو کے زمانہ سے لیکر نظیر اکبرآبادی کے زمانہ تک خاص خاص شعراء اور خاص خاص مضامین کے لئے محدود رہا ہے + اُردو نثر اور ہندی نثر کی سعی متوازی شاہراہوں پر رہی ہے۔ لیکن اُردو نظم کا مضمار عربی اور فارسی عروض ہے اور ہندی نظم کا ڈنگل سنسکرت عروض + غزل جو اُردو نظم کی ہر دلعزیز صنف ہے۔ ہندی میں چنداں مقبول نہیں اُسکے مماثل اگر ہندی میں کوئی چیز ہے تو ٹھمری یا گیت مگر یہ دونوں عروض کی حیثیت سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہیں + قصیدہ بھی اُردو کے لئے مختص ہے + البتہ مثنوی ایسی وسیع صنف ہے کہ اُسکے مماثل چیزیں ہندی شاعری میں بھی مل سکتی ہیں + ہندی شاعری ایک نہایت وسیع موضوع ہے۔ لیکن چونکہ اُسکا بیشتر حصّہ ہندی کے قدیم علم ادب کا جزو ہے۔ اور جدید ہندی شاعری نے ابھی تک اپنے لئے کوئی خصوصیات قائم نہیں کیں۔ اِس لئے اِس موضوع پر تفصیلی بحث کرنیکی یا ہندی شاعری کے گوناگوں محاسن کی داد دینے کی اس تحریر میں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت +

جدید ہندی ادب کا دوسرا قابل ذکر پہلو اُس کا مذہبی اور اخلاقی رجحان ہے + ایشیا میں ہمیشہ سے ادب کو اخلاقی تربیت کا آلہ تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خود اُس کا نام ہی اُسکے اِس مفاد پر دلالت کرتا ہے + دُنیا میں کہیں بھی اِس خیال کا کوئی آدمی نہ ہوگا۔ کہ ادبیات کا اطلاق بے معنی تحریر پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی تحریر معنی رکھتی ہے تو وہ نتیجہ خیز اور سبق آموز بھی ہو سکتی ہے + اختلاف اس قدر ہے کہ یورپ میں بہت سے نقّادانِ سخن کا یہ خیال ہے کہ وہ تحریر جس کا منشاء اوّلین جذبات کی مصوری۔ الفاظ کی سحر کاری اور فطرت کی واقعہ نگاری ہو۔ اور منشائے ثانی کسی حقیقت کی تصدیق و تائید ہو وہ ادب یا خالص ادب کہلانیکی مستحق ہے + اور جس تحریر کا منشائے اوّلین اور غرض و غایت اخلاقی یا مذہبی حقایق کا انکشاف و اظہار ہو۔ وہ اس ذیل میں شمار ہونیکی جائز حقدار نہیں + خلاف ازیں ایشیا میں منشائے ثانی کو منشاء اولیں پر ہمیشہ فایق سمجھا گیا ہے اور نہ صرف پندنامہ و گلستانِ سعدی یا ہت اُپدیش جیسی خالص اخلاقی کتابیں ادب کا مقتدر جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ بلکہ کوئی قصّہ۔ کہانی۔ ناول۔ ناٹک اس میلان سے خالی نہیں ہوتا کہ براہ راست پند و نصائح کا دفتر بن سکے + یہ میلان اُردو ناولوں اور افسانوں میں بھی موجود ہے + کتب فروش کسی نئے ناول کا اشتہار دیتے ہوئے فخریہ لکھتے ہیں کہ اس قصّہ کے مطالعہ سے نہایت عُمدہ اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں + اور پڑھنے والوں

کی نگاہ میں یہ دعوے اُس قصہ کی سفارش بن جاتا ہے۔ لیکن یورپ میں اگر کسی ناول کا اشتہار اس پیرایہ میں کیا جائے تو غالباً اُس کی فروخت کو فروغ دینے کی جگہ اُس کی اشاعت میں حارج ہو۔ اور جو کتاب ان الفاظ کے ساتھ پیشکش عوام کیجائے وہ سوائے معدودے چند پادری منش لوگوں کے عام ناظرین کے لئے سربمہر کتاب ہوجائے۔ ہندی میں یہ میلان اور بھی نمایاں ہے۔ صرف اخلاقی اصولوں کی حمایت ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ہندو دھرم کی تائید بھی مصنف کے پیش نظر رہتی ہے۔ اور جب سے سیاسیات کے دَور دورہ کی وجہ سے بھارت ماتا کی پرستش بھی مذہب کا جزو بن گئی ہے۔ حُبِ وطن کا جا و بیجا اظہار افسانہ نویسی کا پسندیدہ شیوہ ہوگیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل شاید ہندو جذبات کے لئے ناقابل برداشت ہو صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ ہندی مصنف اکثر اُس زرین اصول کو فراموش کردیتے ہیں کہ اپنے مذہب و قوم کی تعظیم دوسری قوموں اور دوسرے مذاہب کی تنقیص سے نہیں حاصل ہوتی۔ اگر اُردو افسانہ نویسوں پر بجا طور سے یہ الزام لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اُنکے افسانوں سے کسی غیر مُلک کے آدمی کو بمشکل اس واقعیت کا احساس ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوستان میں اور مذاہب کے پیرو بھی آباد ہیں۔ تو ہندی افسانہ نویس مُسلمانوں کی موجودگی کا اعتراف اکثر ایسے پیرائیہ میں کرتے ہیں جس سے خود مسلمانوں کو ممنونیت اور تشکر کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا۔ اس پیرایہ کے مذموم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ اُسی مذہبی یا اخلاقی رجحان کا ناگوار اثر ہے جسے میں نے ایشیائی ادب کا ایک خاصّہ قرار دیا ہے۔ نیز یہ بھی خوشی کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ بعض مقتدر اہل قلم اس قابل اعتراض قوم پرستی سے مستثنےٰ ہیں۔ اور مختلف اقوام اور مذاہب کے درمیان صحیح اتحاد و مرّوت کے جذبات پیدا کرنے کے مدعی معلوم ہوتے ہیں۔

جدید ہندی ادب کا تیسرا اہم پہلو جس کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنیکی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ قلتِ ایجاد ہے جس کی طرف اُس عبارت میں اشارہ ہے جو اس مضمون کے آغاز میں نقل ہوچکی ہے۔ جیسے اُردو ادب کا انحصار دُوسرے مُلکوں کے ادب کی خوشہ چینی پر رہا ہے۔ اُسی طرح ہندی نے بھی اپنے لئے کوئی خاص مسلک اختیار نہیں کیا۔ اسکی بدیہی وجہ یہ ہے کہ قدیم ہندی ادب میں سوائے مذہبی اور عشقیہ شاعری کے اور کوئی ادبی نمونے ایسے موجود نہ تھے جو جدید ادب کے لئے بکار آمد ہوسکیں۔ لہذا اور زبانوں کے ادب کی تقلید کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر شاید یہ وجہ ہے کہ ہندی ادب کا جو ارتقاء موجودہ زمانہ میں ہُوا ہے وہ تواتر روایات پر مبنی نہیں بلکہ مصنوعی ذرایع سے عمل میں آیا ہے۔ اور اس لئے اُس میں اصل سے زیادہ نقل کو دخل ہے۔ کوشش اور محنت سے جدید علمی تحقیقات اور معلومات کے ذخائر فراہم کئے

جا سکتے ہیں۔ لیکن ادبی تخلیق اور ایجاد خیال ایک درخت ہے جو طبعی قوانین کے تحت میں پھولتا پھلتا ہے اور جسکی جڑیں ایام ماضی کی سرزمین میں قائم ہوتی ہیں۔ اسکی آبیاری کے لئے اس رس کی ضرورت ہے جو انسانی دماغ کے فطری عمل کیمیائی سے تیار ہُوا ہو۔ اور اسکی شاخوں کو آکسیجن حاصل کرنے کے لئے وہ تمدنی اور معاشرتی ماحول درکار ہے جو تاریخی و طبعی اسباب سے بنا ہو۔ یہ کہنا سچائی سے دُور نہ ہوگا کہ جدید ہندی ادب میں شیکسپیئر اور گوئٹے۔ کالیداس اور سعدی جیسے نادرالوجود افراد کا تو کیا ذکر کوئی سرشار یا آزاد کے پایہ کا بھی اُستادِ فن پیدا نہیں ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ہندی ادب نہ صرف قدیم سنسکرت اور مغربی ادبیات کی تقلید پر مجبور ہے۔ بلکہ اُس کا بیشتر حصّہ اور مروجہ ہندوستانی زبانوں کی تقلید میں عکس ہی نہیں بلکہ عکس در عکس یا نقل در نقل معلوم ہوتا ہے۔

اِس تمہید کو ختم کرنے سے پہلے ہندی ادب کے تجارتی پہلو پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور یہ معلوم کرنا باعث اطمینان و مسرت ہے کہ ہندی کتابوں کی اشاعت کو ان تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو اُردو کی کتابوں کی اشاعت ہارج ہو رہی ہیں۔ اوّل تو ہندی رسم خط ٹائپ کے چھاپہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور اس لئے جس صفائی اور صحت سے معمولی ہندی کتابیں چھپ سکتی ہیں۔ وہ اُردو کتابوں کو خاص اہتمام ہی سے میسر آسکتی ہے۔ دوسرے علی العموم ہندی کے حامی اس زبان کی ترویج و ترقی کو اپنا مذہبی اور اخلاقی فرض خیال کرتے ہیں۔ اور جس ذوق سے ہندی کتابیں خریدی جاتی ہیں اُس کی اُردو کتابیں لکھنے والوں اور چھاپنے والوں کو تمنّا اور حسرت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اس ذوق کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آئے دن ایسے ہندی ناول شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی قیمت بہ اعتبار حجم تین روپیہ سے لیکر پانچ روپیہ فی جلد تک ہوتی ہے۔ درانحالیکہ اُردو ناول عام حالات میں ڈیڑھ دو روپیہ فی جلد سے زیادہ قیمت پانے کی اُمید نہیں کر سکتے۔ اِس ضمن میں بعض اُن جماعتوں کے مساعی کا بھی ذکر خیر کرنا فرض معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ہندی کتابوں کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لیا ہے۔ اور ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف جماعت "ناگری پرچارنی سبھا" ہے جسکو اگر ہندی کے احیاء کا سبب عظیم قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس انجمن کی سعی مشکور "انجمن ترقی اُردو" اور دیگر ہم مقصد انجمنوں کے لئے تازیانہ کا حکم رکھتی ہے۔ تجارتی جماعتوں میں انڈین پریس الہ آباد (جو تصانیف اور تراجم کے علاوہ "سرسوتی" اور دیگر ہندی جرائد کی طباعت اور اشاعت سے ہندی ادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے) اور گنگا پُستکمالا کاریالہ، لکھنو (جسکو ہندی کے مشہور ادبی مخزن "مادھری" اور بعض بہترین ہندی تصانیف کی اشاعت کا فخر حاصل ہے) خاص طور پر قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔ "ہندی پُستک ایجنسی" کلکتہ نے بھی ہندی کتابوں کی طباعت اشاعت اور خصوصاً عُمدہ ادبی افسانوں کی اشاعت میں قابل ذکر حصّہ لیا ہے۔ ان مطابع کی مطبوعات نہ صرف معنوی

خوبیوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ بلکہ اپنی صاف اور خوشنما چھپائی اور نفیس جلدوں کی وجہ سے بھی دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ لیکن اس بات کو دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ سب تجارتی سرگرمی منحصر ہے ہندی بھاشا کے قدردانوں کی ہمت افزائی اور اعانت پر۔ جو کثیر تعداد میں اور گراں قیمت پر عُمدہ کتابیں خرید کر ان جماعتوں کی حوصلہ افزائی میں دریغ نہیں کرتے۔

اِس تمہید کی تفصیل کے طور پر یہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے مختلف شعبوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہُوئے ہر ایک شعبہ کی بعض قابل ذکر اور منتخب مثالوں سے ناظرین کو رُوشناس کیا جائے۔ چونکہ ہندی کے موقت الیشوع رسالوں اور غیر زبانوں کے تراجم نے ادب جدید کے ارتقا میں نمایاں حِصّہ لیا ہے۔ اِس لئے سب سے پہلے ان پر ہی نظر ڈالنی چاہیئے۔ اوپر لکھا جا چُکا ہے کہ ہندی مُصنّفین نے غیر زبانوں سے ترجمہ کرنے میں خاص طور پر سرگرمی دکھائی ہے۔ اول ناٹک وغیرہ کے علاوہ بہت سی عِلمی اور اخلاقی کتابیں سنسکرت اور انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ ہو چکی ہیں۔ انگریزی سے جو تراجم ہُوئے ہیں۔ اُن پر بادی النظر میں ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ جس سے اُردو ترجمے بھی بَری نہیں وہ یہ کہ کسی موضوع پر ترجمہ کے لئے کتاب کا انتخاب کرتے ہُوئے کتاب کی عام شُہرت پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ مگر یہ احتیاط نہیں برتی جاتی کہ کتاب معلومات جدیدہ پر حاوی ہو۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو آج سے پچاس برس پہلے انکشافاتِ جدید کا خزانہ سمجھی جاتی تھیں لیکن مرور زمانہ اور علم کی روز افزوں ترقی نے اُنکی معلومات کو فرسودہ بنا دیا ہے۔ اب بھی اگر کوئی اُن کتابوں کے موضوع کی باقاعدہ طور پر مطالعہ کرنا چاہے تو اُس شخص کے لئے اُن کا مطالعہ لابُدی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ناممکن ہے کہ اُردو۔ یا ہندی میں کسی خاص علم کی تمام مشہور کتابوں کا ترجمہ ہو سکے۔ مشہور اور پُرانی عِلمی کتابوں کے ترجمہ سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کم مشہور اور نئی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ اُس عِلم کی مکمّل معلومات ہماری زبان میں فراہم ہو جائیں۔ ادب جتنا پرانا ہو اُتنا ہی اُس کا کیف بڑھ جاتا ہے۔ لیکن علم (سائینس) کے لئے کہنگی باعثِ زینت نہیں۔ ترجموں کے علاوہ ہندی زبان میں مختلف قسم کی معلومات کا ایک مجموعہ بھی Encyclopaedia Indica "انسائیکلوپیڈیا انڈیکا"[1] کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو مغربی

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ "انسائیکلوپیڈیا" یا جمع علوم لکھنے کا خیال سب سے پہلے عربوں کو پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ اس قسم کی سب سے پُرانی کتاب جس کا مجھے علم ہے "رسائل اخوان الصفا" ہیں جو خلافت عباسیہ کے زمانہ میں جمع ہُوئے تھے۔ لیکن مجھے اس تحقیق

زبانوں کے اس قسم کے مجموعوں کی ایک خاص موقر نقل ہے * کاشکے اُردو میں اس نقل کے پایہ کی بھی کوئی تصنیف موجود ہوتی * موقت الشیوع رسایل میں سب سے زیادہ مقتدر "سرسوتی" (الہ آباد) اور "مدھری" (لکھنو) ہیں * یہ دونوں رسالے اپنی آب تاب میں مغربی مخزنوں اور رسالوں کا بخوبی مقابلہ کرسکتے ہیں اور انکے مضامین نظم و نثر ہندی زبان کے بہترین اہل قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں * ان میں اوّل الذکر یعنی "سرسوتی" کی زبان زیادہ سلیس و سہل ہوتی ہے۔ لیکن ثانی الذکر یعنی "مدھری" شدھ ہندی کا علمبردار ہے * عام رسالوں کے علاوہ ہندی میں بعض اعلیٰ درجہ کے رسالے خاص عورتوں اور بچوں کے لئے بھی شائع ہوتے ہیں * بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی رسالے صوری اعتبار سے اُردو رسالوں سے زیادہ دلکش ہیں۔ اور معنوی اعتبار سے بھی انھوں نے ہندی ادب کی تجدید اور ترقی میں اُس سے کم حصہ نہیں لیا جو تہذیب الاخلاق "دلگداز" "معارف" اور "مخزن" وغیرہ نے اُردو ادب کی تجدید میں لیا ہے۔ "پیام یار" اور "گلچین" کی قسم کے "گلدستے" جہانتک میرا علم ہے۔ ہندی کی ادبی دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن اُنکی عدم موجودگی کو میں ہندی کے لئے باعث عار نہیں خیال کرتا *

ہندی انشاء پردازوں کی ایک کوشش جو اُردو کے حامیوں کے لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ آئے دن ہندی میں ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن کا منشاء ناگری خواں پبلک کو اُردو زبان کے بہترین ادب سے رُوشناس کرانا ہوتا ہے * اسی کوشش کے تحت میں اُردو کے بہترین شعراء مثلاً داغ۔ اکبر۔ ذوق۔ حالی۔ نظیر اکبرآبادی وغیرہم کا منتخب کلام اور اُس پر تنقید مستقل کتابوں کی شکل میں شائع ہوچکی ہے * اُردو کے بہت سے مقبول عام ناول ہندی ٹائپ کے لباس سے مزین ہوچکے ہیں اور بعض پُرانے قصے مثلاً فسانہ عجائب۔ باغ و بہار وغیرہ بھی ناگری حروف میں دستیاب ہوسکتے ہیں * اُردو سے گذر کر فارسی علم ادب پر بھی کسی قدر توجہ کی گئی ہے۔ اور شیخ سعدی۔ مولانا روم اور دیگر ہردلعزیز شعراء کو ہندی ادبیات میں جگہ دی گئی ہے *

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۔ پر اصرار نہیں * ممکن ہے کہ یونانی یا لاطینی یا سنسکرت زبان میں اس قسم کا کوئی مجموعہ "اخوان الصفا" سے زیادہ قدیم موجود ہو۔ اور اگر صرف جامعیت کی صفت کو معیار قرار دیا جائے تو ارسطو کی کلیات بھی انسائیکلوپیڈیا کہلانے کی مستحق معلوم ہوتی ہیں موجودہ مغربی زبانوں میں اس قسم کی تالیفات کی تدوین میں اوّلیت کا فخر غالباً فرانسیسی زبان کو ہے۔ کیونکہ فرنچ انسائیکلوپیڈیا، جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں مرتب ہوئی تھی اس نوع اور نام کی پہلی تالیف تھی * لیکن اُس سے قبل انگریزی زبان میں اس کے مماثل ایک آدھ کتاب شائع ہوچکی تھی اور مشہور و معروف "انسائیکلوپیڈیا برطانیکا" بھی اول مرتبہ فرنچ انسائیکلوپیڈیا، کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ شائع ہوگئی تھی *

اُردو کی مانند ہندی زبان کے جدید ادب کا بھی بہت سا حصّہ ناولوں اور قصص و حکایات کی شکل میں ہے اور اس صنفِ ادب میں ہندی کو اُردو پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے + اُردو زبان میں جدید قسم کے ناولوں کی کمی نہیں۔ اور اِن میں سے بعض ہر لحاظ سے بلند پایہ شمار ہونے کے قابل ہیں +کم ازکم دو تین ناول نویسوں نے اُردو کے جدید ادب میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اور اُن کی قدر و منزلت نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی ہے + اِن مسلّم الثبوت اُستادوں کے علاوہ بعض اور کم درجہ کے لوگوں نے بھی اچھے ناول لکھے ہیں۔ جو میری نگاہ میں ہندوستان کی کسی اور زبان کے ناولوں سے کم پایۂ کے نہیں ہیں + اسی طرح طرزِ قدیم کی داستانوں میں بھی داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال وغیرہ کی بدولت اُردو کو کسی دُوسری ہندی زبان کے آگے سر جُھکانے کی ضرورت نہیں + لیکن مختصر قصّے لکھنے کا جو فن یورپ اور امریکہ میں زمانہ حال میں درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اُس فن کے اعلےٰ نمونے ابتک اُردو زبان میں سوائے ترجمہ کے نظر نہیں آئے + یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ ناول کا آغاز بھی ایسے ہی چھوٹے چھوٹے قصّوں سے ہُوا تھا۔ اور فنِ ناول نویسی کی تکمیل کے بعد بھی ایسے قصّے روز بروز زیادہ فروغ پا رہے ہیں +

ہندی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے دو ایک ایسے اہلِ قلم نصیب ہو گئے ہیں جن کو اس فنِ لطیف سے غائت درجہ کی مناسبت ہے + مسٹر "پریم چند" کے نام نامی سے تو اُردو خوان ناظرین بھی بخوبی آشنا ہیں کیونکہ اُنکی بہت سی کہانیاں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں + لیکن اُن کے علاوہ اور بھی بعض ہندی اہلِ قلم اِس خاص صنفِ تحریر میں بہت سلیقہ رکھتے ہیں + اِن میں شاید سب سے زیادہ قابلِ تعریف پنڈت بشمبر دیال کوشک ہیں جن کی کہانیوں کا مجموعہ حال میں "چتر شال" کے نام سے شائع ہُوا ہے + یہ کتاب واقعی ایک "چتر شال" یا "تصویر خانہ" ہے جس کے اوراق میں مختلف الطبائع زن و مرد اپنے مرقعے پیش کرتے ہیں + اگر کاپی رائٹ کی دِقّت مانع نہ ہوتی تو میرا قصد تھا کہ اس مجموعہ کی کسی کہانی کا ترجمہ اس مضمون میں شامل کر لیتا جس سے اُردو خوان ناظرین کو میرے بیان کا ثبوت مل جاتا + لیکن چونکہ سرِدست یہ ممکن نہیں اس لئے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ مسٹر پریم چند اور مسٹر کوشک دونوں مختصر قصّوں کے لکھنے میں ایک طرزِ خاص کے ماہر ہیں اور اگر اول الذکر کی سلاست و روانی دلکش ہے تو ثانی الذکر کا غائر مطالعۂ فطرت بھی کچھ کم قابلِ داد نہیں +

مختصر قصّوں سے قطع نظر کر کے طویل قصّوں کو لیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندی افسانہ نویسی کے تین دَور تمیز کئے جا سکتے ہیں + پہلے دَور میں تو وہ افسانے ہیں جو پُرانی داستانوں کی تقلید میں شجاعت و عیاری۔ حسن و عشق وغیرہ جذبات کی مبالغہ آمیز روایتوں پر مشتمل تھے۔ اور جنہیں داستانِ

امیر حمزہ[1] و بوستانِ خیال وغیرہ کا ہندی مماثل خیال کرنا چاہیئے + ان افسانوں میں سب سے زیادہ شہرت شاید "چندر کانتا" کو حاصل ہوئی ہے۔ لیکن راقم الحروف کی دانست میں یہ اور اس قسم کے تمام ہندی افسانے اُردو زبان کے اسی قبیل کے افسانوں کے مقابلہ میں بہت حقیر معلوم ہوتے ہیں + اسی دَور میں جاسوسی کے قِصّوں کو بھی بہت فروغ حاصل ہُوا + ہندی خوان پبلک کا جاسوسی اور عیاری کے قِصّوں میں انہماک اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس وقت تک ادبی مذاق پختہ نہیں ہُوا تھا۔ اور چونکہ تقریباً تمام جدید ہندی ناول اور افسانے گذشتہ ۲۵۔۳۰ برس کے اندر لکھے گئے ہیں۔ اِس لئے یہ قیاس آسان ہے کہ اِس دَور کو ختم ہُوئے ابھی کچھ بہت مُدت نہیں ہُوئی + اسکے بعد دُوسرا دَور تراجم کا شروع ہُوا + انگریزی اور بنگالی سے بہت سے ناول ہندی میں ترجمہ کئے گئے خصوصاً بنگالی ناولوں کو مناسبتِ زبان و موافقتِ خیالات کی وجہ سے بہت مقبولیت حاصل ہُوئی + بنگالی ناول نویسوں میں بنکم چندر چٹرجی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اور ہندی میں بھی غالباً اسی مصنف کے ناولوں کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہُوئی ہے + بنکم بابو کے وہ ناول جن میں قومی جذبات کا اظہار ہے ہندی میں خاص ذوق سے پڑھے جاتے ہیں + کیونکہ اپنے قومی تفوّق کی داستانیں سُننے کا شوق تقریباً ہر قوم میں کم و بیش موجود ہوتا ہے + اور خصوصاً قومی زوال کے بعد ایسی داستانیں سننے سے وہی اطمینان و تسکین ہوتی ہے جو کسی مفلوک الحال خاندان کو اپنے اسلاف کی عظمت و ثروت کی روائتیں سننے سے ہوتی ہے + چونکہ بنکم چندر چٹرجی کے بعض ناول

---

[1] جدید تحقیقات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مشہور و معروف افسانوں کی ایجاد کا تعلق فرقہ اسمٰعیلیہ کی تاریخ سے ہے جن کا ایک زمانہ میں مصر و شام و عراق غرضکہ جزیرۃ العرب کے اکثر اقطاع میں بہت زور تھا + عرب میں قدیم ایام سے شجاعت کی منظوم و منثور داستانوں کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ایامِ جاہلیت کی ایک یادگار عنتر ابن شداد العبسی کا ایک ضخیم قصہ جس کو عباسیوں کے زمانہ میں ترتیب دیا گیا تھا۔ مصر و شام میں آجتک بہت ذوق سے پڑھا اور سُنا جاتا ہے + بوستانِ خیال کو خلفائے فاطمین مصر کی تاریخ کہا جاسکتا ہے مگر ایسی تاریخ جس میں اول سے لیکر آخر تک واقعات کی جگہ بعید از فہم و قیاس تخیلات نے لے لی ہے + داستان امیر حمزہ اگرچہ بظاہر امیر حمزہؓ عمِّ رسُول صلعم سے منسوب معلوم ہوتی ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ دراصل یہ داستانیں اسمٰعیلیہ شام کے ایک سردار حمزہ نامی کے لئے اختراع ہُوئی تھیں اور بعد میں جب وہ داستانیں ترکی اور فارسی زبان میں مروج ہُوئیں تو اُن کو امیر حمزہؓ کے نام سے منسوب کر دیا گیا + ان داستانوں کی بہت سی خصوصیات اُنکے اسمٰعیلیہ کی ایجاد ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس اجمال کی تفصیل موجودہ مضمون میں بالکل بے موقعہ ہوگی + اِس لئے صرف ایک اشارہ کافی ہے +

مثلاً درگیش نندنی، مرنالنی۔ راج سنگھ وغیرہ اُس تاریخی زمانہ سے متعلق ہیں جبکہ ہندوستان میں ہندو اور
مُسلمان ملک و سلطنت کے لئے جنگ آزمائی کر رہے تھے۔ اس لئے ان کتابوں میں جن جذبات کا
اظہار ہے۔ وہ دونوں قوموں کے لئے یکساں طور پر خوشگوار نہیں ہو سکتے + ہندی ادب کا وہ ناگوار
میلان جس کی طرف اس مضمون کی تمہید میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ غالباً اسی قسم کے بنگالی ناولوں کی ترویج کا
اثر ہے + چونکہ بنکم چندر کے متعدد ناول اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اِس لئے اُن کی خصوصیات کو
زیادہ صراحت سے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں + سر رابندر ناتھ ٹیگور[1]۔ رومیش چندر دت اور
دیگر بنگالی مُصنّفوں کے ناول بھی کثرت سے ہندی میں ترجمہ ہو چکے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی
ہیں جو انگریزی یا ہندوستان کی کسی اور زبان میں کبھی ترجمہ نہیں ہُوئے + مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے بھی
بعض مشہور ناولوں کا ہندی ترجمہ ہو چکا ہے + ان میں سے ایک مرہٹی ناول "راگنی" نے بہت کچھ شہرت حاصل
کی ہے۔ لیکن مجھ کو اس ناول کے مطالعہ میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو اس شہرت کی وجہ قرار دی
جاسکے + بحیثیت مجموعی اس رائے میں تامل کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی کہ بنگالی ناولوں کے مقابلہ میں
مرہٹی اور گجراتی کے ناولوں کا بہت کم پایہ ہے +

ہندی افسانہ نویسی کا تیسرا دور حال میں شروع ہُوا ہے۔ اور اس دَور کی خصوصیت ہندی کے
طبعزاد ناولوں کی گرم بازاری ہے + ترجموں نے پبلک کے مذاق کو ان ناولوں کے استقبال کے لئے
تیار کر دیا ہے۔ اور ہندی انشاپردازوں نے بھی غیر زبانوں کے ناولوں سے اپنے فن کے اصول سیکھ لئے
ہیں + جہانتک میں اپنے محدود مطالعہ سے اندازہ کر سکا ہوں۔ ہندی ناولوں میں کوئی ایسی بات نہیں جو
اُردو ناولوں سے انہیں نمایاں طور پر متمیز کر سکے + لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اُردو کے کسی خاص ناول نویس کا
کوئی بیّن اثر ہندی افسانہ نویسوں پر پڑا ہے + موخرالذکر کے زُمرہ میں مجھے کوئی سرشار و شرر و محمّد علی طبیب کا ناقل
یا مقلّد نظر نہیں آتا۔ البتہ بنکم چندر اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلنے کے بہت سے ساعی معلوم ہوتے ہیں + اور
شاید حقیقت حال تو یہ ہے کہ ہندوستان کی سب زبانوں کے ناول انگریزی زبانوں کے ناولوں کا عکس ہیں
اور اُن میں سے کسی ایک زبان کے ناولوں کو اصل اور دوسری زبان کے ناولوں کو نقل قرار دینا غلط فہمی

---

[1] اس نام کو صحت لفظی کے اقتضائے سے اُردو اور ہندی میں "ٹھاکر" لکھنا چاہئے لیکن اسکی یہ شکل اس قدر عام
ہو گئی ہے کہ اب اُس سے انحراف کرنا تصنّع معلوم ہوگا +

ہے * اگر کچھ جدّت ہے تو اُردو ناولوں ہی میں ہے کیونکہ جو رنگ سرشار اور محمد علی طبیب نے اختیار کیا تھا اُس کو انگریزی کا عکسِ محض قرار دینا انصاف سے بعید ہوگا *

ہندی ناول نویسوں کی فہرست میں شاید سب سے چوٹی کا نام مسٹر پریم چند[1] کا ہے۔ جن کے طویل قصّے بھی اُسی قدر مقبول ہوئے ہیں جس قدر اُن کے مختصر افسانے * آپ کے تین ناول خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے نام علی الترتیب اشاعت "سیوا سدن"۔ "پریم آشرم"۔ اور "رنگ بھومی" ہیں * اِن میں سے پہلے ناول "سیوا سدن" کا ترجمہ "بازارِ حسن" کے نام سے اُردو میں بھی شائع ہو چکا ہے * اِن قصّوں کا موضوع خاص ہندوستانی اور خصوصاً ہندوانی زندگی کے مختلف معاشرتی پہلو ہیں "سیوا سدن" میں گروہِ طوائف کے مالہ و ماعلیہ سے بحث کر کے اس فرقہ کی اصلاح کی چند تدبیریں بیان کی ہیں * اُن اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بعض دفعہ شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔ اور بے جوڑ شادیوں کے بُرے نتائج کا بھی تذکرہ کیا ہے * غرضکہ وہ اخلاقی میلان جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اس ناول میں بدرجۂ غایت موجود ہے * "پریم آشرم" میں زمینداروں اور کسانوں کی زندگی کا مرقعہ کھینچا گیا ہے۔ اور ضمناً ہندو سوسائٹی کے اور بھی بہت سے معاشرتی پہلو دکھائے گئے ہیں * "رنگ بھومی" دونوں ماسبق ناولوں سے زیادہ وسیع پیمانہ پر لکھا گیا ہے اور اس میں معاشرتی مسائل کے علاوہ مُلکی اور تمدنی مسئلوں پر بھی بہت سی ردّ و قدح کی گئی ہے * ان تینوں کتابوں پر ادبی حیثیت سے تنقید کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پریم چند افسانہ نویس نے عموماً پریم چند معلم اخلاق کو غلبہ نہیں پانے دیا۔ اور بہت کم مقامات ایسے ہیں جن میں یہ خارجی مباحث قصّہ کی دلچسپی میں خلل انداز ہوتے ہوں * مسٹر پریم چند کے افسانوں میں دو بڑی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انکے اشخاصِ افسانہ جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں جو اپنے طبعی قوانین سے حرکت کرتے ہیں۔ محض کٹھ پُتلیاں نہیں معلوم ہوتے جن کو افسانہ نویس غیر طبعی ترکیبوں سے نچاتا ہو * دوسرے یہ کہ عام جذبات کے سمجھنے اور بیان کرنے میں انکو بہت قدرت حاصل ہے * اور یہ دونوں خوبیاں بجائے خود اُن کو افسانہ نویسوں کی صفِ اوّل میں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں * انکے علاوہ اُردو اور ہندی کے اکثر ناول نویس صرف شہروں کی مہذب آبادی کے نقشے کھینچنے میں اپنا کمال دکھاتے ہیں لیکن مسٹر پریم چند شہری اور دیہاتی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ ذات والے اور اچھوت۔ غرض ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کی زندگی کو یکساں خوبی سے سمجھتے اور بیان کرتے ہیں * ان سب خوبیوں کو سراہتے ہوئے

---

[1] غالباً ناظرین اس حقیقت سے واقف ہونگے کہ "پریم چند" مصنف مذکور کا فرضی نام ہے۔ لیکن چونکہ وہ اسی نام سے پبلک سے روشناس ہونا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے اصلی نام کی تفتیش کی ضرورت نہیں *

یہ کہنا شاید "قابل معافی ہوگا کہ جملہ انسانی مصنوعات کی مانند یہ ناول بھی خامیوں سے پاک نہیں + اول تو واقعات کی ترتیب اور قصہ کا نشوا ایسے عمدہ طور پر نہیں ہوتا کہ اصلاح سے مستغنی سمجھا جائے + بعض جگہ مقدم و موخر میں تمیز کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اور کسی واقعہ کو ایک خاص حد تک پہنچانے کے بعد اُسکے ضمنی واقعات کو بعد میں شروع کر دیا جاتا ہے جس سے پڑھنے والے کو یہ معلوم کرنے میں ضرور دقت واقع ہوتی ہے کہ کونسا واقعہ پہلے ہُوا اور کونسا پیچھے + دوسرے حشو و زوائد کا بیان کہیں کہیں طول نویسی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر بعض مقامات میں اختصار کو مدِنظر رکھا جاتا تو قصہ کی خوبی میں کوئی نقص واقع نہ ہوتا بلکہ شاید بعض اعتبار سے اُس میں اضافہ ہوجاتا + "پریم آشرم" کا حجم چھ سو صفحہ سے زیادہ ہے اور "رنگ بھومی" اس سے بھی تقریباً ڈیوڑھا ہے + اس مصروفیت و کشمکش حیات کے زمانہ میں ایسے ضخیم ناولوں کا لکھنا اور پڑھنا آسان کام نہیں + اِن مشکلات کے علاوہ ایک اور بات جو ذوقِ سلیم کو گراں گذرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "مسٹر پریم چند" کے ناولوں کا انجام فطری قوانین سے زیادہ اخلاقی قوانین کے تابع معلوم ہوتا ہے + "سیوا سدن" کی ہیروئن یا تو اس قدر ہوا و ہوس میں گرفتار ہوتی ہے کہ گھر سے نکل کر بازار میں جا بیٹھتی ہے اور یا اس قدر زہد و ریاضت کے شوق میں مبتلا ہوجاتی ہے کہ بڑے بڑے سنیاسیوں اور یوگیوں کو بھی اُس پر رشک آئے تو بجا ہے + شاید اس کایا پلٹ کے لئے یہ عذر پیدا کیا جائے کہ بسا اوقات بڑے گنہگار بڑے اولیا بن جاتے ہیں۔ لیکن "پریم آشرم" میں گایتری اور ودیا وتی کی خودکشی کسی فطری قانون کی تحت میں نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ نسائیت کے ایک نادر الوجود نصب العین کے تابع معلوم ہوتی ہے + ان ناولوں کے بڑے بڑے کیریکٹرز با استثناء چند غیر طبعی طرز عمل کے ضرورت سے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں + چنانچہ "رنگ بھومی" کے "ہیرو" اور "ہیروئن" دونوں اس دُنیا کے انسانوں سے اس قدر مختلف نظر آتے ہیں کہ اُن کی اصلیت پر شُبہ ہوجاتا ہے + ان برگزیدہ ہستیوں کے مقابلہ میں وہ رذیل اور پست دہقان جن کی تصویر کھینچنے میں مسٹر پریم چند کو خاص ملکہ ہے واقعیت اور اصلیت کے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں +

مسٹر پریم چند کے ناولوں کے علاوہ اور بھی دو چار معرکتہ الآرا ناول ہندی میں تصنیف ہوچکے ہیں۔ لیکن اُن پر صراحت سے گفتگو کرنے کی چنداں ضرورت نہیں + البتہ ہندی ناٹک کے متعلق دو چار لفظ ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتے ہیں + میرے ایک دوست نے جو سنسکرت اور ہندی کا کافی و وافی علم رکھتے ہیں میرے استفسار کے جواب میں یہ بتایا ہے کہ ہندی زبان میں کوئی ناٹک سوائے سنسکرت ناٹکوں کے ترجموں کے ایسا نہیں جس کو قدیم کے لفظ سے متصف کیا جاسکے + زمانہ حال میں البتہ بعض طبعزاد ناٹک لکھے گئے ہیں

جن میں غالباً ہریشچندر کے ناٹکوں کا پایہ سب سے بلند ہے۔ ان میں سے بعض ناٹک اسٹیج پر بھی کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور بہت سے ابتک صرف ادبی حیثیت ہی سے قابل ذکر ہیں۔ اس دوسری قسم کے ناٹکوں میں ایک خاص دلچسپی کی چیز مسٹر پریم چند کا ناٹک "کربلا" ہے جس میں واقعات کربلا کو ناٹک کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف کئی لحاظ سے مفصل تنقید کے قابل ہے۔ لیکن موجودہ مختصر مضمون میں اس طویل بحث کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔

اُن مساعی کو دیکھتے ہوئے جو ہندی ادیب۔ اُردو زبان کے ادبی نمونوں کو ہندی زبان اور ناگری حروف میں شائع کرنے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ ہندی زبان کی مقبول تصانیف کو اُردو میں لانے کی کوئی باقاعدہ کوشش جاری نہیں۔ جس سے یہ دونوں متحد الاصل زبانیں ایک دوسرے کے تخیلات سے فایدہ اُٹھا سکیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر قسم کی ہندی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیا جائے۔ بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ ہندی میں اگر ادب لطیف کی قسم سے کوئی تصنیف خاص شہرت اور مقبولیت حاصل کرے تو وہ جس قدر جلد ممکن ہو اُردو خوان پبلک کو بھی میسّر آجائے۔ مسٹر پریم چند کے ناول اور "کربلا" ناٹک اور نیز بعض اور ناول و ناٹک بھی ہر اعتبار سے اس قابل ہیں کہ انکے اُردو ترجمے عوام کے مطبوع خاطر ہوں۔ اور اگر کوئی باحوصلہ پبلشر اس تجویز کو اختیار کرے تو نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں معلوم ہوتا۔

محمد سعید

بُڑھاپا

خوش اسلوبی سے بڈھا ہونا بہت دشوار ہے۔

اُس کی عمر کے گھڑیال نے ساٹھ بجائے۔

ہر شخص عمر دراز کا خواہاں ہے لیکن بڑھاپے کا کوئی آرزومند نہیں۔

چالیس جوانی کا بڑھاپا ہے پچاس بڑھاپے کی جوانی۔

پیری کیا ہے؟ دانت غائب آنکھیں غائب ذائقہ غائب ہر شے غائب۔

نوجوانی ایک غلطی ہے شباب ایک جدوجہد اور بڑھاپا اک پچھتاوا۔

گلچیں

جذباتِ سلیم

پھر رشکِ صحنِ روضۂ رضوان چمن ہوا
پھر شاخِ گل پہ مرغِ چمن نعرہ زن ہوا

ہر پھول مشکِ نافۂ دشتِ ختن ہوا
ہر چشمہ مثلِ چشمۂ نہرِ لبن ہوا

ہر طائرِ چمن کا ہوا تازہ ولولہ
ہر شاہدِ چمن کا نیا پیرہن ہوا

موتی پگھل کے رہ گئے خجلت سے جس گھڑی
شبنم کا قطرہ زینتِ برگِ سمن ہوا

اک سُو دکھائی تیغِ رواں موجِ نہر نے
اک سو ظہورِ لالۂ خونیں کفن ہوا

نرگس کی آنکھ ایک طرف سرمہ سا ہوئی
سنبل کا طرہ ایک طرف پُر شکن ہوا

القصہ دی خزاں کو ہزیمت بہار نے
دُنیا پہ پھر عیاں کرمِ ذوالمنن ہوا

پرتو سے تیرے حسن کے تارِ نظر مرا
روشن ہوا تو نورِ سحر کی کرن ہوا

بلبل نہ تیری موت پہ رشک آئے کیوں مجھے
تیرا کفن ہوا بھی تو برگِ سمن ہوا

پھولوں کی آب و تاب پہ شبنم برس گئی
جب جلوہ گر چمن میں وہ رشکِ چمن ہوا

ہے وہ غلام ہے جسے دُنیا و دیں کی فکر
آزاد وہ ہے جو تیری دُھن میں مگن ہوا

ہنگامے جلوتوں کے سبھی سرد پڑ گئے
خلوت میں کون مجھ سے یہ گرمِ سخن ہوا

پھر کوندتی ہیں وادیٔ سینا میں بجلیاں
پھر تازہ میرے سینے میں داغِ کہن ہوا

پھولوں سے کھیلنے لگیں اس کی نزاکتیں
جب مائلِ خرام وہ گُل پیرہن ہوا

اُلجھاؤ دیکھئے ابھی کیا کیا ہیں عشق میں
دو چار ہی قدم پہ یہ رستہ کٹھن ہوا

دل ہو کے چاک چاک مرا فکرِ شعر میں
آج اے سلیم شانۂ زلفِ سخن ہوا

وحید الدین سلیم

معترضہ جملے

۱۵- جولائی-

وہ خدائے قدیر جس کے حکم بغیر پتّا نہیں ہلتا مگر بجلی کا پنکھا چلتا ہے (لاحول و لا- کیا الحاد کا کلمہ میرے قلم سے نکلا! اصل بات یہ ہے کہ جب ساتھ والی اونچی کوٹھی کی خس کی ٹٹیوں کا، وہاں کی مقطر و آتشہ میں مُبرف سوڈے کا، صبح شام کی چہل پہل اور روزانہ "غالب شاہی" عید کا خیال آتا ہے تو جی جل جاتا ہے اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ہی گھر پر اللہ میاں کا زور چلتا ہے کہ پہروں گزر جائیں اور پتّہ نہ ہلے- بچے ہیں کہ گرمی دانوں سے بلبلا رہے ہیں، بیوی چولھا پھونکتے پھونکتے ڈارون کی تھیوری کا زندہ ثبوت بن گئی ہے، خود پسینے میں ڈوبا جاتا ہوں مگر اللہ صاحب کی کلکٹری میں غریب کی شنوائی نہیں، خیر، نئے سرے سے مضمون شروع کرتا ہوں)

وہ رزّاقِ ازلی جس کے ادنےٰ اشارے سے سمندر کی تہ میں پتھر کے کیڑے کو مقررہ قوت لایموت برابر ملتی ہے اور جس کی مرضی سے چیونٹیاں میری کھانڈ اور چوہے میری روٹی سرقہ کرتے ہیں (استغفراللہ پھر وہی بات، ذاتِ باری اور چوروں کی اعانت! اصل بات یہ ہے کہ کل جو اس کوٹھی میں جا نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاء کی میز سے تین چار قند دار کیک کے ٹکڑے وہاں کے کتّوں کی نذر ہوئے اور خانساماں نے مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ مہتر کو معمولی دریا دلی سے دیدیئے حیران ہوا کہ اس جگہ چیونٹیوں اور چوہوں کی الٰہی فوج کیوں حملہ آور نہیں ہوتی؟ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آگیا کہ فرش پکے ہیں اللہ صاحب کی سفر مینا پلٹن کی انجنیری انکے آگے عاجز ہے مگر یہ عقدہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ کوٹھی میں تو صرف مہتر کا درجہ کتّوں سے ذرا کم رہا مگر میرے گھر میں چوہے پہلے اور میں پیچھے! خیر اس اُلجھن سے کیا فایدہ! مضمون پھر شروع کرتا ہوں)

وہ حافظِ حقیقی جس کو آسمانوں کی منوّر کتاب ازبر ہے مگر جسے بنئے کی بہی کے اندھیر کا کچھ پتہ نہیں (معاذاللہ پھر وہی دہریہ پن! اصل بات یہ ہے کہ یہ اونچی کوٹھی ایک مشہور بہی کا ایک ورق ہے- کسی زمانے میں ایک نواب صاحب نے پانسو کا رقعہ لکھا تھا وہ کسی وجہ سے پانچ ہزار درج ہوا اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ کوٹھی اور ایک گاؤں ہضم کر گیا اللہ صاحب کی جمی میں کچھ اسی قسم کی ڈگریاں ہوتی ہیں مگر مجھے اس سے کیا؟ میں تو ایک چشم پارسا کی فرمایش کی تعمیل میں مضمون لکھنے بیٹھا تھا- انھوں نے چلتے چلتے خیال ظاہر کیا تھا کہ مُسلمان خواتین کے ایک بہترین نمونہ کا نقشہ

باندھا جائے۔ کہاں ایک بہترین مسلم بیوی کا حسنِ کامل کہاں یہ میرا بیساختہ نیم پختہ کُفر! پھر شروع کروں)

وہ مُسبب الاسباب جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے مگرمچھوں کی خاطر سمندروں کو بیشمار کمزور و ناتواں مچھلیوں سے بھر دیا ہے، جس کے لازوال خزانوں میں سے ہر بلّی کو کبھی نہ کبھی کبوتر اور ہر سانپ کو کہیں نہ کہیں مینڈک میسّر ہو جاتا ہے مگر جس کے ہاں میرے لئے صرف مچھروں اور مکھیوں کی پلٹنیں ہیں اور وہ بھی میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ مجھے کھانے کے لئے . . . . (پھر وہی دریدہ دہنی! اصل بات یہ ہے کہ جب ہر شام کو فرمانبردار ملازم اس اونچی کوٹھی کے وسیع صحن میں شبنمیوں اور مسہریوں کی قطار کھڑی کرتے ہیں اور پائنتی کی طرف بجلی کے پنکھوں کی لین لگاتے ہیں تو میں حسرت سے کہتا ہوں کہ اللہ اللہ وہاں مچھر بھوکے مرینگے مگر میرا خون آکر چوس لینگے۔ مگر یہ تو روز ہی ہوتا ہے مجھے جلدی سے اپنا مضمون شروع کرنا چاہیئے) وہ احکم الحاکمین جس نے صاحب ضلع کے اوپر لاٹ اور لاٹ کے اوپر بادشاہ اور بادشاہ کے اوپر اپنے آپ کو اور اپنے اور ہمارے اوپر ہمارے پٹواری کو حکمران مقرر کیا ہے (لعنت بہ کارِ شیطان، پھر وہی بے تکاپن! اصل بات یہ ہے کہ اونچی کوٹھی والے مجھ سے ساتھ والی دو گز زمین قیمتاً مانگتے تھے اور قیمت بھی اچھی دیتے تھے مگر میں نے انکار کیا۔ جب خرید کے متعلق وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے تو انہوں نے پٹواری کے ذریعہ سے حدبراری کراکے وہ زمین اپنے احاطہ میں مفت شامل کرالی۔ ننانشلی تک مقدمہ کیا، اجمیر شریف سے خاک لاکر اُس زمین پر بچھائی۔ داتا گنج بخش سے پانی لاکر چھڑکا، ختمِ قرآن اس موقع پر کرایا مگر نہ ننانشل نہ ولی نہ کلام پاک، غرضکہ کوئی بھی اس پٹواری کے "کُن فیکون" کے آگے دم نہ مار سکا۔ مگر یہ سب کچھ تو ہو چکا مجھے مضمون شروع کرنا چاہیئے)

حمیدہ "ابا! آداب، آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

میں "کچھ نہیں"

حمیدہ "میں دیکھوں؟

(بغیر میری اجازت کے حمیدہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور جوں جوں پڑھتی جاتی ہے ناک بھوں چڑھاتی جاتی ہے)

حمیدہ "(ختم کر کے) ابا آپ کا خط روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں تو اس قدر آپ کہتے ہیں خود کیوں صاف صاف نہیں لکھتے؟ اور یہ مضمون تو کچھ اچھا نہیں"

میں "اچھا کہ برا تم اب جاؤ مجھے لکھنے دو"

حمیدہ :- اچھے ابا! خفا نہ ہوجئے یہ بتایئے کہ وہ کون بیوی ہیں جنہوں نے بہترین مسلمان خاتون کا تذکرہ آپ سے طلب کیا؟
میں :- حمیدہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے کام کرنے دو "
حمیدہ :- (یہ میری وہ ۱۶ سالہ نعمت ہے جس کا عشر عشیر بھی اس اونچی کوٹھی کو میسّر نہیں اور جس کے ہوتے باوجود غربت کے یہ دُنیا میرے لئے ہزاروں جنتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ حمیدہ کی شرارت کے مقابلے میں جنت کی ثقاہت لاکھ دفعہ قربان ہے) ابا! بھلا آپ اور مجھ سے غصہ! بتائیے وہ بیوی کون ہیں ؟
میں :- کیوں پوچھتی ہو ؟
حمیدہ :- ضرور کوئی مولوی بیوی ہونگی کیونکہ آجکل ذرا ان کا زور ہے ؟
مَیں :- یہ تو بڑی بودی دلیل ہے۔ کیا کوئی آزاد منش بیوی یہ خیال نہیں کرسکتی کہ معلوم تو کریں کہ مردوں کی نظر میں بہترین مسلم بیوی کے خیالات کیا ہونے چاہئیں ؟
حمیدہ :- یہ اچھی رہی! خیالات پر کسی کا کیا بس ہے۔ سوال تو عادات کا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ جس بیوی کو آزادی کی ہوا چھو بھی گئی ہے وہ یقیناً جانتی ہے کہ جو بیوی دل سے مسلم ہو وہی بہترین ہے اس لئے وہ کبھی ایسا سوال نہ کریگی۔ وہ خود سوچ لیگی کہ مختلف بہترین ہستیوں میں اتنا فرق ضرور ہوگا کہ مختلف حالات میں ان کا باطنی حسن الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ اماّں ہی بہترین مسلم بیوی کا اچھا خاصا نمونہ ہیں میں نے کسی پارٹی میں کسی بیوی کے چہرہ پر وہ اطمینان اور مسرت کی جھلک نہیں دیکھی جو اماّں کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ رشیدہ کا مُنہ دھلوانے وقت خود کلمہ پڑھتی ہیں اور رشیدہ تُتلا تُتلا کر "محمد رسول اللہ" کہتی ہے۔ اس قدر بشاشت تو کسی انگریز مس کے چہرے پر بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ تب بھی نہیں دیکھی جب مس بلینک ہارتے ہارتے ٹینس کا سٹ جیت گئیں ۔
میں :- کسی ایک وقت بشاش ہونے سے انسان بہترین انسان تھوڑا ہی بن سکتا ہے ۔
حمیدہ :- ابا آپ تو غضب کرتے ہیں۔ تو کیا انسان محلوں میں رہنے سے بہترین انسان بن جاتا ہے؟ یہ تو دل کی بات ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص، چاہے اسکے حالات کیسے ہی ہوں، اپنی طرف سے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو (نتیجہ چاہے اس کے موافق ہو کر مخالف) وہ بہترین انسان ہے
میں :- کہتی تو ٹھیک ہو "
حمیدہ :- آپ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں بے عقل ہوں "

میں :۔ کب ؟ کب ؟
حمیدہ :۔ نہیں کبھی نہیں۔ یونہی آپ سے اپنی تعریف سننے کو جی چاہتا تھا۔ بیٹھئے اب جاتی ہوں۔ ننھے کو روٹی کھلادوں "

حمیدہ گئی تو میں نے اسکی اور اپنی ادپروالی گفتگو قلمبند کرلی جس قدر غور کرتا ہوں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بہترین زندگی کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ مفید ہونیکی پوری کوشش کی جائے۔ مگر بلانے گا کون ؟ حمیدہ کی فطرتی راستی کی روشنی نے کس آسانی سے اور کس صفائی سے میرے پراگندہ تخیل کی تاریکی کو دور کیا ہے مگر چڑیل نے مضمون برباد کردیا میرے پیش نظر وہ خارجی اسباب تھے جن سے انسان ہمچشموں کی نگاہوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس گڑیا نے ایک ذرا سے جملے سے یعنی یہ کہ دل کی بات ہے، اسے مسئلہ نفسیات کردیا۔ پھر شروع کرتا ہوں ،،

وہ نورانی موتیوں کا ہار جس کا نام زندگی ہے اور جس کے پرکھنے والے جوہری خدا اب ایشیا میں پیدا نہیں کرتا کیونکہ یہاں کے لوگوں کو مرنے اور مرنے کے قصوں سے نہ فرصت ہوگی نہ وہ زندگی کا خیال کرینگے (خدا کو چھوڑ کر اب ایشیا کا پیچھا میں نے کیا ! مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا ؟ اصل بات یہ ہے کہ ایک نامتناہی تواتر سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں سوائے اسکے اور کچھ کام ہی نہیں کہ فلاں جگہ بچہ ہوا عقیقے کی دعوت ہے، دوسری جگہ شادی کے متعلق دلیمہ کی دعوت ہے اور تیسری جگہ مرگ کے متعلق چالیسویں کی دعوت ہے۔ پیدایش، بیاہ، موت، اور ساتھ ساتھ روگ سوگ کچھ ایسا تانتا بندھا ہے کہ کسی کو اور کسی کام کے لئے فرصت ہی نہیں مگر مجھے اس سے کیا ؟ میں تھوڑا ہی اس سفید کالے کبل کا جلاہا ہوں کہ خواہ مخواہ شرماؤں۔ پھر شروع کرتا ہوں)۔
وہ خاتم سلیمانی جس کا نام کامیابی ہے اور جو سلطان صلاح الدین کے بعد مسلمانوں سے گم ہوئی اور سمندر میں سے یورپین اقوام کے ہاتھ ایسی آئی کہ اب کبھی نہ نکلیگی راہشت۔ یہ میں کیا لکھ گیا ؟ میں کہاں کا ولی ہوں۔ کہ پیشینگوئی کردں اور جو مجھے پیشینگوئی ہی کرنی تھی تو اشتہار کے ذریعہ سے کرتا کہ زید بکر سے پہلے مریگا یا عمر کے ہاں لڑکا ہوگا یا زلزلہ آئیگا یا طاعون پھیلے گا۔ جب میری کامیابی سے صورت آشنائی تک بھی نہیں تو اسکے متعلق اس قدر وثوق کس قدر لغو ہے ؟ اور کیا پتہ ہے کہ کامیابی یورپ سے امریکہ ہوتے ہوئے جاپان جانکلے اور پھر وہاں سے چین کا چکر لگاتی ہوئی واپس لوٹ جائے ؟ اصل بات یہ ہے کہ کبھی بھی تو اخباروں میں نہیں پڑھا کہ میرے نام دس لاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔ جب دیکھو یہی ہوتا ہے کہ مسٹر ڈیم فول کو دس ہزار پونڈ آئے، مس گلاب کے پھول کو بیس ہزار پونڈ

دستیاب ہُوئے۔ مسٹر گورگ کو اسکے چچا دس لاکھ پونڈ چھوڑ گئے۔ بوڑھیا مس بھیڑا اپنے کُتّے کے لئے ہزار پونڈ چھوڑ گئیں۔ مسٹر پتھر انداز نے دو کروڑ ہسپتال کی نذر کئے۔ کاش میں ہسپتال ہی ہوتا!)

بیگم :۔ اوہو! آپ تو مضمون نگاری کی دُھن میں ہیں! دیکھوں کیا لکھا ہے (بغیر اجازت پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور مسکراتی جاتی ہیں۔

میں :۔ کیوں کیا رائے ہے؟

بیگم :۔ یہ تو میں نہیں کہتی کہ محض لفّاظی ہے، زندگی کے دو پہلوؤں کی اچھی تصویر ہے مگر حمیدہ والی تعریف جس کے آپ اس قدر مداح معلوم ہوتے ہیں وہ تو غلط ہے "

میں :۔ (عالمانہ غرور کے ساتھ) ہرگز نہیں، ایسی صحیح تعریف تو کبھی سننے میں نہیں آئی شاید کسی وقت گفتگو میں میں نے وہ فقرہ استعمال کیا ہوگا اور حمیدہ کو یاد رہ گیا۔ میری مینا کا حافظہ بہت اچھا ہے "

بیگم :۔ آپ کا فقرہ ہو کہ حمیدہ کا یہ تعریف قطعاً غلط ہے، کم از کم اسلامی نقطۂ خیال سے "

میں :۔ تو تم ذرا اسلامی تعریف بیان کردو "

بیگم :۔ صرف ایک جملہ ایزاد کرنے کی ضرورت ہے "

میں :۔ وہ کیا؟

بیگم :۔ جو شخص چاہے اسکے حالات کیسے ہی ہوں اپنی طرف سے ہر حال میں خالص خدا کی خوشی کے لئے پُوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو اور نتیجہ سے مُطلقاً بے نیاز ہو وہ بہترین مُسلمان ہے "

میں :۔ خدا کی خوشی کا کیا معیار ہے؟

بیگم :۔ سبحان اللہ! کیا سوال ہے؟ خدا کی خوشی وہ ہے جس میں مخلوق کی بہتری ہو۔ بیماری نہ ہو، مفلسی نہ ہو، خوب عیش و عشرت ہو مگر حتی الوسع سب کے لئے مساوی ہو۔ اور خدا کی خوشی کیا ہے؟

میں :۔ اور نماز روزہ؟

بیگم :۔ مجھ سے جو پوچھتے ہو تمہیں بتاؤ کہ نماز روزہ آخر کیا ہیں؟

میں :۔ عبادت "

بیگم :۔ اور بچّوں کو اچھی طرح پالنا۔ صاف رہنا۔ ان کی، گھر والوں کی، ہمسایوں کی خدمت کرکے خوش رہنا

یہ کیا ہیں؟ کیا یہ عبادت نہیں ؟

میں " عبادت تو ہیں "

بیگم " پھر کیا. جس کو نماز روزہ میں خوشی ہو وہ وہ کرے جس کو اور کسی قسم کی عبادت میں خوشی ہو وہ وہ کرے مجبور کرنیکا یا جو ایک خاص قسم کی عبادت نہ کرے اسے مُتہم کرنیکا کسی کو کیا حق ہے؟ شرط تو صرف یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ مقصود خالص خدا کی خوشی ہے "

میں " تم تو معتزلہ ہو "

بیگم " معتزلہ وعتزلہ تو میں جانتی نہیں مگر بات ٹھیک کہتی ہوں۔ اسلام رسوم کا نام تھوڑا ہی ہے۔ صرف ایک قلبی کیفیت ہے۔ غیر مسلموں کو دنیا کے دُکھ درد بے چین بناتے ہیں اور انکے پاس کوئی کلید ایسی نہیں جس سے وہ اس زندان سے نکل سکیں۔ زندگی ایک تازیانہ ہے جو بار بار انہیں مجروح کرتا ہے اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو بجائے تازیانہ کے سواری کا گھوڑا سمجھو۔ خوب اس سے کام لو اگر اتفاق یہ آپڑا ہے کہ تمہارا گھوڑا گھوڑ دوڑ والا نہیں بلکہ تانگے والا ہے تو اس سے ملول نہ ہو، جن کے پاس گھوڑ دوڑ کے اسپ تازی ہیں انکی طرف بہ نگاہ حسد نہ دیکھو۔ قلبی کیفیت یہ رکھو کہ ہمارے لئے سوال یہ نہیں کہ ہمیں مجروح یا بدرنگ یا پست قامت گھوڑا کیوں ملا بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ جو کچھ اچھے سے اچھا کام ہم اسی سے لے سکیں وہ پوری کوشش سے لیں۔ تم مرد تو صرف نام کے مسلمان ہو، اصل میں زر وجاہ کے حریص ہو تبھی تو یہ ساتھ والی اونچی کوٹھی ہر وقت تمہیں کھٹکتی ہے۔ میں تو روز ان کے لئے بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں بہت دے اور وہ خوش رہیں۔

میں " تو کیا تم دعا کی قائل ہو ؟

بیگم " کیا جہالت کا سوال ہے !

میں " کیوں ؟

بیگم " دعا میں اس لئے تھوڑی مانگتی ہوں کہ اللہ کبھی میرے کہنے سے مجبور ہو جائیگا۔ صرف اس لئے مانگتی ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ مخلوق کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کا بھلا چاہیں اور یہی خدا کی خوشی ہے۔ بلا سے دعا کا اثر ہو کہ نہ ہو۔ میرا اپنا دل تو زنگ آلود نہیں ہوتا ۔

میں " واللہ باللہ اگر کوئی مولوی تمہاری منطق سُن لے تو ابھی ڈبل کُفر کا فتوےٰ تم پر عائد ہو جائے "

بیگم :۔ خیر مگر میں تو ان مولوی صاحب کے لئے بھی دعا ہی کرونگی مگر ساتھ ہی یہ بھی دُعا کرونگی کہ یا اللہ اب ٹرکی کی طرح ہندوستان میں بھی کوئی ایسی تدبیر ہو کہ مولویوں کے وعظ اُسی طرح زیرِ لائسنس ہوں جس طرح مسکرات کی فروخت ؞

میں :۔ بچارے مولوی! وہ دیانت داری سے اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور قوم ہے کہ صلواتیں سُناتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہارے قول و فعل میں کس قدر فرق ہے۔ تم بنتی تو پردہ کی مخالف ہو مگر خود کس قدر سخت پردہ کرتی ہو، اسلام کو قلبی کیفیت بتاتی ہو مگر بچوں کو نماز کی تاکید ؞

بیگم :۔ اِس میں قول و فعل میں فرق کی کیا بات ہے۔ کیا فیشن کے لئے آدمی کچھ نہیں کرتا؟ فی الحال مروجہ فیشن یہی ہے جو میرا ہے، کم از کم میری جماعت کا۔ مگر پھر تم نے مجھے بحث میں گھسیٹا۔ اسلام میں کم از کم میرے اسلام میں بحث منع ہے کیونکہ بحث ایک لغو فعل ہے اور ہر مومن کو لغو سے پرہیز ہے۔ لو۔ اب کھانے کے لئے آؤ۔ تمہارے لئے بہت اچھی سی کچوریاں تلونگی ؞

بیگم تو چلدیں مگر میں نے اُن کی گفتگو بھی لکھ لی۔ سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ان کی منطق بھی درست ہے تو کیا میرے گھر کی صحیح مردم شماری یہ ہے کہ دو بہترین مسلمان خانونیں اور ایک جہالت کا پُتلا مرد؟

اور کیا اکثر مُسلمان گھروں کے اعداد اسی کے لگ بھگ ہیں؟ کوئی تعجب نہیں جو یہ درست نکلے۔

عبدالعزیز

خوابِ بیداری

وہ آرہے ہیں وہ آرہے ہیں نقاب رُخ سے ہٹا رہے ہیں
کلیمؔ جن کو ترس گئے تھے مجھے وہ جلوے دکھا رہے ہیں
بگڑ بگڑ کر مچل مچل کر لچک لچک کر سنبھل سنبھل کر
اُدھر مجھے آزما رہے ہیں اِدھر مرا دِل بڑھا رہے ہیں
وہ حُسنِ مُطلق کی جلوہ ریزی وہ سُنبلستاں کی عِطر بیزی
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے وہ میری ہستی پہ چھا رہے ہیں
مری مسرّت کی انتہا کیا! مری خوشی کا بھلا ٹھکانا؟
مجھے وہ آغوش میں لئے ہیں مجھے گلے سے لگا رہے ہیں
یہ خامشی میں خطابِ جاناں یہ بے خودی میں مرا تبسّم
صبا ہے سانس اُن کی جس سے گویا وہ غنچۂ دل کھلا رہے ہیں
مری وفا کا یہی صِلہ تھا یہی مرے عشق کی جزا تھی
وہ اُن کا بے اختیار کہنا ایں بڑے باوفا رہے ہیں

امین حزیں

انتہائے یاس

ضرورت ہے - چار اشخاص کی جو مرنے پر تُلے ہوں۔ انہیں ایک خطرناک کارنمایاں میں حصّہ لینا ہوگا۔ درخواستیں یکم جون سے قبل مفصلہ ذیل پتہ سے آنی چاہئیں:۔

کپتان انڈرسن (پنشن یافتہ) ہواباز ابرمال لاہور

کپتان انڈرسن نے یہ اشتہار ملک کے تمام روزانہ اخبارات میں شائع کرادیا۔ گو اسے اُمید نہ تھی کہ کوئی درخواست آئیگی تاہم ایک درجن کے قریب درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے اس نے چار کو انتخاب کرکے دوسرے دن اُمیدواروں کو اپنے مکان پر طلب کیا +

جس وقت سب جمع ہوگئے تو کپتان نے دروازہ بند کرکے ان سے یہ گفتگو شروع کی "میری تجویز یہ ہے کہ چونکہ ماؤنٹ ایورسٹ یعنی کوہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچنے کے لئے دو بار ناکام کوشش کی جاچکی ہے اور زمین کا راستہ نہایت دشوار ہے اس لئے ہوا کے راستے سے کوشش کی جانی چاہیئے۔ انجن سے چلنے والے ہوائی جہازوں کے اُترنے کی کوئی جگہ نہ ہوگی اس لئے وہ بھی مناسب نہیں ہیں۔ سفر خطرناک ہوگا اس لئے صرف انہی لوگوں کو اسے اختیار کرنا چاہیئے جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہوں۔ میری رائے میں خودکشی صرف اس لئے گناہ ہے کہ وہ جان جو بنی نوع انسان کے واسطے مفید ثابت ہوسکتی ہے بیکار ضائع کردی جاتی ہے۔ میں نے ایک بہت بڑا غبارہ تیار کیا ہے جو پورے ساز و سامان سے آراستہ ہے اور جس میں ماؤنٹ ایورسٹ تک جانے کے لئے ہر قسم کی ضروریات مہیا کی گئی ہیں یہانتک کہ گیس تیار کرنیکا مسالہ بھی موجود ہے۔ کیا آپ چاروں اس غبارے میں سفر کرنے کے لئے تیار رہیں؟"

سب نے یک زبان ہوکر "ہاں" کہا۔

"بہرحال آپ اپنی جان کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے؟"

چاروں نے اثبات میں جواب دیا۔

"تو مجھے اپنے نام لکھوا دیجئے" کپتان انڈرسن نے کہا اور مفصلہ ذیل نام لکھے:۔

نشی شہناز رائے ۔ ڈاکٹر گردھاری لال۔ میر اعجاز الزمان۔ الطاف علی خاں ۔
شہناز رائے کی عمر تقریباً پچپن سال تھی۔ وہ متمول اور لذائذِ دستر خوان کا شوقین معلوم ہوتا تھا۔ گو اسکے لباس سے بے پروائی ٹپکتی تھی۔
ڈاکٹر دبلا پتلا نحیف دزار اور غمزدہ سا آدمی تھا۔ کشادہ پیشانی اور چمکدار آنکھوں سے دماغی قابلیت ظاہر ہوتی تھی
میر صاحب کی پتلی لمبی اور گاؤدم انگلیاں۔ شانِ استغنا۔ اور دیوانہ پن کی ادا پکارے دیتی تھی کہ وہ آرٹسٹ یا صناع ہیں۔ عمر دیکھنے میں بہت کم معلوم ہوتی تھی لیکن گفتگو سے وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ خدا جانے کائنات کے کتنے دَور انکی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔
الطاف علی خاں نوجوان اور خوش شکل تھا لیکن اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں جس طرح کسی ایسے شخص کی ہوتی ہیں جو رات بھر سویا نہ ہو۔ اور چہرے پر آنسوؤں کے نشانات کا پتہ چلتا تھا۔
کپتان انڈرسن نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ آپ اس سفر کو طے کر کے بخیریت واپس آئیں گے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ لوگوں کو بہت سے خطرات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے آپ کو ایک تحریر اس مضمون کی دینا ہوگی کہ آپ ان خطرات کو جانتے ہوئے اپنی خواہش سے یہ سفر اختیار کرتے ہیں۔ کل میں غبارے میں گیس بھرنا شروع کردونگا آپ پرسوں صبح نو بجے روانگی کے لئے تیار ہو کر یہاں آجائیں" ۔
مقررہ وقت پر چاروں آدمی کپتان کی قیامگاہ پر پہنچ گئے اور وہ انکو موٹر میں سوار کر کے شہر سے باہر میدان میں لے گیا جہاں غبارہ گیس سے بھرا موٹے موٹے رسّوں سے بندھا ہوا تیار کھڑا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔ چاروں کو گرم کپڑے بہم پہنچائے گئے اور وہ غبارے کی گاڑی میں بیٹھنے کو تھے کہ ایک نوجوان عورت احاطے میں داخل ہوئی اور جلدی جلدی کپتان انڈرسن کی طرف چلی۔
"میں غبارے کے ساتھ جاؤں گی" اس نے جوش بھرے الفاظ میں کہا۔
کپتان نے کہا "ناممکن ہے۔ صرف چار آدمی جا سکتے ہیں۔ اور آپ ہمارے مقصد سے ناواقف ہیں"
عورت نے جواب دیا "نہیں۔ یہ لوگ زندگی سے مایوس ہیں۔ اور ماؤنٹ ایورسٹ کو جارہے ہیں میں ضرور جاؤنگی"
"لیکن ــــــــ"
"میں ضرور جاؤنگی۔ ورنہ ابھی سب کے سامنے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالونگی۔ یہ لوگ مجھ سے زیادہ حقدار نہیں ہیں"

ڈاکٹر نے بے پروائی سے کہا "تو اسے بھی آنے دو"

"لیکن" کپتان نے پھر یہی کہا کہ "غبارے میں وزن زیادہ ہو جائیگا"۔

"خواہ کچھ بھی ہو میں جاؤنگی" یہ کہہ کر وہ غبارے میں سوار ہوگئی۔

کپتان انڈرسن نے ایک آہ بھری اور کہا "اچھا۔ آپکی خوشی"

اس پر عورت نے کہا "میرا نام شکیلہ دیوی ہے۔ امید تو نہیں لیکن شاید کوئی تم سے میرے متعلق دریافت کرے۔ یہ اس لئے بتا دیا ہے"۔

کپتان انڈرسن نے خدا حافظ کہا۔ رسّے کھول دیئے گئے اور غبارہ تیزی سے آسمان کی طرف چلا۔ تھوڑی دیر میں جنوب مغربی ہوا کا ایک جھونکا اس کو لگا اور وہ نظروں سے غائب ہونا شروع ہو گیا۔

ایک عرصے تک غبارے میں خاموشی رہی بلکہ کوئی دوسرے کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ نہ کسی کو یہ خواہش ہوئی کہ کنارے پر جھک کر تیزی سے گذرتے ہوئے نظارے کو دیکھے۔ لیکن اسکے بعد شہناز رائے نے جو شکیلہ دیوی کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے پوچھا۔

"کیا آپ نے جان دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟"

"جی ہاں" اس نے جواب دیا۔

"مجھے تو اگر ہم ماؤنٹ ایورسٹ تک پہنچ کر صحیح وسالم واپس آ گئے تو بھی زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوگی" شہناز رائے نے کہا

"یہی حالت میری بھی ہے" شکیلہ دیوی نے کہا۔ اور باقی سب نے اپنے اپنے متعلق اسی خیال کی تائید کی۔

اس کے بعد قریباً نصف گھنٹے تک بالکل خاموشی رہی۔

پھر اعجاز الزمان کہنے لگا "اس طرح دُنیا کے مصائب سے آزاد ہوا میں اُڑتے پھرنے میں ایک خاص لطف ہے۔ اگر میں اس قدر مایوس نہ ہوتا تو شاید یہ سفر خوشگوار ہوتا"

"مجھے اب کسی بات میں لطف نہیں آسکتا" شکیلہ دیوی نے کہا "گو ظاہر ہے کہ یہ طریق سفر بُرا نہیں ہے"

ڈاکٹر بولا "مجھے علم نہ تھا کہ ہوا کے بلند طبقات اس قدر فرحت آور ہوتے ہیں"

الطاف علیخاں کہنے لگا "ہاں واقعی۔ لیکن اگر دل بجھا ہوا نہ ہو"۔

پھر شہناز رائے نے شکیلہ دیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "مجھ جیسے بڈھے آدمی اگر موت کے خواہشمند ہوں تو عجب نہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور الطاف علیخاں اور میر صاحب جیسے نوعمر لوگ کیوں زندگی سے

مایوس ہیں۔ بھلا تم کیوں مرنا چاہتے ہو؟"

اس کا اِن میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔

"دیکھئے تو" ڈاکٹر نے کہا "ہم سب مل کر موت کی تلاش میں جارہے ہے۔ گویا زندگی کے آخری مرحلے میں ہمسفر ہیں اگر ایک دُوسرے کو اپنی اپنی داستانِ غم سُنائیں تو کیا ہرج ہے! وقت خوب کٹے گا۔"

"میری رائے میں بالکل مناسب ہے" شہناز رائے نے جواب دیا "اور میں اپنے حالات سُنانے کے لئے تیار ہوں اگر باقی سب بھی اس تجویز کو منظور کریں۔"

اس سے سب نے اتفاق ظاہر کیا۔

شہناز رائے کہنے لگا "میرا قصہ بالکل مختصر ہے۔ میں اس قدر متمول ہوں کہ اپنی ہر خواہش کو پُورا کرسکتا ہوں دُنیا میں ہر ایک چیز کا میں نے خوب لطف اُٹھایا ہے۔ لیکن معدے کے ہاتھوں عاجز آگیا ہوں۔ میری قوت ہاضمہ جاتی رہی ہے جس سے اب زندگی بار معلوم ہوتی ہے اور میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

ڈاکٹر بولا "ہم دونوں کی حالت میں کتنا عجیب اختلاف ہے۔ میری تمام عمر پیشۂ طبابت میں صرف ہُوئی ہے لیکن محنت کی زیادتی کی وجہ سے صحت گنوا چکا ہوں اور عُمر کا تقاضا بھی ہے۔ اب مجھے آرام کی ضرورت تھی لیکن تمام سرمایہ ایک تجارتی نقصان کی نذر ہو جانے سے مایوس ہو گیا ہوں۔ کام ہوتا نہیں اور اسکے بغیر زندگی محال ہے"

"قریب قریب یہی صورت میری ہے" شکیلہ دیوی کہنے لگی "میں نے اپنی کوشش سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے لیکن بے یار و مددگار ہوں۔ کوئی معزز ملازمت نہیں ملتی۔ ذلت برداشت نہیں ہوتی گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مر نہ جاؤں تو کیا کروں!"

"میں مصوّر ہوں" میر صاحب نے کہا "اور جس پایہ کا مصوّر ہوں وہ میں ہی خوب جانتا ہوں۔ ہر قسم کی تصویر کشی میں مجھے پُوری مہارت ہے۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ کسی کے آنکھیں نہیں ہیں۔ میرے کام کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ ہر شخص مجھے نصیحت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ خود جانتے نہیں اور مجھے پڑھاتے ہیں۔ ایسی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔ مر جاؤنگا تو یاد کرینگے کہ کوئی تھا۔ اس وقت میری قابلیت کی قدر ہوگی"

الطاف علیخاں نے اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے ایک دو بار کھانس کے گلا صاف کیا اور رومال سے آنکھوں کو پونچھا۔ پھر کہنے لگا "میرے پاس اپنی ضروریات کے لئے کافی روپیہ ہے اور کسی چیز کی حاجت

نہیں لیکن محبت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ جس خاتون سے مجھے عشق تھا اس نے چار روز ہوئے مجھے صاف جواب دے دیا۔ اب میں زندہ رہ کے کیا کرونگا"۔

اس نے از سرِ نو رومال آنکھوں پر رکھ لیا اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

اسکے بعد کچھ عرصے تک کوئی نہ بولا۔ پھر ڈاکٹر نے کہا "غبارہ نیچے اُتر رہا ہے۔ میری رائے میں اب بجائے اسکے کہ اسے ہلکا کرکے اوپر لے جائیں زمین پر اُتار کر درخت سے باندھ دیا جانا چاہیئے۔ کل صبح اور گیس بھر کر پھر روانہ ہو جائیں گے"۔

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور ڈاکٹر نے لنگر نیچے پھینکا جو ایک درخت کے ساتھ اٹک گیا۔ کچھ وقت سے غبارے کو اُتار کر مضبوط باندھ دیا گیا اور سب زمین پر اُتر آئے۔

یہ ایک غیر آبادسی جگہ تھی تاہم انہوں نے آگ جلا کر کھانا تیار کرنا اور رات بسر کرنے کے لیئے جہانتک ممکن ہوسکتا تھا سامان کرنا شروع کر دیا۔

کھانا کھانے کے بعد سب کے چہروں پر قدرے رونق آگئی اور وہ نرم نرم گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شہناز رائے کہنے لگا "مجھے خیال آرہا تھا کہ کس قدر شرم کی بات ہے۔ یہ لڑکی" اور اس نے شکیلہ دیوی کی طرف اشارہ کیا "گزر اوقات کے ذرائع سے مایوس ہو اور میرا اتنا روپیہ بیکار ضائع ہو جائے۔ مس شکیلہ اگر آپ واپس چلی جائیں تو میں اپنی تمام جائداد ابھی آپکے نام لکھ دونگا۔ میری پہلی وصیت کو جس کے ذریعہ سے میں نے جائداد اِدھر اُدھر تقسیم کر دی ہے آپ میرے مکان پر جا کر تلف کر دیں"۔

"میں واپس جانا نہیں چاہتی" شکیلہ دیوی نے کہا۔

"اگر آپکی جگہ میں ہوتا" الطاف علیخاں نے کہا "تو ضرور چلا جاتا۔ آپکو اس قسم کے سفر میں نہ جانا چاہیئے اور میر صاحب اگر آپ بھی میرا کہنا مان لیں تو بہت اچھا ہوگا۔ میرے والد ہر قسم کی دستی تصاویر جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں آجکل ایک آپ ایسے مصوّر کی ضرورت بھی ہے جو تصاویر کی ضروری مرمت اور خبرداری میں انکی مدد کر سکے میرا خیال ہے کہ اگر آپ انکے پاس چلے جائیں تو بیفکری میں بسر ہوگی اور تھوڑے عرصے میں آپ نام بھی پیدا کر سکیں گے"۔

"کاش یہ بات مجھے کل معلوم ہوتی" اعجاز الزمان نے جواب دیا۔

"ہاں" ڈاکٹر کہنے لگا "اور اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ شہناز رائے صاحب معدے کی خرابی کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہیں تو میں انکی مدد کر سکتا تھا۔ اس مرض کا علاج میں نے خصوصیت سے کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ مجھے یقین واثق

ہے کہ آپکو صحت ہو سکتی ہے"۔

شہناز رائے نے کہا "کل میں آپکو اسکے عوض میں اپنی نصف جائداد دیدینے کو تیار ہو جاتا۔ لیکن اب ——— بیکار ہے۔

اعجاز الزمان بولا "کیا ہم سب واپس نہیں جا سکتے؟"

ڈاکٹر نے کہا "ناممکن ہے"

"اور میں کس چیز کے لئے واپس جاؤں؟ ظاہر ہے کہ میرے مرض کا کوئی علاج نہیں" الطاف علیخاں کہنے رگا شہناز رائے نے کہا "دنیا میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں جن سے شادی کی جا سکتی ہے"!

"ہاں . . . . . . لیکن ———" الطاف علیخاں نے جھجکتے ہوے جواب دیا اور دزدیدہ نگاہوں سے شکیلہ دیوی کی طرف دیکھا۔ اُسکے چہرے پر سُرخی کی ایک رو دوڑ گئی اور اس نے نگاہیں نیچی کرلیں"

"تو جلدی کیا ہے" ڈاکٹر نے کہا "رات بھر ہم سب اس معاملے پر غور کر سکتے ہیں صبح کو دیکھا جائیگا"

سب اپنے اپنے سفری بستروں پر جا کر سو گئے۔

اس تمام گفتگو کا اثر ظاہر تھا۔ انسان کی تکالیف کو بھلانے کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی بات کارگر نہیں ہوتی کہ اسے دوسروں کے درد کا احساس ہو۔ صبح کے وقت ناشتہ کے بعد شہناز رائے نے کہا۔

"گذشتہ رات کی باتوں پر غور کرنیکے بعد مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب اگر آپ مس شکیلہ دیوی اور اعجاز الزمان صاحب کے ساتھ واپس جانے کو تیار ہوں تو میری جائداد تینوں آپس میں تقسیم کرلیں۔ الطاف علیخاں صاحب اور میں اس سفر کو مکمل کرنیکی کوشش کرینگے۔ کہو کیا رائے ہے؟"

"مجھے اس میں کچھ عذر نہیں"۔ اعجاز الزمان بولا۔

ڈاکٹر نے کہا "میں جانے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ آپکی صحت کا میں ذمہ وار ہوں"۔

"لیکن" شہناز رائے نے کہا "ہم الطاف علیخاں صاحب کو تنہا کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ نہیں۔ میں زندگی سے سیر ہو چکا ہوں اور ضرور غبارے میں جاؤں گا"

"ڈاکٹر صاحب کی تجویز بُری تو نہیں ہے" الطاف علیخاں کہنے لگا۔

شہناز رائے نے پوچھا "تو آخر کار آپ بھی پسپا ہو گئے کیا؟"

"میں کچھ عرض نہیں کر سکتا" الطاف علیخاں نے شرمیلے انداز سے کہا "رات سوچتے سوچتے مجھے خیال

ہوا کہ ایک عورت کی بے وفائی کے عوض جان گنوا دینا عقلمندی نہیں ہے"

"درست" شہناز رائے نے کہا "بالکل درست۔ اس صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے مجھے شفا ہوجائے تو میں انکو ایک لاکھ روپیہ نقد دیدونگا۔ میر صاحب کو بیس ہزار روپیہ دیکر الطاف علیخاں صاحب کے والد کے پاس رکھوا دیا جاوے۔ اور شکیلہ دیوی صاحبہ کو میں اپنی لڑکی بنالوں"

"میری تجویز اس سے کچھ مختلف تھی" الطاف علیخان کہنے لگا "لیکن ــــ شاید وہ ممکن نہ ہو؟"

"وہ کیا تجویز تھی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میرا خیال تھا ـــ" الطاف علیخاں نے رکتے رکتے جواب دیا "لیکن ـــ نہیں ـــ کہنے سے کیا فایدہ؟"

"کہو تو!" شہناز رائے نے کہا "ہمیں سب کی رائے درکار ہے"

الطاف علیخاں کی آنکھیں زمین کی طرف تھیں "میرا خیال تھا کہ شاید ...... مس شکیلہ آپکی لڑکی بننے کی بجائے ـــ میری بیوی بننا قبول کریں تو ـــ لیکن شاید ان کا مذہب مانع ہو؟"

مس شکیلہ نے سر جھکا لیا گویا حیا نے مجبور کیا۔ پھر آہستہ سے کہا "میرے عقیدے میں ہندو مسلمان سب ایک ہیں۔ لیکن ــــ میں سوچ کر جواب دونگی"

شہناز رائے نے مسکرا کر کہا "اسکا مطلب ہے کہ قبول کرلینگی۔ اور بہتر ہوگا کہ اسوقت تک میرے یہاں قیام فرمائیں کیا سب صاحبان کو میرے پروگرام سے اتفاق ہے؟" سب نے اتفاق ظاہر کیا۔ اور سب ہی خوش معلوم ہوتے تھے۔

"اوہو! وہ کیا ہے؟" شکیلہ دیوی یکایک چلا اٹھی اور دور آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر نے اس طرف دیکھ کر کہا "ہمارا غبارہ ہوگا۔ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہم ناشتہ کر رہے تھے ہوا کے زور سے رسی ٹوٹ گئی یا کھل گئی اور غبارہ آزاد ہوگیا"

"خیر جانے دو کیا مضائقہ ہے!" شہناز رائے بولا "میں کپتان انڈرسن کو اسکا معاوضہ دیدونگا۔ آئیے اب گھر پہنچنے کا بندوبست کریں"

میر صاحب اور الطاف علیخاں کسی سواری کی تلاش میں روانہ ہوئے اور تقریباً دو گھنٹے کے بعد ایک کسان کا چھکڑا لے آئے۔ ریل کا سٹیشن وہاں سے آٹھ نو میل کے فاصلہ پر تھا لیکن اور دو گھنٹے میں یہ سفر بھی طے ہوگیا اور جس وقت شہناز رائے ٹکٹ خرید رہے تھے۔ ڈاکٹر نے تار گھر میں جاکر یہ تار روانہ کیا:ـ

"کپتان انڈرسن۔ غبارہ ضائع ہوگیا۔ مسافر سب بخیریت اور خوش ہیں۔ کل صبح لاہور پہنچ جائیں گے"

اِنسان

ایک قیدی دہر میں زنجیریٔ ایام ہے
ایک ہستی ہے مگر مجبور ہے ناکام ہے

موج ہے پانی کی نامحدود جولانگاہ میں
ایک مشعل ہے مگر روشن ہوا کی راہ میں

مطرب تقدیر کے ہاتھوں میں کوئی ساز ہے
اس کا نغمہ زخمۂ تقدیر کی آواز ہے

بلبلا ہے بادِ کبر و ناز سے پھولا ہوا
اک مسافر ہے وطن کا راستہ بھولا ہوا

وقت کے ہاتھوں میں اک شمشیر بے زنہار ہے
زندگی کے پاؤں میں اک گردشِ پرکار ہے

اک صدا ہے اس صدا کا کوئی منوالا نہیں
اک خدا ہے کوئی جس کا پوجنے والا نہیں

ایک قطرہ ہے جو دریا کے پرستاروں میں ہے
ق ایک طائرِ زندگی کے نو گرفتاروں میں ہے

جو ابھی ناآشنا ہے قید کے دستور سے
اور زمیں پر تک رہا ہے آسماں کو دور سے

یا ازل کے چرخ کا ٹوٹا ہوا اک تارہ ہے
اور بے مقصد فضائے دہر میں آوارہ ہے

عشق کے پاکیزہ تر جذبات کی بستی ہے یہ
آسماں بھی جس کے آگے خم ہے وہ پستی ہے یہ

حسن کے جلوؤں کی اک آراستہ محفل ہے یہ
شاہدِ لیلائے جاں کا عارضی محمل ہے یہ

کارواں ہے زندگی کے شہر میں اترا ہوا
اک مسافر ہے سرائے دہر میں اترا ہوا

خواہشوں کی ایک کل ہے آج کل کے ہاتھ میں
ایک مٹی کا کھلونا ہے اجل کے ہاتھ میں

ہے الگ دنیا سے اور اس بزم میں داخل بھی ہے
موج ہے آزاد بھی پابستہ ساحل بھی ہے

کر دیا پیدا اسے فطرت نے غایت کچھ نہیں
ہے تو اک دنیا مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں

مطرب تقدیر کے ہاتھوں میں کوئی ساز ہے
اس کا نغمہ زخمۂ تقدیر کی آواز ہے

آفاق ہریانوی

خوش کیونکر رہیئے؟

خوشی! ـــــ کتنا پیارا لفظ ہے! کون ہے جو خوشی کا نام سنتے ہی اس کا چاہنے والا نہ بن جائے؟ سچ یہ ہے کہ نوعِ انسان کو دُنیا بلکہ کائنات بھر میں اگر کسی سے دلی اُلفت ہے تو اسی پری سے!

کون ہے جو خوشی کا تمنائی نہ ہو؟ بچے سے لے کر بوڑھے تک اور فقیر سے لے کر بادشاہ تک سب اسی کے نام لیوا ہیں بلکہ عالم اور جاہل خدا شناس اور عقل پرست سب اِک اِس بات پر متفق ہیں کہ دُنیا کی زندگی نام ہے خوشی کی تلاش کا۔ خوشی سے ملاقات گاہے گاہے ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو ہم سب اگلے پچھلے شکوے بھول جاتے ہیں اور اپنے تئیں بغیر چون وچرا کئے اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر ہم نہیں پوچھتے کہ تو کہاں تھی اور اتنی مدت کہاں رہی؟ خوشی کے ہوتے ہم سب کچھ یہانتک کہ وہ گلے شکایتیں بھی جو ہمیں اس کے خلاف ہوں بھول جاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ سب کچھ بھول جانے کا نام ہی خوشی ہے!

زندگی خوشی کے لئے ہے۔ زندگی کا لطف خوشی سے ہے۔ خوشی ہی زندگی ہے اور غمگین زندگی تو موت ہے بلکہ موت سے بھی بدرجہا بدتر۔ خالق نے زندگی کو خوشی کے لئے پیدا کیا۔ خوشی کو کائنات کے میدان میں چھوڑ دیا اور زندگی سے کہا کہ جا اور اس پر قابو پالے۔ زندگی گویا اک بچہ ہے اور خوشی ایک چلتا پھرتا کھلونا کہ اس بچے کے آگے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ مادرِ قدرت محبت و مسرت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ بچہ جب کھلونے کو پکڑ لیتا ہے ہنستا ہے پھر اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ آگے آگے ہولیتا ہے۔ یہ دوڑتا ہے بلبلاتا ہے ماں مسکراتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ابھی اسکے ننھے ہاتھ پھر اُسے اپنی گرفت میں لے لیں گے۔

اِنسان مجبور بھی ہے اور خود مختار بھی۔ دُنیا کے میدان میں قدرت نے اُسے تگ و دو کے لئے چھوڑا وہ اس میدان سے باہر نہیں جا سکتا اس لئے مجبور ہے لیکن اس میدان میں بھاگ دوڑ سے وہ بہت سی چیزوں کو اپنا بنا سکتا ہے اس لئے با اختیار بھی ہے۔

زندگی کا منتہا خوشی ہے اور خوشی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ بغیر کوشش کے خوشی کا پانا صرف محال ہی نہیں بے لطف بھی ہے! مشکل ہی ہے جو دُنیا کے کاروبار میں آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ تکلفت ہی ہے جس کے دم سے آرام میں راحت ہوتی ہے علالت ہی ہے جس کے بعد ایک تندرستی ہزار نعمت بن کر دُنیا کی بیسیوں تکلیفیں بھلا دیتی ہے!

زندگی رنج و راحت سے مُرکب ہے۔ زندگی خوشی کے لئے ہے۔ پھر کیوں انسان مُصیبت میں گرفتار ہے؟ پھر کیوں ہم میں سے اکثر دُنیا کو دھوکے کی ٹٹّی اور رنج وغم کا گھر پُکارتے ہیں؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسان بے صبر ہے تکلیف کو تھوڑی دیر کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا اور چیخ اُٹھتا ہے کہ دُنیا دوزخ کا نمونہ ہے۔ ناشکر گذار ہے تکلیف کی گھڑی میں آرام کے دنوں کو بُھول جاتا ہے۔ خُدا کی نعمتوں کا شُکر گذار نہیں ہوتا اور اُسکی کُلفتوں پر زباں دراز ہوجاتا ہے کہ اگر اس کائنات کا خالق کوئی عقلمند ہے تو اُس نے کرب و اندوہ کو اس میں جگہ کیوں دی؟ نہیں سمجھتا کہ محض اُس کی خوشی کی خاطر خدا نے اُسے تکلیف کا تحفہ بھیجا۔ کانٹے بنائے تاکہ پُھول غیر کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ خزاں بنائی تاکہ بہار کی دل آویزی دوچند ہو۔ کسی تھکے ماندے کسان سے پُوچھیئے جب وہ دن بھر کنوئیں کے رہٹ پر گیہوں کے کھیت میں یا بنجر زمین میں اپنی محنت کا پسینہ بہاتا ہے اور شام کو گھر آکے اپنی روکھی سُوکھی روٹی کھاتا اور بستر پر دراز ہوجاتا ہے تو اُسے اِس نیند میں کتنا مزا آتا ہے۔ اس کے مقابل میں ایک موروثی امیر کا حال دیکھئے کہ سامنے قسم قسم کے لذیذ کھانے رکھے ہیں لیکن بُھوک نام کو نہیں یا جی للچایا اور کُچھ کھالیا تو جب تک ہاضمے کی دو گولیاں اور سودے کی ایک بوتل نوش جاں نہ فرمالی پیٹ مٹکے کی طرح پُھولا رہا۔ سُورج کو ڈُوبے گھنٹے ہوگئے لیکن آنکھوں میں نیند کا نشان تک نہیں اور اگر کہیں قسمت سے کچھ اُونگھ سی آئی بھی تو طرح طرح کے بھیانک خواب آکے چونکانے اور ڈرانے لگے۔ کوئی ماں اپنے بچے سے کوئی باوفا شوہر اپنی زوجہ سے کوئی دلبر اپنی دلبر سے جدا ہو تو ملاقات کے وقت اُن کی مسرت کا عالم دیکھو کہاں اُن کی وہ آہیں کہ اپنے محبوب سے ملنا کب ہوگا اور کہاں آنکھوں کا یہ تبسم جس کی چلبلاہٹ پر فرشتے اپنے زہد و اتقا کو قربان کردیں۔ فراق شاق نہ ہوتا تو وصال میں یہ کمال پیدا نہ ہوتا۔ طالب علم کے لئے محنت کی راتیں اور امتحان کا فکر نہ ہو تو تعطیلوں کے دن اور کامیابی کی بشارت کیسے ہو؟ ماں کے لئے زچگی کی تکلیفیں نہ ہوں تو وہ بچے کی خوشیاں کیونکر دیکھے؟ مزدور چلچلاتی ہُوئی دھوپ اور ٹھٹھرتی ہُوئی سردی میں اینٹیں ڈھونا گوارا نہ کریں تو عمارتوں کی یہ آن بان اور شہروں کی یہ آراستگی کیسے ہو؟ جاہل اپنی جہالت سے تباہی کی طرف نہ جائے تو عقل و تمیز کی قوت نوع انسان میں کس طرح پیدا ہو؟ جسم جسم میں تصادم نہ ہو تو برق کی جلوہ نمائیاں کہاں ہوں؟ مادے میں رُکاوٹ کا مادہ نہ ہو تو حرکت سکون میں جذب ہو جائے۔ صحرا جانسوز نہ ہو تو گلشن بھی یوں دل نواز نہ ہو۔ علالت کی تکلیفیں نہ ہوں تو صحت کی قدر کیسے ہو سکے؟ دُنیاوی کاروبار کی مشغولی نہ ہو تو فراغت سے جان اجیرن ہو جائے غیروں کی سرد مہری اور خود غرضی سے واسطہ نہ پڑے تو عزیزوں کی محبت و ہمدردی کی قیمت ہیچ ہو جائے! غرض ہمارے لئے اس دُنیا میں انتہا کے بعد سیری عُسرت کے بعد امارت رنجش کے بعد صلح خاموشی کے بعد گفتگو اور غم ہی کے بعد خوشی کا لُطف ہے!

یہ قدرت کا ایک اٹل قانون ہے کہ زندگی رنج و راحت سے قوت حاصل کرتی ہے۔ ہم دنیا کو دارالمحن اس لئے کہتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں اور ناشکر گذار۔ ہماری دس خوشیاں ایک غم سے ملیا میٹ ہو جاتی ہیں لیکن فی الحقیقت ہم اک بڑی حد تک آزاد ہیں اور ہمیں قوت پر بہت کچھ اختیار حاصل ہے۔ ہم اپنی تکلیفوں کو گھٹا سکتے ہیں اور اپنی راحتوں کو بڑھا سکتے ہیں اکثر مشرقی لوگ سمجھتے ہیں کہ قسمت اٹل ہے اور آزادی نام نہاد۔ ایسا خیال اپنے خدا پر اک سخت الزام دھرنا ہے۔ اگر انسان محض مجبور ہوتا تو سعی کا احساس اُس میں نہ ہوتا۔ انسانی کوشش کا احساس انسانی آزادی کا ثبوت ہے۔ منجمد شے نہ بااختیار ہوتی ہے نہ ذمہ دار لیکن متحرک وجود سمت و رفتار کا اختیار رکھتا ہے۔

کوشش ترقی کے لئے لازم ہے۔ ہم خوش نہیں رہتے اس لئے کہ ہم خوش رہنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بھاپ انجن میں جوش پیدا نہ کرے تو وہ جوں کا توں اڑا رہے۔ ہوائی جہاز کی کل بے کل نہ ہو تو جہاز پرواز کیونکر کرے۔ لگاتار کوشش ہی ہے جس سے پہاڑوں میں سرنگ پانیوں سے بجلی اور صحراؤں میں گلزار پیدا کئے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ روزی مقرر ہے کوئی شخص بھوکا نہیں مرتا جو کچھ جس کے نصیب میں ہے اُسے مل کے رہتا ہے۔ مانا کہ روزی مقرر ہے لیکن بالکل اسی طرح یہ بھی مقرر ہے کہ کوئی قحط سے مرے گا اور کوئی فاقے میں جان دے گا۔ کوئی اپنی کاہلی کے باعث دفتر کا کلرک بنا رہے گا اور کوئی اپنی چالاکی کے بل پر ہائی کورٹ کا جج ہو جائیگا۔ کوئی اپنی قناعت سے اپنے بال بچوں کو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیگا اور کوئی اُن کو یوں راہ ترقی پر لگائیگا کہ خود فطرت کی قوتیں واہ واکہہ اٹھیں گی۔ یہ قدرت کے قانون ہیں یہ بھی خدا کے کارخانے ہیں کہ سب کام کسی نہ کسی اصول کے تحت میں ہو رہے ہیں بعض اصولوں کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہماری کوششوں کا بارآور ہونا ہماری ہمتوں کا عوض ملنا۔ بعض کو ہم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس پوشیدگی کی تہ میں ہزاروں مصلحتیں پنہاں نہیں ہیں؟ کسی دفتر کا ہشیار کلرک سوال کریگا کہ میں باوجود اپنی کوشش کے چھبیس برس سے بدستور کلرکی کر رہا ہوں بتائیے تو میری کوشش کیا ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ لاکھوں محنتی تنگی میں ہیں اور ہزاروں نکھٹے چین سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا جس نے دونوں کو پیدا کیا جس نے زندگی اور اشیاء کو اصولوں کے ذریعے ترتیب دی جس نے تنگی و فراخی کو پیدا کیا جو رنج و راحت کو وجود میں لایا وہ سمجھتا ہے کہ زندگی کے ترازو کو کس طرح برابر رکھا جائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محض دولت ہی مسرت نہیں وہ بدنصیب شخص کو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح ضرور سزا کے بدلے جزا رنج کے بدلے راحت اور عسرت کے بجائے دنیا جہان کی فراخیاں عنایت کریگا۔ یہ نہ کہو کب یہ نہ کہو کیسے؟ خدا کے قانون ہماری فہم سے بالاتر ہیں۔ تم اپنا کام کئے جاؤ قدرت اپنا کام کر لے گی۔

کوشش رائگاں نہیں جاتی۔ بہت کچھ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا لیکن بہت کچھ ہم سمجھ بھی سکتے ہیں۔ سمجھ لیتے ہیں پھر کچھ جان بوجھ کر کچھ اک دوسرے کی چشم پوشی اور باہمی انسانی سازش سے سمجھنا نہیں چاہتے۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ جفاکش کی محنت عموماً کچھ نہ کچھ پھل لاتی ہے۔ مزدور سختیاں سہ سہ کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ محبانِ وطن اپنے وطن کی محافظت میں جانیں لڑا دیتے ہیں اور یوں ہی ملک کی آزادی دشمن کے ظلم سے آزاد رہتی ہے سائنسدان برسوں سر کھپاتے ہیں اور آخر ایک دن ہزاروں تجربوں کے بعد گراموفون کی آواز بندی ٹیلیفون کی آواز رسانی اور برق کی حیرت انگیز سرعت کا پتہ چل ہی جاتا ہے۔ مشرق صدیوں سے قناعت کئے ہوئے ہے اور جو حال اُس کا ہے ظاہر ہے۔ جہالت کی تاریکی یہاں چھائی ہوئی ہے توہمات کی فتنہ سامانیاں یہاں جلوہ گر ہیں غلامی کا یہاں سکہ رواں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غم واندوہ کا یہاں دلوں پر راج ہے۔ اُدھر مغرب چار سو برس سے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ عربوں سے اُس نے علوم سیکھے ہندیوں سے اُس نے تجارت کی اور دنیا بھر میں اُس نے اپنے جال پھیلادیئے اور جو اُس کا حال ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ علم کی روشنی وہاں سے نکل کر باقی چاروں براعظموں پر پھیل رہی ہے انسان وہاں اپنی سعیِ مسلسل کے سہارے فلک کے تارے توڑ رہا ہے آزادی کا نعرہ وہاں اس قدر بلند ہے کہ غلام قومیں بھی جا بجا شور و غل مچا رہی ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اس خوشحالی کے ساتھ خوشی وہاں کی زندگی میں برقی رو کی مانند دوڑ گئی ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کوشش کے بغیر کچھ نہیں پاتا) اِس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مذہب نے ہمیں سعیِ انسانی کی ہیچ سامانی کا سبق دیا ہے۔ مذہب تو کہتا ہے جو کروگے سو بھروگے ذرہ برابر نیکی یا ذرہ برابر برائی کا بدلہ مل کے رہیگا۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جو بوؤگے سو کاٹوگے۔ ہو نہیں سکتا کہ جو بوئے جائیں تو گندم اُگے۔ اسی طرح ناممکن ہے کہ تم اپنی قسمت کا آنسو بہر رونا روتے رہو اور قدرت تمہاری یاوری کرے۔ قدرت تو کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر کام کرتی اور نکموں کے ساتھ نکمی بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ اسی طرح قدرت ہنستوں کو ہنساتی اور روتوں کو رُلاتی ہے۔ قدرت کی قوتیں ہماری منتظر ہیں۔ بعض کو ہم نے اپنا بنا لیا ہے، بعض سے ہم گریز کرتے ہیں اور بعض کی طرف ہمکو ہماری قسمت لئے جاتی ہے۔

خوش رہنے کی کوشش۔ خوش رہنے کی کوشش کرو اور تم خوش رہوگے۔ اپنی زندگی کو اس زریں مقصد کے ساتھ اک سنہری زنجیر کے ذریعے سے وابستہ کرلو۔ کوئی کہے گا حضرت! زندگی بچوں کا کھیل نہیں کہ ہم اُس سے اِس طرح مذاق کریں۔ دنیا عملی مشکلات کا کارخانہ ہے یہاں کے جھگڑوں جھمیلوں میں محض

زبردستی خوش ہولینا ناممکن ہے۔ جب تک حالات بہتر نہ ہوں انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ بلاشبہ زندگی بچپن کا سا تماشا نہیں لیکن نہ وہ موت کی سی جانکنی ہے۔ دُنیا جھگڑوں جھمیلوں کا گھر ہو۔ تکلیفوں اور مُصیبتوں کی منزل سہی لیکن سعیِ مُسلسل، صبر و حوصلہ اور ہمت و شجاعت بھی دُنیا ہی میں خود ہمارے اندر موجود ہیں ہر مشکل کے لئے اک مشکلکشا ہمارے پہلو میں ہے۔ ضرورت ہے تو اتنی کہ ہم کاہلی کے بستر سے اُٹھ بیٹھیں ہمت کی کمر باندھ لیں اور اپنی قسمت کو اپنے ہاتھ میں سنبھال کر میدانِ زندگی میں کچھ کرنے کو چل نکلیں !!

خوش رہنے کی کوشش کرو لیکن کیونکر ؟ تم یہ سُن کر حیران ہوگے کہ خوشی بھی اک فن ہے جو حاصل کیا جا سکتا ہے اور زندہ دلی اک ایسی قوت ہے جو گھٹائے گھٹتی اور بڑھائے بڑھتی ہے !

آؤ دیکھیں کہ ناخوشی اور رنج و غم کے کیا وجوہات ہیں ؟ دُنیا کیوں مُصیبت گاہ سمجھی گئی ہے اور اکثر لوگ کیوں مغموم و فکر مند رہتے ہیں ؟

فکر و تشویش کے اسباب۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انسان کے ناخوش رہنے کی اصلی وجہ خوشی کی خواہش ہے یہ تمنا کہ ہر وقت ہر بات میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر میں آرام کی زندگی بسر کروں۔ اُس کی حیوانی فطرت تو یہ چاہتی ہے اس کے برعکس قُدرت کا چاہنا ہے کہ میرا بچہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر عقل و اطمینان کی چوٹی پر جا پُہنچے۔ ہماری زندگی اسفل و اعلیٰ قوتوں سے وابستہ ہے۔ اعلیٰ قوتیں اُسے اُوپر کو کھینچتی ہیں اسفل قوتیں نیچے کو حیوانیت کاہل ہے نفسانیت کے پیچھے دوڑتی ہے فردی اطمینان مانگتی ہے۔ ملکوتیت جفاکش ہے نیکی میں مسرت پاتی ہے اور سب کا بھلا چاہتی ہے۔

فکر و تشویش کے اسباب میں کچھ **مادی و جسمانی** ہیں۔ اِن میں ایک سخت **افلاس** ہے جس کی وجہ سے کروڑوں آدمی مُصیبت میں ہیں۔ بعض اپنی کوشش اور سمجھداری سے دو وقت کی روٹی کما لیتے ہیں بعض اپنی کاہلی اور ناسمجھی سے خود بھی بھُوکے مرتے ہیں اور اپنے بچّوں کو بھی بُرے حال میں رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ وہ بھی ہیں جو باوجود اپنی محنت کے عُسرت میں مُبتلا رہتے ہیں۔ جنہیں دن بھر کے کام کے بعد بھی پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہیں ہوتا یہی لوگ ہیں جو خیرات کے مستحق ہیں۔ قُدرت اُن کی طرف سے انسانیت سے بھیک مانگتی ہے اور ہمارے ضمیر میں خُدا کی آواز آتی ہے کہ ان کی مدد تیرا فرض ہے۔ ایسے لوگ خُدا کے محبوب ہیں۔ وہ اپنی تکلیفوں سے اپنے گناہوں کا کفارہ دے کر اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں اور جنہیں یہ حاصل ہو وہ یقین کئے رہیں کہ اُنکی چندروزہ تکلیفیں پائدار خوشیوں کا پیش خیمہ ہیں۔ سُست اور کم فہم کی تنگ حالی اک تازیانہ ہے جو اُسے حرکت اور فہم

عقل کا سبق سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسے کی چیخ پکار سے صرف شیطان ہمدردی ظاہر کرے تو کرے۔ اُس کی اپنی خوش قسمتی خاموش رہتی ہے اور اچھے دِنوں کی اُمیدوار منتظر +

بناوٹی یا معاشرتی افلاس کی ناخوشی کا علاج سوائے اسکے کچھ نہیں کہ بناوٹ اور معاشرت کے پھندے سے جہاں تک ہو سکے رہائی پائی جائے۔ زیادہ تر نام نہاد مفلس لوگ اس دُنیا میں وہی ہیں جنہوں نے یا تو اپنے معیارِ زندگی کو بڑھا لیا ہے خود بخود یا اوروں کی دیکھا دیکھی یا وہ جو ہر وقت اپنے آپ کو تنگ حال سمجھتے ہیں۔ اِن کی تنگ خیالی انہیں باوجود تھوڑی بہت دولت کے ہمیشہ تنگ حال رکھتی ہے + بالخصوص آجکل کی مہذب دُنیا میں جس میں شہری ہندوستان بھی شامل ہے اس قسم کی مصنوعی تنگ حالی عام ہو رہی ہے + ایک شخص کی سَو یا دو سو روپیہ تنخواہ ہے لیکن وہ دن رات تشویش میں رہتا ہے اُس کا قول ہے کہ مجھے شرفا کی طرح رہنا ہے۔ راج مزدور مجھ سے بہتر ہیں وہ اک لنگوٹی پہن کر سڑک پر چلے جائیں تو مضائقہ نہیں لیکن مجھے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی عزت مدِّنظر ہے اُنکے رہنے کو اک مکان کھانے کو سالن چپاتی اور کبھی کبھی پھل، مکان میں چند دریاں کرسیاں میزیں لکھنے پڑھنے کو قلم دوات کاغذ کتابیں، باہر جانے کو سواری گرمی میں پنکھا قلی سردی میں آتش دان، بچوں کے لئے اپنی گائے کا دُودھ بیوی کے لئے ایک دو بنارسی ساڑھیاں درکار ہیں، کیئے میں یہ سب کچھ کہاں سے لاؤں۔ کولھو کے بیل کی طرح کام کرتا ہوں۔ خود بھی خودداری سے رہتا ہوں کیا کروں کالر ٹائی کوٹ پتلون یا شلوار اور طلائی کوٹ، ایک چھڑی ایک گھڑی چند سگریٹ یا اک پیچواں یہ رکھنے ہی پڑتے ہیں۔ عزت کا معاملہ ہے دُنیا میں رہنا ہے، اِس کا دُکھ درد سہنا ہے، مجبور ہوں اپنے بس کی بات نہیں" + اعلیٰ معیارِ زندگی کے ہاتھوں جوگت ہماری بن رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ افراد نالاں ہیں اور قوم باوجود زر و دولت کے کنگال + ہم میں کچھ مغربی قوموں کی نقل اُتارتے ہیں کچھ پُرانی مشرقی وضع کی نوابی کرتے ہیں۔ ہر دو کی حالت کا نتیجہ افلاس اور تنگی ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ عدمِ تعاون کی تحریک کا وہ حصہ جو سادہ لباس اور سادہ رہائش سے متعلق تھا نہایت مفید اور آخر کار مُلک کے لاکھوں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اطمینان و مسرت کا نامہ بردار تھا۔ کھدّر پہننا خلافِ شان نہ تھا اور سادہ وضع اعلیٰ خیال ظاہر کرتی تھی +

اعلیٰ معیارِ زندگی ۔ اِس سے یہ سبق لینا چاہیئے کہ وہ وضعداری وہ زرق برق کے لباس وہ سُوٹ بُوٹ وہ اچھی رہائش جس کا لازم نتیجہ دلی بے اطمینانی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بجائے آرام کے تکلیف کا باعث ہیں۔ جہانتک ہو سکے اِن سے رہائی پانے کی کوشش کرنی چاہیئے + آدمی اک مشین تو نہ ہو کہ صبح سے شام تک جو کمائے جائے وہ صبح سے شام تک اُڑائے جائے۔ پرزے گھستے جائیں، کھٹا کھٹ سے اپنی اور اوروں کی زندگی عذاب ہو جائے اور نتیجہ اپنے اور

سب کے لئے بجز بے چینی اور اضطراب کے کچھ نہ ہو۔ مُدعا یہ بھی نہیں کہ ہم اپنے کام کاج چھوڑ دیں دولت حاصل کرنے کو گناہ سمجھیں یا سب کچھ ترک کر کے صرف چرخہ ہی کاتا کریں۔ اس ایثار کے قابل جب یہ ایثار کرنیکے قابل ہو لاکھوں میں ایک ہے ہر ایک نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اعتدال پر قائم رہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کا کام نہیں کہ وہ اپنے معاشرتی دائرے یا اپنی دُنیا کو بدل ڈالے۔ اکثر لوگ اپنی محدود قابلیت کی وجہ سے مجبور رہیں کہ قائم کردہ موجودہ نظام کے تحت میں کام کریں لیکن اتنے مجبور بھی نہیں کہ بات بات میں اوروں کی نقل ہی اُتارا کریں۔ چاہیئے کہ ہم اپنا اپنا کام مستعدی سے کریں اپنے معیارِ زندگی کو جہاں ضرورت ہو تبدیل کر دیں تاکہ ہماری محنت مزدورِ مقہور کی سی نہ ہو ہمیں اس جدوجہد کی دُنیا میں کچھ قلبی اطمینان بھی ملے۔ ہم ہر شے کو موجبِ شرم تصوّر نہ کریں اور دُنیا کے جال کو جو ہمیں جکڑے ہُوئے ہے کہیں کہیں سے تھوڑا بہت اپنے زور سے توڑ کر خود ساختہ بنالیں۔ دُنیا کے قوانین کے آگے ہم اک مادر زاد غلام کی طرح سر نہ جھکائیں بلکہ اک آزاد مرد انسان کی طرح اُس کی عدالت میں حاضر ہو کر معقول بات سُنیں اور معقول بات ہی کہیں۔

مُہذب دُنیا کی مصروفیتیں۔ قناعت کرو۔ دیئے ہُوئے پر راضی رہو اس حال میں کہ تم اپنی ترقی کے لئے صبر و اطمینان کے ساتھ کوشش بھی کرتے رہو۔ آج کل زر طلبی اور جاہ طلبی کا بازار اس قدر گرم ہے کہ یہ گرمی آتشِ جہنم کی گرمی سے کم نہ ہو گی۔ ہٹ جاؤ پیٹو مار ڈالو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ جبر و مقابلہ اپنے زوروں پر ہے یوم الحساب پر کسی کو اعتقاد نہیں اخلاقیات صرف معاشرتی گورکھ دھندے ہیں اور صدائے ضمیر اکثر خاموش رہتی ہے۔ افراد سے قومیں قوموں سے برسرِ پیکار ہیں۔ علم و فن کی مدد سے بھائی بندوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں غلامی کی زنجیریں پہنائی جاتی ہیں مرد و عورت غرور و ثروت کے دیوتا بنے بیٹھے ہیں کہ دُنیا ہماری پرستش کرے۔ نوجوان سنِ بلوغ سے پہلے ہی اس قدر سرکش ہو جاتے ہیں کہ باپ کو بولنے کی مجال نہیں (خیر یہ اُس نامناسب حکومت کی سزا ہے جو انسانی باپ صدیوں سے اپنے بچّوں پر کرتے آئے) مغربی عورتیں برابری کی دعوے داری سے نظامِ معاشرت میں جائز و ناجائز طوفان برپا کر رہی ہیں (خیر یہ اُس شرمناک ظلم و ستم کا ردِّ عمل ہے جو مردوں کے ہاتھوں صنفِ نازک پر ہوتا رہا ہے) اور سبھی لوگ کاروبار اور اشغال کی فراوانی میں اس قدر مصروف و منہمک ہیں کہ اُنہیں اس بات پر غور کرنے کی مُطلق فرصت نہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ درست بھی ہے کہ نہیں۔ اک لُوٹ مار ہے جس میں کسی کو اپنا یا دُوسرے کا ہوش نہیں۔ اس شیطانی مصروفیت کا لازم نتیجہ خود غرضی جنگ آزمائی فساد اور تشویش و اندوہ ہے۔ خود مغرب میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہے۔ رسکن اور ایمرسن برسوں یہی رونا روتے رہے۔ جنگِ عظیم کے بعد کی نئی رُوحانیت اک نئی زندگی کی داغ بیل ڈال رہی ہے۔ فطرت کی انتہائی مادہ پرستی کے بُرے نتائج سے فائدہ اُٹھا کر قدرت راہِ اعتدال کی

طرف اُس کی رہنمائی کرتی ہے +
جاہ طلبی و زر طلبی ۔ جاہ طلبی نے کتنوں کی نیندیں حرام کیں ۔ زر طلبی نے کتنوں کی خوشیاں برباد کیں ۔ اپنے پرائے ہیچ ہو گئے ۔ بُرائی جائز اور نیکی ایک مذہبی ڈھکوسلا ٹھہرا ۔ کائنات میں کوئی قوت انسانی عیش و عشرت کی روک ٹوک کرنے والی نظر نہ آئی ۔ سچ یہ ہے کہ یہ ایسے نشے ہیں جن کا خمار مرکر ہی اُترتا ہے یا کوئی خوش نصیب ہو تو قسمت اُسے مصیبتوں میں گرفتار کر دیتی ہے اُسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتی ہے کہ وہ راہِ راست پر آئے ۔ بنیا اپنے ہی کھاتے کو صرف دُنیا نہیں بلکہ کائنات کا سب سے زیادہ ضروری مسوّدہ تصوّر کرتا ہے ۔ جو شے وہاں درج نہیں وہ کام کی نہیں + اسی طرح جاہ طلبی اور عزت خواہی بھی ایسے مرض ہیں کہ اپنے نام کے ساتھ صرف دو حرف لگا سکنے کی غرض سے اِنسان ہمالیہ کی چوٹی کو بحرالکاہل میں پھینک دینے سے نہیں جھجکتا ۔ اُسکی بلا سے یہ امر انسانیت کے لئے نقصان دہ اور قُدرت کے نزدیک نامناسب ہو اُس کی حرص تو پوری ہوتی ہے + اس بنئے پن اور یورپ پن کی روک تھام ہمارا اخلاقی فرض ہے ۔ اگر خوشی چاہتے ہو تو دُنیا کی واہ وا اور دولت کی جھنکار سے اپنے نفس کو آلودہ نہ ہونے دو + اوروں کی تعریف اور زندگی کے ساز و سامان کو گناہ سمجھنا ضروری نہیں لیکن اِن کی خاطر باقی سب خیالوں پر لات مار کر شیطان سے اتحاد پیدا کر لینا بھی عقلمندی نہیں + اگر ہمارے رُتبے میں کچھ فرق آگیا ، کسی سودے میں گھاٹا پڑا ، ضرورت سے ہم مقروض ہو گئے ، لاٹ صاحب نے ہمیں کھانے پر بُلانا چھوڑ دیا ، کوئی ہم مرتبہ خان بہادر بن گیا ، ہم یونیورسٹی کے ممتحن نہ ہو سکے ، کسی جلسے میں ہمیں میز کے قریب جگہ نہ ملی تو یہ نہ ہو کہ ہمارا مزاج درہم برہم ہو جائے راتوں کو نیند اور دنوں کو بھوک اُڑ جائے اور ہماری زندگی کی فضا میں بدقسمتی کی آندھیاں چلنے لگیں + دُنیا کے کاموں میں مصروف رہو لیکن نہ اتنا کہ کھانے اور سونے اور چیں بجبیں ہونے کے سوا اور کسی بات کے لئے تمہیں فرصت ہی نہ ہو ۔ کام کے ساتھ تفریح اور مصروفیت کے بعد کسی نہ کسی طرح کی فراغت اور کوئی نہ کوئی شغل جسمانی راحت اور دماغی فرحت و ترقی کے لئے لازم ہے جو ہر وقت کام ہی کرتے رہیں وہ دیر تک کام نہیں کر سکتے ۔ جو متانت کو عقلمندی اور ظرافت کو جہالت سمجھتے ہیں وہ اک گدھے سے بھی کم زندہ دل ہیں کہ یہ کبھی نہ کبھی اپنی خوشی میں بے وجہ دولتیاں مار کر ہی اپنا جی خوش کر لیتا ہے + ایسے متین مزاجوں سے لوگ اس طرح دُور بھاگتے ہیں گویا وہ اک بھیڑیا یا لگڑ بگڑ ہیں جنہیں مُردوں ہی سے واسطہ پڑتا ہے + اگر تم نہایت متین مزاج ہو اگر تمہارے لب آٹھوں پہر صرف چند فقرے بولنے اور چند لقمے کھانے ہی کو کھُلتے ہیں تو خُدارا کبھی ذرا سا ہنس بھی دو کہ تمہارے دانتوں پر سُورج کی کرنیں پڑیں

ہمان کی ہوائیں چلیں۔ ہنسنا صرف جاہلوں اور غریبوں ہی کا پیشہ تو نہیں۔ عقل اک چڑیل نہیں ہے کہ ہر وقت اس سے لوگ ڈرتے ہی رہیں +

کاہلی اور ناکارہ پن۔ مغربی جدوجہد کی انتہا روحانیت کے منافی ہے لیکن مشرقی کاہلی بھی اُس کے موافق نہیں۔ اور صحیح قسم کی جدوجہد زندگی کی جان ہے۔ مسلمانوں کو کس چیز نے تباہ کیا؟ بے موقع قناعت اور غلط توکل نے! جو کچھ انہوں نے اپنی زیاں کاری سے کھویا قسمت کے سر تھوپ دیا۔ اُن کے بڑوں نے دُنیا کو اس قسم کی فرضی مذہبیت سے زیر نگیں نہ کیا تھا + شام کی مہم میں جب مسلمانوں کے لشکر میں وبا پھیلی تو حضرت عمرؓ نے لشکر کو کوچ کا حُکم دیا۔ اس پر ابوعبیدہ جو سرِ لشکر تھے طعنہ زن ہُوئے کہ "عمرؓ کیا تم قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو" حضرت عمرؓ بولے "مَیں قضائے الٰہی سے بھاگتا ہوں مگر بھاگتا بھی ہوں قضائے الٰہی کی طرف" + موت خُدا کی بھیجی ہُوئی ہو۔ لیکن زندگی بھی تو اُسی کی دی ہُوئی ہے۔ موت سے بچنا موت سے ڈرنا نہیں + ہم زندگی کو نعمت کیونکر نہ جانیں کہ وہ اک نعمتِ خداوندی ہے + اِسی طرح کچھ نہ کرنا خُدا کی رضا پر چلنا نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا اُس کی طرف چلتے رہنا ہے اور کچھ نہ کرنا یا بُرائی کرنا ٹھہرے رہنا اور اُس سے گریز کرنا ہے + کہیں کسی جگہ کوئی شے محض ساکن و منجمد نہیں ہے نہ رہ سکتی ہے ہر وجود تبدیل ہوتے رہنے پر مجبور ہے۔ تمہاری حالت تو بدلتی ہی رہیگی اُسے بد سے بدتر کیوں ہونے دو بہتر کیوں نہ بنالو + کام زندگی ہے کاہلی موت۔ تم جب زندہ ہو تو مُردنی تُم پر کیوں چھائی رہے۔ ابھی موت کا دن نہیں آیا تو فراغت کا مُنہ تکتے رہنے سے کیا حاصل؟

اکثر ہندوستانیوں کی تشویش کی وجہ نکماپن ہے یا غلط قسم کی مصروفیت جو کبھی باپ دادا سے وراثت میں آئی ہو اور کبھی اپنی ناسمجھی سے گلے پڑی ہو + کتنے نوجوان ہیں جو بازاروں میں بے مقصد مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی اپنے بزرگوں کو گالیاں دیتے ہیں کبھی اپنے ساتھیوں سے لڑتے جھگڑتے ہیں کسی بیٹھک میں بیٹھے تاش کھیلتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ لغو باتوں میں زندگی گذار دیتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ ہا! قسمت ہی ایسی ہے ورنہ ہر فن میں ہیں ہم طاق ہمیں کیا نہیں آتا۔ کچھ ہماری آب و ہوا میں سُستی ہے کچھ ایسے صاحبوں کے مزاج زیاں کار واقع ہُوئے ہیں اور اسی طرح ہماری قوم قعرِ غفلت میں پڑی انگڑائیاں لیا کرتی ہے + اس ناکارے پن سے انتہا درجہ کی تشویش ناکی اور بیزاری پیدا ہوتی ہے اور ساری کائنات اک بے مدعا کارخانہ معلوم ہونے لگتا ہے جس میں خدا نے زبردستی اپنی مخلوق کو کام میں لگا رکھا ہے۔ زیاں کاری کا کیڑا مشرق کے دماغ میں لگ گیا ہے اور اُسے کھا رہا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اگر وہ نواب زادہ

بھی ہے تو اپنے تئیں کسی نہ کسی مفید کام میں مصروف رکھے زندگی کا کچھ نہ کچھ نصب العین ضرور ہو خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ سے "بیکار مباش کچھ کیا کر کپڑے ہی اُدھیڑ کر سیا کر" خدا اپنے کام میں فرشتے اپنے کام میں' یہاں تک کہ شیطان بھی اپنے کام میں منہمک ہے۔ پتھر چٹان میں لگا ہے اور اُسے مضبوط کئے ہوئے ہے۔ لہریں ساحل کی طرف رواں ہیں سُورج میں اپنے شعلوں کی گرم بازاری ہے۔ صرف نکمّا آدمی جان بوجھ کر کام سے بھاگتا ہے۔ مگر قُدرت اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیگی۔ کوئی نہ کوئی مرض کوئی نہ کوئی مُصیبت اُس پر نازل کرکے رہیگی تاکہ اُسکا نابالغ بچہ اپنی کاہلی میں اُداس نہ ہو جائے۔ کام بھی ایک قسم کا ساتھی ہے جو ہمیں اکیلا نہیں رہنے دیتا۔ تنہائی زندگی کی سب سے بڑی آفت ہے اور فراغت تنہائی کی بہن ہے۔ کام کرتے رہو اور کام کے ساتھ کچھ آرام۔ پھر دیکھو زندگی کیونکر مطمئن ہو جاتی ہے اور دُنیا کیسی دلکش نظر آتی ہے۔ یاد رکھو کہ چند کام اِس دُنیا میں ضرور ایسے ہیں جو تمہارے بغیر پُورے نہیں ہو سکتے وہ سب تمہارے منتظر ہیں۔ اُٹھو اور اُنہیں سرانجام کرو۔

(باقی دارد)

(آئندہ نمبر میں فکر و تشویش کے دیگر اسباب پر غور کیا جائیگا)

بشیر احمد

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے تمام ستارے مجھ میں درخشاں ہیں' دُنیا میری زندگی میں اِک طوفان کی طرح اُمڈی آتی ہے، پھُول سبھی کے سب میرے جسم میں کھِلتے ہیں، زمینوں اور سمندر کا سارا شباب میرے دل میں عنبر کی طرح مُشکبار رہتا ہے اور تمام چیزوں کا نفس میرے خیالات پر اس طرح اپنی راگنیاں چھیڑتا ہے گویا وہ اِک بانسری کے تار ہیں!

اپنے خاموش خیالوں کے سائے میں

اپنے خاموش خیالوں کے سائے میں تنہا بیٹھا ہُوا میں تیرا نام پکارتا رہونگا، میں اُسے بغیر الفاظ کے بغیر کسی مُدعا کے پکاروں گا کیونکہ میں اِک ایسے بچے کی مانند ہوں جو اپنی ماں کو سو بار پکارتا ہے اور اسی میں خوش ہے کہ وہ "ماں" کہہ سکتا ہے!

گلچیں



داماد کا انتخاب

شیخ امراللہ کا سارا وقت عبادت اور اوراد و وظائف میں گزرتا تھا، دوستوں، عزیزوں کے بچے، بڑھ کر جوان ہو گئے۔ انہوں نے نہ کبھی انکی شکل دیکھی اور نہ انہیں پہچانا۔ گھر کے انتظام سے وہ بے خبر، آنے جانے والوں سے وہ لاعلم۔ لیکن شیخ صاحب ایک ہفتے سے بہت ششش و پنج میں تھے، اُن کی پیاری بیٹی جمیلہ کے دو طالب پیدا ہوئے تھے۔ اور دونوں اتفاق سے ڈاکٹر، دونوں کے پیام لانے والے شیخ امراللہ کے راستہ کا چھ سات دن سے تانا بانا کر رہے تھے۔ خوشامدیں کر کر کے اُن سے وعدہ لینا چاہتے تھے۔ ایک کہتا تھا، لڑکا آپکی جمیلہ کا دل و جان سے طالب ہے، دوسرا کہتا تھا، لڑکے کے مُنہ میں ہفتہ بھر سے کھیل اُڑ کر نہیں گئی ہے، کہتا ہے اگر جمیلہ نہ ملی تو نہ کھاؤنگا، نہ پیوں گا، خودکشی کر لونگا، شیخ امراللہ کے لئے دونوں مجہول تھے، دونوں اگرچہ اُس کے عزیز تھے لیکن اُنکے عادات و اطوار سے واقف ہونا تو علیحدہ رہا، اُنہوں نے ابھی تک کسی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ حیراں تھے، کسے انتخاب کریں کسے اپنی بیٹی دیں فال اور استخارے دیکھتے۔ سب سے زیادہ فکر اُنہیں اُنکے اخلاق و عادات کے متعلق تھی۔ اُنکی بیٹی کے طالب، کیا طبیعت، کیسے خیالات رکھتے تھے؟ اگر ان کا اعتقاد سُست اور مزاج غیر متبین ہُوا، تو اُن سے گذارہ مشکل ہو گا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اُنکا داماد، ایک قوی ایمان کا مالک ہو۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ واقف اصول و فروع دین ہو، فقرا و ضعفا کا بہت خیال کرتا ہو، نرم دل ہو، اگر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں کہ وہ امورِ دین سے واقف، اور ان پر عامل ہے، تو کم سے کم دو شاہدِ عادل سے تو سُن چکے ہوں۔ اسکی تحقیق بغیر تو وہ اپنی چہیتی بیٹی کو دینے سے رہے۔ کیا وہ اپنے لختِ جگر کو، اپنے گھر سے دھکا دے کر گلی میں پھینک دینگے؟

مگر اس کی تحقیق کس طرح کریں۔ دونوں لڑکوں میں سے کسی سے واقف نہیں۔ تلاش پر بھی کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی نہ ملا، جو اُنکے صحیح صحیح حالات بتا سکے۔ برخلاف اسکے اُنکے کانوں میں تو یہ خبریں پہنچی تھیں کہ ان میں سے ایک تو ایسا ہے جس نے عمر بھر میں اک دفعہ بھی خدا کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ وہ ایک فرنگ مآب فلسفی تھا۔

آخر ایک دن شیخ امراللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ ایک مہینے سے، اُنکے گھر میں خدا کی بھیجی ہُوئی اک مہمان بُڑھیا ٹھیری ہُوئی تھی۔ یہ ایک بے یار و مددگار ضعیفہ تھی، جو نہ معلوم کہاں سے گھِستی گھِستی اُن کے

دروازے تک آئی تھی اور انہوں نے اپنے ہاں اُسے ٹھیرالیا تھا مگر بیچاری بُڑھیا جس دن سے آئی، اُس دن سے بیمار جو پڑی، تو آج تک بیمار تھی، بخار میں پھُک رہی تھی، اور اب اُس میں بستر سے اُٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی، سب گھر والے پریشان و متفکر تھے۔ ہر روز اُسکے مُنہ میں غذا دوا چواتے تھے، اور بستر پاک کرتے تھے اس بیمار کو اک طبیب حاذق کی ضرورت تھی۔ شیخ امراللہ ایسے خسیس و سنگدل نہ تھے، کہ اُس ضعیفہ کے علاج میں جس نے انکی چھت کے نیچے آکر پناہ لی تھی، ہر ممکن کوشش و صرف سے دریغ کرتے۔ لیکن یہ موقع بھی اچھا موقع تھا۔ انکی جوان لڑکی کے طالب دو ڈاکٹر تھے۔ انہیں ہی بُلانا چاہیئے، اُن سے باتیں کرنی چاہئیں، اُنکے خیالات و افکار کی تحقیق کرنی چاہیئے، اور ان میں سے جو بہتر معلوم ہو، جمیلہ کو اُسے سونپنا چاہیئے، اس تجویز کا، اُنہوں نے اپنی بیوی کے سوا، اور کسی سے ذکر نہیں کیا، بیوی نے جب اُنکی رائے سے اس طرح اتفاق کیا۔ گویا وہ ان میں سے کسی سے بالکل واقف نہیں۔ تو اُنہوں نے دونوں کو فوراً خط لکھے، جن میں دو دو دن کے فاصلے سے اُن سے مُلاقات کرنے کے لئے وقت مقرر کئے خط ڈاک میں ڈال دئے گئے۔

۳ر جولائی۔ صبح

آج صبح چٹھی رساں مجھے دو خط دے گیا، میں نے دونوں کو کھولا اور پڑھا۔ اللہ! میں کیسا خوش قسمت ہوں، ایک پر پیاری جمیلہ کے، اور دُوسرے پر اُسکے باپ کے دستخط تھے۔

شیخ امراللہ کے خط کا مطلب یہ ہے:۔

اُنکے گھر میں کوئی یکایک بیمار ہوگیا ہے، جب کہ میں اُنکا فرزند بننے کے لئے تیار ہوں تو اُنہیں مناسب نہیں معلوم ہُوا کہ مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور ڈاکٹر کو بُلائیں، لہذا مجھے ہدایت ہُوئی ہے کہ ازراہِ سعادتمندی میں دوشنبہ ۵ر جولائی کو تکلیف کر کے اُنکے گھر آؤں۔

حال آنکہ جمیلہ کا پیارا خط کچھ اور ہی کہہ رہا ہے؛ "میرے سامنے جو تم مذہب کے متعلق واہی تباہی بکا کرتے ہو، خبردار، ابا جان کے سامنے وہ فضول بکواس مت کرنا، تم جانتے ہو ابا جان مذہب کے معاملے میں پکّے متعصب اور اٹل اعتقاد رکھنے والے ہیں۔ جس بیماری کا انہوں نے ذکر کیا ہے، وہ معمولی بیماری ہے اُسکی مُصیبت تو ہم ایک مہینے سے جھیل رہے ہیں یہ تو اک بہانہ ہے کہ تمہیں دیکھ کے، تم سے جرح کر کے تمہارے متعلق رائے قائم کیجائے کہ تمہیں داماد ی میں لیں یا نہ لیں، تمہارے رقیب کا، میں نے تم سے اُس دن ذکر کیا تھا۔ آبا جان کا اُسکے نام بھی خط گیا ہے۔ وہ بھی آئیگا۔ مگر اُس آدمی کو جس نے اپنی سی سالہ زندگی سختی میں، اور اپنی جوانی، تمہاری طرح پیرس و لندن

جیسے دیارِ عشرت میں نہیں، بلکہ یہاں ریاضت و عبادت میں گذاری ہے، جانتے ہو، میں نے کیا خبر بھجوائی ہے؟ ابا جان کے سامنے خوب تیار ہو کے آئیں، ابا جان اگرچہ مولوی ہیں مگر مغربیت و نئی روشنی کی بڑی قدر کرتے ہیں اُن سے باتیں کریں تو ٹھونس ٹھونس کے، جا و بیجا انگریزی فقروں اور لفظوں کا استعمال کریں۔ اگر مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو اُس کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ اِس مُلاقات میں حتی الامکان فیشن ایبل اور آزاد خیال بنیں۔

وفا شعار، مہربان و نوازش کار، جمیلہ کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں، اس خط کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میری اور اُس کی خوب گذریگی۔

آج بازار جا کر اک ریشمی ڈورے اور ریشمی پھُندنے کی نہایت خوبصورت تسبیح خرید کر لاؤنگا۔

۵ رجولائی، شام

میں شیخ امر اللہ سے ملاقات کر کے ابھی آیا ہوں، اپنے پیارے، قابلِ عزت خُسر سے مجھے شرف نیاز حاصل ہُوا۔ بڑی دیر تک لطف و عنایت فرمائی۔ ہنس مُکھ چہرے سے میرا استقبال کیا مریضہ کے کمرے میں مجھے خود لے گئے۔

مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد، ہم دونوں کمرے سے باہر آئے تو مجھ میں اور شیخ صاحب میں یہ گفتگو ہوئی:

"عزیز من، کہو مریضہ کی کیا کیفیت ہے"

"شکر ہے خدا کا، شکر ہے"

"بالکل نا اُمیدی تو نہیں، کیوں؟"

"(سر جھکا کر) اللہ بہتر جانتا ہے، اِنسان کچھ نہیں کہہ سکتا"

"تو کیا وہ مسافرِ دارِ آخرت ہے، آپکا یہ مطلب ہے؟"

"لا واللہ ـ مع ذالک المقدر لا یتغیر۔"

"قطعی یاس تو نہیں؟"

"انشاء اللہ الرحمٰن"

شیخ صاحب نے اور بہت سے سوالات مجھ سے کئے، یعنی جمیلہ نے جیسا لکھا تھا انہوں نے طرح طرح سے میری تحقیقات کی، ایک گھنٹے سے زیادہ میں زیر جرح رہا۔ اسکے بعد میں نے نسخہ لکھا، اور دوا کے متعلق ہدایتیں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دن جو شیخ صاحب کی خدمت میں گذرا، وہ میری زندگی کے خوش تریں، پُرنشہ تریں دنوں میں سے تھا، میرے خسر، بلا شک و شُبہ، بالکل لڈو پیڑا ہیں +

۸ر جولائی

میں کل پھر مریضہ کو دیکھنے گیا تھا، بیچاری بُڑھیا کچھ ہوش میں تھی باتیں بھی کرتی تھی، کچھ مُسکرائی بھی۔ شیخ امراللہ کی باچھیں خوشی سے کھلی جاتی تھیں مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"عزیز من! عزیز من! محض تمہاری کوشش سے اسکی حالت سنبھلی" میں نے فوراً بطور رد کے جواب دیا۔

آپ کیا فرماتے ہیں، توبہ کیجئے، توبہ کیجئے، ھذا من فضل ربی لطفِ الٰہی، لُطف ربّانی،،

شیخ صاحب نے میرے معروضہ کی تصدیق فرمائی، مُسکرائے اور نظر سامنے کو گاڑ دی۔ واپسی میں جمیلہ سے میری باتیں ہُوئیں، صاف دل اور بھولے رقیب کو، جو دو دن قبل ذلت نصیب ہُوئی جمیلہ نے اِس کا حال سُنایا۔ اُسکے عجیب اطوار اس کی لایعنی انگریزی سے گڈ مڈ گفتار نے شیخ صاحب کو اس قدر مغلوبِ غضب کر دیا تھا کہ انہوں نے اُسے اپنے سامنے سے نکال دیا تھا۔

۱۲ر جولائی۔ شب۔

آج رات، میں دیر سے گھر لوٹا، تو جمیلہ کا ایک خط مجھے ملا میں نے دھڑکتے دل سے اُسے کھولا اور اور پڑھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ میں نے خط دوبارہ پڑھا۔ تو یہ صحیح تھا کہ جمیلہ اب میری تھی؟ شیخ امراللہ نے اس کا فیصلہ کر لیا تھا اور بیوی کو بھی اطلاع دیدی تھی۔

پیاری جمیلہ کا خط جو ایسی بڑی بشارت میرے لئے لایا، میری کامیابی کے راز کو اِس طرح بیان کر رہا ہے۔

میں اپنے مُنہ پر ہاتھ رکھے کہ کہیں آواز نہ نکل جائے، کواڑ کی درز میں کان لگائے سُن رہی تھی، آبا جان بڑی بی سے تمہارے متعلق یہ کہہ رہے تھے "حاذق ڈاکٹر ہے، اور پھر الحمدللہ پکا، سچا مُسلمان، وہ دوسرا تو بے دین ملحد ہے۔ اور یہ اُس کی طرح دو ٹوک بات نہیں کہدیتا، اُمید ہے، بڑی بی، اُمید ہے جب تک سانس ہے تب تک آس ہے،،

(ماخوذ)

سید سجاد حیدر

اِنسان کی بیٹی

وہ کالی گھٹا نہیں ہے۔ مگر ابرِ رحمت کی طرح خانگی زندگی کے کھیت میں برستی ہے۔
وہ گرنے والی بجلی نہیں ہے۔ مگر حیاتِ کائنات کے ہر تار میں اسکی چمک موجود ہے۔
وہ گرجنے والا بادل نہیں ہے۔ مگر اس کی ہستی افکارِ زیست کو گرج گرج کر دُور کرتی ہے۔
نسیمِ سحر اسی کے لئے چمن میں آتی ہے۔ پھُول اسی کی خاطر شبنم سے مُنہ دھوتے اور مُسکراتے ہیں۔ دریا اُسی کی تلاش میں رات دن بہتے چلے جاتے ہیں۔ کنارہ اسی کے انتظار میں خاکی بیڑی پہنے کھڑا رہتا ہے۔
اِس کا نام عورت ہے، وہ اِنسان کی ماں ہے، اِنسان کی بہن ہے انسان کی بیوی ہے اور اِنسان کی بیٹی ہے۔
جب وہ ماں ہے تو اسکے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اور انسان کی سرپرستی اس سے زیادہ دُنیا میں کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ اور جب وہ بہن ہے تو بھائی کی شمع پر پروانہ ہے۔ اور جب بیوی ہے تو شوہر کے جسم کی روح اور اپنے جسم کی صرف آنکھ اور اپنے دل کی محض تمنّا ہے۔
مگر جب وہ بیٹی ہے تو بس وہی سب کچھ ہے۔ وہ باپ کی ہے۔ وہ ماں کی ہے۔ اور وہ سب کی ہے۔ اور سب ہی اسکے ہیں۔ محبت اسی کے لئے دُنیا میں پیدا کیجاتی ہے۔ مامتا اسی کی خاطر دُنیا میں نمودار ہوتی ہے، زندگی اگر کوئی چیز ہوتی ہے تو بس انسان کی بیٹی ہی کو وہ ملتی ہے، بیٹا کہتا ہے میں انسان کا وارث ہوں، بیٹی کہتی ہے میں اِنسان کی لاڈلی اور پیاری ہوں۔ اِنسان کہتا ہے میں بھول میں ہوں جو بیٹے کی چاہت کرتا ہوں۔ دِل دینے اور صدقے قربان ہونے کے قابل تو بیٹی ہے۔
اِنسان کی بیٹی۔ ہندوستان میں عجیب رسموں کے ستم سہتی ہے۔ کچھ بھی ہو جب وہ دُنیا میں ہے تو بیٹا اسکے حق کی برابری نہیں کرسکتا۔ رسمیں ختم ہوجائینگی ظلم وستم مٹ جائینگے۔ اور ایک دن بیٹی ہی کا راج ہوگا۔ مگر دیکھو تو اِنسان کی بیٹی کو۔ راج ملنے کے بعد بھی اسکو گھمنڈ نہ ہوگا۔ غرور نہ ہوگا۔ خود پسندی خودسری نہ ہوگی۔ وہ بھائی پر۔ باپ پر۔ ماں پر۔ اور ہر انسان پر مہربانیاں کریگی۔ کیونکہ قدرت نے اسکو کچھ بنایا ہی ایسا ہے +

حسن نظامی

کوہسارِ شملہ

ہمالیہ پہاڑ کی بلندیوں کے سلسلے　　نپولین کے حوصلے پہاڑیوں کے سلسلے
پہاڑ پر پہاڑ ہیں زمین سے لے کے تا فلک　　یہ سیڑھیوں کا سلسلہ ہے بامِ آسماں تلک

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے

پہاڑ کی بلند، آسماں وقار چوٹیاں　　ہیں صُنعِ صانعِ ازل کی شاہ کار چوٹیاں
فلک سے ہمسری کے ولولے تھے، تھم گئے ہیں کیا؟　　زمین کے حوصلے بلند ہو کے جم گئے ہیں کیا؟

یہ سین تیرا اے پہاڑ کس قدر حسین ہے

یہ کون جلوہ گر ہے اے پہاڑ تیری دھوپ میں　　ہے کس کا حسن جلوہ ریز اس سُنہری رُوپ میں
چمک رہا ہے گوشہ گوشہ جس سے شش جہات کا　　دمک رہا ہے ذرہ ذرہ تیری کائنات کا

یہ سین تیرا اے پہاڑ کس قدر حسین ہے

ہے کتنا دل گُداز سین غم فشارِ شام کا　　ہے چہرہ کس قدر حسیں افق نگارِ شام کا
افق نگارِ شام کیا شفق سے لالہ فام ہے　　شفق سے لالہ فام شام دلفروز شام ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے

حسینۂ فلک کی کیا یہ قوسِ ہفت رنگ ہے　　کہ اسکے رنگ دیکھ کر ہر اک کی عقل دنگ ہے
یہ سین یہ حسین سین اک بلائے ہوش ہے　　دھنک کمان کا نظارہ بیخودی فروش ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے

پہاڑیوں کے گیت سے ہیں وجد میں پہاڑیاں　　درخت مست بے طرح ہیں جھومتی ہیں جھاڑیاں
فضا میں نشہ تیرتا ہے جس سے رات مست ہے　　میں مست ہوں کہ آج رات کائنات مست ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے

حسین فطرة اس چمن میں بے نقاب ہو گئی　　یہ بے نقاب ہو گئی کہ لاجواب ہو گئی
نقابِ رُخ اُٹھا دیا دلوں پہ قہر ڈھا دیا　　خدا پرست مولوی کو نیچری بنا دیا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے

تاجور

انگشتری

ممکن تھا کہ اختر اپنی طبعی اولوالعزمی اور فہم و فراست کی وجہ سے حکیمانہ تحقیق و تدقیق کرنے والوں کی صفِ اوّل میں پہنچ جاتا، لیکن وہ اپنی متلون المزاجی کی وجہ سے ایک ہمہ گیر شہرت طلبی کے مرض میں مبتلا تھا۔ اور علم و فن کے کسی ایک شعبے میں کمال بہم پہنچانے کی بجائے وہ ہر شعبے میں امتیاز حاصل کرنیکی فکر میں لگا رہتا تھا۔ ابتدا میں اس نے علم حیوانات و نباتات کی طرف غیر معمولی رجحان ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ اس کے دوست اسے ایک دوسرا ڈارون سمجھنے لگے لیکن جب اعترافِ قابلیت کی وجہ سے اسے ایک یونیورسٹی میں پروفیسری ملنے ہی والی تھی، اس نے دفعتہً ان مضامین کا مطالعہ ترک کر کے علم کیمیا سے رشتہ جوڑ لیا اور اسکے متعلق اپنی تحقیقات سے بعض نئی نئی باتیں دریافت کیں جس کے باعث اُسے ایک بہت بڑی علمی انجمن کی رُکنیت بھی حاصل ہو گئی لیکن آخر اُس نے علم کیمیا سے بھی بے وفائی کی، اور تجربہ خانے سے ایک سال کی غیر حاضری کے بعد وہ انگلستان جا نکلا اور وہاں کی "مجلسِ مشرقیہ" کا رکن بن گیا، جہاں اس نے "الکعب" پر قدیم مصری زبان کے کتبوں کے متعلق ایک مضمون پڑھ کر اپنی مصر دفیتوں کی بے ربطی اور بوقلمونی کا سب سے بڑا اشتہار دیا۔

لیکن ہرجائی بھی کبھی نہ کبھی قابو میں آ ہی جاتے ہیں، اور اختر کی بھی آخر یہی کیفیت ہوئی۔ مصریات" کے مطالعہ میں اس نے جس قدر کد و کاوش سے کام لیا، اس کے لئے تحقیقات کا ایک وسیع میدان پھیلتا چلا گیا جس کی عظمتِ شان سے ہر دوسرے محقق کی طرح وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ مضمون جس سے تہذیبِ انسانی کے اولیں عناصر اور تمام موجودہ علوم و فنون کے سرچشموں کا سراغ نکلنے کی اُمید تھی، کس قدر اہم تھا۔ اختر ان باتوں سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اس نے فوراً لندن کی ایک نوجوان خاتون سے جو "مصریات" کی ماہر تھی، شادی کر لی۔ اپنے علمی مشاغل کے لئے یوں راستہ نکال کر اب اس نے ایک کتاب کے لئے معلومات کا ذخیرہ فراہم کرنا شروع کیا۔ جس کے محققانہ اور پُر حکمت طرزِ بیان کے عدیم النظیر ہونے کے متعلق اسے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ اس "شاہکار" کی تکمیل کے لئے وہ متعدد دفعہ لُوور[1] پہنچا، جہاں مصر کے آثارِ قدیمہ کا ایک نایاب مجموعہ موجود ہے۔ لیکن گزشتہ اکتوبر کے وسط میں جب وہ آخری مرتبہ وہاں گیا اسے ایک اہم اور عجیب و...

---

[1] پیرس کا بڑا عجائب خانہ۔

واقعے سے سابقہ پڑا۔

ٹرین سُست رفتار تھی، اور سمندر بھی کچھ طوفان خیز تھا۔ اس لئے ہمارا محقق بہت خستہ و ماندہ ہوکر پیرس پہنچا۔ ہوٹل میں دو گھنٹے تک وہ ایک صوفے پر بیٹا رہا، لیکن چونکہ اسے نیند نہ آسکی، اس نے دریافت طلب امور کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے اسی وقت لُوور جانے اور شام کی گاڑی سے واپس ڈی اپ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ مطلع ابر آلود تھا، اور کبھی کبھی تقاطر بھی ہوجاتا تھا، اس نے اپنا بڑا کوٹ پہن لیا، اور روانہ ہوگیا، لُوور میں داخل ہوتے ہی گویا وہ اپنے گھر میں پہنچ جاتا تھا۔ اُس کو اسکے چپہ چپہ سے واقفیت تھی چنانچہ وہاں پہنچتے ہی اُس نے سیدھا اُن کمروں کا رُخ کیا جن میں قدیم مصری تحریروں کا مجموعہ تھا۔ کیوں کہ یہیں سے اُسے اپنے لئے معلومات بہم پہنچانی تھیں +

اختر کے بڑے سے بڑے مداح کی نظر میں بھی اس کی شکل و صورت قابل تعریف نہ ہوسکتی تھی، اس کی لمبی نوکیلی منقار نما ناک اور اس کی ضرورت سے زیادہ اُبھری ہوئی ٹھوڑی میں وہی چبھتی ہوئی تیزی نظر آتی تھی، جو اس کی فہم و فراست کا طغرائے امتیاز تھی۔ وہ اپنے سر کو کچھ پرندوں کے سے انداز میں رکھتا تھا، اور گفتگو کے دوران میں دوسروں کی تردید و تغلیط کے لئے دلائل و براہین پیش کرتے وقت اُس کی ٹھونگنے کی سی حرکتیں بھی بالکل پرندوں ہی کی طرح ہوتی تھیں۔ جس وقت وہ اپنے بڑے کوٹ کا کالر اپنے کانوں تک اُٹھائے ہُوئے کھڑا تھا، سامنے کی الماری کے شیشوں میں سے وہ یہ دیکھ سکتا تھا، کہ اس وقت اس کی وضع و قطع نادرِ روزگار تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے ایک ناگہانی صدمہ ہُوا۔ جب اس نے اپنے پیچھے کسی انگریز کو یہ کہتے ہُوئے سُنا۔ "دیکھنا کس انوکھی وضع و قطع کا انسان ہے"

ہمارا محقق بہت زیادہ خود پسند واقع ہُوا تھا، اور اپنی ذات کے متعلق اس قسم کی باتوں کا اس نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے تلخ جذبات پر قابو پانے کے لئے اپنے لب ایک دوسرے سے زیادہ پیوست کئے اور بے اعتنائی ظاہر کرنے کے لئے اپنے سامنے کے قدیم مصری کتبوں پر نظریں گاڑ کر دیکھنے لگا لیکن اُس وقت اُس کے دل کے اندر برطانی سیاحوں کی ایک پُشت کی پُشت کے خلاف نہایت زہریلے جذبات موجزن ہو رہے تھے۔

اتنے میں ایک دوسری آواز آئی "تم نے سچ کہا یہ شخص واقعی ایک اعجوبہ ہے"

ک ساحلی مقام۔

اس کے بعد پھر پہلی آواز آئی "تم نے یہ بھی خیال کیا کہ ہروقت ممیوں کے متعلق غور و فکر کرتے رہنے سے یہ حضرت خود بھی اب قریب قریب ایک ممی ہی معلوم ہوتے ہیں"

دوسرے شخص نے جواب دیا "واقعی اس کا بشرہ مصریوں ہی کا سا ہے!"

اختر دفعتہً پیچھے کو مڑا۔ تاکہ تہذیب انسانی کے ان علمبرداروں کو ایک آدھ جلی کٹی سنا کر ذرا شرم دلائے لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب اور ساتھ ہی اطمینان بھی ہوا کہ اس کی طرف ان دونوں کی پشت تھی۔ اور ان کی نگاہیں لوور کے ایک ملازم پر جمی ہوئی تھیں جو کمرہ کے دوسرے کونے میں پیتل کی کچھ چیزیں صاف کر رہا تھا۔

ایک سیاح نے اپنی گھڑی دیکھ کر دوسرے سے کہا کہ چلئے رائل میں کارٹر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں چلے گئے اور اختر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

دفعتہً اس کے دل میں خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی وہ بیہودہ گو کس چیز کو مصریوں کا سا بشرہ کہہ رہے تھے؟ چنانچہ اپنی جگہ سے ذرا سرک کر اس نے اس شخص پر نگاہ ڈالی، اور فرط تحیر سے چونک پڑا۔ کیونکہ جن قدیم مصری چہروں سے وہ اپنی علمی تحقیقات کے دوران میں آشنا ہو چکا تھا، ایک ویسا ہی چہرہ اس کی نظر کے سامنے تھا، اس کے مجسمہ کے سے خد و خال، اس کی کشادہ پیشانی اس کی گول گول ٹھوڑی اور اس کے چہرہ کے خاک آلودہ سے رنگ و روغن میں انہیں مجسموں ممیوں اور تصویروں کی جھلک نظر آتی تھی، جن سے وہ کمرہ بھرا پڑا تھا۔ اسکو دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ یہ شخص ضرور مصری ہے۔ اختر اس سے مخاطب ہونے کے لئے اس کی طرف بڑھا لیکن قریب سے اس کا چہرہ دیکھ کر اس کو کچھ اس قسم کا احساس ہوا کہ اس کی شباہت میں کوئی خرق عادت اور غیر انسانی سی بات ہے۔ اس کی کنپٹی پر اور گال کی ہڈی کے اوپر اس قسم کی چکناہٹ اور چمک تھی، جیسی روغن کئے ہوئے کاغذ پر ہوتی ہے۔ مساموں کا کہیں نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ اس کے چہرہ کی خشک سطح پر رطوبت نام کو نہ تھی لیکن اس کی پیشانی سے لے کر ٹھوڑی تک ہزاروں خفیف خفیف اور نازک سی جھریاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ایک جال سا بنائے ہوئے نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے ایک بے پروائی کی حالت میں بے ربطی بے قاعدگی اور ژولیدگی کا مکمل ترین نمونہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

اختر نے اس شخص کی طرح جو محض گفتگو کا سلسلہ چھیڑنے کے لئے کوئی بیہودہ سا سوال وضع کرنے کی کوشش کرے کہا "ممفس کا مجموعۂ غرائب کہاں ہے"؟ Ou est la collection de Memp

خدمتگار نے اکھڑ پن سے ایک طرف اشارہ کر کے جواب دیا "ادھر ہے" اور ساتھ ہی رخ اسکی طرف

کئے بغیر اپنے سر کو ایک اثباتی جنبش دی۔ پھر اس نے سوال کیا "تم مصری ہو نا؟"
خدمتگار نے اپنی سیاہ اور عجیب غریب آنکھیں سوال کنندہ کی طرف اُٹھائیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیشے کی بنی ہوئی ہیں دُھندلے پن اور بھوست کے ساتھ ان میں ایک ایسی چمک بھی پائی جاتی تھی، جو اختر نے آج تک کہیں کسی انسانی آنکھ میں نہ دیکھی تھی۔ جب اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اسے انکی گہرائیوں میں کوئی پُرجوش جذبہ پیدا ہوتا نظر آیا۔ آخر اُس نے اختر پر ایک ایسی نظر ڈالی جس میں خوف اور نفرت کا احساس باہم ملا ہُوا تھا۔

پھر اس نے فرانسیسی زبان میں یہ کہہ کر کہ "نہیں جناب میں فرانسیسی ہوں"

"Non monsieur, je suis français"

یکایک نہایت بے ڈھنگے طور سے اپنا رُخ دُوسری طرف پھیر لیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

اختر کچھ دیر تک اس کے چہرہ پر اپنی تحیّر آمیز نگاہ ڈالے کھڑا رہا اور پھر کمرہ کے ایک علیحدہ گوشہ میں دروازہ کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی کتاب کے متعلق تحقیق شدہ امور کو بطور یادداشت قلمبند کرنے کے لئے بیٹھ گیا، لیکن اسکے خیالات میں ایک انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ اسے بار بار وہ پُراسرار خدمتگار، اسکا ابوالہول جیسا چہرہ، اور اس کے چہرہ کا غیر انسانی رنگ و روغن یاد آتا تھا۔

اختر دل میں سوچتا تھا کہ میں نے پہلے ایسی آنکھیں کہاں دیکھی ہیں اس نے علم حیوانات کے مطالعہ کی یاد تازہ کرکے اس کی آنکھوں کو کئی قسم کے کیڑوں مکوڑوں، سانپوں اور اژدہوں کی آنکھوں سے تشبیہ دی۔ وہ دل میں کہتا تھا کہ اُن میں کیسی چمک تھی اور میرا خیال ہے کہ اسکے ساتھ ہی اُن میں تدبر و دانش کی بھی جھلک نظر آتی تھی۔ اور پھر وہ کوفت اور تکان وہ انتہا درجہ کی کوفت اور تکان اور حسرت و یاس جو اسکی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی طبیعت پر کس قدر گہرا اثر ڈالتی ہے؟ ممکن ہے کہ یہ میرے تصوّر کا وہم ہو لیکن کسی بات کا اتنا گہرا اثر آجتک مجھ پر نہ ہُوا تھا۔ وہ یہ کہہ کر کہ "واللہ میں ایک دفعہ پھر ضرور وہ آنکھیں دیکھوں گا" اپنی جگہ سے اُٹھا۔ لیکن وہ شخص جو اس کے لئے سامانِ حیرت بن رہا تھا، غائب ہوچکا تھا۔ چنانچہ اختر پھر اپنی جگہ پر واپس آکر اپنی جدید معلومات کو قلمبند کرنے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر تک اس کا قلم تیزی سے کاغذ پر گردش کرتا رہا، لیکن رفتہ رفتہ سطور زیر و زبر ہونے لگیں، الفاظ دھندلے ہوتے چلے گئے، پھر قلم کے زمین پر گر پڑنے کی آواز آئی، اور آخرکار ہمارے محقق کا سر نیند کے بوجھ سے چھاتی کی طرف جھکنے لگا۔

اس کو سفر کی تکان کی وجہ سے اس قدر گہری نیند آئی کہ وہ عجائب خانے کے اس الگ تھلگ گوشے میں بالکل بیہوش پڑا رہا۔ ملازموں کے ادھر اُدھر چلنے پھرنے کی آواز دروازے بند کرنے کا شور یہاں تک کہ اس بڑے گھنٹہ کی تیز ٹننٹن ٹن بھی جو عجائب خانہ بند کرنے سے پہلے بجایا جاتا ہے اسے ہوش میں نہ لا سکی۔

ساعتیں گزرتی رہیں، اور وہ بے خبر پڑا رہا۔ آخر رات کا ایک بج گیا۔ اس وقت اختر نے ایک تیز اور گہری سانس لی جس کے ساتھ ہی دفعتہً اس کی آنکھ کھل گئی۔

پہلے اُسے یہ خیال آیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے لیکن پھر جلد ہی اسے عجائب خانے کا خیال آ گیا چاند کی روشنی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی دیواروں کے ساتھ ساتھ ممیاں قطار در قطار کھڑی نظر آتی تھیں۔ لیکن اختر کمزور دل کا آدمی نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس نئی حالت میں دیکھ کر بہت لُطف اُٹھا رہا تھا۔ اسے اس بات سے کچھ بھی حیرت نہ ہوئی، کہ عجائب خانے کے محافظوں نے اسے کیوں نظر انداز کر دیا؟ کیوں کہ دروازے کا گہرا سیاہ سایہ عین اسکے اُوپر پڑ رہا تھا۔

ہر طرف یکسر خاموشی کا عالم طاری تھا۔ اندر اور باہر کسی پتے کے کھڑکنے تک کی آواز نہیں آتی تھی اور وہ ایک صدیوں کی پرانی تہذیب اور ایک صدیوں کی مُردہ قوم میں بالکل تنہا تھا۔

اگر اُن کمروں سے باہر انیسویں صدی کی زرق برق تہذیب کا دَور دَورہ تھا، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اِن دیواروں کے اندر تو گیہوں کے مرجھائے ہوئے بالوں سے لے کر مصوّر کے رنگوں کے ڈبے تک کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس نے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں چار ہزار سال کے عظیم الشان زمانے کا مقابلہ نہ کیا ہو۔ اختر نے اپنے اردگرد ایک نظر دوڑائی ہر طرف میوں کی قطاریں تھیں۔ قدیم زمانے کے محنت کش مزدور اب کس قدر آرام اور چین میں تھے۔ آنکھوں کے سامنے ایک اس قدر پرانی تہذیب کا ساز و سامان اور یادگاریں دیکھ کر اختر کو اپنی کم عُمری اور نوجوانی کا خیال آیا اور اسے اپنی ہستی بالکل ہیچ معلوم ہونے لگی۔

پھر اس نے اپنی کرسی پر سے جُھک کر کمروں کے اس تمام طویل سلسلہ پر ایک خواب آلودسی نظر دوڑائی تمام کمرے چاندنی سے بُقعۂ نور بنے ہوئے تھے، لیکن دُور اسے کسی چراغ کی زرد شعاعیں دکھائی دیں روشنی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتی آ رہی تھی اختر کو فوراً خیال آیا کہ ضرور یہ کوئی نقب زن ہے۔

اس شخص کا باقی جسم سایہ نے چھپا رکھا تھا لیکن اس کا چہرہ چراغ کی روشنی سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آخر صرف ایک کمرے کا فاصلہ باقی رہ گیا۔ اختر نے کچھ خوف سے اس چہرہ پر جو ہوا میں معلق نظر آتا تھا۔ نظر ڈالی اور اسے وہی چمکیلی شیشہ کی سی آنکھیں اور وہی مُردار کا سا چہرہ نظر آیا جس سے وہ خوب واقف ہو چکا تھا۔ یہ عجائب خانہ کا وہی ملازم تھا جس سے دن کے وقت اس کی باتیں ہوئی تھیں ۔

اختر کا خیال تھا کہ اُس کو اپنے متعلق حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے دروازہ کھلوا کر اپنے ہوٹل کو چلا جائے لیکن جب اسے اس شخص کی حرکات و سکنات کچھ مجرمانہ سی نظر آئیں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا تھا، اور ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ صاف ظاہر تھا۔ کہ اس وقت اس کی یہ آمد فرائض ملازمت سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ اختر کمرہ کے کونے میں باہر کو اور زیادہ سرک گیا اور اس کی حرکات کو نہایت دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور کوئی پُراسرار اور غالباً مجرمانہ کام کیا چاہتا ہے ۔

خدمتگار کی روش میں کسی قسم کی جھجک نہ تھی وہ نہایت چُستی اور ہوشیاری کے ساتھ ایک بڑی سی الماری کے پاس پہنچا اور اپنی جیب میں سے چابی نکال کر اسے کھولا اور اس میں سے ایک ممی نکالی جسے اُٹھا کر وہ ذرا فاصلہ پر لے گیا وہاں اس نے اسے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ لیکن ایک پُر اضطراب طریقے سے زمین پر ڈال دیا۔ اس کے پاس ہی اس نے اپنا چراغ رکھا اور خود بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کی وہ پٹیاں کھولنے لگا، جن میں ممی لپٹی ہوئی تھی جوں جوں پٹیاں کھلتی جاتی تھیں، کمرہ میں ایک خاص قسم کی خوشبو پھیلتی گئی۔ اور خوشبودار لکڑی کے ٹکڑے اور مختلف قسم کا مسالہ کمرے کے فرش پر گرنے لگا ۔

اختر یہ سب کچھ نہایت تعجب اور دلچسپی سے دیکھتا رہا اور اس کا پرندہ نما سر دروازے سے برابر آگے آگے کو جھکتا گیا، لیکن جب چار ہزار سال کے پرانے سر سے آخری پٹی اتاری گئی اس وقت وہ صدائے تحیّر بلند کرنے سے بمشکل باز رہا۔ سب سے پہلے ممی کے سیاہ لمبے اور چمکیلے گیسو نکلے، اور کھُل کر خدمتگار کے بازوؤں پر پریشاں ہو گئے۔ دوسری پٹی کھلنے پر اس کی گوری اور خوبصورت پیشانی اور اس کے دو نفیس اور نازک ابرو نظر آئے۔ اس کے بعد اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں اس کی خوش وضع ناک اور اس کے نازک لب دکھائی دئے۔ تمام چہرہ پر بحیثیتِ مجموعی ایک حیرت انگیز حسن و جمال برستا تھا۔ صرف پیشانی کے درمیان ایک داغ سا نظر آرہا تھا۔ یہ ممی مسالہ لگانے والے کی صنعت گری کا ایک نہایت کامیاب

نمونہ تھی۔ اس کو دیکھ کر اختر کی آنکھیں فرطِ تحیّر سے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں اور وہ منہ ہی منہ میں اطمینان سے "چیچہایا"۔
ممی کو دیکھ کر پُراسرار خدمتگار کی کچھ عجیب حالت ہوگئی۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپر کو اُٹھا کر مُنہ میں کسی نامعلوم زبان کے کچھ الفاظ کہے پھر زمین پر گر کر ممی کو اپنی آغوش میں لے لیا، اور پے بہ پے اس کے بالوں کو اس کے لب و عارض کو اور اس کے تمام چہرہ کو چُومنے لگا۔ پھر اس نے فرانسیسی زبان میں یہ الفاظ کہے۔
(ma petite, ma pauvre petite) میری پیاری! میری بدنصیب دربا!
جذبات کے ہیجان کی وجہ سے اُس کی آواز اُکھڑی اُکھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور الفاظ اس کے منہ سے نہ نکلتے تھے۔ کچھ دیر تک اس کی یہی کیفیت رہی اس کے بعد دفعتہً اس کے چہرہ پر تبسّم نمودار ہوا، اور وہ کسی عجیب و غریب زبان میں کچھ الفاظ کہہ کر یکایک اس طرح اُٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی کسی بہت بڑے کام کے انجام دینے کا تہیّہ کر چکا ہو۔ اسی کمرہ کے وسط میں ایک بڑی الماری کھڑی تھی۔ جس میں جیسا کہ اختر کو معلوم تھا قدیم مصر کے جواہرات رکھے تھے۔ ان میں بہت سی انگشتریاں بھی تھیں۔ خدمتگار اس الماری کی طرف بڑھا، اُس نے اسے اپنی چابی سے کھول کر اس میں سے مُٹھی بھر انگشتریاں باہر نکالیں۔ چراغ اُسکے قریب پڑا تھا۔ پاس ہی ایک پیالہ رکھا تھا جس میں کوئی سیّال چیز تھی۔ خدمتگار ایک ایک انگشتری اس میں ڈال کر دیکھتا گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن مُٹھی بھر انگشتریوں میں ایک بھی اس کے کام کی نہیں، کیونکہ اس نے مایوسانہ انداز سے وہ تمام انگشتریاں پھر اُسی الماری میں پھینک دیں، اور پھر کچھ اور انگشتریاں نکالیں۔ ان میں ایک بہت بڑی انگشتری بھی تھی۔ جس میں ایک بڑا نگینہ جڑا تھا۔ اسے اُس نے بہت شوق سے اپنے ہاتھ میں لیا، اور پھر پیالہ میں ڈال کر دیکھا۔ اس پر بے اختیار اس نے ایک صدائے مسرت بلند کی، اور فرطِ انبساط سے اُچھل پڑا۔ اتفاقاً اس کا ہاتھ پیالہ پر جا پڑا جس سے پیالہ اُلٹ گیا، اور وہ سیّال چیز کمرے کے فرش پر بہتی ہوئی عین اختر کے قدموں میں چلی گئی خدمتگار نے فوراً اپنی جیب میں سے ایک سُرخ رومال نکالا جس سے فرش کو صاف کرتا ہوا وہ سیدھا اُسی کونے میں جا پہنچا جہاں اُس کا تماشائی کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔
اختر نے انتہائی خلق سے کام لیکر کہا، "معاف کیجئے میں بدقسمتی سے اس کمرے کے پیچھے سو گیا تھا"
خدمتگار کا لاش نما چہرہ غضب آلود ہو گیا پھر اس نے کہا اچھا تم مجھے دیکھتے رہے ہو؟
اختر نے اقرار کیا کہ "ہاں میں نے واقعی آپ کی حرکات و سکنات کو نہایت تعجب اور حیرت کے ساتھ دیکھا ہے"

خدمتگار نے ایک لمبا اور تیز خنجر نکال کر کہا کہ "اگرچند لمحے قبل تم پر میری نظر پڑ جاتی تو تم اب تک ایک ابدی نیند سو چکے ہوتے اور اب بھی اگر تم نے ذرا جنبش کی یا تم میری کسی بات میں خلل انداز ہوئے تو یہ خنجر تمہارے سینے کے پار ہوگا"

اختر نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ اس وقت یہاں میری موجودگی بالکل اتفاقی ہے، اور یقین جانئے مجھے آپ کے کام سے کوئی سرو کار نہیں ۔

خدمتگار اب تک اپنی ہتھیلی پر اپنے خنجر کی نوک کی تیزی آزما رہا تھا۔ اختر نے پھر نہایت حلم اور فروتنی سے کہا "میری خواہش صرف اس قدر ہے، کہ آپ ازراہ نوازش کوئی دروازہ کھول کر مجھے یہاں سے باہر نکال دیں "

خدمتگار: "اگر میں یہ سمجھتا کہ . . . . خیر اب تو بات ہی گزر گئی . . . . اچھا تمہارا نام کیا ہے"؟

اختر نے اپنا نام بتایا۔

خدمتگار: "خوب! اختر! اچھا تم وہی اختر ہو، جس نے لندن میں الکعب کے متعلق ایک مضمون پڑھا تھا۔ میں نے اخبارات میں اس کی روئداد دیکھی تھی۔ اس موضوع کے متعلق تمہاری معلومات نہایت حقیر ہیں"

اختر: (تعجب سے چونک کر) جناب، آپ نے کیا فرمایا"؟

خدمتگار: (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے)۔ لیکن خیر اکثر ایسے لوگوں سے جن کو تم سے کچھ زیادہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے، تمہاری معلومات پھر بھی غنیمت ہیں۔ مصر میں ہماری قدیم زندگی کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ وہ یادگاریں اور وہ کتبے ہی نہیں ہیں، جن کے متعلق تم لوگ اس قدر شور مچاتے ہو، بلکہ اصلی چیز ہمارے پراسرار علوم اور ہمارا پُراسرار فلسفہ ہے، جس کے متعلق تم لوگ ایک حرف بھی نہیں کہتے"

"ہماری قدیم زندگی" اختر اپنے دل میں یہ الفاظ تعجب سے دُہرا رہا تھا۔ پھر یک بیک چلا اُٹھا، "ہائیں یہ ممی کی صورت کو کیا ہو گیا"؟

ممی کا چہرہ ہوا کے اثر سے سیاہ ہو گیا تھا، گال بیچ کو پچک گئے تھے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں البتہ پیشانی کا وہ داغ اب بھی نظر آ رہا تھا۔

خدمتگار پر پہلے کچھ رنج و غم طاری ہوا لیکن اس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "خیر کوئی مضائقہ نہیں بس آج اپنی جستجو میں کامیاب ہو چکا ہوں اُس پرانی لعنت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، اور اب میں جلد ہی اس سے جا ملونگا اس خاکی جسم کا کیا ہے، جب اُس کی رُوح دُنیا کے اُس پار میرے انتظار میں ہے"

اختر کو یقین ہو گیا، کہ آج اسے کسی دیوانے شخص سے سابقہ پڑا ہے۔ پھر خدمتگار نے اس سے کہا "آؤ

تمہیں تو باہر نکالدوں، یہ سن کر اختر اُسکے پیچھے ہو لیا مختلف کمروں میں سے گزرتے ہوئے آخر وہ اس دروازہ کے پاس پہنچے، جو باہر کوچہ میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا حجرہ تھا خدمتگار اس میں داخل ہُوا، اور اس نے اختر کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا اختر پہلے تو کچھ جھجکا لیکن پھر تجسس اور تحقیق کا شوق بھی عناں گیر تھا آخر اندر داخل ہو ہی گیا، خدمتگار نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور خود بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ نہایت اچھی انگریزی بولتا تھا۔ اُس نے نہایت دلجمعی سے کہا "مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس بلند پرواز فانی ہستی کے لئے جسے انسان کہتے ہیں اور جسے قدرت کے اٹل قوانین کی خلاف ورزی کا شوق ہر وقت دامنگیر رہتا ہے تنبیہ کے طور پر کوئی بیان چھوڑ جاؤں"۔

"جیسا کہ تمہیں خیال ہُوا تھا میں واقعی مصری ہوں لیکن میں غلاموں کی اس ذلیل قوم میں سے نہیں۔ جو آجکل وادیٔ نیل میں آباد ہے بلکہ اس بہادر جفاکش اور ہنگامہ پرور قوم کی ایک یادگار ہوں، جس نے مشرق و مغرب کو زیر و زبر کر دیا تھا، اور جس کے عظیم الشان کام آئندہ قوموں کے لئے انتہائی تعجب اور رشک کا سرمایہ بنے ہوئے ہیں مسیح کی پیدائش سے سولہ سو سال قبل جبکہ مصر پر شہنشاہ ٹیوتھمس کی حکومت تھی، میں نے اول اول دنیا کی روشنی دیکھی۔ تم خوف سے پیچھے ہٹ گئے ہو، لیکن میری بات سنو، اور تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ میں موجب خوف نہیں بلکہ قابل رحم ہوں"۔

"میرا نام تاثرا تھا اور میرا باپ ایک بہت بڑے معبد میں پیشوا کے عہدہ پر مامور تھا۔ میری تعلیم و تربیت نہایت اچھے طریقہ سے ہُوئی، اور میں نے سولہ ہی سال کی عمر میں تمام وہ مذہبی معلومات بہم پہنچالیں جن پر کوئی بڑے سے بڑا مذہبی پیشوا ناز کر سکتا تھا اس کے بعد میں نے اپنے طور پر قدرت کے رموز و اسرار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور ان میں زندگی کا عقدہ مجھے سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہُوا۔ میں اپنے دل میں سوچتا تھا کہ جب دوا انسانی جسم کو بیماری سے محفوظ رکھ سکتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ کوئی ایسی چیز بھی موجود نہ ہو۔ جو ہمارے جسم کو موت کے مقابلہ کے لئے بھی تیار کر دے میں نے اس کے متعلق جو مختلف تجربے کئے اور مجھ پر جو جو انکشافات ہُوئے وہ تمہارے لئے سمجھنے بھی دشوار ہیں۔ یہ تجربے میں نے جانوروں پر غلاموں پر اور بعض خود اپنے آپ پر کئے۔ مختصر طور پر اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ آخر مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہو گئی جو اگر پچکاری کے ذریعہ سے خون میں داخل کی جاتی تو جسم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی کہ وہ نہ صرف امتداد زمانہ کا مقابلہ کر سکے، بلکہ سخت سے سخت حادثات اور بیماریوں کا بھی اس پر اثر نہ ہو اول اول میں نے ایک بلی پر اس کا تجربہ کیا اور وہ بلی ابتک

مصر میں زندہ موجود ہے اس میں کوئی جادو کا کھیل یا کوئی پُر اسرار شعبدہ نہ تھا بلکہ یہ محض ایک کیمیائی تحقیق تھی۔

سب سے پہلے میں نے اپنے خون میں یہ لعنت خیز دوا داخل کی اور چونکہ نوجوانوں کو زندگی سے بہت محبت ہوتی ہے مجھے انتہا درجہ کا اطمینان حاصل ہوگیا، کہ اب میری یہ زندگی کبھی فنا نہ ہوگی۔ اسکے بعد میں نے اپنے عزیز ترین دوست پارمیز سے اِس دوا کا ذکر کیا، اور اُس کی خواہش پر وہی عمل اس پر بھی کیا۔ اب مجھے اطمینان ہوگیا کہ میرے ساتھ ہمیشہ اپنا ایک ہم عمر اور ہم عصر رفیق زندہ رہیگا۔ اس طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق کو ایک عرصے کے لئے چھوڑ دیا، لیکن پارمیز اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ مصروف نظر آنے لگا۔ وہ اپنے تجربہ خانے میں ہر روز مختلف تجربے کرتا۔ لیکن اُنکے نتائج کے متعلق اس نے کبھی مجھ سے کوئی ذکر نہ کیا۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ میں بازاروں میں نہایت فخر و ناز سے چلتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہ تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں لیکن میں باقی رہوں گا۔ میرے علم و فضل کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی اور لوگ ہر طرف سے مجھے جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔

اُسی زمانہ میں شہنشاہ کی طرف سے ہمارے شہر کا ایک نیا حاکم مقرر ہوا۔ میں اس کی دوشیزہ بیٹی کے حسن و جمال کے بہت چرچے سُن چکا تھا۔ اور ایک دن جبکہ میں اپنے دوست پارمیز کے ساتھ بازار میں سے گزر رہا تھا میں نے اسے خود بھی دیکھ لیا۔ وہ اپنے غلاموں کے کندھوں پر سوار جا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایک برق سی گر گئی۔ میرا دل میرے پہلو سے نکل گیا میں چاہتا تھا کہ اس کے غلاموں کے پاؤں تلے روندا جاؤں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسی سے شادی کروں گا کیونکہ اسکے بغیر زندگی بسر کرنا محال ہے۔ میں نے اپنا یہ فیصلہ پارمیز پر بھی ظاہر کر دیا۔ یہ سُن کر اس کے ماتھے پر آدھی رات کی سی سیاہی نمودار ہوئی اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"زیادہ تفصیل بے سود ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دن مجھے اظہار اُلفت کا موقع مل گیا رفتہ رفتہ اسے بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہوگئی جتنی مجھے اس سے تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ پارمیز کو مجھ سے پہلے اس سے ملنے کا موقع حاصل ہو چکا ہے، اور وہ اظہار محبت بھی کر چکا ہے، لیکن میں دل میں اُس پر ہنستا تھا، کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا دل مجھے دے چکی ہے انہیں دنوں میں شہر کے اندر "سفید طاعون" پھیل گیا۔ میں بالکل نڈر ہو کر تمام مریضوں کے پاس جاتا اور اُن کی تیمار داری کرتا تھا۔ اس پر وہ بہت حیران ہوتی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے اپنا راز کہہ ڈالا، اور اس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے خون میں یہ دوا

داخل کرنے کی اجازت دے،

"میں نے کہا آتما تم پھول ہو لیکن اسکے بعد تم ایک ایسا پھول بن جاؤ گی جسے خزاں کا خوف نہ ہو۔ ہر دوسری چیز فنا ہو جائیگی لیکن میں اور تم اور ہماری یہ عظیم الشان محبت اس چرخ نیلوفری کے ہزاروں دَور دیکھیگی اور دیکھتی رہیگی۔ اور فنا نہ ہوگی۔

"اُس نے میری اس تجویز پر بہت سے لڑکیوں کے سے اعتراضات کئے۔ وہ کہتی تھی کیا یہ فعل دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف نہ ہوگا۔ اگر اُن کی خواہش یہ ہوتی، کہ ہم اتنی دیر تک جئیں، تو کیا وہ خود ہی ہماری عمریں لمبی نہ کر دیتے،

"آخر بڑی مشکل سے میں نے اسے منایا، لیکن اس نے مزید غور کرنے کے لئے ایک رات کی مہلت مانگی۔ مجھے طوعاً و کرہاً رات بھر انتظار کرنا پڑا، اور علی الصباح میں اس کے گھر پہنچا لیکن وہاں عجیب پریشانی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے آتما کی بیماری کی اطلاع دی گئی۔ میں ایک بے قرار دل کے ساتھ اسکے کمرے کی طرف بھاگا اس کے ماتھے پر مجھے ایک انگارے سا جلتا ہوا داغ دکھائی دیا یہ سفید طاعون کا داغ تھا۔ افسوس میں دیر سے پہنچا اور میری آتما میرے دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل گئی۔

"اب میرے دن یاس و حسرت میں بسر ہوتے تھے، صحرا میں کوئی پیاسا بھی پانی کے لئے اتنا بے قرار نہیں ہوتا، جتنا میں موت کی تمنا میں مضطرب تھا، مگر افسوس کہ نہ مجھ پر ہتھیار ہی کا اثر ہو سکتا تھا، اور نہ زہر ہی سے مجھے نجات مل سکتی تھی۔

ایک دن پارمینز میرے پاس آیا۔ وہ بہت خوش خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا تم آتما سے محبت کرتے تھے، پھر تم نے اسے زندہ کیوں نہ رکھا؟ زندگی میں تم نے اسکے دل پر فتح پائی تھی لیکن بالآخر اصلی فتح مجھے حاصل ہوئی۔ میں آج قبر میں اس سے جا ملوں گا۔ اور تم بیٹھے اپنی قسمت کو روتے رہو گے،

میں نے جواب دیا مگر تم پر بھی تو میری دوا کا اثر ہو چکا ہے، پھر تم کس طرح مر سکتے ہو؟ اس نے ہنس کر جواب دیا تمہاری دوا کا اثر اب مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نے ایک ادر ایسا مرکب دریافت کر لیا ہے۔ جو اس دوا کے اثر کا قاطع ہے، لیکن میں تمہیں وہ ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ تم نے مجھ سے اس کا دل چھین کر مجھے اس دُنیا میں بہت عذاب دیا تھا۔

میں نے کہا میں خود کوشش کر کے یہ مرکب تیار کر لوں گا، اس پر اس نے سرد مہری سے جواب دیا

کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ مجھے بھی یہ نعمت اتفاقی ہی طور پر حاصل ہوگئی تھی اور اب محال ہے کہ تم سے کبھی تیار ہوسکے پھر اس نے کہا کہ دنیا بھر میں اگر کہیں یہ چیز مل سکتی ہے تو ثاث کی انگشتری میں، لیکن وہ انگشتری بھی کبھی کسی کو نہیں مل سکتی۔ پھر اس نے کہا لو اب میری موت کا وقت قریب ہے۔ میں جاتا ہوں اور تم اس دُنیا کی زندگی کے جہنم میں پڑے سالہا سال جھلستے رہو۔ یہ کہہ کر وہ وحشیانہ مسرت سے بھاگ گیا، اور دوسرے دن علی الصباح مجھے اس کی موت کی خبر ملی۔

اس کے بعد میرے دن رات یا تو تجربہ خانے میں گزرتے تھے، یا آتما کی قبر پر۔ میں نے پارمیز کے تمام آلات استعمال کئے، اس کے کاغذات دیکھے۔ لیکن کہیں مجھے اُس مرکب کا سُراغ نہ ملا۔ میں آتما کی قبر پر جاکر عالم خیال میں گھنٹوں اس سے باتیں کیا کرتا اور بحسرت کہتا کہ اگر اس ناقص انسانی عقل نے میرا عقدہ حل کر دیا، تو میں جلد تم سے آملوں گا۔

پارمیز نے کہا تھا کہ اس کی بیش بہا ایجاد کا تعلق ثاث کی انگشتری سے ہے، مجھے اس انگشتری کو دیکھنے کا اس سے پہلے اتفاق ہوچکا تھا، جس دھات سے یہ بنائی گئی تھی، وہ سونے سے بھی زیادہ وزنی تھی، اور کوہستانِ ہاربول سے دستیاب ہوئی تھی۔ اسے تم آجکل پلاٹینم کہتے ہو۔ اس انگشتری کا نگینہ بہت بڑا اور اندر سے کھوکھلا تھا۔ پارمیز کے کاغذات سے مجھے اتنا پتا چل گیا، کہ اس کا ایجاد کردہ مرکب اسی نگینہ میں موجود ہے، لیکن باوجود ہزار کاوش کے مجھے انگشتری کا کچھ پتا نہ چلا۔ جس دن پارمیز کی لاش مسالہ لگانے والے کے پاس گئی۔ میں نے اچھی طرح سے دیکھا بھالا مگر انگشتری اس کے ہاتھوں میں نہ تھی۔ میں نے پارمیز کے مکان کے ایک ایک گوشے میں اُس کی تلاش کی، جہاں جہاں عام طور پر وہ جاتا تھا، میں نے اُن راستوں کی خاک تک چھان ماری، لیکن افسوس کہ میں کامیاب نہ ہُوا۔

اس پر ایک اور مصیبت نازل ہُوئی، یعنی ہمارے علاقہ پر وحشی قبائل نے حملہ کر دیا۔ دن اور رات شہروں میں خون کا دریا بہتا ہُوا نظر آتا تھا۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں نہایت بے دردی سے جلائی جارہی تھیں۔ لیکن ہم اپنے تحفظ کے لئے ان وحشیانہ لشکروں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ کرسکتے تھے۔ میں گرفتار کرکے غلام بنایا گیا، اور برسوں میں نے فرات کے کناروں پر بکریاں چرائیں۔ میرا آقا مرگیا، اس کے بعد اس کا بیٹا بھی میرے سامنے ہی بوڑھا ہوگیا، لیکن میں ویسے کا ویسا رہا آخر ایک دن موقع پاکر میں بھاگ نکلا، اور اپنے شہر میں پہنچا لیکن اب وہاں بجز خاک کے ڈھیروں

کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ آتما کی قبر کا بھی نام و نشان مٹ چکا تھا۔ کھجور کے وہ درخت جو اس کا سراغ نکالنے میں کچھ مدد دے سکتے تھے، غالباً آگ سے جل کر نیست و نابود ہو چکے تھے۔ ہر طرف صحرا ہی صحرا نظر آتا تھا۔ اب مجھے انگشتری کے ملنے سے بالکل مایوسی ہوگئی، اور میں نے اس وقت کا انتظار کرنا شروع کیا، جب خود بخود دوا کا اثر زائل ہو جائے اور میں موت سے ہمکنار ہوں۔ آہ میں تمہیں کس طرح بتاؤں، کہ میں نے کس عذاب سے اپنی یہ زندگی بسر کی۔ دُنیا کی تاریخ کے کئی دَور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، دنیا کے ہر حصہ میں اور دنیا کی ہر قوم کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے دن گزارے، میرے سامنے کئی نئے مذاہب کی بُنیادیں رکھی گئیں یسوع مسیح کا ظہور ہُوا، اور کئی وحشیانہ زمانوں میں سے گزر کر آخر اس نئی تہذیب کا زمانہ آیا۔ لیکن آتما کو یہ معلوم ہے کہ میں نے اس سے رشتۂ اُلفت جوڑنے کے بعد کسی دُوسری عورت پر آنکھ نہیں ڈالی، اور میں آج تک اس کا وفادار رہا ہوں۔

"میری زندگی کبھی امیرانہ اور کبھی غریبانہ طور پر بسر ہوتی رہی، لیکن مصرِ قدیم کے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کرنے کا شوق ہمیشہ میری جیب پر غالب رہا اور میں اس قسم کے رسالے اور اخبارات ضرور خرید لیا کرتا تھا، جن سے مجھے ایسی معلومات میسر آسکیں جن کا تعلق قدیم مصر سے ہو۔ پچھلے دنوں جب میں سان فرانسسکو میں تھا۔ مجھے ایک اخبار سے معلوم ہُوا۔ کہ میرے قدیم وطن کے قریب ایک ماہر مصریات نے کئی آثار قدیمہ دریافت کئے ہیں، اور ایک قبر سے ایک ممی بھی نکلی ہے، جس کے صندوق پر درج شدہ تحریر سے معلوم ہُوا ہے، کہ یہ شہنشاہ ٹوتھمس کے عہد کے ایک حاکم شہر کی بیٹی کی لاش ہے۔ صندوق کھولنے پر پلیٹینم کی ایک بڑی انگشتری بھی ملی۔ جو ممی کے سینے پر رکھی تھی۔

یہ پڑھ کر میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ پارمیز نے سچ کہا تھا، کہ یہ انگشتری کسی کو نہیں مل سکتی، کیوں کہ کوئی مصری اتنا سنگدل نہ ہو سکتا تھا کہ کسی مردہ دوست کی لاش کے صندوق کو کھولنے کی کوشش کرے، یا اس کی خفیف سے خفیف بے حرمتی کا خیال بھی دل میں لائے۔

یہ اطلاع پڑھ کر میں سیدھا اپنے وطن کی قدیم سرزمین میں پہنچا۔ لیکن وُہاں دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہُوا کہ ممی اور انگشتری دونوں عجائب خانۂ مصر میں پہنچا دی گئی ہیں۔ چنانچہ میں فوراً مصر کی طرف روانہ ہُوا۔ لیکن وہاں بھی مجھے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا، اور مجھ سے کہا گیا۔ کہ یہ دونوں چیزیں لونڈر پہنچ چکی ہیں۔ آخر کار میں لونڈر پہنچا۔ حسن اتفاق سے عجائب خانے میں ایک خدمتگار کی ضرورت تھی۔ مجھے تجربہ کار ہونے کی بنا پر بہت جلد ملازمت مل گئی، اور اس کے بعد جو کچھ ہُوا، اس سے تم واقف ہو چکے ہو۔ آج تم نے اتفاق سے اس عورت کا چہرہ

دیکھ لیا ہے۔ جس کی محبت میں میں نے ایک طویل تاریخی زمانہ گزارا ہے آج مجھے وہ مطلوبہ انگشتری بھی مل گئی ہے اور وہ مرکب بھی جو زندگی کے اس عذاب سے چند گھنٹے میں مجھے نجات دلوانے والا ہے"

اس کے بعد اس نے دروازہ کھول کر اختر کو باہر نکال دیا، اختر نے پلٹ کر دیکھا۔ تو دروازہ ابھی کھلا تھا، اور ثاثرا باشندۂ مصرِ قدیم اس میں کھڑا نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ بند ہوگیا اور پھر اس میں ایک بھاری قفل کے پڑنے کی آواز آئی۔

دوسرے دن لنڈن پہنچ کر اختر نے ٹائمز کے بہرۂ مراسلات میں پیرس کے نامہ نگار کی یہ تحریر پڑھی:۔

لوور میں ایک عجیب واقعہ:۔ کل صبح ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب جھاڑو دینے والے مصری عجائبات کے کمروں میں گئے، تو انہیں ایک کمرے میں لوور کے ایک خدمتگار کی لاش فرش پر پڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بازو ایک ممی کے گرد لپٹے ہوئے تھے، اور اُن کی گرفت اس قدر سخت تھی، کہ ممی کو اس سے جدا کرنے میں بہت دقت پیش آئی۔ پاس ہی ایک ڈبا جس میں بہت سی بیش قیمت انگشتریاں رکھی تھیں، کھلا پڑا تھا۔ لوور کے ذمہ دار عہدہ داروں کی رائے میں یہ شخص غالباً مدت سے دل کی بیماری میں مبتلا تھا اور خیال ہے کہ کل رات جب کہ وہ ممی کو چرا کر غالباً کسی شوقین کے پاس بیچنے کے لئے جارہا ہوگا۔ اُسکے دل کی حرکت دفعتہً بند ہوگئی جس کی وجہ سے وہ وہیں گر کر مرگیا۔ کہا جاتا ہے، کہ اس شخص کی عمر کے متعلق کوئی صحیح اندازہ قائم نہیں ہوسکا اس کی طبیعت اور اس کی عادات کچھ پُراسراری تھیں۔ جہاں تک تحقیق ہُوا ہے اس شخص کے عزیزوں اور قرابت داروں میں سے کوئی ایسا شخص زندہ موجود نہیں، جو اس کے حسرتناک انجام اور اس کی بے وقت موت پر غم کے آنسو بہائے"!

ملخص

حامد علی خاں

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت
وندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

حافظ

آئینہ

ہے آب آب صورتِ چشمِ تر آئینہ
عرضِ حدیثِ عشق کو ہے مضطر آئینہ

ہر ذرہ اس کا ہے ترے پرتو سے مضطرب
ہے فتنہ گاہِ شورشِ صد محشر آئینہ

تیری اک اک ادا کا حق اس نے ادا کیا
حیراں ہوں کس قدر ہے سخن گستر آئینہ

ساقی بھی تو شراب بھی تو بادہ کش بھی تو
تو مستِ نازِ حسن ترا ساغر آئینہ

دل غیر ہے، کسی کا دل اپنا نہیں بنا
تو دلبر اک جہاں کا ترا دلبر آئینہ

عکسِ صفائے حسن سے اس جلوہ گاہ میں
از مہر تا بہ ذرہ بنے یکسر آئینہ

ہے کس کے شوق میں دلِ ہر ذرہ مضطرب
ہر سمت اُڑ رہا ہے لگا کر پر آئینہ

اپنے نظارہ سے اُسے فرصت نہیں ہنوز
رہتا ہے میرے دل سے بھی حیران تر آئینہ

ہے کس کا عکس آئینۂ دل میں جلوہ گر
کس جلوہ گاہِ ناز کو ہے رہبر آئینہ

روشن شکستِ دل سے ہے تقدیر عشق کی
ظاہر مآلِ حسن ہے ٹوٹے گر آئینہ

ہر ذرہ ایک جلوہ گہِ ناز ہے مجھے
تو ہے مری نگاہ میں پیدا گر آئینہ

حامد علی خاں

تدبیرِ منزل

نسائیات کا اک وہ دلکش موضوع، جس کو "تدبیر منزل" کہتے ہیں اپنے متعلقات کی دلچسپیوں کے اعتبار سے اس درجہ جاذبِ ذوق ونظر ہے کہ علمی دُنیا نے ترقیٔ تمدن کے ہر دَور میں، مختلف حیلوں اور عنوانوں سے اس پر بحث کی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ "امور خانہ داری" میں عورت کی جد وجہد، مرد کے مقابلہ میں بہت زیادہ معقول اور ممتاز ہے، ایسی اختراعات جن کا علاقہ ہماری معیشت منزلی سے ہے اِسی کی لطافتِ دماغ کی سعی ہیں اور ایسی ایجادات جو تہذیبِ معاشرت میں آج نمایاں نظر آتی ہیں اُن کا بھی اکثر حصہ اسی کی جودت وذہانت کا کرشمہ ہے، خانہ داری کی تدابیر میں اس کے خیال کی وسعت لاتناہی ہے، اور اس کی تفصیل ——"

میاں —— میاں مٹکا آپ ہی آپ ٹوٹ گیا تمام پانی بہہ گیا اُس کے پاس جو ٹھلیا رکھی تھی وہ بھی پھُوٹ گئی —— اب تو نل بھی بند ہو گئے، پانی ——"

"نامراد کیا بک رہا ہے، دفع بھی ہو یہاں سے ——"

خدا جانے میں کیا لکھنے والا تھا، —— اُسکی تفصیل ہر گھر کا حُسنِ انتظام پیش کر سکتا ہے —— ہرگز نہیں اس درجہ بھونڈی اور سطحی بات میں لکھنے والا نہ تھا —— اُس کی تفصیل کا علم، محض اس کے محبوبات میں ——" یہ بھی نہیں —— اُس کی تفصیل کے لئے تمدن کی تاریخ کا ہر صفحہ اپنے آپ کو پیش کریگا ——"

اِنسانی حیات کا ہر شعبہ، عورت کی خوئے تدبیر اور جودت اہتمام سے معمور ہے، یوں تو عورت اپنے ہر عہد میں مرد کے لئے رفیق ہے، مگر اس کے حسنِ تخلیق کے نمایاں ہونیکا زمانہ علی الخصوص تزویج سے شروع ہوتا ہے، اس کی زندگی کے مہتم بالشان عنوانات، محبت و رفاقت اور تربیت اولاد ہیں اور اُن کی شرح و وضاحت اسی عہد سے رونق پاتی ہے۔ شوہر اور بچے اس کے اعمالِ رفق وانس کا ——

ابّا میاں! دس بج گئے مجھے مدرسہ جانے کو دیر ہو رہی ہے، جو کتاب رقیہ نے پھاڑ ڈالی وہ آج بھی امّی نے منگوا کر نہ دی —— مجھے مار پڑیگی —— امی کہتی ہیں میں یہ پاپ کب تک" اچھا، آج بھی

یوں ہی چلے جاؤ کل بند و بست کر دینگے" سُنا میاں اصغر کیا لکھ رہا تھا، شوہر اور بچے اُسکے اعمالِ رفق و انس کا۔ اک لفظ کے رہ جانے سے ساری عبارت مہمل ہوگئی ـــــ بالکل دماغ میں نہیں رہا، اچھا محو ہوتے ہیں، یہی سہی" ـــــ "

اُس کے حسیات کے لطائف اُس کے تمام اعضاد جوارح میں اک رنگ بھر دیتے ہیں جو نفسوں کا سا اثر کرتے ہیں وہ شوہر پرست ہوتی ہے اور یکسر وظیفۂ محبت، اُس کی حیات ازدواجی کا انحصار، اُس کے دل کی گرمی دوسروں کو راحت پہنچاتی ہے اور اُسکے سینہ کی موجِ تنفس دوسروں میں روح حیات پھونکنے والی' وہ اپنے گھر میں اک ملکۂ ذی اقتدار سے کم نہیں، اُسکی حکومت زمین کے فرسودہ قطعات پر نہیں بلکہ دل کی اقلیم پر ہوتی ہے، اسکی فرماں روائی کے انداز، تلوار سے اقتدار قائم رکھنا،، اور قوت سے اثر پیدا کرنا، نہیں۔ وہ اطاعت آمیز تحکم سے اور انکسار آمیز تکبر سے اس مہم کو سر کرتی ہے اور مرد کبھی سرتابی نہیں کرتا ـــــ اور سرتابی نہ کرنا ہی ممدِ انتظام ہے!

میں پوچھتی ہوں، آج اندر بھی آؤ گے یا نہیں ـــــ زنانہ مکان میں سے اک آواز آئی ـــــ "

آج اس مکان میں بلائیں نازل ہو رہی ہیں، پہلے مٹکا آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کہو گھڑونچی کے پائے بودے تھے ـــــ پھر ٹھلیا ٹوٹ پڑی۔ اُس پر مٹکے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے آپڑے ہونگے مگر یہ چھینکا چھت میں سے آپ ہی آپ کیوں آپڑا؟ ـــــ وہاں کوئی گلہری بھی نہیں، اچھا اسکو بھی جانے دو عظمت گوشت لایا میں نے چولھے کے آگے رکھا تھا، اک ذرا کی ذرا اِدھر چھینکے کو دیکھنے آئی کہ وہ غائب ہوگیا کیا بلّی سیر بھر گوشت کھا گئی؟

میں تو اس گھر سے باز آئی، تمکو مضمون لکھنے سے فرصت نہیں اور گھر تمہاری توجہ بغیر چلیگا نہیں۔ اب بات بنے تو کیونکر، رات کو بارہ بج جائیں، گھر میں رات نہ آئے دن کو گیارہ بج گئے ابھی صبح نہیں ہوئی خدا جانے یہ مضمون لکھ لکھ کر کیا قلعے سر کرلو گے۔ خدا اِن نامرادہاں میں ہاں ملانے والوں کا بھلا کرے تمہیں کہیں کا نہ رکھا، آئے دوست کہیں کے، راتوں کو پان کھاتے کھاتے صبح کر دیں، حُقّے پیتے پیتے گھر کے دھوئیں اُڑا دیں اُن سے کوئی پوچھے کمبختو یہ مضمون کیا تمہیں خدا کے ہاں بخشوانے جائینگے" اُڑانے شروع ہوئے تو گھر بھر کو سر پر اُٹھا لیا، خدا کی سنوار! گھر میں فاقہ، باہر اکبری دربار سین بے علیگ

مجھے میرے باپ کے ہاں بھیجدو۔ یہ گھر اور بچے تم خود سنبھالو، وہ مضمون لکھے اب اس لکھنے کو بھی لکھو یہ زمانے بھر کے اخبار، رسالے کیا اور کسی کے ہاں نہیں جاتے، صبح کو ناشدنی ڈاکیہ قسمت کے چھپے ہوئے لکھے کو دے جاتا ہے اور یہ دن بھر پڑھتے رہتے ہیں ---- جب سنو ہمایوں کا اصرار تھا، عالمگیر کا انتخاب کا، اِس کا، اُس کا حکم تھا اس لئے لکھا ---- خدا کے لئے مجھے اتنا تو بتادو، ان رسالوں کے جو لوگ اڈیٹر ہیں اُن کی شادیاں بھی ہوئی ہیں یا نہیں ----" مانا مضمون لکھنا اچھی بات ہے، مگر پھر ہم کہاں جائیں ----"

اُن روحانی اذیتوں کے ساتھ جو ہندوستان میں ادیب کی زندگی کے لئے فقدانِ تعلیم و تربیتِ دماغِ نسوانی سے پیدا ہیں۔ یہ کہاں ممکن ہے کہ وہ تدبیر منزل پر اک مقالۂ دلکش سپرد خامہ کرسکے؟! اِس سے بحث نہیں صحت حالات اور امر واقعہ کیا ہے، امکانِ وقوع کی وسعت سلامت چاہیئے"۔ لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا ----"

ہاں میں نے کیا لکھا تھا۔ "مرد سرتابی نہیں کرتا ---- اور سرتابی نہ کرنا ہی ممد انتظام ہے ---"

کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ سرتابی نہ کرنا ہی ممد انتظام ہے" ---- ؟

ہر چند مضمون اپنی وسعت کے لحاظ سے ابھی کچھ اور چاہتا ہے مگر مجھے اس فقرہ پر وجد ہونے لگا کہ "سرتابی نہ کرنا ہی ممد انتظام ہے" ---- اس لئے یہیں مضمون ختم کردوں۔؟

میاں! بیگم کہتی ہیں اصغر کو بلالو، وہ تختی لکھ رہے ہیں اور تمام فرش کو سیاہی سے خراب کردیا ہے ----"

"لاحول ولا قوۃ"

بس آخری فقرہ تدبیر منزل کا یہی ہے کہ "سرتابی نہ کرنا ہی ممد انتظام ہے"

"خلیقی"

تمنائیں مری نافہم ہیں اے مطربِ ہستی
جب آکر بزم میں گاتا ہے تو یہ غل مچاتی ہیں
تجھے سنتا رہوں دل میں مرے وہ درد پیدا کر
کہ یہ تو عیش ہی کا روز و شب قصہ سناتی ہیں

گلچیں

رفیقِ زندگی

اے گُلِ خوش رنگ و خوشبوئے بہارِ زندگی
روشنی تیری چراغِ رہ گزارِ زندگی
اے رفیق و ہمدم و غمخوار و یارِ زندگی
تُو نہ گر ہوتی تو دُنیا تھی مزارِ زندگی

کشتِ زارِ زندگانی خشک ہے تیرے بغیر
نخلِ گلزارِ جوانی خشک ہے تیرے بغیر

اے چراغِ خانہ تجھ سے گھر مرا روشن ہُوا
اے گُلِ اُمید تجھ سے دل مرا گُلشن ہُوا
رشتۂ اُلفت ترا جب سے رگِ گردن ہُوا
نونہالوں سے چمن ''ویرانہ'' مسکن ہُوا

دردِ دل کے واسطے بن کر دوا آئی ہے تُو
رفعِ وحشت کے لئے اے مہ لقا آئی ہے تُو

اے مشیرِ خیر اندیش و وزیرِ باصفا
میرے جہلِ نفس کو ہے رائے تیری آئینہ
جب مُصیبت میں بگڑتی ہے زمانے کی ہوا
ناخنِ تدبیر ہوتا ہے ترا عقدہ کشا

ناخدا اے کشتیِ عُمرِ رواں تُو ہی تو ہے
توسنِ دیوِ جوانی کی عنان تو ہی تو ہے

روحِ آدم کی تنِ خاکی میں جب گھبرا اُٹھی
شکلِ حوّا باعثِ تسکینِ آدم بن گئی
دارِ فانی کی کٹھن منزل بھی پھر آسان ہُوئی
ہوگیا آباد ویرانہ کلی دِل کی کھِلی

صدرِ آدم سے ہُوئی تھی جس کی تخلیق و نمود
آدمی کا جزوِ لاینفک بنتا اُس کا وجود

ہاں فقط تیرے اشارے سے کھُلا رازِ حیات
اور تری تحریک سے ٹوٹا جمودِ کائنات
فہمِ انسانی سے باہر ہے تری ہر ایک بات
ہوں نہ مرہونِ قلم تیری ہیں وہ ذات و صفات

پُوچھے رضواں سے کوئی ہنگامہ آرائی تری
جنت الفردوس میں وہ کارفرمائی تری

اے گُلِ خوش رنگ و خوشبوئے گلستانِ قدیم
غنچۂ دل کے لئے بنا گر رقصِ نسیم
مختصر یہ ہے [illegible] کوچۂ اُمید و بیم
سونگھ کر جیتے ہیں ہم تیری محبت کی شمیم

مغزِ جاں ہے تازہ تیری زلفِ عنبر بار سے
دل بھی گرمایا ہوا ہے آتشِ رخسار سے

محمد مصطفیٰ حسین
بی۔ اے علیگ

محفلِ ادب

اکتوبر ۱۹۲۵ء کا رسالہ "اردو" اس دفعہ نواب عماد الملک بہادر کی سالگرہ کی تقریب میں خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے اس کے متعدد مضامین قابلِ قدر ہیں عرب کی شاعری کے موضوع پر مولٰنا وحید الدین سلیم کا ایک نہایت جامع مضمون صفحہ ۷۴۵ پر درج ہے مولٰنا شکوہ سنج ہیں کہ ہر ملک کا ادب اس ملک کی قومی اور ملکی خصوصیات کا آئینہ ہے لیکن افسوس کہ ہماری اپنی شاعری اور انشاپردازی تمام کی تمام محض بیرونی ادب کی نقالی ہے اور اس سے اس ملک کی اپنی خصوصیات کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ گویا ہماری شاعری سراپا تکلف اور حقیقت سے یکسر بے تعلق ہے آگے چل کر مولانا عرب کی شاعری کے موضوع گناتے ہیں:-

(۱)۔ بہادری کے جذبات۔

(۲)۔ اخلاقی جذبات۔

(۳)۔ عاشقانہ جذبات۔

(۴)۔ مدح و ذم۔

(۵)۔ غم کے جذبات۔

اس کے بعد مختلف عرب شاعروں کے کلام سے اقتباس درج کئے گئے ہیں۔ اور عربی کے مشہور مقولہ "الشعر دیوان العرب" کی صحت ثابت کر دی ہے (یعنی "عرب کی شاعری عرب کا دفتر ہے دفتر کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ اس میں عرب کا جغرافیہ عرب کی تاریخ عرب کا تمدن عرب کی معاشرت عرب کے توہمات و خیالات عرب کی ملکی اور قومی خصوصیات سب کچھ ہے)

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس خصوصیت کے لحاظ سے کہاں تک ہم عرب کی شاعری کی تقلید کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہماری شاعری میں اس قسم کی خصوصیات ضرورت سے بہت کم ہیں۔ لیکن غالباً عربوں کی طرح ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اپنی شاعری کو ہر قسم کے رطب و یابس سے بھر دیں، اور شاعری میں "[illegible]" کو زیادہ دخیل کرنے کی کوشش سے شاعری کی خوبصورتی ہی کو نقصان پہنچانے لگیں ہمارے خیال میں شاعری کا سب سے بڑا مقصد اس قسم کی حقیقت طرازی نہیں بلکہ انسان کے [illegible] ایسا بلند مطمح نظر پیش کرتا ہے۔ جس کو پانے کی کوشش وہ

ہمیشہ کرتا ہے، خواہ وہ کبھی اسے پا نہ سکے۔ کیونکہ پھر بھی اس کی فطرت اس کوشش سے برابر کسب فروغ کرتی رہیگی ۔

اس طولِ کلام سے مقصد اس امر کا اظہار ہے، کہ شاعری، اگر وہ شاعری ہی ہو تو محض "خیالی" ہونے پر بھی مفید اور مؤثر ہو سکتی ہے۔ عربوں کی بعض خاص قسم کی "صاف گوییاں" اور "خفیفت طرازیاں" ہم عجمیوں کے کانوں کو اچھی معلوم نہیں ہوتیں خواہ اُن کا اندازِ بیاں کتنا ہی قدرتی کیوں نہ ہو۔ ذیل میں مثال کے طور پر ہم مولنا وحید الدین سلیم کے مضمون سے عربی اشعار کے تراجم کا اقتباس درج کرتے ہیں:-

(۱) عشقیہ:- میں نک چھدے اونٹ کی طرح تیرے عشق کا تابع ہوں، کہ جہاں وہ لے جائے جاتا ہوں ۔

(۲)۔ فخریہ:- ہم ایسی ماں کے بیٹے نہیں ہیں، جس کی چھاتیاں چھوٹی ہوں اور اُن کا دُودھ منقطع ہو گیا ہو، اور وہ صرف ایک ہی دفعہ جنی ہو۔ الخ

(۳) عشقیہ:- اگر جنگل کے بھیڑیئے میری محبوبہ کے ہم نسب ہوتے، تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان سے بھی محبت کرتا ۔

(۴)۔ محبوب کی تعریف:- سفیدی اور سیاہی میں اُس کی آنکھیں پنیر اور خرما سے بنی ہُوئی ہیں اور اس کا باقی بدن گویا ثرید (شوربے میں پکے ہُوئے روٹی کے ٹکڑے) ہے۔

(۵)۔ بعض نازک اندام عورتیں ہیں جن کی آنکھیں اس حلوے کی مانند ہیں جس میں گوشت پڑا ہو۔

(۶)۔ فخریہ:- میں موت کے تھنوں میں سے اس وقت دودھ نکالتا ہوں، جب بڑے بڑے بہادر بھاگ نکلتے ہیں

ان اشعار میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں وہ قومی خصوصیات کے کتنے ہی آئینہ دار کیوں نہ ہوں اور اُن کی سادگی اور بے تکلفی کے حق میں فصاحت و بلاغت کے کتنے ہی دریا کیوں نہ بہائے جائیں لیکن ان کے بھونڈے پن سے انکار کرنا ناممکن ہے اس خالص بدویت کو ہم شاعری نہیں کہہ سکتے اور امید ہے کہ ہم سے اختلاف رکھنے والے اصحاب ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم اپنے ملک کے شعرا کے تخیل کو اس قدر بے مہار ہونے کا مشورہ نہ دیں لیکن ہمیں ڈر ہے کہ جن اشعار کا ترجمہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے ان کو دیکھ کر بعض غیر عربی دان اصحاب کو عرب کی شاعری کے متعلق یہ خیال نہ ہو جائے کہ بھدّے پن کے سوا اس میں کچھ ہے ہی نہیں، اور تخیل کی آوارگی اور بے راہ روی عرب کی شاعری کی ایک لازم و ملزوم خصوصیت ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں بلکہ اگر ایسے اشعار سے قطع نظر کیا جائے [illegible] آوارگیٔ بیان سے کام لیا گیا ہے تو عرب کی شاعری من حیث المجموع اس قدر عظیم الشان ہے کہ اہل عرب اس پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ متذکرہ [illegible] مضمون ہی سے ہم عربی شعروں کے کچھ اور تراجم

نقل کرتے ہیں جو اس حقیقت کے شاہد عادل ہیں۔

(۱)۔ **ابر کی تعریف**:۔ ابر کے ٹکڑے رات کے ابتدائی حصے میں مستانہ چال چل رہے تھے۔ بادلوں کی قطاریں جنگلوں میں اس طرح گرجتی تھیں، جیسے اونٹنیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر چلاتی ہوں۔ بادلوں کے بلند کنارے اس طرح معلوم ہوتے تھے، کہ گویا وہ کوہ لبنان کی چوٹیاں ہیں۔ بارش کا زور اُن ہواؤں کا مقابلہ کرتا تھا، جو حضرموت کی طرف سے چلتی تھیں۔ اس بارش نے بلند مقامات کے درخت عرفج کو اور نمکین گھاسوں کی جڑوں اور ریشوں کو یکساں طور سے تر و تازہ کردیا ہے۔ ابر کے بوجھل ٹکڑے اس طرح آہستہ آہستہ چلتے تھے، جیسے رسّی بندھے کمزور اونٹ نرم زمین پر چلتے ہوں۔

(۲)۔ **محبت**:۔ جب ہمارے قافلے کے اونٹ ہمیں شام کی طرف لے جارہے تھے، تو یکایک آدھی رات کے وقت تیرا خیال آیا، اور میں شام کی طرف ایک قدم نہ چل سکا۔ میں نے تیرے خیال کو لبیک کہا اور حدی خوانوں سے کہا کہ اونٹوں کو واپس حجاز کی طرف چلاؤ۔ اب شام کی طرف کوچ کرنیکی حاجت نہیں

(۳)۔ جب اُس محبوب کی اونٹنی صبح کو روانہ ہوگئی تو میں نے اپنی اونٹنی کو اس کے پیچھے ہنکایا، حالانکہ اس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے (بیخودی کا عالم ہے)

(۴)۔ اے نجد کی ہوا۔ تو کب چلی؟ تیرے جھونکوں نے مجھ پر عشق کی تہیں چڑھادیں۔ جب چاشت کے وقت درخت اند کی تر و تازہ شاخ پر ایک کبوتری بولی تو اس کی آواز سُن کر میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور وہ بھید جو میرے دل میں مدت سے چھپا ہوا تھا۔ یکایک فاش ہوگیا۔

(۵)۔ **فوج کشی کا سماں**:۔ ہم جب لڑائی پر کمربستہ ہوتے ہیں، تو ایسی فوج ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جس کے اطراف میں ابلق گھوڑے غائب ہوجائیں، جس کا پچھلا حصہ مدینہ میں اور اگلا دمشق میں ہوتا ہے جب ہم مشرق اور مغرب کے درمیان چلتے ہیں، تو جاگتی اور سوتی زمین لرزنے لگتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں ہم اکتوبر کے رسالہ اردو سے جناب اختر شیرانی کی نظم "نیتری" نقل کرتے ہیں یہ اُردو زبان کی نئی شاعری کا ایک نہایت اچھا نمونہ ہے، اور اگر ملک کے نوجوا[illegible]عراس قسم کے موضوعات پر اس رنگ میں طبع آزمائی کریں تو زبان اُردو کے ذخیرہ ادب میں ای[illegible]بیش بہا اضافہ ہوسکتا ہے:۔

تیتری

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگِ پریدہ ہے؟ بوئے چکیدہ ہے؟
آغوشِ گل میں یا کوئی نقشِ دمیدہ ہے؟ عکسِ کشیدہ ہے؟
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے! پاشیدہ سامنے!
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے! دامن کشیدہ ہے!
موج ہوا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بو! ہیجانِ رنگ و بو!
اوجِ فضا میں چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بو! جو صف کشیدہ ہے!
اک عکس ہے جما ہُوا رنگیں غبار کا؟ کیف و خمار کا؟
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا! حسنِ رمیدہ ہے!
ہلکی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر، اوجِ نسیم پر!
رقاصۂ جنت کا فرشِ شمیم پر، رقصِ پریدہ ہے
موجِ شراب کی اِسے اک تھرتھری کہوں؟ ننھّی پری کہوں؟
یا موسمِ بہار کی اک تیتری کہوں؟ جو آرمیدہ ہے!

فسانہ نگاری

ولیم لی کوئکس موجودہ زمانہ میں انگلستان کا نہایت مقبول ناول نویس ہے۔ اس کے افسانے نہایت کثرت سے خریدے اور پڑھے جاتے ہیں۔ کثرتِ مضامین کے لحاظ سے اس کو اس وقت انگلستان کی ناول نویسی کی دنیا میں وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی زمانہ میں سر والٹر اسکاٹ مشہور ناول نویس کو حاصل تھی، دلکشی اسکی طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے یہ شخص اپنے ناول لکھنے کے طریقہ کو مندرجہ ذیل سطروں میں بیان کرتا ہے۔ اُمید ہے کہ ہندوستان کے ناول نویس جو بے سوچے سمجھے کاغذ لیکر کسی فرضی داستان کو قلمبند کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی ناول نویسی کا کوئی مقصود بھی ہونا چاہیئے اسے غور سے ملاحظہ کرینگے،
وہ لکھتا ہے" انگلستان اور یورپ میں تعلیمیافتہ اشخاص جو مجھ سے ملتے ہیں تو یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ

میں ناول کس طرح لکھتا ہوں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ناول لکھنا اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر اس کو لوگ سمجھتے ہیں۔ پہلے دل میں ناول کا پلاٹ (خاکہ) تیار کرنا چاہیئے۔ پلاٹ کی حالت بالکل انڈوں کی ہوتی ہے یعنی وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور گندے بھی۔ ہر شخص پلاٹ تیار کرسکتا ہے اور کوئی پلاٹ نہ ہو تو خود اسکی زندگی کا پلاٹ کافی ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ زندگی کے اصلی واقعات کو لوگ بے مزہ کہتے ہیں۔ کوئی شخص جو ایک نئی کتاب پڑھتا ہے تو وہ بالکل نئے اور حیرت میں ڈالنے والے واقعات کا طالب ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت اسکی ہوتی ہے کہ اصلی مضمون کو صرف سچے واقعات زندگی سے وابستہ رکھا جائے لیکن غیر معمولی حوادث بھی ایسے بیان کئے جائیں جنکا مقابلہ اکثر واقعات زندگی میں ہر شخص کو کسی نہ کسی دقت کرنا پڑتا ہے۔ جب میں کوئی ناول لکھنا شروع کرتا ہوں تو ایک کاغذ پر بیس پچیس ایسے الفاظ اسماء لکھ لیتا ہوں جن پر اس افسانہ کے پلاٹ کو قائم کرنا ہے پہلے میں پورا پلاٹ عام ناول نویسوں کی طرح نہیں سوچ لیتا اسکے بعد پلاٹ تیار کرتا ہوں پھر اسی کاغذ پر ہیرو اور ہیروئین اور دوسرے اشخاص متعلق افسانہ کے نام لکھتا ہوں۔ ان تمام اشخاص افسانہ کو میں ان لوگوں سے چنتا ہوں جن کو میں نے خود دیکھا ہے اور جنکے واقعات میری نظروں کے سامنے گذرے ہیں۔ انکے حلیہ کو بھی میں اس یادداشت ہی کے کاغذ پر لکھتا ہوں۔ پھر انکے متعلق جن خاص صفات یا برائیوں کا ذکر کرنا ہے اسکو بھی یادداشت ہی کے کاغذ پر مختصراً لکھ ڈالتا ہوں۔ پھر ہیروئین کی شکل و شباہت کے متعلق بھی پہلے ہی نوٹ کر لیتا ہوں۔ لوگ ایسی ہیروئین کے تذکرہ کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں جسکی زلفیں کالی نہ ہوں بلکہ بھوری یا لال ہوں جب میں افسانہ کے اشخاص اور ان کے صفات کی فہرست تیار کر لیتا ہوں تو سب سے بڑا مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ قصہ کے مقام کا ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس قصہ کو کس مقام سے متعلق کرنا چاہیئے۔ تمام دنیا میرے سامنے ہوتی ہے اور میں اس صفحۂ ارضی کے کسی مقام کو اپنے افسانہ کے جائے وقوع کے لئے منتخب کرسکتا ہوں لیکن میرا دستور ہے کہ میں کسی مقام کو اپنے افسانہ کے لئے نہیں چنتا یا اس کا تذکرہ اپنے ناول میں نہیں کرتا جبتک کہ میں نے خود اس مقام کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہو۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ مجھے ان مقامات کا سفر کرنا چاہیئے۔ جہاں کے مناظر دلکش اور خوبصورت ہیں۔ میں نے ابھی تک ایکسٹھ(۶۱) بیس ناول لکھے ہیں۔ میں نے یورپ میں اپنی زندگی اپنے افسانوں کے لئے مناظر تلاش کرنے میں گذاری ہے۔ یورپ میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میں اپنے مناظر اور خاکے مہیا کرنے کے لئے پہنچا ہوں میں نے مناظر کی تلاش میں سائبیریا کا سفر بھی کیا ہے اور تین مرتبہ اونٹوں کے قافلوں کے

ساتھ صحرائے افریقہ کو بھی اسی غرض سے عبور کرچکا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بحر احمر اور آسون کے درمیان جو صحرا واقع ہے اسکے متعلق مجھے کافی معلومات حاصل ہیں کیونکہ میں نے اس قطعہ کا کئی بار سفر کیا ہے۔ لیکن یہاں کے سفر میں مَیں کبھی ان شیوخ صحرا سے نہیں ملا جنکا تذکرہ انگلستان کی ناول نویس عورتیں اپنے ناولوں میں کرتی ہیں۔ میں تمام لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ صحرا کا سفر اونٹ کی پیٹھ پر لطف انگیز اور خوشگوار نہیں ہوتا بلکہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ (نوید)

پیرس میں ایک شخص روزانہ ایک راستہ سے گزرتا تھا اور وہاں ایک فقیر کو موجود پاتا تھا جو اسکو دیکھ کر اپنا کشکول آگے بڑھا دیتا تھا، یہ روزانہ اس فقیر کو چار سکے دیا کرتا تھا۔ ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن اس نے بجائے اسکے دوسرے فقیر کو دیکھا اور اس شخص نے اسکو بھی اسی طرح چار سکے دئے۔ اور برابر دیتا رہا۔ ایک دن اس کے نام عدالت کا سمن آیا کہ دو شخصوں نے اسے ایک معاملہ میں شاہد بنایا ہے۔ چنانچہ یہ گیا اور دیکھا کہ عدالت گاہ میں وہی دونوں فقیر موجود ہیں اور نزاع یہ ہے کہ دوسرا فقیر پہلے سے اپنے خسارہ کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ پہلے فقیر نے یہ بیان کرکے کہ فلاں شخص روزانہ دس سکے دیتا ہے اس شخص کو ایک معقول رقم پر بیچ دیا تھا لیکن جب تجربہ سے معلوم ہوا کہ وہ روزانہ صرف چار سکے دیتا ہے تو اس نے اپنے خسارہ کا دعوے کردیا۔ نگار

آنکھ اور نگاہ کے اثرات عہد قدیم سے تسلیم ہوتے چلے آرہے ہیں، اور عہد حاضر میں بھی ہپناٹزم مسمریزم وغیرہ اسی اثر نگاہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ چنانچہ اس اثر کو علمی طور پر ثابت کرنے کے لئے انگلستان کے ایک ڈاکٹر نے ایک نہایت نازک آلہ ایسا ایجاد کیا ہے جو نگاہ کے اثر کو فوراً بتا دیتا ہے۔ اس آلہ میں ایک سوئی لگی ہوئی ہے جو نگاہ پڑتے ہی جنبش میں آجاتی ہے اور جسکی نگاہ جس قدر قوی ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ نمبر تک یہ سوئی پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جن کی نگاہ بہت ضعیف ہے اُن کے دیکھنے سے سوئی میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ (نگار)

حیاتِ جاوداں

آج اتفاق سے ہے نگہ تجھ سے کامیاب اک ذرہ تیرے نورِ جبیں سے ہے آفتاب
پیوستہ آج ازل سے ابد کا کنارہ ہے مجھ کو اُٹھا کے لے گئی اک موجِ اضطراب

تھا میں بھی تو نگاہ سے جب تک نہاں رہا
اب تُو ہے جلوہ بار تو پھر میں کہاں رہا

باطل ہے تیرے جلوہ سے افسونِ ما و من یا نورِ آفتاب ہے تاروں پہ خندہ زن
ہے تیرا رنگ روحِ گل و لالہ و سمن آ میرے دل میں اور مرے نغموں کی رُوح بن

میرے سخن کی مستیٔ پنہاں تجھی سے ہو
ہر تار اس رباب کا رقصاں تجھی سے ہو

تیری بہارِ حُسن کو بیمِ خزاں نہیں تُو جاوِداں ہے اور کوئی جاوداں نہیں
ہر ذرہ شش جہت میں ہے چشمِ نظارہ باز حیراں ہوں تیرا نور کہاں ہے کہاں نہیں؟
فانی تھا میں تو عشق ترا کیوں ملا مجھے؟ اب میں حریفِ کشمکشِ امتحاں نہیں!

کیوں ہر طرف ہے تیری نگہ مجھ کو رُو بہ رُو
شبنم کو آفتاب مقابل ہے سُو بہ سُو

کرتا ہوں تجھ سے عہدِ وفا استوار میں ہو نثار ہوں گا تجھ پہ ابد تک نثار میں
جب تک زباں ہے تیرے فسانے سُناؤں گا ہوں گرچہ اپنے نطق سے خود شرمسار میں
گونجا نوائے عشق سے باغِ سخن مرا دیتا ہوں اس چمن کو نویدِ بہار میں

ازبس کہ اس بہار کو بیمِ خزاں نہیں
باطل ہے یہ خیال کہ میں جاوِداں نہیں

"ماخوذ" حامد علی خاں



نئی کتابیں

جلال الدین خوارزم شاہ ۔ یہ سید سجاد حیدر صاحب "یلدرم" (رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کی تازہ ترین تصنیف بلکہ ترجمہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب جنہیں انشائے اردو کی دنیا سے رخصت ہوئے مدت ہو چکی ہے اب ہمارے سامنے ترکی لباس میں جلوہ گر ہیں۔ محبت وطن اور ایثار کی جو زندہ مثالیں اس ڈرامے میں ظاہر ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہری شان باطنی خوبیوں کی طرح دلکش ہے۔ قیمت ۱۲ عہ۔ مینیجر مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علیگڈھ سے طلب کیجئے اور پڑھ کر لطف اٹھائیے۔

قوانین عربی حصہ اول مولفہ مولوی احمد بخش صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل۔ یہ کتاب عربی علم صرف کی ایک مفصل بحث پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے کتاب کو ہر طرح سے مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ دقیق سے دقیق مسائل تا بہ حد امکان سہل المفہوم کر دیئے گئے ہیں بالخصوص ابواب خواص ابواب اور تخفیف و تعلیل کے پیچیدہ مباحث اس طور پر بیان کئے گئے ہیں کہ خود بخود ذہن نشین ہوتے چلے جائیں عربی زبان سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے عموماً اور طلبہ کے لئے خصوصاً یہ کتاب مفید ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے قیمت عہ ر عارف اینڈ برادرز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور سے طلب فرمائیے۔

سیر المصنفین جلد اول۔ جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے (علیگ) کی قابل قدر تصنیف ہے اردو زبان کے شاعروں کے حالات اور انکے کلام پر تنقیدی کتابیں تو ہمارے ذخیرہ ادب میں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں چنانچہ ان میں تذکرہ آبحیات اور خمخانہ جاوید کے نام سے بچہ بچہ آشنا ہے لیکن اردو زبان کے نثر نگاروں کے متعلق غالباً اس سے قبل کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی اور جناب محمد یحییٰ صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھا کر ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں اردو مصنفین کے تین الگ الگ دور قائم کئے گئے ہیں اور ہر دور کے مصنفین کے الگ الگ حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں جس سے کتاب میں مزید دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ شائقین ادب کو اس کتاب کی ضرور قدر کرنی چاہیئے۔ کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی عمدہ حجم ۲۲۴ صفحے

قیمت فی جلد عہ مینجر دارالاشاعت غازی آباد سے طلب فرمایئے ۔

دکن میں اُردو۔ مولفہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی (منشی فاضل) دکن میں زبان اُردو کے نشو و ارتقا کی تاریخ پر اس کتاب میں نہایت مفصل اور مشرح بحث کی گئی ہے۔ دکنی انشا پردازوں مصنفوں اور شاعروں کے کلام کے نمونے اور ان کے حالات درج کئے گئے ہیں اور ابتدا سے لے کر آج تک دکن نے اُردو زبان کی تحصیل و فروغ کے لئے جو کوششیں کی ہیں اُن پر روشنی ڈالی گئی ہے کاغذ کتابت طباعت عمدہ قیمت دو روپیہ۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی خلف مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم رجسٹرار بلدیہ۔ ترپ بازار حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے ۔

صیدیہ۔ یہ کتاب واجد علی شاہ والئے اودھ کے امرائے دربار کی مہم صید و شکار کے دلچسپ منظوم حالات پر مشتمل ہے میر وزیر علی صاحب صبا (مرحوم) لکھنوی کی تصنیف اور مولانا علاء الدین خاور بی۔ اے کی تالیف ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ :۔ نور الدین احمد مینجر دار البلاغ۔ بنگلہ ایوب شاہ۔ لاہور

تذکرہ شعرائے اُردو موسوم بہ گل رعنا :۔ یہ قابل قدر کتاب مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کی تالیف ہے اس میں اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اردو شاعری کا آغاز اور عہد بہ عہد باکمال اُردو شعرا کے صحیح حالات درج کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرا کے کلام کے نمونے بھی اُنکے حالات کے ساتھ درج کئے گئے ہیں یہ کتاب نہایت تحقیق سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ ہر شخص اسکے مطالعہ سے مستفید ہو حجم ۵۴۶ صفحے کاغذ لکھائی اور چھپائی غیر معمولی طور پر اچھی ہے سرورق چکنا قیمت پانچ روپے مینجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ سے طلب فرمائیے ۔

سیر انصار حصہ دوم مصنفہ مولوی سعید احمد صاحب انصاری اس کتاب میں انصار اور خلفائے انصار کے سوانح و حالات اور انکے فضائل و کمالات مستند ذرائع سے بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے شوق رکھنے والے اصحاب کیلئے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے کاغذ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ حجم ۴۸۰ صفحے قیمت عہ دار المصنفین اعظم گڑھ سے طلب فرمایئے

ہمایوں کے متعلق رائیں

مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی:۔ جب سے رسالہ ہمایوں جاری ہوا ہے میں ہمیشہ وقت نکال کر اسکے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اردو کے صرف چند رسالے ہیں جنکے مطالعہ کے لئے انسان کو وقت بچانا ضروری ہوتا ہے ان میں ہمایوں بھی ہے ۔

وہ جب سے چلن میں آیا ایک ہی صورت شکل پر قائم ہے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی میں کمی نہیں ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اس معمولی وضعداری میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ اخبار تہذیب نسواں کے بعد یہ خصوصیت صرف ہمایوں کو حاصل ہے کہ اسکی شکل میں آواگون نہیں ہوتی ۔

اسکے مضامین میں کبھی تنزل محسوس نہیں ہوا۔ دن بدن ترقی نظر آتی ہے۔ البتہ مضامین و خیالات کی نوعیت میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اسکو میں ضروری سمجھتا ہوں ۔

ہمایوں میں چھوٹے قد کے غلمان یعنی مختصر مضامین جو چند سطروں یا چند فقروں میں ختم ہوجاتے ہیں یقیناً بکھرے ہوئے موتی معلوم ہوتے ہیں ۔

ہمایوں لٹریری اور ادبی رسالہ ہے مگر اسکے لٹریچر میں اخلاق و تصوف اور تمدنی جھلکیاں بہت پُر لطف ہوتی ہیں جو مطالعہ کے وقت ذہن اور دماغ پر گراں نہیں گذرتیں ۔

ہمایوں کے مضامین میں نہ ایسی عریانی ہے جو مستورات یا سنجیدہ و متین طبقہ کے نامناسب حال ہو۔ نہ ایسی خشکی و بیبوست ہے جس پر بدمزاج ناناجان کی پھبتی کسی جائے۔ ہمایوں بڑھ رہا ہے۔ بڑھیگا۔ اور اسکو کوئی شیر شاہ رُک نہ دے سکیگا ۔

شیخ غلام قادر گرامی شاعر خاص حضور نظام دکن منصبدار خلد اللہ ملکہٗ:۔ خدمت عالی حضرت میاں بشیر تسلیم! گرامی کو آپ نے لکھا ہے کہ ہمایوں کی نسبت رائے صحیح لکھے۔ میاں صاحب بہادر۔ ہفتاد سالہ گرامی ہمایوں کی نسبت کیا صحیح رائے دے سکتا ہے۔ گرامی خود حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے یا مٹنے والا ہے پنجاب گرامی کے حواس خمسہ باطل کردئے گرامی بیمار رہتا ہے ع کہ بیمار ست رائے مرد بیمار ۔

ہمایوں کا خود نام ہی ہمایوں کے دلآویز ہونیکی دلیل ہے دست آویز ہے -
آفتاب آمد دلیل آفتاب

ہاں اس قدر لکھتا ہوں کہ ہمایوں ہندوستان کے کل رسالوں کا چیف جسٹس ہے۔ مالک بشیر۔ حامد تاجور۔ نشر کار ادارت۔ فکر پستی آویز گرامی مضامین ہمایوں سے عرش پرواز مختصر یہ کہ ہر طرح سے ہمایوں لاجواب ہے
والسلام۔ راقم گرامی

جناب سید غلام بھیک صاحب بی۔اے نیرنگ پلیڈر انبالہ۔- ہر تعلیمیافتہ اور سوچنے سمجھنے والا انسان اس حقیقت کو تسلیم کریگا کہ موجودہ زمانے میں خیالات کی توسیع و تہذیب اور زبان و ادب کی اصلاح و ترقی کے لئے ایسے رسالوں کا وجود ایک زبردست آلہ ہے جو ہفتے یا دو ہفتے یا مہینے میں ایک مرتبہ شائع ہوتے رہیں۔ عہد حاضر کی زندگی صیحح مشغولی اور تضیع اوقات کا کچھ ایسا معجون مرکب ہے کہ بڑی بڑی کتابوں کو پڑھنے کے لئے کم لوگ وقت نکال سکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رسالوں کے مختصر مضامین کو بہت سے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اُردو میں اعلیٰ درجہ کے رسالوں کی بیحد ضرورت ہے۔ حضرت شیخ پنجاب نے یادش بخیر مخزن جاری کیا۔ اُسکے کارناموں کو ارباب ذوق سلیم آج تک یاد کرتے ہیں۔ مخزن کے زمانے میں اور اُسکے بعد طول و عرض ملک میں بہت سے ادبی رسالے جاری ہُوئے اور اُن میں کئی ایسے ہیں جو درجہ اعلےٰ میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں لیکن حق یہ ہے کہ مخزن کی جگہ عرصہ دراز تک خالی رہی۔ (جب لاہور کے آسمان صحافت پر کہکشاں کا نورانی غبار دکھائی دیا تو مخزن کے یاد کرنے والوں کی نگاہوں سے ایک حسرت آمیز مسرت ٹپکنے لگی۔ خدا کی قدرت کہ کچھ دیر کے بعد وہ بُرادۂ نور غائب ہوگیا اور ارباب ذوق کی نگاہیں پھر ناکامی کا مُنہ تکتی رہ گئیں!) آخر ایک مرحوم ادیب و فلسفی کے فاضل سپوت کے نام پر قرعہ فال پڑا۔ میاں بشیر احمد صاحب نے اپنے والد ماجد آنریبل خان بہادر جسٹس میاں محمد شاہ دین بی۔اے بیرسٹرایٹ کی یاد اور یادگار میں چشم بد دور رسالہ ہمایوں جاری کیا۔ میں اس رسالے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے اُن کو پُورا کرنے کے لئے اس رسالے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا جاتا۔ مضامین اچھے۔ زبان اچھی۔ نظم اچھی۔ نثر اچھی۔ اخلاقی معیار بلند۔ ادبی نصب العین بلند۔ لکھائی اچھی۔ چھپائی اچھی۔ کاغذ اچھا۔ وقت پر چھپنا وقت پر پہنچ جانا۔ غرض جتنی خوبیاں درکار ہیں وہ سب موجود ہیں۔ پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کے سامنے ادبیات عالیہ کا ایک صیحح و وسیع تصور اور اُس کے بہترین نمونے پیش کرنا اُن کو تقلید جامد کی پامال تنگنائ

سے نکال کر جدت خیال و بیان کے وسیع گلزاروں کے رنگ و بو سے بہرہ اندوز کرنا اس رسالے کی خصوصیات سے ہے۔ کیوں نہ ہو۔ جنہوں نے میاں شاہ دین مرحوم کو دیکھا ہے وہ شہادت دینگے کہ جس رسالے کا نام اُن کا تخلص ہو۔ جو اُن کی یادگار کے طور پر جاری کیا جائے اور جس کا مدیر اُن کا بیٹا ہو وہ ایسا ہی ہونا چاہیئے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مرزا محمد سعید صاحب ایم اے آئی ای ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ "ہمایوں" نام اس رسالہ کی ترقی کیلئے مُبارک فال ہے + اور یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوتی ہے کہ ہمایوں اپنی خاص روش پر نہایت خوبی اور سلامت روی کے ساتھ روزافزوں ترقی کر رہا ہے + اسکے مضامین نہ تو اس قدر دقیق ہوتے ہیں۔ کہ قاموس اور صراح کی مدد کے بغیر اُنکے مفہوم تک پہنچنا دشوار ہو۔ اور نہ عامیانہ کہ لطیف طبائع اُنکے مطالعہ کو گراں تصور کریں + مضامین کے انتخاب میں ادبی لطافتوں کے ساتھ ساتھ مفید معلومات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور اُن ناظرین کے رجحان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا جو محض تفریح طبع کے لئے مخزنوں اور رسالوں کا مطالعہ کرتے ہیں + اس جامعیت کی بناء پر رسالہ "ہمایوں" ہر دلعزیز بننے کا مستحق ہے۔ اور اُمید ہے کہ اسکے شائقین کی جماعت روز بروز بڑھتی جائیگی + میرے معزز دوست ایڈیٹر "ہمایوں" کی خواہش ہے کہ رسالہ کے مفاد کی توسیع کے لئے اگر کوئی تجویز میری سمجھ میں آئے تو اُسکو بھی پیش کر دیا جائے + اگرچہ حکمت بہ لقمان آموختن کا مصداق ہے لیکن محض تعمیل حکم کے خیال سے میں یہ تجویز پیش کرنیکی جرأت کرتا ہوں۔ کہ اُردو زبان کی ادبی و علمی تصانیف کی مفصل تنقید پر آئندہ زمانہ میں خاص توجہ کی جائے + بہت سے لوگ ہیں جو اُردو کی جدید مطبوعات سے آگاہ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن جہانتک میرا علم ہے کوئی اُردو مخزن یا رسالہ ان لوگوں کی راہنمائی کو اپنا فرض خیال نہیں کرتا + یہ چند سطور "ہمایوں" کے گوناگوں محاسن کی داد دینے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن چونکہ لفاظی۔ خلوص کی دلیل نہیں یہ مختصر تحریر میری عقیدت کے اظہار کے لئے کافی ہے +

محمد سعید

خانصاحب جناب میاں عبدالعزیز صاحب مہتمم بندوبست جھنگ۔ چار سال میں ہمایوں کو

اڑتالیس دفعہ موقع ملا کہ دیر سے شائع ہوکر خریداروں کے شوق کی بیتابیوں کا اندازہ لگائے مگر یا اسکے مدیروں کو معذرت کے مضامین لکھنے نہیں آتے یا ان کے دلوں میں ناظرین کی بے انتہا عزت ہے میاں بشیر احمد آکسفورڈ میں رہ چکے ہیں اور مزید براں بیرسٹر ہیں اس لیئے یہ تو ناممکن ہے کہ وہ معذرتوں کے مصنوعی پھول نہ برسا سکتے ہوں۔ یہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمایوں کی باقاعدگی ناظرین کے جذبات کے احترام کا قابل قدر ثبوت ہے۔ یہ سوال کہ یارانِ نکتہ دان کی طرف سے اس ادائے خاص کی قدرشناسی کیا عملی صورت اختیار کرے کچھ مشکل نہیں۔ ان کے دل ضرور کہہ رہے ہونگے "چاہے اچھوں کو جتنا چاہے" کیونکہ کیا بلحاظ کتابت کیا بلحاظ مضامین ہمایوں اچھوں سے اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمایوں کی اشاعت کی توسیع کی کوشش کرنا اردو خوان پبلک کی خدمت کرنا ہے کیونکہ مقبول ماہوار رسالوں میں یہی ایک رسالہ ہے جس کے دلچسپ قصے عریانی کے چھچھورا پن سے خالی ہیں اور جس کے دوسرے مضامین معلومات سے لبریز ہیں ؂

عبدالعزیز



فہرستِ مضامین

جلد ۹	بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۶ء	نمبر ۲

جہاں نما

علیگڑھ میں اجتماعِ قومی۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علیگڑھ میں مسلمانوں کا مجمع اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں مدت تک یادگار رہیگا۔ یہ ایک ایسا مجمع تھا جس سے اسلام کی گذشتہ عظمت یاد آگئی جس سے مسلمانوں کی آئندہ فلاح و بہبود کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ گیا۔ ظاہر ہوگیا کہ مسلمان جو پہلے ہی سے خوش وضع خوش لباس اور خوش گفتار رہیں، خوش انتظام پُر ایثار اور نیک کردار بھی ہوسکتے ہیں۔ مسلمان جو باتیں کرنی خوب جانتے ہیں کام کرنا بھی سیکھ سکتے ہیں۔ مسلمان جو جوش میں آکر عجیب و غریب اچھے بُرے کام کر لیتے ہیں استقلال سے کام لیکر ترقی کی ایک پائدار عمارت بھی کھڑی کر سکتے ہیں ۔

۲۵ دسمبر کو اُردو کانفرنس تھی۔ اُس میں تو وہی کچھ ہُوا جو ان اُردو کانفرنسوں میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے یعنی چند پُر جوش تقریریں چند دقیانوسی تجویزیں اور چند رسمی تائیدیں اور دوسرے دن شام کے مشاعرہ میں بھی سوائے دو ایک پُر جوش نظموں کے اور کچھ نہ تھا لیکن یہ ادبی انحطاط شائد اس لئے رُونما ہُوا کہ بعد کے زیادہ مفید جلسوں کی کارروائی سے ثابت ہوجائے کہ اب مسلمانوں کو علم ادب کی چاٹ کم اور جد وجہد کا شوق زیادہ ہوگیا ہے ۔

۲۶ کی صبح کو مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر سر عبد القیوم نے اپنا خطبہ پڑھا جو فی الحقیقت نہایت مفید اور دلچسپ تجاویز سے لبریز تھا۔ محترم صدر نے کہا کہ معزز پیشوں اور اعلیٰ مُلکی ملازمتوں میں یوں تو مُسلمانوں کو کم و بیش سبھی میں حصّہ لینا چاہیئے مگر یہ ضروری نہیں کہ اُنکو یہی دُھن لگی رہے کہ ہر ملازمت میں ہمیں ضرور معتدبہ حصّہ ملے، اسکی بجائے ملکی و ملّی ترقی کیلئے زیادہ سود مند یہ ہے کہ مُسلمان زیادہ تر اُن شعبوں کی طرف توجہ دیں جو اُنکی طبائع کے زیادہ موافق ہیں اور ہندو اُن شعبوں میں منہمک ہوں جو اُنکے زیادہ مناسب حال ہیں۔ مثلاً اگر مُلک کی تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے تو یہ تشویش کی وجہ نہیں بلکہ مُسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ صنعتی فنون میں سبقت لیجائیں۔ اگر ہندوؤں کے خون میں تجارت کا میلان موجود ہے تو مُسلمانوں کے خون میں صنعت وحرفت کا رُجحان ہے۔ اگر وہ لین دین کے ماہر ہیں تو ہم کلوں کے دھنی بن سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ فاضل صدر نے تعلیمی نصب العین کا ذکر کر کے تحقیقِ علمی پر زور دیا اور خوب کہا کہ جب میں سرکاری ملازمتوں میں تمہیں اپنے مناسب حقوق پر زور دیتے سُنتا ہوں تو تعجب کرتا ہوں کہ کیا تمکو کبھی ہندوؤں کے علمی کارناموں پر بھی رشک آیا ہے یا نہیں؟ تم اپنی سیاسی غلامی کی باتیں کرتے ہو لیکن

کیا کبھی تم نے اپنی ذہنی غلامی پر بھی غور کیا ہے؟" کیا خدا نے حکم نہیں دیا کہ ہم قدرت کا مطالعہ کریں تاکہ اسکے ذریعے سے ہم اُسکو پا سکیں"؟ پھر زراعتی تعلیم کا ذکر کر کے کہا کہ مسلمانوں کو سب سے پہلے اس شعبۂ تعلیم کی طرف توجہ کرنی چاہیئے + اخلاقی تعلیم کی طرف متوجہ کر کے کہا کہ اپنے نوجوانوں کو اسلامی صفات و اخلاق سے مزین کر کے زبردست شخصیتیں پیدا کرو کیونکہ آجکل کے مسلمان دُنیا بھر میں سب سے زیادہ غیر متحد اور غیر منتظم لوگ ہیں جس کا بڑا سبب انکی ضد انکی انانیت اور اُن کا ایک دُوسرے کی عزت نہ کرنا ہے۔ نسوانی تعلیم کے مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ میرے نزدیک عورتوں کی تعلیم جمع تفریق کا ایک سوال ہے۔ جب ہمیں قوم میں زیادہ سے زیادہ بکار آمد شخصوں کی ضرورت ہے تو جتنی پڑھی لکھی عورتیں زیادہ ہونگی جمع میں اضافہ ہوگا اور جتنی زیادہ اَن پڑھ رہینگی قومی جمع کم ہوتی رہیگی۔ اگر یورپ کی عورتیں جنگِ فرنگ کے زمانے میں مردوں کا کام خود نہ سنبھال لیتیں تو وہاں کے مرد میدانِ جنگ میں جا کر اپنے مُلکوں کی حفاظت میں یوں جانیں نہ لڑا سکتے +

خطبۂ صدارت ختم ہُوا تو نسوانی پردوں کی طرف سے اک مشتبہ غُل بلند ہُوا۔ پہلے پہل تو اسٹیج نشینوں نے اسے تضیع اوقات کا موجب سمجھ کر اس پر کچھ توجہ نہ کی لیکن جب حاضرین کا میلان دیکھا کہ بہت سے اپنی نشستوں سے اُٹھ اُٹھ کر اُدھر کا رُخ کر رہے ہیں تو طوعاً و کرہاً پوچھا اور معلوم کیا کہ اک خاتون پردے کے پیچھے سے اُن حضرت کے خلاف اپنی کمزور آواز بلند کر رہی ہے جنھوں نے شب گزشتہ حکم صادر کر دیا تھا کہ عورتیں کانفرنس میں نہ گھسنے پائیں۔ اُنکے لئے یہ کافی نہ تھا کہ ان بیچاری ناقص العقلوں کو اسٹیج سے دُور ایسی جگہ دے دی جہاں کسی مقرر کی آواز نہ پہنچتی تھی نہیں بلکہ نادر شاہی حکم دیدیا کہ پردہ گاہ کی چلمنیں اُٹھا دی جائیں اور کرسیاں اوندھی ڈال دی جائیں۔ لیکن حضرت کو یہ خیال نہ تھا کہ جس ترقی کی ہوا سے قوم کا گلشن لہلہا رہا ہے وہ ذرا سی اُن ننھی نازک کلیوں کو بھی چھو گئی ہے جنکو اس سے قبل مردوں نے اپنے گرم خانوں میں محفوظ کر رکھا تھا + حامیانِ نسوان کی مدد سے کرسیاں بچھ چکی تھیں چلمنیں چھوڑ دی گئیں تھیں اور اب عورتیں مردوں سے اس گستاخی اس ظلم اس بے انصافی کا جواب طلب کر رہی تھیں + پردہ پسند بڑی دقت میں پڑ گئے۔ اگر ان بھونروں کو صحنِ چمن میں چبوترے کے پاس جگہ دیدی ہوتی تو خیر گذرتی لیکن اب پسِ پشت ڈال کر اُنکو بھڑوں کا چھتہ بنا لیا جس میں سے ایک چالاک بھڑ نے وہ غُل مچایا کہ اکثر باغبان سٹپٹا گئے +

مصلحت اندیش صدر نے اجازت دی تو محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ اسٹیج پر آئیں اور ایسی تقریر کی کہ مخالفین کے چھکے چھوٹ گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ مردوں کو یہ اختیار کیونکر ملا کہ خدا نے جو صریح حقوق ہم عورتوں کو عطا کئے ہیں وہ آپ ہم سے چھینیں۔ آپ مدتوں ہم پر ظلم کرتے آئے ہیں اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی آزادی کو اپنے ہی ہاتھوں سے حاصل کریں + اس واقعہ کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ حاضرین نے بار بار تالیاں

بجا کر مقرّرہ کے خیالات کی داد دی گویا صاف ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کے تعلیمیافتہ مسلمان اب دراصل ان بندشوں سے اُکتا چکے ہیں جو مذہب کے احکام کے خلاف اُنکی سمجھدار نیک خصلت عالی حوصلہ عورتوں پر عائد ہیں۔ علیگڑھ میں اکثر تعلیمیافتہ طبقے کے یہی خیالات تھے کہ اب زمانہ اک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ مغرب میں تو عورتیں اکثر باتوں میں مردوں کے مساوی ہیں ہی لیکن اسلامی ممالک میں بھی عورتوں کو جا بجا آزادی مل رہی ہے ترکی مصر ایران طونس کہیں یہ کیفیت نہیں کہ عورت کو چار دیواری کے اندر قید کر کے رکھا جائے پھر ہندوستان کے مسلمان کب تک اس موروثی جہالت کے پردے اپنی عقل اور عورتوں کی شکل پر ڈالے رہیں گے! غرض قومی اجتماع میں عورتوں نے بھی اپنی ہمت کی داد پائی اور خوب پائی!

اسی روز سہ پہر کو یونین ہال میں ایک "بین جامعہ" مباحثہ منعقد ہوا جسے دیکھ سُن کر آکسفورڈ اور کیمبرج کے مباحثے یاد آ گئے سوال یہ تھا کہ ملکی ترقی کے لئے اک ملّی جامعہ زیادہ مفید ہے یا اک غیر ملّی غیر مذہبی جامعہ۔ الٰہ آباد بنارس دہلی پشاور کے ہندو مسلمان طلباء شریکِ مباحثہ تھے۔ انعام پشاوری مقرر کو ملا۔

۲۷ کو لیڈیز کانفرنس کی کارروائی پس پردہ ہوا کی۔ شام کو جوبلی ہال میں مسلم یونیورسٹی یونین کا وہ زبردست مباحثہ منعقد ہوا جو سننے والوں کو مدتوں یاد رہیگا۔ معرضِ بحث یہ تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں ملّی فرقہ دارانہ طرزِ عمل کو چھوڑ کر قومی ملکی طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ اک نوجوان علیگ جو حال ہی میں انگلستان سے متعدد اعزازات حاصل کر کے آئے ہیں اس بحث کے محرّک تھے اور اک کم نوجوان علیگ اُنکے مخالف تھے۔ قابل محرّک نے نہایت خوبی کے ساتھ اپنے مسئلے کو پیش کیا اور حاضرین سے درخواست کی کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ملک شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو تو فرقہ بندی چھوڑیئے اور قوم بندی سیکھیے۔ یہ جُداگانہ تحریکیں یہ مخالفتیں یہ مقابلے یہ معرکے کبتک رہینگے؟ آپ جب بھی اپنے لوگوں کو اک قوم بنانا چاہیں گے اپنے مُلک کو صحیح معنوں میں اک ملک بنانا چاہیں گے آپ کو یہ باتیں چھوڑنی پڑیں گی اور قومی طرزِ خیال سیکھنا پڑیگا اور بغیر سیکھے بغیر اختیار کئے قومی طرزِ عمل خود بخود کبھی حاصل نہ ہو سکیگا۔ مخالف کے جواب کے بعد اسلامی ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈروں نے یکے بعد دیگرے آ کر محرّک کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ ملّی و اسلامی قوت کے حصول اجتماع اور عمل کی گھڑی ہے ہندوؤں کے ساتھ مل کر محض قومی مُلکی کام کرنیکا وقت نہیں۔ مسلمان مقابلۃً کم تعلیمیافتہ کم دُور اندیش کم زر دار کم بیدار ہیں اُنکے لئے موجودہ حالات میں جُداگانہ نیابت اور جُداگانہ ترقی قطعی طور پر لازم ہے۔ ہندو ہم سے آگے ہیں اُنکے اور ہمارے پاؤں میں قومی طرزِ عمل کی ایک ہی رسی کے بندھنے سے ہم اور وہ اکٹھے نہیں دَوڑ سکتے۔ پہلے کوشش کر کے اُن تک پہنچئے پھر مل کر جتنا تیز

چاہیئے دوڑ پیئے + مسٹر جناح اور سر محمد شفیع کی تقریریں نہایت مدلل اور مؤثر تھیں اور حاضرین اُنکے خیالات کے ساتھ ہمہ تن متفق نظر آتے تھے + اسکے بعد نوجوان محرک اپنی آخری جوابی تقریر کے لئے اُٹھے۔ انھوں نے اپنے فی البدیہ جواب سے حاضرین کے دلوں کو مسخر کرلیا اور فی الجملہ اُن نکتہ چینوں پر بھی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھادی جو اُنکی ابتدائی تقریر کو محض اک تیار کردہ لکچر سمجھے ہوئے تھے۔ اُنکی انگریزی کی قابلیت اُن کی تقریر کی روانی اُن کے جواب کی برجستگی اُنکے چہرے کی شرافت و معقولیت اور اُنکی وہ صداقت جو اُنکے اس اعتراف سے ظاہر ہوگئی کہ واقعی ابھی ہم اپنی فرقہ دارانہ نیابت کو نہیں چھوڑ سکتے ان سب خوبیوں نے موافق و مخالف ہر شخص کو اُنکے طرز بیان کا گرویدہ بنالیا اور مجلس نے اُن کی تجویز زیر بحث کو منظور کیا + ہندوستان کے مُسلمانوں میں جب غلام السیدین جیسے قابل سپوت موجود ہیں تو کون اُن پر یہ جھوٹا بُہتان باندھ سکتا ہے کہ وہ اک مُردہ قوم ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی صلاحیتیں برقی لہریں ہیں جو قوم کے جسم و جان میں پے در پے دَوڑ رہی ہے + اگر یہ نوجوان اپنی جدوجہد کے ساتھ اپنے دل و دماغ کو خودداری و فروتنی کے جذبات سے معمور کئے رہیں گے تو یقین رکھیئے کہ اُنکی یا قوم کی ترقی کو روکنے والا اِس دُنیا میں کوئی نہیں!

۲۸ کو جوبلی کا جشن تھا۔ پنڈال رنگ و تناسب اور شعر و حسن کا ایوان معلوم ہوتا تھا جہاں پچاس سال کے بعد اک باہمت بزرگ کی محنت کے کارنامے پیشِ نظر تھے۔ کہنے والوں نے وہی کچھ کہا جو سُننے والوں کے دل میں خود بخود اس موقع و محل کو دیکھ کر اُتر رہا تھا + پچاس سال ہُوئے کہ سر سید مرحوم و مغفور نے اک چھوٹے سے سکول کی بنا ڈالی جس میں صرف پچاس طالب علم تھے۔ پچاس سال کے بعد وہی اک پُرعظمت یونیورسٹی ہے جس میں آج کم و بیش پونے تین ہزار نوجوان تعلیم پا رہے ہیں۔ پچاس سال ہُوئے کہ مرحوم بانیٔ علیگڑھ نے ہندوستان میں تن تنہا اپنی آواز بلند کی۔ اسکے پچاس سال بعد علیگڑھ میں اسی تعلیمی جشن میں دس ہزار سے زائد مُسلمان مُلک کے کونے کونے سے آکر شریک ہُوئے + یہ ہمتِ مردانہ کا اک کرشمہ ہے نعمتِ خداوندی کا اک نمونہ ہے کہ قومِ مُردہ زندہ ہوگئی۔ اُٹھ بیٹھی اور دیکھنے لگی کہ میرے گرد کیا کچھ ہورہا ہے۔ میدانِ ترقی میں چل نکلی کہ میں بھی کچھ کر گذروں۔ دُنیا دیکھ رہی ہے اور حیران ہے کہ کیا ماجرا ہے۔ صدیاں ہُوئیں وہ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر اس سے بھی زیادہ حیران تھی!

سہ پہر کو نواب سر مزمل اللہ خاں کے عالیشان مکان پر ایک گارڈن پارٹی دی گئی جس میں نائے و نوش سے زیادہ لُطف پُرانے دوستوں اور نئے صاحبوں سے مُلاقات کرنیکا تھا۔ حیدر آباد۔ کشمیر۔ کوئٹہ

کلکتہ دہلی لکھنؤ پٹنہ کہاں کہاں کے احباب یکجا ہوئے۔ جن کو برسوں سے نہ دیکھا تھا وہاں ایسے وقت میں اُن سے مُلاقات ہُوئی جب دل یوں بھی اسلامی جذبات سے معمور ہو رہے تھے ؛

۲۹ کو کانووکیشن (تقسیم اسناد) کا جلسہ تھا۔ اس تقریب پر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا نے ایک دلچسپ خطبہ پڑھا۔ جس کے بعد مسلم یونیورسٹی کی طرف سے مہاراجہ الور کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ مہاراجہ موصوف کی جوابی تقریر نے حاضرین کو مسحور کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا ذکر کرتے ہُوئے انہوں نے فرمایا کہ یہ قومی اتحاد سیاسیات کے عالیشان مشترک نصب العین بنانے سے کبھی حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے حصول کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہبوں کے صحیح مفہوم کو سمجھیں اُن کے سیدھے رستوں پر چلیں یہاں تک کہ وہ مختلف رستے اُس ایک راہ میں مل جائیں جہاں ربانیت کا روشن شعلہ بلند ہے۔ وہی شعلہ ہے جس سے ہماری انفرادی انانیت جل کے راکھ ہو جائیگی اور وہ خودی ردنما ہوگی جو خدائی کی ترجمان ہے۔ یہی وہ شکل ہے جس سے ہمارے دل متحد ہونگے ایسے متحد کہ پھر کبھی اک دوسرے سے الگ نہ ہونگے ؛ کہا کہ "انسانی رُوح آخر اُسی شعلۂ ربانی کی اک چنگاری ہے جس کے لئے وہ بے کل و بے تاب رہتی ہے اور نوع انسان کے تمام رہنماؤں کے سامنے ہمیشہ یہ سوال درپیش رہا ہے کہ یہ کیونکر اُس شعلۂ درخشاں میں جا ملے۔ بس اسی تلاش و جستجو کا نام مذہب ہے "؛ مہاراجہ ممدوح نے بعد میں مسلم یونیورسٹی کو الور سے اک تار بھیجا کہ علیگڑھ میں میں محبت کے اک سمندر میں تیرا کیا ہوں۔ وہ بھی میرا اک گھر تھا۔ جس سے میں اپنے اس گھر میں آیا ہوں "؛ خدا دائم و قائم رکھے ایسے روشنضمیر ہندوؤں کو کہ ایسے ہی لوگ اتحادِ مُلکی کا آسان ترین آلہ بن سکتے ہیں جو نہ صرف خود مُسلمانوں سے محبت کرنے لگیں بلکہ اُس محبت کا جو مُسلمان اُن سے رکھتے ہوں یوں صاف صاف اعلان کر دیں ؛ اس تاریکی میں بھی کیسی کیسی پیاری روشنیاں جلوہ گر ہیں !

سہ پہر کو تنظیم کانفرنس ہُوئی جس کے فاضل صدر مسٹر عبداللہ یوسف علی نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ مُسلمانوں کی تنظیم کوئی نئی شے نہیں۔ وہ ہندوؤں کے خلاف قائم نہیں کی گئی۔ مُسلمانوں کی ترقی مُلک کی ترقی ہے کیونکہ کسی زنجیر کی طاقت اُس کی سب سے کمزور کڑی کی طاقت سے زیادہ نہیں ہو سکتی ؛ انہوں نے مُسلمانوں کی معاشی ترقی پر خاص طور پر زور دیا اور کہا کہ یہ نہ سمجھے رہو کہ مُسلمانیت معاشیات کے منافی ہے۔ بیت المال قانونِ اوقاف محاصل عام و خاص حقوق یہ کیسے پیدا ہُوئے جغرافیہ اور مساحت اور الجبرا اور کیمیا یہ کیونکر پھُولے پھلے ؟ پھر سمجھایا کہ آپ کا معاشی انحطاط نتیجہ ہے اس بات کا کہ آپ کی سیاسی اور معاشرتی فضا بدل گئی لیکن آپکی معاشی نظر جُوں کی توں رہی۔ وقت ہے کہ آپ اس نظر کا زاویہ بدل ڈالیں !

۳۰ر اور ۳۱ر کو لیگ کے جلسے تھے۔ سر عبدالرحیم کی سخت کلامی نے برادرانِ وطن کو چراغ پاکر دیا۔ اگرچہ انکی بعض باتیں سچی تھیں لیکن مشکل یہ ہے کہ سچ عموماً تلخ ہوتا ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ صدر نے یہ باتیں اپنی ملت کو جگانے کے لئے کہیں ہمسایہ ملت کو ستانے کے لئے نہیں کہیں۔ سیاسی مطالبات کے متعلق چند مفید تجاویز منظور کی گئیں جن کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور ترکی کی حمایت تھا۔

غرض ہفتہ بھر علیگڑھ میں اس لطف سے وقت گذرا کہ کبھی نہ بھُولے گا۔ اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جمعیت ہیں اگرچہ نہایت پراگندہ ایک قوم ہیں اگرچہ آپس میں بہت لڑنے بھڑنے والی۔ ہم مذہب ہیں اور بیشتر امور میں ہمخیال ہو سکتے ہیں۔ سمجھ چکے ہیں کہ ترقی کئے بغیر وہ ہندوؤں سے اپنے حقوق نہیں لے سکتے اور ہندوؤں سے متحد ہوئے بغیر انگریزوں سے اپنے قوم و ملک کو رہا نہیں کر سکتے۔ اُنکا نصب العین یہ ہے کہ مُلکی زندگی کے مختلف شعبوں میں جدوجہد کریں۔ کسبِ کمال کریں۔ حصولِ علم کریں دولت پیدا کریں۔ عزت پیدا کریں۔ اسلامی اخلاق کا سبق سیکھیں ہندی اتحاد کی راہ پر چلیں۔ اگر وہ زیاں کار بنے رہیں گے تو اپنے اور غیر سب اُن کو ٹھکرائینگے اگر وہ کام میں منہمک ہو جائیں گے تو اپنے پرائے سب انہیں سر آنکھوں پر بٹھائینگے! اگر یہی تعلیم اگر یہی تنظیم اور اگر یہی ملّی ترقی ہے تو یقیناً تہذیب و تمدن اور قومی و ملکی ترقی بھی یہی ہے!

ب

نرگس کا اِک پھُول

مغربی مُلک سوئٹسان کے شہروں ترو میں اک خوش منظر جھیل کے کنارے ہر سال بہار کے دنوں میں اک میلا لگتا ہے جسے وہاں کے چمن زاد لوگ نرگس کا میلا کہتے ہیں۔ اس میلے کی سب باتیں نرگس کے پھولوں سے ہوتی ہیں۔ سوانگ نرگس سے بھرتے ہیں آرائش نرگس سے کرتے ہیں گُل بازی نرگس سے ہوتی ہے۔ گانے بھی نرگس کے ہوتے ہیں۔ غرض اس روز زمین و آسمان نرگس کے جشن میں ہمہ تن غرق نظر آتے ہیں +

ہم مشرقی تو گُل و نرگس کے دلدادہ گُل و نرگس کے لئے روز و شب بُلبل و باغبان بنے رہتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عشق و نگہداشت حدِ خیال سے آگے نہیں بڑھتی + نرگس تو شاید بعض وضعداروں کے باغیچوں میں چشمک زنی کرتی ہے لیکن نرگس کی خوشیاں ہمارے حِصّے میں اکثر نہیں ہوتیں + ہماری خوشیاں خیالی ہوتی ہیں اور رنج و غم کو ہم خاص اپنے عزیزوں میں شمار کرتے ہیں! اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں سب چیزوں ہمارے لئے ہیں کہ خود بخود ہماری خدمت کریں خود بخود ہمیں خوش کریں۔ لیکن بات یہ ہے اک پھول بھی اتنا خود دار ہے کہ اگر اُس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ نہ اُگے گا اور اگر اُگے گا بھی تو جلد مرجھا جائیگا!

جانتے ہو ہر انسان کے گھر میں نرگس کا اک پھُول ہے! اُسکی پنکھڑیاں عورت کا سراپا ہیں اور اُسکی آنکھ عورت کا دل!

مانیٔ قدرت نے ان پنکھڑیوں میں حُسن و خوبی کی اک تصویر انسان کے سامنے رکھدی ہے اور خدا نے اس آنکھ میں محبت ہمدردی سے لبریز اک دل ہمیں دیا ہے + اسی سے گھر میں چہل پہل ہے اسی سے دل و دماغ معمور و معطر ہیں۔ اسی سے کام میں آرام ہے اسی سے کلفت بھی راحت اور اسی سے مشقت بھی مسرت بن جاتی ہے!

یہ نرگس کا پھُول کس کے لئے ہے؟ تیرے لئے اے مُرد انسان؟ نہیں تُو کس قدر کوتاہ اندیش تُو کس قدر خود پرست ہے! سوچ تو سہی کہ باغبان پھُول کی پرورش کے لئے ہوتا ہے نہ کہ پھُول باغبان کی پرستش کے لئے تو باغبان پھُول کے لئے ہے نہ کہ پھُول باغبان کے لئے!

ہاں پھر پھُول کس کے لئے ہے؟ یہ پھُول اُس عندلیب کیلئے ہے جو اے کم بیں! تجھے نظر نہیں آتی!

ح ب



نرگس کا ایک پھول

رنگوں کے ذریعہ سے سیرت کا مطالعہ

رنگین مزاج ایشیا رنگ پسندی کو اپنے مذاق کی اک خاص خصوصیت سمجھتا ہے، اور فی الحقیقت اس بارے میں دُنیا کا کوئی حِصّہ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ لیکن کیا رنگ صرف ذوقِ نظر ہی کی چیز ہیں یا ہماری سیرت (کیرکٹر) سے بھی ان کا کچھ تعلق ہے؟ غالباً اس حیثیت سے ایشیا میں اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔

بعض ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ زمانۂ گذشتہ کی متمدن قوموں کو بھی اس حقیقت کا کچھ مبہم سا احساس تھا یعنی وہ رنگوں کی پسند سے لطافتِ ذوق کا اندازہ کرلیتی تھیں۔ مگر اس کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ ان کی واقفیت بہت محدود، سطحی اور بے دلیل تھی۔

لیکن موجودہ زمانہ میں قدیم زمانہ کے ایک وہمی و بے بنیاد خیال نے اتنی وسعت اختیار کرلی ہے کہ "رنگوں کے ذریعہ سے سیرت کا مطالعہ" ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ اور ان کے اثرات و خصائص کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ انسان کے اخلاق و عادات کا کوئی جز اس سے باہر نہیں رہتا۔ رنگوں کے سیرتی خصائص اور جذباتی اثرات کی یہ ایک نہایت مفید و دلچسپ دُنیا ہے، جس سے آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے کی انسانی آبادی بالکل بے خبر تھی۔

حال کے نفسیاتی تجربات نے یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر شخص کا ایک خاص رنگِ طبیعت ہوتا ہے، اور اس کو اسی رنگ سے یا اس سے ملتے ہُوئے کسی دوسرے رنگ سے طبعی و روحانی مناسبت ہوتی ہے۔ اور اسی کے مطابق اس پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رنگوں کو دیکھ کر ہمارے اندر مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں بعض رنگ اطمینان و مسرت، عیش و نشاط اور سرگرمی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اور بعض رنج و غم، غیظ و غضب اور سستی و کاہلی کے، بعض رنگوں سے ہماری رُوح کو سُکھ اور چین ملتا ہے، اور بعض سے دُکھ اور درد۔ بعض رنگ ہمارے دماغ کو روشن کر دیتے ہیں، اور بعض تاریک۔ رنگوں کے جذباتی اثرات کی یہ باتیں رات دن ہمارے دیکھنے میں آتی اور ہم پر گذرتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ معاشرتی انجمنوں میں جب بہت سے لوگ ہمیں نظر آتے ہیں۔ تو کسی کو دیکھ کر ہم ملنے کے لئے بے چین ہوجاتے ہیں، کسی کے لئے شوق کی ہلکی سی گدگدی پیدا ہوتی ہے، کسی کی طرف صرف نظریں ہی اُٹھ کر رہ جاتی ہیں، اور کسی کو دیکھ کر طبیعت مکدر و منغض ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ملاقاتوں میں بھی ہمرنگی و غیر ہمرنگی کے

اثرات روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں، کسی سے ایک ہی ملاقات برسوں کے میل جول کی طرح شگفتہ ہوتی ہے، دل بے تکلف ہوئے بغیر مانتا ہی نہیں۔ اور کسی سے برسوں کی ملاقات بھی راہ چلتے کی ملاقات ہوتی ہے، جب کبھی ملتے ہیں دل فوراً بھینچ سا جاتا ہے اور اگر چاہیں بھی تو پوری طرح بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ کسی سے ایک دو ہی دفعہ کا ملنا شیر و شکر بنا دیتا ہے، اور کسی سے جتنا ملتے جائیں بے تعلقی اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی روزانہ زندگی میں ان اثرات کا مطالعہ کر سکتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ انسان کے جسم سے جو برق پارے ہر وقت خارج ہوتے رہتے ہیں وہ ہالہ کی صورت میں ہر وقت اس کا حلقہ کئے رہتے ہیں اور ان میں وہی رنگ غالب ہوتا ہے جو اس کی طبیعت کا رنگ ہوتا ہے۔ اور چونکہ ہم رنگی میں کشش باہم ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اس لئے ہم رنگ طبیعتیں دلی میلان کے ساتھ باہم ملتی اور فوراً شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ فلکی مسلمات اس کی تائید کرتے ہیں۔ اور تاریخ کی ذمہ دار زبان بھی ایک حد تک اس کی حامی ہے۔ لیکن اس صحبت میں گفتگو کے اس موضوع سے بحث نہیں۔ بلکہ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ کون کون سے رنگ ہمارے مزاج کی کن کن خصوصیتوں کو ظاہر کرتے ہیں ۔

اگرچہ اس اثر و تاثر میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، لیکن ایک رنگِ طبیعت کے دو مرد و عورت ایک مذاقِ طبیعت اور ایک اخلاق کے نہیں ہوتے۔ بلکہ دونوں کے اخلاق و رجحانات میں اکثر و بیشتر تقریباً بعد المشرقین ہوتا ہے ۔

سبز رنگ۔ مردوں میں اس رنگ کی پسند اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنی کوئی مستقل رائے نہیں رکھتے ہوا اور زمانے کے رُخ پر چلتے ہیں۔ ان کی ذہنیت پر تلوّن کی حکومت ہوتی ہے، ماحول کے اثرات کو بہت جلد مگر خوبی سے قبول کر لیتے ہیں۔ لوٹ مار، جنگ و جدل ان کی گھٹی میں ہوتی ہے۔ پرلے درجے کے ظالم و بے درد ہوتے ہیں۔ حسد، عداوت، کینہ پروری، انتقام ان کی فطرت ہوتی ہے۔ بات کے پورے ہوتے ہیں، اور آن پر جان دے دیتے ہیں (لیکن عموماً جان پر اسی وقت کھیلتے ہیں، جب بالکل سر ہی پر آ بنتی ہے) چاق چوبند ہوتے ہیں، قوت ارادی بہت زبردست ہوتی ہے، جو ٹھان لیں فوراً کر گذرتے ہیں۔ جس کام کو شروع کرتے ہیں بغیر ختم کئے نہیں چھوڑتے۔ بہت پھرتیلے اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ بہادری، زبان آوری، دلیری، خود غرضی، عیاری، نقالی، بہانہ بازی، لالچ اور خاص خاص صورتوں میں انتہا درجہ کی رحمدلی ان کا خمیر مایہ ہوتی ہے۔ دوست کے دوست دشمن کے دشمن ہوتے ہیں۔ آدمی کو خوب پرکھتے ہیں، غرض کے پیچھے کسی بات کا خیال نہیں کرتے۔ ننگ و ناموس پر اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ ہمیشہ برابر والے سے لڑتے ہیں، کمزور پر ہاتھ نہیں ڈالتے،

اندھی تقلید کرتے ہیں جس کو ایک دفعہ رفیق سمجھ لیں پھر اس کی اچھی بُری ہر بات پر آمنا وصدقنا کہنے لگتے ہیں۔ بلا کے جفاکش مگر ساتھ ہی بے انتہا عیاش، قانع بلکہ دُنیا سے متنفر لیکن حددرجہ دنیا پرست ہوتے ہیں۔ جب تک دُنیا ان کا ساتھ نہ دے پستی و فلاکت میں خوش رہتے ہیں جفا و جور نفسی خوشی سہتے ہیں اور جب ساتھ دے تو انتہا درجہ کے دنیا پرست ہوجاتے ہیں۔ اور فوراً اس طرح رنگ بدل لیتے ہیں کہ جیسے پوتڑوں کے امیر ہیں۔ ایسے لوگوں کو فنونِ لطیفہ سے بھی بہت مناسبت ہوتی ہے۔ خاصکر شعبہ تعمیر کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ مگر حکومت کی قابلیت اور علمی ذہنیت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ لوگ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں ۔

بخلاف اسکے اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں سست، کاہل، نکتہ چین، خوردہ گیر، عیب جو، خفیف الحرکت پریشان خیال، بے ڈھنگی اور آرام طلب ہوتی ہیں۔ دلیر مگر کم ہمت، دل کی اچھی مگر خود غرض۔ جو بات ایک دفعہ دل میں بیٹھ جائے پھر نہیں نکلتی۔ حسد اور غیرت کے جذبات بہت قوی ہوتے ہیں۔ لیکن عصمت وعفت کا کچھ بہت زیادہ خیال نہیں ہوتا نیکی پر آجائیں تو فرشتہ۔ اور بدی پر آجائیں تو شیطان! ایسی عورتوں کے عقائد سراپا اوہام ہوتے ہیں۔ انہیں فنونِ لطیفہ سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ کوئی کام دھیان سے نہیں کرتیں۔ بات بات پر نکتوڑے توڑتی ہیں۔ عام ذہنیت ناقص ہوتی ہے۔ علمی اشغال سے نفرت کرتی ہیں۔ اور اپنی انوکھی طبیعت کی وجہ سے دائرہ معاشرت میں ناپسند کیجاتی ہیں۔ اگر ایسی عورتوں کی باقاعدہ تربیت کی جائے تو اعلیٰ درجہ کی دستکار ہوسکتی ہیں ۔

نیلا رنگ ۔ اس رنگ کی طبیعت والے مرد تخیلی انسان ہوتے ہیں حسین مناظر سے لطف اندوزی، شعر و موسیقی میں انہماک، تکلف، نفاست، صفائی، اور دیدہ زیب پاکیزگی ان کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً تیز و طرار چوں چاں، رسا طبیعت، بلند خیال، خوش بیان اور عالی حوصلہ ہوتے ہیں تخیل اور استدلال میں جولانی ہوتی ہے، دل کے اچھے، زبان کے دھنی، رشک کے پتلے اور "رنگین مزاج" ہوتے ہیں۔ خودداری خود بینی کی حد تک ہوتی ہے۔ عزت دوست خوشامد سے خوش ہوتے، اور اس قسم کی ذرا ذرا سی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ ان کو علم و فن سے خاص شغف ہوتا ہے یہ من موجی اور لہریئے ہوتے ہیں، جی میں آجائے تو بچہ بچہ کا کہنا مان لیں، اور نہ آئے تو خدا رسول کا حکم بھی نہ مانیں، ان میں تقلید کا مادہ ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ ان کا دل لطف آگیں محبت کے لئے ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔ یہ عیش کے دلدادہ ہوتے ہیں اور رندی و ہوسناکی میں آگے پیچھے کا کچھ خیال نہیں کرتے معاشرتی رسوم کی پابندی کا انکو بہت خیال ہوتا ہے۔ اور اپنے عام پسند اخلاق کی وجہ سے سوسائٹی میں بہت جلدی اثر پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں استدلالی قوت بڑھی ہوئی اور ارادی قوت کمزور ہوتی ہے۔ حکومت و اقتدار کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن ان میں

حکومت کی اعلیٰ ذمہ داریوں کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انصاف اور محبت کی تول میں علانیہ ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ یہ ہر نئے خیال کا بڑے جوش سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ جذب کرنے اور جذب ہو جانے اور بات کو پانے کی ان میں خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ بڑے ظاہر دار ہوتے ہیں۔ بیدلی اور نفرت سے بھی اس طرح ملتے ہیں کہ دوسرے کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ایسے لوگ ادبیات کے جس شعبہ کی طرف توجہ کریں کمال پیدا کر سکتے ہیں ٭

لیکن اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں، سادگی پسند، محبت پرست، وفا شعار، نیک مزاج، صاف دل، ہنس مکھ، زود رنج، سریع الانفعال، راحت طلب، خوش سلیقہ، شرمیلی، حیادار اور اعلیٰ درجہ کی منتظم ہوتی ہیں۔ ان میں موقع و محل کے لحاظ سے ہر قسم کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ امیری ہو یا غریبی ہر حال میں خوش رہتی ہیں اور تنگی ترشی میں بھی اس طرح گذر کر لیتی ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ہمیشہ اچھائی پر نظر رکھتی ہیں۔ اور سختی کے دن صبر و شکر سے کاٹ لیتی ہیں۔ انکے شہوانی جذبات کمزور ہوتے ہیں۔ اترانے، اپھرنے، چیندرانے، اور طعن و تشنیع کرنے سے نفرت کرتی ہیں۔ شوہر کو خوش رکھنا اور اولاد پر جان چھڑکنا ان کی طینت ہوتی ہے ٭

زرد رنگ۔ اس رنگ کے شائق مردوں میں ایجاد و اختراع کا خاص ملکہ ہوتا ہے یہ جو کام کرتے ہیں مستقل مزاجی سے کرتے ہیں۔ ان کے طور طریق گو پسندیدہ نہیں ہوتے، اور یہ بہت اکل کھرے سے ہوتے ہیں، مگر عموماً قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ خیالی باتوں میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی دھن میں لگے رہتے ہیں میل جول کو پسند نہیں کرتے تنہا رہنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی، کینہ کپٹ اور دشمنی سے دور رہتے ہیں، خیالات میں رواداری اور حوصلہ میں وسعت ہوتی ہے، اپنی عزت و شہرت کے لئے دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ لکھنے پڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ محنتی، جفاکش، اوباش اور جلاتن ہوتے ہیں۔ جس کے دوست ہو جائیں اڑی تھڑی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ احسان کو کبھی نہیں بھولتے۔ ذرا سی مہربانی اور ہمدردی سے ہمیشہ ہمیشہ کو غلام ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے عقائد سیدھے سادے اور سراپا اوہامی ہوتے ہیں۔ جھاڑ پھونک، ٹونے ٹوٹکے پر ان کا ایمان ہوتا ہے۔ امن چین کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ جہاں آرام ملے وہیں خوش رہتے ہیں مگر بیکار بیٹھنا نہیں جانتے۔ اور نہ آرام کی خاطر کام کا نقصان کرتے ہیں۔ ان کی عام ذہنیت بہت ناقص ہوتی ہے۔ اپنی کوئی خاص رائے نہیں رکھتے۔ دوسروں کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی عموماً ناکامیاب ہوتی ہے ٭

لیکن اس رنگ کو پسند کرنے والی عورتیں بدگمان، شکی مزاج، اوہام پرست، تنگ خیال، حریص، لتری،

کاہل اور آرام طلب ہوتی ہیں، انہیں نہ شوہر کا خیال ہوتا ہے، نہ بال بچوں کا، رات دن لڑنا، بات بات پر روٹھنا، آوازے توازے کسنا، سارے کنبے کو بُرا بھلا کہنا، اپنے تئیں سب سے اچھا سمجھنا، اور لگائی بجھائی کرنا۔ یہ سب انکے خصائص ہیں، اول تو ایسی عورتیں دل لگاکر کوئی کام کرتیں ہی نہیں، مگر جب کرتی ہیں تو اچھی طرح کرتی ہیں۔ ان کا ارادہ لوہے کی لاٹھ ہوتا ہے، جس بات کو ٹھان لیں کئے بغیر نہیں مانتیں۔ گھرداری کی طرف جب تک توجہ نہ ہو لاکھ کا گھر خاک میں مل جائے تو پروا نہ کریں۔ مگر جب دل پر رکھ لیں تو مٹی سے سونا پیدا کردیں، پانی سے چراغ جلادیں۔ اگرچہ ان میں ذرا ظہور آوارگی کا مادہ بھی ہوتا ہے مگر دل ملے پروغا نہیں کرتیں۔ ایک دفعہ دل سے جس کا ہاتھ پکڑلیں اسی کی ہو رہتی ہیں، ایسی عورتیں ایسے شوہروں کو پسند کرتی ہیں جو ان کے فرمانبردار ہوں، ان کی ہر بات کا خیال رکھیں، انکی محبت کا جواب دیں، دولتمند و صاحب اقتدار ہوں اور ان کے سوا کسی اور سے لگاوٹ نہ رکھیں۔ اگر ان سب سے ایک بات بھی کم ہو تو ان کا دل بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ اور یہ اپنے ساتھ دوسرے کی زندگی بھی تلخ کردیتی ہیں +

بنفشئی رنگ۔ ایسے مرد جو بنفشئی رنگ سے دلچسپی رکھتے ہیں، عموماً سست مزاج، پست خیال، دُون ہمت، بزدل، نکھٹو اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ انہیں صرف کھانا اور اینڈنا آتا ہے۔ یہ علم وفن کے بھی کچھ ایسے شائق نہیں ہوتے۔ اور صرف ایسے کام کرسکتے ہیں جن میں نہ دماغ پر بار پڑے نہ جسم کو تکلیف ہو۔ دُنیا کی طرف سے ان کا دل سرد ہوتا ہے، اپنی مختصر سی معاشرتی دُنیا میں خوش رہتے ہیں۔ ترقی کی نہ ان میں امنگ ہوتی ہے اور نہ اس کے مطابق زندگی کی صلاحیت۔ سرگرمی، حوصلہ اور جوش نام کو نہیں ہوتا، ذراسی بات میں خوش اور ذراسی بات میں رنجیدہ ہوجاتے ہیں، ان میں کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جد وجہد کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اور اگر مارے باندھے ہمت کریں بھی تو ذراسی بات میں دل برداشتہ ہوجاتے ہیں۔ مذہبی پابندی کا ان کو بہت خیال ہوتا ہے، اور اپنے عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتے۔ سادہ مزاج اور سادہ دل ہوتے ہیں۔ علانیہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتے، مگر ان کی عادتیں اور ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نتیجہ لازماً لڑائی جھگڑا ہوتا ہے، یہ لوگ ذمہ داری کے کاموں کے نااہل ہوتے ہیں۔ انہیں بال بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے مگر ان کی خاندانی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی +

بخلاف اس کے ایسی عورتیں ضدی، وہمی، حد درجہ آرام طلب اور تنک مزاج ہوتی ہیں۔ جم کر کوئی کام نہیں کرسکتیں۔ ہوائی قلعے بنایا کرتی ہیں۔ پستی و زبونی کو سخت ناپسند کرتی، اور ہمیشہ عزت اور ترقی کی خواہش مند رہتی ہیں۔ حکومت اور اقتدار کا بھی ان کو شوق ہوتا ہے۔ خوشامد سے بہت خوش ہوتی ہیں۔ جو ان کی تعریف کرے اس سے محبت کرنے لگتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ اور اگر پڑھ لکھ

لیں تو دوسروں پر اپنی قابلیت کا خاصا رعب جما دیتی ہیں، اور سوسائٹی میں اثر پیدا کر لیتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ خاصکر گانے بجانے اور مصوری نقاشی سے انہیں فطری مناسبت ہوتی ہے۔ اور سیر تماشے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ایسی عورتوں کی کی شادی اگر ان کے ہم رنگ مردوں کے ساتھ کر دی جائے تو دونوں کی زندگی جیتے جی کا دوزخ بن جاتی ہے ؀

لیکن اگر اس رنگ میں سبز یا زرد رنگ کے ذرات تناسب سے زیادہ ہوں، تو ایسے مرد اور عورت سرتا پا جذباتی ہوتے ہیں۔ دونوں کسی ایک کے ہو کر نہیں رہ سکتے۔ جب تک دس سے نہ ملیں انہیں چین نہیں پڑتا اور یہ بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ان کا وجود سوسائٹی کے لئے مثل ناسور ہو جاتا ہے ؀

انگوری رنگ ۔ اس رنگ کے شائق مرد بلند حوصلہ، وسیع القلب اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کا استدلال قوی۔ مگر ارادہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ کسی کی قوت وسطوت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے ہیں، جو ایسی وسیع اور لچکدار ہوتی ہے کہ ہر ماحول میں اپنے بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے، اپنے تئیں اسی کے موافق ڈھال لیتے ہیں۔ ان کی ذہنیت بہت جدت پسند ہوتی ہے۔ غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں۔ ترقی و ترفع کے مدام خواہاں رہتے ہیں۔ جو شخص ان کا احترام نہ کرے یا ان کے وقار کو صدمہ پہنچائے۔ اس کو نیچا دکھائے بغیر نہیں مانتے۔ زعیمی و پیشوائی کی ان میں خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ مگر عملاً اس میں اکثر ناکام رہتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس سوچنے والا دماغ تو ہوتا ہے مگر کام کرنے والا ہاتھ نہیں ہوتا۔ سوجھ اچھی ہوتی ہے۔ اُپج کے آگے کسی کو چلنے نہیں دیتے۔ جس کام کی طرف توجہ کریں کمال پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن عملی قوت کے کمزور ہونے سے مادی فوائد حاصل نہیں کر سکتے۔ جذبات عقل کے زیر فرمان ہوتے ہیں۔ بات کو پھیلانے کا خاص مادہ ہوتا ہے۔ کسی قدر جری اور بیباک بھی ہوتے ہیں مگر ہاتھا پائی کے مطلب کے نہیں ہوتے۔ دماغی لڑائی خوب لڑتے ہیں، اور دشمن کو اپنی عقل کے زور سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے دلی خیالات ہمیشہ سربستہ رہتے ہیں۔ ایک طرف اتنے بلند کہ آسمان بھی اس کے آگے پست نظر آتا ہے، اور دوسری طرف اتنے پست کہ تحت الثریٰ بھی اس کے آگے بلند دکھائی دیتا ہے۔ دیر آشنائی انکی خُو، اور شیر و شکر ہو کر الگ تھلگ رہنا ان کا وتیرہ ہوتا ہے۔ یہ صرف ایسی سوسائٹی میں خوش رہ سکتے ہیں جو وسیع اور مہذب ہو۔ اور جہاں انکی قدر کیجائے، اور ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا احترام کرے۔ خود ان کی بھی یہی عادت ہوتی ہے، یعنی یہ ہر شخص کا اس کی مخصوص حیثیت کے مطابق واجبی احترام کرتے ہیں۔ یہ لوگ خاصے مستقل مزاج ہوتے ہیں مگر ہر وقت ایک ہی کام میں لگے رہنا پسند نہیں کرتے۔ وقت وقت سے ہر شغل کی طرف میلان ہوتا ہے ـــــ کبھی علمی مباحث، کبھی سیاسی مسائل، کبھی اصلاحی امور، کبھی ادبی لطائف، کبھی شعری چرچے۔ اور کبھی سور و سرود کی بزم آرائی!

لیکن باوجود ایسی طبیعت رکھنے کے ان میں اپنے وقار کا اتنا زیادہ خیال ہوتا ہے کہ اپنے یارانِ بادہ پیما سے پردہ رکھتے ہیں۔ قیافہ شناس اس بلا کے ہوتے ہیں کہ آدمی کو پہلی نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔ بہت محتاط ہوتے ہیں فوراً کوئی رائے قائم نہیں کرتے پیش بینی اور مصلحت اندیشی ان کے خمیر میں ہوتی ہے۔ ان سے بیجا فائدہ اٹھانا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ مگر جب محبت کا معاملہ آتا ہے تو یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی ذات اور اسکے متعلقات کو ہر حال میں ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔ اخلاص و محبت کے پردے میں جا و بیجا کام نکالنے کا ان کو خوب ڈھب آتا ہے۔ ان کی زبان دل سے اور دل عمل سے مختلف ہوتا ہے۔ بڑی رائے قائم کرنے میں بہت دیکھ بھال سے کام لیتے ہیں۔ مگر کسی صورت میں اس کو ظاہر نہیں کرتے۔ میل جول کے اچھے ہوتے ہیں۔ اگرچہ پہلی نظر میں ان کا اثر اچھا نہیں پڑتا مگر جوں جوں تعلقات بڑھتے جائیں جوہر کھلتے جاتے ہیں، اور سوسائٹی ان کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ عورت، موسیقی، حکومت، سیر تماشہ اور رنگ رلیاں ان کی رغبت کی چیزیں ہیں، اور یہی ان کی ساری تگ و دو کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ لوگ کامیاب ادیب، شاعر، مقنن، مدبر اور منتظم ہوتے ہیں۔

اسی طرح اس رنگ کی دلدادہ عورتیں نیک نفس، پاکباز، عفیف، شرمیلی اور نمائش پسند ہوتی ہیں۔ انتظام و اہتمام کی ان میں خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ بے سوچے سمجھے کوئی کام نہیں کرتیں۔ آزاد خیال اور آزادی پسند ہوتی ہیں حیاتِ معاشری کے متعلق ان کا مطمح نظر مکمل ترین آسودگی ہوتا ہے۔ اپنی عزت کا بہت پاس کرتی ہیں۔ توہین اور مخالفت کی مطلق برداشت نہیں ہوتی، زیادہ تر ہم خیالوں ہی سے ملتی ہیں۔ چھوٹے درجہ کی سوسائٹی میں بے تکلف نہیں ہوتیں۔ شوہر کی مرضی کو ہر بات پر مقدم سمجھتی، اور اس کو اپنے قابو میں رکھتی ہیں۔ ادبی اشغال سے بھی مناسبت ہوتی ہے۔ اولاد کی پرورش میں سختی سے کام لیتی ہیں۔ ان کا خاندان ان کا گھر ہوتا ہے۔ فضول کے میل جول سے گھبراتی ہیں۔ محبت کرنے والے سے محبت، اور نفرت کرنے والے سے نفرت کرتی ہیں۔ شعر و موسیقی، نقاشی و مصوری اور عیش و آرام کو دل سے پسند کرتی ہیں۔

لاجوردی رنگ ۔ اس رنگِ طبیعت والے مرد اوچھے، ناعاقبت اندیش، غصیل، جھلّے، متلون، ایترے اور بیحد نمائش پسند ہوتے ہیں۔ ان کی کسی بات میں استحکام نہیں ہوتا۔ جو بات کرتے ہیں بے سوچے سمجھے گھڑی میں رونا، گھڑی میں ہنسنا، گھڑی میں لڑنا، گھڑی میں ملنا۔ شوخی، چلبلاپن، بیہودگی، آوارگی، عیاشی، سخافت چالبازی، عیاری، بے حیائی، بدمعاشی، ان کے خمیر میں ہوتی ہے۔ جس سے بے تکلف ہو جائیں کسی بات کا پردہ نہیں کرتے۔ ترقی کے کوشاں رہتے ہیں، اور ہر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ معمولی سمجھ خاصی ہوتی ہے

تھوڑا بہت علمی شوق بھی ہوتا ہے۔ ہر ماحول کے موافق اپنے تئیں بنا لیتے ہیں۔ بطور خود ذمہ داری کے کام نہیں کر سکتے۔ منہ زور ہوتے ہیں۔ استقلال نام کو نہیں ہوتا، ہمیشہ برداشتہ خاطر رہتے اور در در مارے مارے پھرتے ہیں ترش رُوئی اور سخت کلامی سے آگ ہو جاتے ہیں۔ اور ہمت افزائی سے جان پر کھیل کر کام کرتے ہیں +

بخلاف اسکے ایسی عورتیں ظالم، بے درد، جھگڑالو، اور اقتدار پسند ہوتی ہیں۔ دل صاف مگر پیٹ ہلکا ہوتا ہے۔ دُودھ کے اُبال کی طرح غصہ آتا ہے اور میٹھی بات کے ایک ہی چھینٹے میں اُتر جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو حسب مرضی شوہر مل جائے تو ہمیشہ خوش خرم، نک سُک سے دُرست، اور گھر بار کے انتظام میں مشغول رہتی ہیں ورنہ انتہائی پھوہڑ، بے ڈھنگی، زبان دراز، بلائے جان۔ قدامت پسندی گو انکے خمیر میں ہوتی ہے لیکن تربیت اور صحبت کے اثر سے جدید خیالات کو بھی آہستہ آہستہ قبول کر لیتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ ان کا فطری میلان قصہ و افسانہ کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کی دماغی تربیت کی جائے تو مفید علمی کتابیں بھی دیکھ سکتی ہیں۔ ان کو اچھا پہننے اوڑھنے، بڑے لوگوں سے ملنے جُلنے، اور اپنے تئیں بہترین صورت میں پیش کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ عقل جذبات کے ماتحت ہوتی ہے۔ دولت، حشمت، وجاہت، گہنے پاتے پر جان دیتی ہیں۔ اور اگر صحبت یا جنس کے موقعے ملتے رہیں۔ تو رفتہ رفتہ آفاقی ہو جاتی ہیں +

سُرخ رنگ - اس رنگ والے مرد سوسائٹی کے عام اخلاق سے کسی قدر منحرف اور اپنے خود ساختہ رسوم کے پابند ہوتے ہیں۔ خود غرضی، حکومت تابی، ارادے کی پختگی، اصابت رائے اور خود اعتمادی ان کا خاص جوہر ہوتا ہے۔ اپنی رائے کسی قیمت پر نہیں بدلتے۔ وقت اور مصلحت کو خوب پہچانتے ہیں، اور اسی کے مشورے پر عمل کرتے ہیں واقعات کی صورت بدلنے میں ان کو خاص مہارت ہوتی ہے، اپنی ہار کبھی نہیں مانتے۔ دُھن کے پُورے ہوتے ہیں۔ جبتک اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہولیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ بلند ہمت، بلند نظر، بلند خیال ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں جلتے، ہمیشہ مہمات پر نظر رکھتے ہیں۔ حصول مقصد کے لئے ہر قسم کے وسائل فخریہ اختیار کرتے ہیں، اور اس میں نہ مذہب کی سنتے ہیں نہ اخلاق کی، نہ بدنامی کو دیکھتے ہیں نہ ذلت کو۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دھوکا فریب، مکاری، جعلسازی، دغابازی، افترا پردازی ان کی گھُٹی میں ہوتی ہے۔ طبعاً بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اپنے اصلی خیالات کا کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتے موقع آپڑے تو دُشمن کے بھی دوست بن جاتے ہیں۔ جو کام کرتے ہیں اچھی طرح اور جلدی کرتے ہیں۔ ترقی کی فکر اور جد و جہد سے کسی وقت غافل نہیں رہتے۔ ان کا دماغ پریشانیوں میں بھی فرخندہ حالی کی طرح کام کرتا ہے، مصیبت، پریشانی، اور خطرے میں ــــ ایسے خطرے میں، جس میں جان

جانے کا اندیشہ ہو، اپنی کرنی سے باز نہیں آتے۔ مخالف کو بُری طرح ذلیل کرتے ہیں۔ اور دشمن سے انتقام لئے بغیر نہیں ملتے۔ ان پر عقل اور جذبات، دونوں کی حکومت ہوتی ہے۔ اور موقع موقع سے ہر اک کا پلہ ہلکا بھاری ہوتا رہتا ہے، انتہائی ظالم اور جانب دار ہوتے ہیں۔ حق اور انصاف کے ان کے ہاں کوئی معنی نہیں۔ ان کی رحمدلی ہمیشہ اپنوں کے ساتھ، اور اپنی اغراض کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ کسی کو اپنے دل کے حال سے واقف ہونیکا موقع نہیں دیتے دیکھنے میں اچھے اور برتنے میں بُرے۔ خودغرض، لالچی، بہانہ باز، اور ابن الوقت۔ مگر قوم و ملک کے عاشق ہوتے ہیں، اور متحدہ اغراض پر ذاتی اغراض کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ خیالی دنیا کے گماشتے نہیں ہوتے، بات کو لے اڑنا، اور ہمہ وقت سرگرم عمل رہنا ان کا خاصا ہے۔ جو کام کرتے ہیں پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ حکومت کی ان میں خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ بے نظیر پیش بیں اور صحیح اندیش ہوتے ہیں ۔۔۔۔ یعنی خطرے کو پہلے سے محسوس کر لیتے اور اس کے دفعیہ کی تیر بہدف تدبیریں کرتے ہیں۔ بھول کر بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں نقصان کا احتمال ہو۔ مذہب و روحانیت سے سروکار نہیں رکھتے۔ مادی و ذہنی ترقی ان کا مطمح نظر ہوتی ہے۔ اپنے کو شریف اور دوسرے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تدبیروں اور چالوں کی لڑائی خوب لڑتے ہیں۔ کام لینے اور نکالنے میں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں +

اور قریب قریب یہی اخلاق اس رنگ والی عورتوں کے بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً آوارہ مزاج، اوباش خیال، آزادی پسند، راحت طلب، بزدل، اور نازک مزاج بھی ہوتی ہیں۔ باقی اور باتوں میں اپنے صنفی خصائص کو لئے ہوئے تقریباً ان ہی اخلاق کا نمونہ ہوتی ہیں +

مگر ایسے مرد جن کا جبلی رنگ گہرا سرخ ہوتا ہے، درشت مزاج، اکھڑ، ظالم، بے درد، ڈاکو، اور قاتل و سفاک ہوتے ہیں۔ اور ایسی عورتیں آفاقی و عیاش۔ یا پھر دنیا سے بالکل متنفر +

یہ تقریباً مرکزی رنگوں کی سیرت کا ذکر تھا۔ ہلکے رنگوں کے اخلاقی خصائص بالتفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ مختصراً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جن لوگوں کا خمیر مایہ ہلکے رنگ ہوتے ہیں، ان میں بنیادی طور پر کمی کے ساتھ وہی اخلاق ہوتے ہیں، جو مرکزی رنگوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن کی طبیعت کا قوام دو رنگوں یا کئی رنگوں کی چاشنی سے تیار ہوتا ہے۔ یا ایسے لوگ جن کا مزاج کئی مختلف رنگوں کی مساوی یا متناسب یا کم و بیش آمیزش سے ترکیب پاتا ہے، ان کی سیرت اسی تناسب سے مختلف اخلاقی خصائص کا مرکب ہوتی ہے۔ دھانی، بسنتی، پیازی، قرمزی، اگرئی، گلابی، لاگیری، اور فیروزی رنگوں کی طبیعت معتدل اخلاق ۔۔۔۔ ذمائم کی طرف کم، درمیلان، اوسط درجہ کی ذہنیت، ادبی ذوق، فنون لطیفہ سے شغف اور

پسندیدہ معاشری طبیعت کو ظاہر کرتی ہے ؛

سیاہ رنگِ طبیعت والے مرد وعورت انگوری اور سرخ رنگ کے اخلاق کا مجموعہ ہوتے ہیں کشمشی رنگ والے سبز اور کبودی رجحانات کا آمیزہ ہوتے ہیں۔ اور خاکی رنگ والے ، نیلے اور زرد رنگ کے مشترکہ اطوار کا نمونہ مگر انہیں فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور ایجاد و اختراع کی خلاقی قوتوں سے بھی تہی مایہ ہوتے ہیں۔ زردی مائل نیلے رنگ والوں کو آلاتِ ہلاکت بنانے سے جبلی مناسبت ہوتی ہے۔ اور نیلگوں خاکی رنگ والوں کا میلان اپنی بنیادی خاصیت کے ساتھ ہلکے نیلے رنگ کے خصائص کا آمیزہ ہوتا ہے، اس رنگ کی بنیادی خصوصیت سفاہت، درندگی، بدمعاشی، اور شرمناک آوارگی ہے ؛

لیکن یہ بالکل لازمی نہیں ہے کہ ان رنگوں کی طبیعت والے اشخاص کی من وعن یہی سیرت ہو۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ رنگوں کی غیر تربیت یافتہ سیرت ہے جو تعلیم وتربیت کی خراد پر چڑھ کر بظاہر اصلیت سے بالکل مختلف صورتیں اختیار کرلیتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص کا مزاجی رنگ نیلا یا بنفشئی ہو مگر اس کے اخلاق بالکل ویسے نہ ہوں، کیونکہ ماحول کے اثرات، تعلیمی عادتیں، معاشری آداب، بچپن کی تربیت اور معاشی زندگی ایسی کایا پلٹ کردیتی ہے۔ کہ انسان خود اپنے تئیں بھول جاتا ہے۔ اور اپنے تئیں ایسی صورت میں پیش کرنے لگتا ہے جو دراصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ نظر فریب ملمع ہوتا ہے۔ اور ایسی سیرت ہرگز اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ فرض کیجئے ایک شخص بُری عادتیں چھوڑ کر اچھی عادتیں اختیار کرلے۔ یا زیادہ صحیح لفظوں میں معائب کو چھپا کر محاسن کی نمائش کا اپنے تئیں عادی بنالے۔ تو کیا اس سے وہ فی الحقیقت ویسا ہو بھی جائیگا جیسا کہ وہ اپنے تئیں دکھاتا ہے ؟ یقیناً نہیں! قلب ہیئت کے ساتھ قلب ماہیت لازمی نہیں ہے۔ گو ظاہر بیں نگاہیں اس میں کوئی عیب نہیں دیکھتیں لیکن اصلیت بیں نگاہیں فوراً تاڑ جاتی ہیں کہ ساری چمک دمک نمائشی ہے۔ اصلیت کا جوہر اس میں نام کو نہیں اس کی مثال بالکل اصلی اور نقلی ہیرے کی سی ہے۔ دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت یکساں نہیں ہوتے اَن جان دھوکا کھا جاتا ہے۔ اور جوہری فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ نقل ہے اور یہ ہیرا ہے ؛

بارہا ایسا ہوا ہے کہ سبز اور لاجوردی مزاج والے، انگوری ماحول میں تربیت پانے کے باعث اتنے منقلب ہو گئے ہیں کہ ان سے تقریباً ویسے ہی افعال صادر ہونے لگے جیسے انگوری سیرت والوں سے ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے طبعی ماحول میں گئے تو ان کی نہادِ فطرت کے پردہ پوش خصائل اکبارگی بے نقاب ہو گئے۔ اور اس وقت وہ ایسی صورت میں نظر آئے جو اس صورت سے بالکل مختلف تھی، جس صورت میں اس سے قبل

نہیں دیکھا گیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ ہر رنگ کے متعلقہ اخلاق جو صفحات بالا میں لکھے گئے ہیں، کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ اِس رنگِ طبیعت والوں میں من کل الوجوہ پائے ہی جائیں۔ کیونکہ تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات کی تراش خراش جبلی عادتوں کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ البتہ جز وغالب ضرور اپنے رنگِ طبیعت کا ہوگا۔ اور اسی سے سیرتی مزاج کا کھوج لگانا چاہیئے

یہ بات کہ رنگِ طبیعت کس طرح معلوم کیا جائے۔ اس کا ابتک کوئی آسان اور قابلِ اطمینان طریقہ دریافت نہیں ہُوا ہے۔ تاہم جن طریقوں سے اس فن کا عملی مطالعہ کیا جاسکتا ہے وہ قارئین کرام کی آگاہی کے لئے لکھدیئے جاتے ہیں۔

پہلا اور زیادہ یقینی طریقہ خوردبین، اور اسی طرح کے دوسرے آلات کے ذریعہ سے دیکھنے کا ہے۔ اس سے ہالہ کے تمام رنگ معہ تناسب کے معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور نہایت آسانی سے رنگِ غالب کے کیرکٹر کو دیگر امیز شدہ رنگوں کے خواص کے ساتھ ترتیب دے لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ بہت اہتمام طلب ہے۔ اور اس سے روزانہ زندگی میں کام نہیں لیا جاسکتا۔

دوسرا طریقہ وجدان کے ذریعہ سے دریافت کرنیکا ہے۔ لیکن وجدان ایسی چیز نہیں ہے کہ ہر شخص کو حاصل ہو۔ گو بعض فلاسفہ اور ماہرین فن کا خیال ہے کہ خاص قسم کی تربیت اور مہارت سے انسان اپنے اندر کی اس پوشیدہ قوت کو ترقی دے سکتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ دولت حاصل ہوتی ہے وہ پہلی نظر میں ہر شخص کو اول سے آخر تک پڑھ لیتے ہیں۔ اگرچہ انکے پاس دوسروں کو اپنی رائے کے صحیح باور کرانے کی کوئی معقول دلیل نہیں ہوتی۔ مگر ان کو دل سے یقین ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ اور عملی زندگی کے تجربات میں جب ان کی رائے کو تولا جاتا ہے تو ان کی سچی فراست کا ہر شخص کو قائل ہونا پڑتا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ذاتی و خاندانی اخلاق و عادات، اور ماحول کے اثرات کی روشنی میں رنگِ طبیعت کی جستجو کی جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ شخصِ معلوم کی ذاتی عادتیں کیسی ہیں، اس کے والدین، بھائی بند، عزیز اقارب کے اطوار کس قسم کے ہیں۔ اور اس کا زیادہ وقت عموماً کیسے ماحول میں گذرتا ہے۔ اور پھر یہ سمجھتے ہُوئے کہ جس رنگ میں وہ اپنے تئیں دکھاتا ہے وہ اس کا اصلی رنگِ طبیعت نہیں ہے، نہایت گہری انتقادی نظر سے اس کا اصلی رنگِ طبیعت متعین کیا جائے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ ظاہری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال اور پہناوے کو رنگ پسندی کے نقطۂ نظر

سے دیکھ کر رنگِ طبیعت معلوم کیا جائے۔ لیکن یہاں رنگِ پسندی سے مراد وہ عام رنگ پسندی نہیں ہے، جس کا مادہ فطرت نے ہر شخص میں ودیعت کیا ہے۔ بلکہ یہاں رنگ پسندی سے مراد اپنی طبیعت کے رنگِ غالب کے ساتھ وہ عمیق روحانی شیفتگی ہے جو دل ودماغ پر لطف ومسرت اور شوق وطلب کے از خود رفتہ کر دینے والے جذبات طاری کر دیتی ہے۔ ایسی رنگ پسندی جو صرف لطف نظر تک محدود ہو، یہاں خارج از بحث ہے +

یہ دونوں آخرالذکر طریقے گو سہل الحصول ہیں۔ لیکن ان میں بہت احتیاط، اور وقت نظر کی ضرورت ہے۔ جبتک وسیع تجربہ اور اعلےٰ مہارت حاصل نہ ہو، اپنی رائے پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ جلد بازی سے صحیح بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس میں بعض اوقات اچھے اچھوں سے چُوک ہوجاتی ہے +

ابوالخیر مودودی

شاعر کا دِل

شاعر کا دل زندگی کی موجوں پر ہوا اور پانی کی آوازوں کے درمیان تیرتا ہے اور گاتا ہے + اب جب کہ آفتاب غروب ہوچکا ہے اور تاریک آسمان سمندر کی سطح پر اس طرح مائل ہے جیسے جُھکی ہُوئی پلکیں کسی تھکی ہُوئی آنکھ پر تو وقت ہے کہ وہ اپنے قلم کو اُٹھا کر رکھ دے اور اپنے خیالات کو سمندر کی تہ میں اُس خاموشی کے ازلی راز کے عین بیچوں بیچ غرق ہونے دے +

وہ رستہ جانتے تھے

وہ رستہ جانتے تھے اور پھر بھی اک تنگ سی پگ ڈنڈی پر تیری تلاش میں نکلے لیکن میں اندھیری رات میں سرگرداں رہا کیونکہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ تاریکی میں تجھ سے ڈرتا اسی لئے میں تیری دہلیز پر بغیر سمجھے بُوجھے آ پہنچا +

عقلمند آدمیوں نے مجھے جھڑکا اور کہا کہ یہاں سے چلا جا کیونکہ میں پگ ڈنڈی پر سے نہ آیا تھا میں شک وشبہ میں مُڑا لیکن تُو نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا اور انکی جھڑکیاں روز بروز زیادہ بلند ہوتی گئیں !

(گلچیں)

محبت کی اوّلیں سرگذشت

Best.

وہ ترا روزِ ازل گرمِ تماشا ہونا
وہ مرا پہلے پہل تجھ سے شناسا ہونا

وہ ترا پردۂ تفرید سے باہر آنا
وہ مرا سرمۂ توحید سے بینا ہونا

وہ ترا ساغرِ صہبائے محبّت دینا
وہ مرا مستِ مئے شوق و تمنا ہونا

وہ ترا باہمہ انداز مرا دل لینا
وہ مرا بادلِ و جان عاشقِ شیدا ہونا

وہ ترا حاضر و غائب مرے آگے رہنا
وہ مرا ظاہر و باطن متجلّے ہونا

وہ مرا کل ترے اوصاف میں تجھ سے ملنا
وہ مرا کل تری مخلوق میں تجھ سا ہونا

وہ ترا کوششِ ہر مہر و مدارا کرنا
وہ مرا قابلِ ہر نعمتِ عظمےٰ ہونا

بعد ازاں میری تباہی کا زمانہ آنا
اور کل عالمِ راحت تہ و بالا ہونا

وہ ترا میرے مقدر کی طرح پھر جانا
وہ مرا راندۂ درگاہِ معلّے ہونا

وہ ترا مجھکو نگاہوں سے گرا کر چھپنا
وہ مرا تعرِ مذلّت میں ٹھکانا ہونا

وہ ترا آٹھ پہر مجھ سے مکدر رہنا
وہ مرا خاک بسر بادیہ پیما ہونا

وہ مرا دم تری فرقت سے لبوں پر آنا
وہ ترا غم مری صورت سے ہویدا ہونا

وہ ترا جوشِ غضب اور زیادہ بڑھنا
وہ مرا ذوقِ طلب اور دو بالا ہونا

وہ ترا میرے لئے جبرِ مجسم بننا
وہ مرا تیرے لئے صبر سراپا ہونا

وہ بالآخر ترے دل کا سوئے نرمی آنا
وہ بالآخر مری تقدیر کا سیدھا ہونا

وہ ترا قلب مری آہ سے ہل ہل جانا
وہ مرا درد ترے دل میں بھی پیدا ہونا

وہ ترا غفلتِ پیہم سے کنارہ کرنا
وہ مرا غم مجھے فی الجملہ گوارا ہونا

وہ ترا وعدۂ فردا سے تسلّی دینا
وہ مرا بادلِ ناشاد شکیبا ہونا

وہ ترا اپنی مدد سے مجھے تھامے رکھنا
وہ مرا تیری معیت سے توانا ہونا

آخرِ کار ترا رشکِ مسیحا بننا
آخرِ کار مرے دکھ کا مداوا ہونا

وہ ہمیشہ کو ترا کارکشا بن جانا
وہ ہمیشہ کو مرا عقدۂ دل وا ہونا

وہ ترا عالمِ باقی سے طلب فرمانا
وہ مرا عالمِ فانی سے روانہ ہونا

وہ ترا مُسترِ دامنِ رحمت کرنا
وہ مرا منجذبِ مرکزِ اعلیٰ ہونا

وہ ترا اپنے یمِ ذات میں گم کر لینا
وہ مرا قطرۂ ناچیز سے دریا ہونا

وہ مرا اور ترا ایکدل و یکجاں رہنا
وہ مرا اور ترا لایتجزا ہونا

ماحصل یہ کہ بڑی ذات ہے ذاتِ باری
مختصر یہ کہ بڑی بات ہے بندہ ہونا

اگر آزاد! تمہیں دعوئ آزادی ہے
پہلے کچھ سوچ لو۔ پھر بندۂ دنیا ہونا

آزاد انصاری

فلسفۂ مغرب کی اجمالی تاریخ

فلسفۂ یونان[1]

پرمینائڈیز۔ ۵۱۵ ق م میں پیدا ہوا۔ زینوفینز کا شاگرد تھا۔ ہرقلیطوس اور فیثا غورث کے فلسفہ سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اول الذکر کی تصنیف فی الفطرۃ پر اس نے ناصحانہ تمہید لکھی تھی جس کے متفرق مقامات اب بھی دستیاب ہوتے ہیں ۔

اسکا فلسفہ۔ پرمینائڈیز کا فلسفہ تمامتر، ہرقلیطوس کے مذہب کی تردید ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ کسی شے کے خواص بدل سکیں (اس جگہ حکمائے اسلام، خصوصاً شاہ ولی اللہ رح[ل] کا مطالعہ کیجیے) کس طرح ممکن ہے کہ ایک شے ہو بھی اور نہ بھی ہو، کس طرح ممکن ہے، نیستی سے ہستی ہو سکے اور ہست، نیست ہو سکے ؟ اسکا طرز استدلال دلچسپ اور ہمارے لئے روشنی بخش ہے، اور اسی قسم کا ہے، جس قسم کا استدلال ڈاکٹر کلارک وغیرہ نے ملاحدہ کے مقابلہ میں کیا ہے :۔ "جو وجود موجود ہے یا تو نیستی سے ہست ہوا ہے یا ہستی سے اگر نیستی سے ہستی ہوئی تو یہ خلافِ عقل ہے، اور محال ہے۔ اگر ہستی سے ہستی ہوئی تو ہستی کے خواص یکساں طور پر موجود رہے، اور ہستی ازل سے موجود ہے، پس ہرقلیطوس کا نظریہ کہ ہست، نیست ہو جاتا ہے اور نیست ہست ہو جاتا ہے، باطل ہے، اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ صرف ایک ازلی وجود موجود ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا، اور وہ وجود ازلی ابدی غیر معلول، اور غیر متغیر ہے، وہی خدا ہے ۔

زینو۔ (Zeno) ۴۹۰ ق م میں پیدا ہوا، پرمینائڈیز کا شاگرد تھا، ۴۳۰ ق م میں وفات پائی ۔

اسکا فلسفہ۔ صرف واحد، قابل ادراک ہے، جسم (Extention) مقدار (magnitude) حرکت (motion) خلاء (space) وغیرہ کا تصور محال ہے۔ خلاء کو لیجئے۔ اگر خلاء موجود ہے

[ل] ولی اللہ رح ہندوستان کے زبردست فاضل الہیات، اور متکلم اپنے زمانہ کے مجدد، اور بہترین انسان، آپ کی مشہور تصنیف، حجۃ اللہ البالغہ، ہے۔

[1] اس مضمون کا سلسلہ ستمبر اکتوبر نومبر ۱۹۲۵ء کے پرچوں میں شائع ہو چکا ہے ۔

توکہیں نہ کہیں اس کا وجود ہوگا کسی خلاء یا مقام میں، اور اس کا وجود کسی دوسری خلاء میں اسی طرح، چلے جائیں تسلسل لازم آتا ہے اور تسلسل محال ہے، پس خلاء محال ہے اور حرکت کے لئے لازمی ہے کہ خلاء میں ہو، جب خلاء ہی نہیں تو حرکت کہاں ہوگی ؛

گورجیاس۔ (Gorgias) باشندۂ لیانٹنم (Leontinum) سنہ میں پیدا ہوا اپنے زمانہ کا مشہور مقرر (Rhetorician) تھا، زینو کا شاگرد تھا۔ ۴۲۷ء میں اپنے شہر کی طرف سے دارالخلافہ یونان میں بطور سفیر مقرر ہوکر آیا تھا۔ سنہ ق م میں وفات پائی ؛

اس کا فلسفہ۔ گورجیاس اپنے استاد سے بھی چار قدم آگے بڑھ گیا، اُس نے حرکت اور خلاء کا انکار کیا، اس نے وجود ہی کا انکار کردیا، وہ کہتا ہے اگر وجود، موجود ہے تو جیسا پرمینایڈیز نے ثابت کیا ہے اُزلی ہوگا، ازلی، غیر محدود ہوتا ہے، اور غیر محدود، خلاء (Space) میں پایا نہیں جاتا۔ یعنی کہیں نہیں۔ اور جو کہیں نہیں وہ موجود نہیں، جو موجود نہیں وہ معدوم ہے ؛

ایمپیڈاکلیز (Empedocles) بمقام اگریگنیٹم واقعہ صقلیہ ۴۹۵ء ق م میں پیدا ہوا۔ دولتمند اور عالی خاندان تھا۔ بڑا زبردست مدبر اور فصیح و بلیغ لکچرار تھا عام طور پر اسکے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوہ آتش فشاں اٹنا میں جو ایک بڑا سا دہانہ ہے اسکے اندر کود پڑا تھا لیکن یہ محض افسانہ ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں، بعض سیاسی معاملات کی وجہ سے جلاوطنی کی حالت میں ۴۳۵ء ق م بمقام پیلاپونی سس انتقال کیا ؛

اس کا فلسفہ۔ تخلیق اور تخریب مطلق طور پر محال ہے۔ جو چیز ہست ہے وہ نیست نہیں ہوسکتی تغیر مطلق بھی محال ہے، ہاں، اضافی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ دُنیا میں حرکت اور تغیر دیکھتے ہیں، سو بات یہ ہے کہ نئی کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی اور نہ کوئی پرانی چیز، غارت و برباد یا معدوم ہوتی ہے، رات دن افتراق اور امتزاج کا سلسلہ جاری ہے چہار عناصر، آب و آتش، خاک و باد، اصل اشیاء ہیں اور ہر ایک کی خصوصیات اور خواص ہیں، یہ عناصر ناقابل فنا و تغیر و تبدیل ہیں، اپنی اصل آپ ہیں۔ ان کے امتزاج سے اجسام صورت پذیر ہوتے ہیں۔ کائنات میں دو قوتیں کام کر رہی ہیں Love میلان باہمی اور Hate تنافر باہمی۔ یا انہیں موجودہ اصطلاح میں قوتِ جاذبہ (attraction) اور دافعہ (repulsion) کہہ سکتے ہیں۔ بس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انہیں قوتوں کا کرشمہ ہے۔ انسان عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔ ایمپیڈاکلیز بھی تناسخ کا قائل تھا ؛

اینگزاگورس (Anaxagoras) ۵۰۰ ق م میں بمقام کلیزو مینی (Clazomenae) واقع ایشیائے کوچک پیدا ہؤا۔ لیکن ترک سکونت کرکے، ایتھنز چلا آیا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں ایتھنز علم وفضل کا واحد مرکز تھا۔ جو اُٹھتا تھا، ایتھنز آتا تھا۔ خود ایتھنز کی علمی زندگی کی رُوح رواں پیریکلیز، ارباب علم وفضل کا شائق تھا، اور خود بھی فاضل ویگانہ روزگار تھا۔ جس کو قابل پاتا تھا کسی نہ کسی صورت سے اپنے پاس بلا لیتا تھا۔ الغرض انگزاگورس بھی پریکلیز کے دوستوں میں سے ممتاز شخصیت تھی۔ جب پریکلیز کے دشمنوں نے اس پر، الحاد اور کفر کا فتویٰ لگایا، تو اینگزاگورس، ایتھنز اور راہالی ایتھنز سے بددل ہوکر تیس سال کی بود و باش کے بعد لیمپسکس (Lampsacus) میں چلا آیا، جہاں ۴۲۸ء ق م میں وفات پائی۔ یہ شخص علاوہ فیلسوف ہونے کے ریاضی اور ہیئت میں یگانہ روزگار تھا۔ اس کی تصنیف موسومہ (On Nature) کے جستہ جستہ مقامات آج بھی ملتے ہیں۔ طرز تحریر نہایت سادہ اور سلیس ہے +

اسکا فلسفہ۔ اُس نے تسلیم کیا کہ زینوفینز کا یہ خیال کہ کامل تغیر محال ہے، اپنے اندر صداقت رکھتا ہے، تاہم اضافی طور پر تغیر ممکن ہے۔ ایک شئے کی صورتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر ذات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی +

عناصر چار نہیں ہیں۔ اور باد، آب، آتش وخاک، دراصل عناصر نہیں ہیں بلکہ مرکبات ہیں +

دُنیا کے پیدا ہونے سے پہلے ذرات فضائے کائنات میں منتشر تھے۔ اور بے جان اور بے شعور تھے۔ یکایک ان میں حرکت ہُوئی۔ اور پہلی حرکت سے گرمی سردی سے جدا ہوئی۔ نور ظلمت سے جدا ہؤا، خشکی تری سے جدا ہُوئی رفتہ رفتہ اجرام فلکی بن گئے۔ پھر زمین بنی، آفتاب نے زمین سے بخارات کے ذریعہ پانی برسایا، پھر نباتات وغیرہ پیدا ہُوئیں +

سوال یہ ہے کہ حرکت کیسے پیدا ہُوئی؟ انگزاگورس نے حرکت کی علتہ (Nous) یعنی عقل فعال قرار دی ہے یہ فاعل ایک باشعور ہستی ہے جو مادہ سے جدا ہے اور اس پر حکمران ہے، یہ عقل روح ہے جو دنیا کی منتظم ہے، فاعل مختار اور صاحب عقل وشعور ہے۔ عالم الغیب ہے، تمام اشیاء کی علتہ ہے اور مالک اور خالق اور رازق اور حاکم ہے +

نوٹ:۔ انگزاگورس نے حرکت کی علتہ، عقل کو قرار دیکر، اپنا دامن اُن اعتراضات سے بآسانی چھڑا لیا ہے، جو ہم دہریوں پر کرتے ہیں۔ فلسفہ میں یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ حرکت میں قبیل معلول ہے اور معلول کا وجود، بغیر علت کے پایا جانا محال عقلی ہے چنانچہ ارسطو نے اپنی مابعد الطبعیات (Metaphysics)

میں اس بات کو بدلائل عقلیہ مبرہن کر دیا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں :۔

(۱) ۔ مادہ بےحس و حرکت ہے (۲) بے شعور ہے لہذا نہ وہ بغیر کسی محرک خارجی کے متحرک ہو سکتا ہے اور نہ بغیر کسی ذی شعور ہستی کے کسی مقصد کے ماتحت کام کر سکتا ہے اسی لئے عقلائے جہاں نے، اگر عالم کو قدیم مانا ہے تو قدیم بالذات نہیں مانا بلکہ قدیم بالزمان اور واجب بالغیر۔ اور ارسطو نے حرکت ہی سے ذات باری پر استدلال کیا ہے۔ یہی بات انگزا گورس کہتا ہے، اب رہا (VOŨS) یعنی عقل کا معاملہ، سو اُس کے متعلق اسقدر بتانا کافی ہے کہ ہمارے اور انگزا گورس کے درمیان اس جگہ محض لفظی نزاع ہے جس ذات کو وہ عقل فعال کہتا ہے ہم اُسی کو خدا کہتے ہیں۔ کیونکہ بعینہ یہی صفات اور کام خدا کے ہیں جو اُس نے عقل فعال کی جانب منسوب کئے ہیں۔ آگے چل کر افلاطون نے اس عقل فعال کو معلول تسلیم کیا ہے اور اسکی علۃ خدا کو ٹھہرایا ہے، خدا قدیم بالذات اور واجب بالذات ہے، عقل اول قدیم بالزمان اور واجب بالغیر ہے۔ لیکن اس امر میں دونوں متفق ہیں کہ عالم، یا ذرات عالم، خود متحرک نہیں بلکہ ان کی حرکت، خدا ہے، افلاطون ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ خدا نے بواسطۂ عقل اوّل دنیا کو پیدا کیا، انگزا گورس نے عقل ہی کو خدا مان لیا، اسی کو الٰہی صفات سے متصف گردانا ہے۔ ارسطو اس کے فلسفہ کی بابت کہتا ہے" انگزا گورس نے بدرجۂ مجبوری (mind) یا عقل کو حرکت کی (Intelligent caus) علتِ ذی شعور مانا ہے، کیونکہ بغیر اس کے تسلیم کئے اسے چارۂ کار نہ تھا "

خاک میں مل گیا ہے ننھا سا پھول

تیتری کی تلاش میں مشغول

ہائے تقدیر تیتری نہ ملی

پھول کے دل کی یہ کلی نہ کھلی

(ٹیگور)

خوش نہ ہو دیکھ کے آئینے میں صورت اپنی

ڈھونڈ اسے حسن محبت میں حقیقت اپنی

(باغبان)

اُردو

مہمان کو، بالخصوص ایسے مہمان کو جسے معلوم ہو کہ میزبان نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجبور ہو کر اسے مدعو کیا ہے، جس کی اجنبیت چھپائے نہ چھپے اور بھلائے نہ بھولے، جس کی خو بو، نشست برخاست میزبان کے گھرانے سے بالکل الگ ہو۔ کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا ہے؟ دل میں سوچتا ہے کہ کہاں آگیا اور کیوں آگیا؟ رہوں کہ جاؤں؟ پرایا گھر قید خانے سے کم نہیں۔ ایک طرف مہمان کا یہ حال ہوتا ہے تو دوسری طرف میزبان کے خویش واقربا فطرتی تقاضے سے مجبور چہ میگوئیوں سے باز نہیں رہ سکتے۔ کوئی "کُل طویل" کا فقرہ چست کرتا ہے تو کوئی ان کی آواز سے کانوں میں اُنگلیاں دیتا ہے۔ کوئی دبی زبان سے کوئی علانیہ "جی ہاں۔ ان کا رہنا ہو چکا تم دیکھ لینا جو دو چار دن میں نہ بھاگ نکلیں۔ اونٹ، بھیڑ بکری میں کیا رہیگا"؟ یہ سب کچھ کہا جاتا ہے محسوس کیا جاتا ہے مگر ضروریاتِ زندگی وہ بلا ہائے بیدرماں ہیں کہ متعدد مثالوں میں یگانگی پیدا کر ہی دیتی ہیں۔

اس پُر لطف دو طرفہ کشمکش کا ڈراما رائج الوقت اُردو میں دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ مولنا "علیٰ ہذا القیاس" تو کسی نہ کسی طرح ہندی الوطن ہو گئے مگر ستمیان "علےٰ رُوس الاشہاد" اور "علی الرغم" ابھی تک یہاں کے گلی کوچوں سے پورے آشنا نہیں ہوئے اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ لوگ "جو عین" "قاف" کے بھاری ڈول حلق کے گہرے کنوئیں سے کھینچنے میں مشاق ہیں یہ کیا ان سے منوں بوجھل جملے قومی جلسوں میں تڑاق پڑاق بولتے چلے جاتے ہیں اور انکی تحریروں میں تو "نظریہ" "مطمح نظر" "نصب العین" "فاجعہ" "مدبر" وغیرہ وغیرہ کے وہ جال تنتے ہیں کہ زبان کی بیکس چڑیا پھڑ پھڑاتی رہ جاتی ہے مگر ذکر نہ ان لوگوں کا ہے نہ ان کے ان پڑھ نقالوں کا، نہ صرف عرب یا مصر کے مہمانوں کا۔ انگریزی ہی کو دیکھئے۔ کس قدر عجیب ہے کہ "ڈبل" جیسا موٹا بھینسا۔ تو بن بلائے دندناتا ہوا آ گھسے مگر مس "تھیوری" جیسی پری کو ادب کے نقیب ہر دفعہ دور باش سنائیں، کارخانوں کے "انجن" اور "انجینیر" کی تو آؤ بھگت ہو مگر یونیورسٹی سے "آئی ڈیل" اور "آئی ڈیلسٹ" کو ہر دفعہ اطلاع کارڈ بھیجنا پڑے۔ اسی "مسٹر کارڈ" کی ہر دلعزیزی ملاحظہ کیجئے۔ جو "کارڈ" نہیں کہہ سکتے وہ "کارٹ" "کرڈ" پر زور دے کر کہتے ہیں مگر کہتے ضرور ہیں۔ اس سارے معاملے کی تہ میں جو خفیف سا راز ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ عوام الناس تو صرف پابند سلاست ہیں۔ جس لفظ سے جلدی اور آسانی سے صحیح مفہوم ادا ہو سکے اس کا رواج فی الفور

ہو جاتا ہے۔ کرکٹ میں "آوٹ"، کچہری میں "کیس" "ڈسمس" اور گھروں میں "فری پان" "ڈسک" وغیرہ اپنے ہندی الاصل مترادفوں سے زیادہ زبان زد ہیں کیونکہ مطلب کا چھکڑا نہ کبھی رکا ہے نہ رکیگا اور جہانتک بولنے والوں کا تعلق ہے یہ قانون اٹل ہے۔ تحریر میں البتہ نوواردوں کی دیکھ بھال سختی بلکہ تعصب سے کی جاتی ہے اور کچھ عرصہ سے یہ تعصب بجائے ادبی تہذیب کے خلافتی تشدد ہو چلا ہے جو زبان کے لئے سم قاتل ہے۔ اصرار اس بات پر ہے کہ چاہے لکھنے والے کا جی نہ مانے اور چاہے اس کا مطلب فوت ہو جائے مگر انگریزی کا لفظ پاس نہ پھٹکے بلکہ مطالب کی گرفتاری کے لئے قاموس اور صراح کے ٹھنڈے لوہے کو پیٹ پیٹ کر الٹی پلٹی ترکیبوں کی زنجیریں تیار کی جائیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میدان علم میں "تھیوری" اور "نظریہ" کی "آئی ڈیل" اور نصب العین کی تگ و دو ہوتی رہے۔ کیا تعجب ہے کہ الگ الگ رنگ میں دونوں کام دے جائیں زبان ابھی بنتے بنیگی اور زبانوں کی عمر کے لحاظ سے اردو ابھی ہے کتنے دن کی؟

اسے آئینگی شوخیاں آتے آتے

بشرطیکہ اس ہندی نژاد، نام کی ترکن کی لوٹ مار چوطرفہ جاری رہے +

عبدالعزیز

زندہ زیادہ وہ رہتا ہے جس کے خیال زیادہ اچھے جذبات زیادہ پاکیزہ اور عمل زیادہ نیک ہوں اور عمر اسی کی دراز ہوتی ہے جس کا دل سرعت کے ساتھ حرکت کرے۔

"موت"؟ آسمانی زبان میں اسے "زندگی" کہتے ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جسے ہم موت کہتے ہیں زندگی نہیں اور یہ موت نہیں جسے ہم زندگی پکارتے ہیں!

ہماری زندگی اک نامکمل حالت ہے اور تیاری ہے کسی اور زندگی کے لئے انسان پوری طرح پیدا نہیں ہولیتا جب تک وہ موت میں سے ہو کر نہ گذرے۔

(ٹیگور) ۔۔۔۔۔۔۔ + ۔۔۔۔۔۔۔ (باغبان)

غزل

ترے آشفتہ سے کیا حالِ بیتابی بیاں ہوگا
جبینِ شوق ہوگی اور تیرا آستاں ہوگا

زبانِ شمعِ محفل سے سُنا ہے اہلِ محفل نے
ترا انجام کیا پروانۂ آتش بجاں ہوگا

ابھی افسانۂ مہر و وفا ہے لُطف سے خالی
مزا آئیگا جب ذکرِ ستمہائے بتاں ہوگا

تلاطم ہے اُمیدوں کا تقاضا دم آرزوؤں کا
دلِ ہنگامہ پرور کون تیرا رازداں ہوگا

تغافل تو ادا ہے، پُرخطر ہے التفات اُس کا
مُصیبت آئیگی اُس وقت جب وہ مہرباں ہوگا

عتاب آلودہ نظریں مائلِ پرسش اگر ہونگی
خموشی سے مری پیدا اک اندازِ فغاں ہوگا

ہلاکِ غفلتِ صیّاد ہوگا یہ مسلّم ہے
وہ صیدِ تازہ جو ناواقفِ رسمِ فغاں ہوگا

مخاطب ہوگی جب اُن کی نظر میری نگاہوں سے
بیاں افسانۂ دل داستاں در داستاں ہوگا

پڑیگی کشمکش میں جانِ مجبورِ محبت کی
نہ تابِ خامشی ہوگی نہ یارائے فغاں ہوگا

تری بیدادِ لُطف آگیں نہیں ہے جسکی قسمت میں
وہ آخر تختۂ مشقِ جفائے آسماں ہوگا

نہیں پابند اہلِ ذوق کعبہ ہو کہ بت خانہ
سبھی ہونگے وہاں ذکرِ جمیل اُسکا جہاں ہوگا

کبھی توفیقِ ترکِ ماسوا کی ہو ہی جائیگی
دلِ آزاد ہوگا اور عیشِ جاوداں ہوگا

ابھی تو تیری مایوسی سے اِطمینان ہے اے دل
مجھے اُس وقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا

ترا غمزہ اگر غمّاز یاں کرتا رہا یوں ہی
تو دل سے چشم بدظن چشم سے دل بدگماں ہوگا

یقین آتا ہے کس کو دیکھ کر رونق گلستاں کی
کہ کل یہ پیکرِ حسن آفریں وقفِ خزاں ہوگا

اِدھر تاب و تواں مفقود اُدھر صیاد بے پروا
کہاں تک طائرِ پربستہ آخر پر فشاں ہوگا

تہِ مرقد قرار آئیگا کیونکر مرنے والوں کو
جو تمکو دوستوں کا غم نصیبِ دُشمناں ہوگا

زباں دانِ محبت ہوں، ترے تیور سمجھتا ہوں
کہاں تک حیلہ جو مجھ سے فریبِ امتحاں ہوگا

سرور افزا و مستی خیز و شورش آفریں ہوگی
وہ بزمِ شعر جس میں وحشت شیوا بیاں ہوگا

رضا علی وحشت ۔ کلکتہ

خوش کیونکر رہیئے؟

۲

فکر و تشویش کے جسمانی اسباب۔ بعضوں کی ناخوشی کا سبب **صحت کی خرابی** اور اپنی یا اپنے عزیزوں کی علالت ہے۔ جسمانی تکلیفیں ہمیشہ رنجدہ ہوتی ہیں۔ ہضم کی خرابی ہو یا سر میں درد ہو تو مزاج چڑچڑا اور دل بیزار سا ہو جاتا ہے۔ پھر اگر بدقسمتی سے ہفتوں یا مہینوں تک بستر پر پڑا رہنا ہو تو ہزاروں لاکھوں میں ایک ہو گا جس کے چہرے پر مسکراہٹ قائم رہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک کی بیماری سے باقی گھر والوں کی خوشیوں کا خون ہو جاتا ہے اور مشرقی شہروں میں جہاں بدنصیبی سے صفائی اور حفظِ صحت کا خدا ہی حافظ ہے، ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں اور تعویذ بازوں کے دروازے پر خلق خدا کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شہری زندگی کو قدرت کے حضور اپنی قانون شکنی کے عوض اپنی صحت اور اطمینانِ قلب کا خراج دینا پڑتا ہے۔ جس کے معنے ہیں تنگ گلی کوچے تاریک مکانات، باسی غذا، اور قسم قسم کی متعدی بیماریاں۔ امراض کا علاج دوا مشہور ہے۔ اکثر بیمار پڑتے ہی کوئی نہ کوئی معالج یاد آنے لگتا ہے اور اگرچہ بعض اوقات دوائیں مفید ثابت ہوتی ہیں لیکن عموماً وہ صحت کو خراب اور جسم کو برباد کر دیتی ہیں۔ انسان جلد باز ہے اور بے صبر، جب بیمار پڑتا ہے تو سبب دریافت نہیں کرتا۔ چاہتا ہے کسی طرح اس مصیبت سے رہائی ہو کہ میں پھر اسی طرح زندگی بسر کرنے لگوں۔ قدرت علالت کے پردے میں سمجھاتی ہے کہ جسم کے تحفظ کے یہ قاعدے ہیں لیکن انسان مصنوعات پر عاشق ہے۔ انسان کی روح ملکوتی ہے لیکن جسم حیوانی۔ جنگلی حیوانوں کو دیکھیے کہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور عموماً کیسے پُر صحت ہوتے ہیں کہ اُن کے بارے میں صحت کا ذکر ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ آج کل متمدن ملکوں میں بالخصوص امریکہ میں قدرتی زندگی کا چرچا ہو رہا ہے۔ جا بجا جسمانی ورزش اور حفظ صحت کی درس گاہیں کھلی ہیں اور جرائد ہیں کہ اسی کے لئے وقف ہیں۔ اس خیال کے مطابق دوا محض بے سُود ہی نہیں اکثر مُضر ثابت ہوتی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے جسم کا صحیح استعمال کرے اور جسم و دل میں درست رشتہ قائم رکھے۔ کھلی ہواؤں میں رہے، مکان ہوادار ہو، جائے وقوع گنجان نہ ہو۔ غذا سادہ ہو، مقوی اور مقدار میں کم۔ لباس تھوڑا اور اس قسم کا ہو کہ اس میں سُورج کی کرنیں اور ہوا بخوبی آ جا سکے۔ جب کھڑا ہو سیدھا ہو کر۔ جب بیٹھے سیدھا ہو کر اور جب چلے تو سیدھا ہو کر چلے۔ سینہ

آگے کو اُبھرا ہو کند ھے پیچھے کو جُھکے ہوں تاکہ سانس اچھی طرح بھر کر لیا اور نکالا جائے اور دل جگر اور معدہ اپنی اصلی حالت میں کھنچے رہیں اک دوسرے کے بیچ میں گھسے ہُوئے نہ ہوں۔ قدم ڈر ڈر کر نہ رکھے بلکہ بے دھڑک چلے جائے، طرزِ خرام میں اکڑنے کی ضرورت نہیں لیکن بے باکی ہوگی تو دل بھی بے خطر رہیگا مُنشّیات تمباکو نوشی مٹھائی رنگین پانی اِن سے پرہیز ہو۔ صاف، پانی جب جی میں آئے پیئے۔ دیہاتی ہے تو کھیتی باڑی یا باغبانی کرے شہری ہے تو کھُلی ہوا میں کوئی کھیل کھیلے، گھوڑے کی سواری کرے یا پیدل سیر کو نکلے۔ پیدل چلنا ہر غریب امیر کے بس کی بات ہے، بعض ماہرین صحت کا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ورزش نہیں اور اس سے تقریباً سب امراض دُور ہو کر جسم اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے کسی دوست کے ساتھ باغ کی سیر کو یا دریا پر جاؤ یا دُور کھیتوں میں نکل جاؤ، انارکلی یا چاندنی چوک میں فقط نظارہ بازی میں وقت نہ گنواؤ، تمہارے جسم کے تمام اعضا کی روزانہ ورزش لازم ہے۔ انسان کا قدیمی کام گلہ بانی اور کھیتوں میں کام کرنا تھا اس میں دماغ کا تھوڑا اور جسم کا زیادہ کام تھا اور اس لئے غیر مہذب آدمی زیادہ پُرصحت تھا تہذیب و تمدن نے کئی لوگوں کے جسم کو ساکن اور دل و دماغ کو سخت متحرک بنا دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سمجھدار لیکن ساتھ ہی زیادہ بیمار بن گئے ہیں۔ اس خسارے کو پُورا کرنا ہمارا کام ہے + جتنی ہماری زندگی قدرتی زندگی کے قریب ہوگی اُتنی ہی اُس میں زندہ و قوی رہنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی + صحت میں اجتناب اور علالت میں صبر کرو۔ نہ اُس سے بڑھ کر کوئی غذا نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوا آج تک ایجاد ہُوئی ہے۔ ہم لوگ اکثر زیادہ کھانے پینے اور علاج معالجے میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی لئے ہماری صحت اور خوشی محض مصنوعات ہیں جن میں قدرتی اُبھار اور بے ساختہ پن قطعی مفقود ہوتا ہے + جب بیمار پڑو تو اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی بے اعتدالیوں پر غور کرو اور عہد کرو کہ آئندہ صحت کی خاطر مناسب طریق اختیار کرنے کو میں حکم خداوندی کی تعمیل سمجھوں گا کیونکہ آخر قدرت کا ہر قانون خدا کا ارشاد ہے اور ہر قانون کا توڑنا خدا کے احکام کی خلاف ورزی اور اُس کے خلاف بغاوت ہے + تم چاہتے ہو کہ تم اچھے رہو تو اتنا نظر آؤ۔ نیند بھر کر سوؤ لیکن تم دن بھر گھر میں چارپائی پر لیٹے یا کرسی پر ڈٹے بیٹھے ہو کھانے کے وقت تم کو بھوک نہیں لگتی پھر بھی کھا جاتے ہو یا اگر خوب کھا سکتے ہو تو اتنا کھا بیٹھتے ہو کہ جسم و دل دونوں میں اُس کی سمائی کی گنجایش نہیں ہوتی پھر کہو تو تم کس طرح صحت پاؤ یا کیونکر چند برس کے بعد تمہیں یکایک کوئی مرض نہ آلے۔ تم قدرت سے سرکش ہُوئے قدرت کیونکر تمہاری یاوری کرے + بعضوں کو مرض تو کوئی لاحق نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی چھوٹی چھوٹی

جسمانی کمزوریوں کو بڑا سمجھ کر مرضِ وہم سے اپنی صحت کو تباہ کر لیتے ہیں۔ اُن کو ہمیشہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تکلیف محسوس ہوتی رہتی ہے۔ کبھی زکام ہے کبھی معدہ پھول رہا ہے، کبھی دل دھڑکتا ہے کبھی سر چکراتا ہے کبھی بُرے بُرے خیالات دل و دماغ میں گھومتے ہیں + بات یہ ہے کہ جس طرح صحت کی طرف بے اعتنائی برتنا نقصان دہ ہے اُسی طرح ہر وقت صحت کا تسبیح خواں بنے رہنا بھی سخت دل آزاری کا موجب ہوتا ہے + فرانس کے اک مُخیّر موسیو کوئے نے نوعِ انسان کی اکثر بیماریوں کا علاج یہ بتایا ہے کہ اپنے آپکو یہ سمجھاتے رہو کہ میں بالکل اچھا ہوں۔ موسیو موصوف نے لاکھوں مریضوں کو فقط اس بے نظیر طریقے سے ہمیشہ کے لئے چنگا بھلا کر دیا ہے + اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلبِ انسان میں کیسی کیسی حیرت انگیز قوتیں مضمر ہیں۔ خیال کرو کہ تم روز بروز تندرست ہوتے جاتے ہو۔ اِس خیال کو سوتے جاگتے صبح و شام اپنے دل میں رکھو۔ اپنے آپ سے کہو میں اچھا ہوں میں پہلے سے بہتر ہوں زیادہ توانا ہوں، ساتھ ہی یقین کئے جاؤ کہ تم واقعی پُرصحت ہوئے جاتے ہو تو تم دیکھو گے کہ تمہاری کمزور صحت دن دونی رات چوگنی ترقی کریگی + خدائے عزوجل کے سچے معتقد جب اُس کے حضور اپنی صحت کے لئے سچے دل سے دُعا کرتے ہیں اُس کی کھُلی ہوا میں رہتے ہیں اُس کا صاف پانی پیتے ہیں اُس کا اناج اور ترکاری اتنا کھاتے ہیں جس سے تین چوتھائی سیری ہو جائے اور یقین رکھتے ہیں کہ ہماری بیماری بھی صحت کے لئے ہے، وہ عموماً پُرصحت اور تندرست رہتے ہیں۔ یقین و اعتقاد قوت آفریں ہیں۔ افسوس ہے کہ نوعِ انسان اپنی سرکشی کے باعث اس سے کماحقہ فیض یاب نہیں + علالت کے وقت صبر کرنا اور زندہ دل رہنا نصف صحت ہے۔ جب تمہارا کوئی عزیز علیل ہو تو اُس سے یہ کہہ کر ہمدردی ظاہر نہ کرو کہ واقعی تمہاری حالت بُری ہے خُدا جانے یہ بیماری کب تُمہارا پیچھا چھوڑے گی۔ بلکہ اُسے یقین دلاؤ کہ یہ حالت تو عارضی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں دُور ہو جائے گی۔ بیماری کا ذکر اُس کے سامنے نہ کرو بلکہ اُس کے دل کو بشاش خیالوں سے پُررونق بنا دو کہ بیماری جلد اُس میں سے خارج ہو جائے۔ جس دل میں مرض کو جگہ نہیں ملتی اُس کا جسم بھی جلد جراثیم سے پاک و صاف ہو جاتا ہے + تم اپنے عزیز یا محبوب کی ناسازیٔ طبع پر رنجیدہ ہو لیکن غور تو کرو کہ تمہارے رنج و غم سے اُس پر کیا اثر پڑتا ہے تمہارا رنج و غم اُس کی بحالیٔ صحت میں کیونکر مددگار بن سکتا ہے + صحت عمر بھر کے لئے ہے اور بیماری تو عموماً چند گھنٹوں یا چند دنوں کی ناخواندہ مہمان ہے۔ اس کے آنے پر اپنے ہتھیار نہ ڈالدو۔ تمہاری اک نظر اس کے مقابلے کے لئے کافی ہے + دیکھو بے صبر آدمی کیسے خود بھی

گھبراتے ہیں اور دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈالے رکھتے ہیں۔ اس کے مقابل میں اک حوصلہ مند انسان اپنے بسترِ علالت پر بھی مسکراتا ہے اور جی سے کہتا ہے کہ نیز ؎

جس زندگی میں تجھ کو ملی ہیں یہ نعمتیں اُس زندگی میں دُکھ بھی اُٹھانا ہے غم نہ کر

عزیزوں کی موت بالخصوص ایسے اقرباکی جن کی موجودگی سے دُنیا کی بہت سی نعمتیں وابستہ تھیں اکثر دُنیا کی دلکشی کو دل آزاری میں تبدیل کر دیتی ہے زندگی تاریک نظر آنے لگتی ہے خوشیاں غم بن جاتی ہیں اور اس تنگنائے دہر سے نکل جانے کی کوئی راہ نہیں سوجھتی۔ لیکن زمانہ سب زخموں کی مرہم ہے جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے فراموشی کی جھلی زخم پر بڑھتی آتی ہے یہاں تک کہ کچھ دیر کے بعد بعضوں کا غم کم ہو جاتا ہے بعضوں کا دُور+ ایسے غم کا کم ہوتے جانا اِک قدرتی بات ہے اور اک اخلاقی و مذہبی فرض بھی۔ اخلاقی فرض اس لئے کہ تمہارا مغموم و متفکر رہنا تمہارے عزیزوں دوستوں کے لئے باعثِ تشویش ہے اور مذہبی فرض اس لئے کہ قدرت نے جو نظام مقرر کیا ہے اور جو ہزاروں برس سے نوعِ انسان کی قسمت کا جزو بن گیا ہے اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اُس کے ساتھ مل کر کام کرنا ہمارے لئے لازم ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تم اپنے کسی عزیز کے مرتے ہی ہنسی کھیل میں مصروف ہو جاؤ۔ اگر تم دل رکھتے ہو اور اُس دل کو چوٹ لگی ہے تو ایسا کر سکنا تمہارے بس کی بات نہیں لیکن یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ حتی الوسع اپنے غم کو ضبط کرو۔ دوسروں کو اپنے غم سے مغموم نہ ہونے دو دُنیا میں کچھ نہ کچھ کام کرتے رہو، یہ تمہارے فرائض ہیں اور انہیں سے غم خود بخود غلط ہوتا رہیگا + یورپ بعض باتوں میں بُرا سہی لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کی ماؤں کا دل اپنے لختِ جگر کے لئے نہیں تڑپتا، گذشتہ جنگِ عظیم میں جب لاکھوں نونہال آغوشِ مادر سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے ہزاروں مائیں ایسی تھیں جنہوں نے مُنہ سے اُف تک نہ کی اور جنہوں نے اور ایسی زخم خوردہ بہنوں کے ساتھ مل کر خدمتِ قومی اور خیراتِ انسانی کے بیسیوں کام سر انجام دیئے جن کا شغلِ زندگی یہی ہو گیا کہ جب وہ یتیموں کو دیکھ کر اپنے نورِ نظر کو یاد کر اُٹھتیں تو وہ اُن کو اپنا ہی بچّہ سمجھنے لگتیں۔ اُن کے مطمئن غم سے بہتوں کی خوشیوں کے سامان پیدا ہو گئے، اُن کا غم کام میں لگ گیا، ہم مشرقیوں کی طرح نکمے پن کا ساتھی نہیں بن گیا۔ ہم لوگ جب غم آتا ہے اُس کی آؤ بھگت کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ زندگی غم کے لئے ہے غمگین رہنا کارِ ثواب ہے۔ غم آیا اور ہم دُنیا کی بُری بھلی سب باتیں چھوڑ بیٹھے۔ یہ نہیں کہ اپنی اٹوائی کھٹوائی سے اُٹھ کر کسی ایسے پڑوسی کے پاس چل بیٹھے جو ہماری ہی طرح اندوہ و محن کا شکار ہے، جسے انسانی ہمدردی کا انمول ہدیہ درکار ہے۔ جس جی ہارے ہوئے کو کسی کی ہمت افزائی کی ضرورت

ہے۔ دوستو! دُنیا میں لاکھوں کروڑوں اپنے غموں میں ڈوبے رہتے ہیں کچھ اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے کچھ قدرت کے احکام کو نہ سمجھ سکنے کے باعث۔ ان سب کو تمہاری خوشیوں کی حاجت ہے۔ ذرا کسی غم زدہ کے پاس گھنٹہ دو گھنٹے جا بیٹھو اور اُسے تسلی دو پھر دیکھو کیسے اُس کا چہرہ کھل جاتا ہے اور کس طرح تمہارے دل میں اطمینان کی اک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ تمہارا دل چوٹ کھا چکا ہے تو ان چوٹوں سے اوروں کو بچاؤ۔ اپنے پیارے یا پیاری کی یاد میں جو تمہارے دل میں رہتی ہے کسی کا بھلا کر دو تو تم دیکھو گے کہ اس مروّت میں اُس گم شدہ کی ملاقات کا لُطف آتا ہے۔ کسی مفید کام میں اَوروں کو شریک کر لو اور یادِ رفتگاں سے قوت حاصل کرو۔

فکر و تشویش کے اَخلاقی و مُعاشرتی اسباب کچھ کم مُصیبت خیز نہیں۔

کتنے آدمی کہتے ہیں "کیا کریں بھئی زمانہ ہی ایسا ہے" "ہماری سوسائٹی ہمیں نہیں چھوڑتی"۔ یہ درست ہے کہ سوسائٹی کو تبدیل کر دینا ہر کسی کا کام نہیں، کوئی ایک شخص جب تک وہ اک رہبرِ عالم نہ ہو سوسائٹی پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتا۔ لیکن زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ اثر ہم میں سے ہر ایک کا پڑتا ہے۔ ہم اپنی ہیچ کاری کے اس قدر معتقد ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے دل کی ملکہ بن کر ہماری زندگی پر حکومت کرنے لگتی ہے اور راہِ زیست میں ہمارے قدم کو لڑکھڑا دیتی ہے۔ تم مُصلحِ قوم نہیں مُصلحِ خانہ ہی بنو۔ کبھی کبھی چُپکے سے کسی عزیز یا دوست کے کان میں کچھ پھونک دیا کرو۔ تم استقلال سے اپنے خیال کی پیروی کئے جاؤ۔ اگر ہو سکے تو چند اوروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لو یا کسی زبردست شخصیت کے پیچھے ہو لو پھر اس کا اثر اپنے دائرے پر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم بڑے سے بڑے لوگوں کے درمیان بھی کیوں نہ رہتے ہو ناممکن ہے کہ تمہارا اَن دیکھا اثر اُن پر نہ پڑے۔ تمہارے بلند قول سے زیادہ تمہارے خاموش عمل کا اثر ہے۔ اپنے تھوڑے سے عمل سے تم اَوروں کو بہت کچھ سکھا سکتے ہو۔ ہم اکثر لوگوں کو کہتا سُنتے ہیں۔ "دُنیا ساری وہ کام کر رہی ہے اک میرے یہ کرنے سے کیا ہو جائیگا" اور اسی طرح دُنیا بد سے بدتر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ قدیمی رسم و رواج کے بدلنے کے لئے قدرت کو ایک انقلابِ عظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو کام لوگوں کی ذرا ذرا سی مدد سے انجام پا جاتا اب جب تک کہ کوئی معاشرتی زلزلہ قائم شدہ دستور العمل کو تباہ نہ کر دے انسان راہِ راست پر نہیں آتا۔ رُوس کے عظیم الشان معاشرتی انقلاب کو دیکھو۔ نچلے طبقے صدیوں سے دولت و قوت کے نیچے دبے چلے جاتے تھے۔ انقلابِ فرانس نے بہت کچھ مدد کی تھی لیکن باوجود اس کے اقتصادی برابری حاصل نہ ہوئی اور بیسویں صدی میں بھی استبدادی ظلم و ستم جاری رہے

نتیجہ یہ ہُوا کہ اوسط و اعلیٰ جماعت کے جائز و ناجائز حقوق سب چھین لئے گئے + ایسے انقلابات سے کس کو تکلیفوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے نوعِ انسان کو ہم میں سے ہر ایک کو + ہم میں کتنے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ دوسرے کی خرابی ہماری خرابی ہے سب کی تکلیف میں ہر ایک کو تکلیف ہے۔ کتنے یہ ماننے کو تیار ہیں کہ ہم سب ایک ہی مادرِ قدرت کے بچے ہیں ایک کے نفع میں دوسرے کا فائدہ اور ایک کے نقصان میں دوسرے کا گھاٹا ہے + اس وسیع روحانیت کے علاوہ بھی انسانی فطرت کے اصول سادہ اور سریع الفہم ہیں بُرے کام کا بدلہ ساتھ ساتھ اور اچھے کام کا صلہ بھی ساتھ ساتھ ملتا ہے + ہر اخلاقی بُرائی ناخوشی پیدا کرتی ہے۔ ہر وہ فعل جسے کرنے والا اپنے جی میں سمجھے کہ نامناسب ہے صرف ضرر رساں ہی نہیں حقیقت میں تشویش پیدا کرنے والا ہوتا ہے +

جب ہم حسد کرتے ہیں تو حسد کی آگ ہمارے دل کو جلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ حاسد جی ہی جی میں کڑھتا ہے کہ فلاں شخص نے اعلےٰ مرتبہ کیوں پایا۔ ہائے کیوں پایا میں نے کیوں نہ پایا۔ دنیا پر اہلِ دُنیا پر خدا پر سب پر اُسے غصہ آتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کائنات میں ایک یہی اچھی چیز تھی اُس پر اس غاصب نے قابو پالیا۔ اب میں کیا کروں۔ کیا اَور بیسیوں نعمتیں صدہا موقع لاکھوں خوشیاں باقی نہیں رہیں؟ باقی ہیں موجود ہیں منتظر ہیں لیکن اس کم بخت نے تو جی میں جل جل کر دل و دماغ کو خاکستر کر دیا۔ اب موقع گریز پا ہیں۔ مسرتیں کسی کی ہمت کی طالب ہیں اور یہ اُن سے اور اپنے آپ سے بیزار ہیں کہ زمانے کے ساتھ کون دَوڑے اور لُطف و انبساط کو کون جا کر اپنا بنا لے + پھر کہو حسد نے کس کا نقصان کیا؟ حاسد کا صرف حاسد کا!

نفسانی خواہش کو لو۔ جب تک خواہش پوری نہیں ہوتی انسان اندھا دُھند چلے جاتا ہے دوسروں کا دل دُکھاتا ہے اپنے جسم و رُوح کو تباہ کرتا ہے اور آخیر میں جب لذت پا چکتا ہے تو انجام کیا ہے؟ جسمانی بیزاری قلبی نقاہت اور رُوحانی انحطاط! اس سے کس کو گھاٹا پڑا۔ لُطف اُٹھانے والے کو اَور کسی کو نہیں۔ نفسانیت نے طاقت کو کمزوری میں تبدیل کر دیا +

غصہ ور کی حالت دیکھو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ڈورے سُرخ ہو گئے۔ چہرے کی رگیں پھُول گئیں، دانت بھیڑیئے کی طرح نکل آئے۔ دیکھنے والے تماشہ دیکھتے ہیں کچھ اس درندے سے دُور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ مانا اس نے اپنی حیوانیت سے دوسروں پر وقتی فتح پائی لیکن ساتھ ہی اپنے پاؤں پر بھی

توکلہاڑی ماری + جدید تجربوں سے ثابت ہُوا ہے کہ غصہ و تشویش کے وقت انسانی جسم میں چند زہریلے لعاب پیدا ہو جاتے ہیں جو بالآخر جسم کی علالت و نقاہت کا باعث ہوتے ہیں + کتنے کام ہیں جو پیار دلاسے سے اَوروں سے بآسانی کرائے جاتے ہیں لیکن خودسر انسان اپنی ناعاقبت اندیشی میں اکثر ٹیڑھا رستہ ہی پسند کرتا ہے اپنے ہمجنسوں پر سوار ہونا چاہتا ہے مگر تازیانہ اپنے جسم پر لگائے جاتا ہے + سنوئیں سے سنتر گھروں کی ناخوشی کا سبب گھر والوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بدسلوکی اور غصہ وری ہے۔ پھر بہت لوگ جو غیروں کے ساتھ لُطف و ادب سے مِلتے جُلتے ہیں اپنے گھر میں کپڑوں میں چھپے ہُوئے بھیڑیئے ثابت ہوتے ہیں۔ نوکر سے بیوی سے شاید بچے سے بھی ہر وقت کھاؤں پھاڑوں کرتے رہتے ہیں۔ کسی سے ذرا سی خطا ہُوئی اور خداوندِ نعمت برہم ہو گئے + بعض بیبیاں اور "لیڈیاں" بھی اس فن میں ید طولےٰ رکھتی ہیں اور مردوں کے لئے دنیا ہی میں جہنم کا اچھا خاصا سامان فراہم کر دیتی ہیں۔ بچے سے دُودھ چھلک گیا تو تھپڑ رسید کیا۔ شوہر نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو مُنہ کُپّا سا ہو گیا۔ بھلا ایسی حوروں کو کوئی ناگن نہ کہے تو کیا کہے؟ غصہ ور اپنے آپ میں پانی کی طرح کھولتا رہتا ہے اور اپنی بھاپ سے دوسرے کو جلا دینے کی کوشش کرتا ہے + تم اطمینانِ قلب چاہتے ہو تو غُصّے کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دو۔ غصہ آیا تو اُسے ٹال دیا کہ حضرت پھر سہی۔ اتنے میں اپنی بے وقوفی پر ذرا سا ہنس دیا۔ ایسی ہی ترکیبوں سے زندگی کو ہنسی خوشی بسر کر دو! طمع و حرص اپنے شیدائیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب تک من مانی مراد پاتے رہے مُسکراتے رہے جب ذرا ہوا کا رُخ بدلا اور لینے کے دینے پڑے تو انکے تھرما میٹر کا پارا اُوپر کو ان کے دماغ میں جا چڑھا جب تک ان کا نشہ رہا جھوما کئے، لیکن جب اُترنے کو ہُوا تو لگے خاک اُڑانے + افراد و اقوام کی جُوع البقر اور جوع الارض نے دُنیا میں جو اُودھم مچا رکھی ہے وہ ظاہر ہے۔ اُس سے کتنے نونہال کٹ کر رہ جاتے ہیں کتنے دل بے سُود تشویش سے سینوں میں دھڑکتے رہتے ہیں اور حاصل کیا ہوتا ہے کبھی کچھ سیم و زر کبھی کوئی لفظی خطاب لیکن اکثر خستہ حالی، باہمی رنجش اور عام بے چینی +

بظاہر خود غرضی نہایت دل خوش کن ہے۔ خود غرض من و سلویٰ کا حقدار صرف اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور دوسروں کی بدنصیبی کو اُن کی بے وقوفی پر محمول کرتا ہے۔ لیکن چونکہ دنیا کی سبھی نعمتیں ایک شخص کا کا حِصّہ نہیں اس لئے خود غرض اَوروں کو خوش دیکھ کر مضطرب بھی رہتا ہے اور کبھی پُورا مطمئن نہیں ہوتا +

غرور و تکبر انسان کو دھوکے میں ڈالے رکھتا ہے۔ وہ اپنے تئیں وہ کچھ سمجھ لیتا ہے جو وہ حقیقت میں نہیں ہوتا آخر جب برسوں کے بعد حقیقت کھلتی ہے یا امتدادِ زمانہ سے غرور کا سر نیچا ہوتا ہے تو کرب و اندوہ کی گرد زندگی کی شاہراہ پر اُڑتی نظر آتی ہے۔ غرور کاہے کا اور تکبر کیسا؟ مغرور دیکھے کہ اگر ہزاروں اُس سے کمتر ہیں تو ہزاروں اُس سے برتر بھی ہیں۔ خدا نے عقل کی قوت دی دادا نے جائداد چھوڑی باپ نے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ سوسائٹی سے طرزِ لباس و رہایش اُڑائی خود ساختہ کیا ٹھہرا غرّہ کس شے پر؟ پھر دیکھو کہ تکبر کیونکر ہماری طاقتوں کو محدود کر دیتا ہے۔ ترقی وہی ہے جو جاری رہے جب وہ رُکی تنزل بن گئی۔ جہاں یہ خیال پیدا ہُوا کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر ہوں۔ یہیں ڈٹ کر تخت نشیں ہو جاؤں سامنے کی چوٹی نظر سے اوجھل ہو گئی اور زندگی کی حیرت انگیز شان و شوکت اور خوبصورتی سے دل کوسوں دُور رہا۔ نخوت کس قدر نفرت انگیز ہے۔ ایسے آدمی کو دیکھ کر جو کسی کو دیکھنا گوارا نہ کرے خوددار آدمی کے اندر اک پُر متانت جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ خدائی انسان کے دل میں اُٹھ کر بغاوت کرنے لگتی ہے کہ اس ناہنجار کو عزت سے نہ دیکھ۔ جب ہم ایسے رعونت کے پُتلے کو دیکھتے ہیں جو ہوا میں سر اونچا اور نظریں نیچی کئے کھٹ کھٹ چلتا ہے تو شیطان کی تصویر ہماری نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ اپنے دل میں پُر انکسار خودداری پیدا کرو اور خدا کے بندوں کو حقارت سے نہ دیکھو کیا عجب ہے کہ کل کو تمہاری بھی وہی حالت ہو جو آج اوروں کی ہے! غرور اک رنگین شراب ہے انکسار اک مفرّح شربت!

ضِد کا الزام زیادہ تر بچوں پر عائد کیا جاتا ہے لیکن غور کرو تو بڑوں کی ہٹ ان سے کہیں زیادہ آگ اپنے اندر چھپائے رکھتی ہے۔ اس ہٹ کا نام کوئی اصول رکھتا ہے کوئی معاملہ فہمی کوئی تجربہ کاری لیکن اس عقلمندی سے ہزاروں کی خوشیوں کا خون ہوتا ہے۔ جس میں "معاملہ فہم" کا داغ بھی شامل ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک بار ہم کچھ مُنہ سے نکال بیٹھے تو اُس کا درست سمجھنا اور دُرست ثابت کر دینا ہمارے لئے عزت و خودداری کا معاملہ ہے۔ جو غلطی ایک دفعہ ہو چکی اُس کا اعتراف تو کجا اُس کا اعادہ کرنا اور کرتے رہنا وہ اپنے رُعب و متانت کے لئے ازبس ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بدنصیب شخص گدھے سے زیادہ یک سُوا اور خچر سے زیادہ ضدی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تئیں خدا کا نائب اور فرشتوں کا رقیب تصوّر کرتے ہیں۔ خدا ان کی مدد کرے۔ اس کے برعکس کسی بات پر قائم نہ رہ سکنے والے اک ایسا مٹی کا تودہ ہیں جس میں ہر وقت زلزلے اُٹھتے رہیں۔ نہ وہ کسی پر اعتبار کر سکتے ہیں نہ کوئی اُن پر۔ زندگی کے نشیب و فراز میں ہمیشہ گرتے پڑتے ہی اُن کا سفر گھٹتا ہے اور وہ جلد دھوکے میں آکر بدنصیبی کا تمغہ حاصل کر لینے میں مشاق ہو جاتے ہیں۔ آج اک فعل کو اچھا کل کو اُسے

بُرا سمجھنا انسان کو اخلاق کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ تغیر پذیر شخص کے دل میں استقلال کا گذارہ نہیں۔ ایسے آدمی سے کبھی کوئی بڑا کام سرانجام نہیں پاتا۔ قدرت کے اصول درکنار اُسے بارہا خود اپنے دل کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر تم پائدار خوشی چاہتے ہو تو اپنے ارادوں پر قائم رہو۔ دیکھو اگر معمار نصف دیوار بنا کر چھت ڈالنی چاہے تو عمارت مکمل نہ ہو، اگر باغبان اگلے بیج نکال نکال کر نئے بیج بوتا رہے تو بوٹے کیونکر اُگیں اور باغ کیسے آراستہ ہو، اگر رستہ چلنے والے ایک ہی سڑک پر جادہ پیما نہ ہوں تو منزل مقصود پر کیونکر پہنچیں۔ اسی طرح اگر تم ایک کام کو ادھورا چھوڑ کر دوسرا کام کرنے لگو گے تو دُنیا میں کچھ نہ کر سکو گے ایک خیال کو خام چھوڑ کر دوسرے خیال کے پیچھے ہو لو گے تو اپنے ارادے کو مستقل اور اپنی زندگی کو شاندار نہ بنا سکو گے۔ جو اپنی بات پر قائم رہتا ہے اُسے قُدرت کی طرف سے اُمید لگی رہتی ہے کہ میری محنت ایک روز پھل لائے گی۔ زندگی کی تاریکیاں ایسی ہی کرنوں سے روشن ہیں!

خوف قوت شکن ہے اور خوف زدہ لوگ کبھی ترقی نہیں پاتے۔ ڈرنے والا روزِ روشن میں اپنے گھر میں لرزہ بر اندام ہے، لیکن بے خوف تیرہ و تار جنگلوں میں بھٹکے ہُوئے قافلے کا رہنما ہے۔ حاکموں کا ڈر غربت کا ڈر، بیماری کا ڈر، فرضی آفتوں کا ڈر کسی غصّہ ور شوہر کسی چالاک بیوی کا ڈر۔ غرض کسی شخص یا کسی چیز کا ڈر انسان کے دل کی بنیاد کھوکھلی کر دیتا ہے۔ ڈرنے والا مُصیبت کے آنے سے پہلے مُصیبت میں گرفتار ہے وہ دشمن کے حملہ کرنے سے پہلے اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہ جو نڈر ہے جسے اَوروں کی تحقیر دولت کی قِلّت غربت کی مُصیبت اور آنے والی آفتوں کا مطلق ڈر نہیں۔ جو حال مست ہے جسے مستقبل کی پروا نہیں وہ اپنے گھر میں بادشاہ ہے اُس کی رُوح حالات پر حُکمرانی کرتی ہے اور اُس کا دل زمانے کی اونچ نیچ میں اپنی سطح کو ہموار رکھتا ہے۔ بُزدِل نہ بنو، ہمت سے قدم بڑھاؤ، جو آفت باوجود تمہاری دلیری کے آنے والی ہے وہ آ کے رہے گی اُسے آنے دو، موت بھی ہے تو اُس کی پروا نہ کرو۔ جتنے دنوں جیو دلیری سے بلند حوصلگی سے جیو۔ کوئی شے نڈر آدمی کو نہیں ڈرا سکتی، دلیر انسان کے آگے زمانے کی قوت بھی ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ جسے اپنی جان تک کی پروا نہ ہو اُسے کوئی کیا ضرر پہنچا سکتا ہے، حق یہ ہے کہ دلیری اک بادشاہت ہے۔ جس کا حصول قلبِ انسان کے لئے گویا جنت الفردوس کی خوشیوں کا پا لینا ہے!

خوف ہی ہے جس سے بے صبری پیدا ہوتی ہے۔ حوصلہ مند انسان دوستوں عزیزوں کے لئے

خضرِ راہ ہے۔ جہاں وہ آجاتا ہے خوف و خطر دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے کی مصاحبت اک نعمتِ غیر مترقبہ ہے +
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) دین وُ دنیا کی تمام برکتیں صبر و حوصلہ کی خدمت کا دم بھرتی ہیں۔ اگر تم خوشی چاہتے ہو اگر تم خوشیوں کے طالب ہو تو محنت کرو اور پھر اُس ساعت کا انتظار جب خوشی خود آکر تمہارا دامن پکڑلے +

طعنہ زنی کی عادت زیادہ تر نسوانی حلقوں میں پائی جاتی ہے اور خصوصاً مشرق میں جہاں بیکاروں کا مشغلہ ہی زیادہ تر لعن طعن کرنا اور لفظی جنگ میں مصروف رہنا ہے۔ کُھلے اور چُھپے ہُوئے طعنے عالمانہ و جاہلانہ حجت بازیاں انتہا درجہ دل آزار اور موجبِ رنجش ہوتی ہیں + ہمارے باہمی تعلقات اکثر ان خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر تار تار ہو جاتے ہیں + طعنہ کرنے والا بھی بچتا نہیں جس طرح وہ دوسرے پر وار چلاتا ہے بعینہٖ اُسی طرح خود اُس پر وار ہوتا ہے جس طرح وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر کسی کی بُرائیاں تلاش کرتا ہے اُس کی معصومیت کو بھی عُریاں کرکے دُنیا کے آگے پیش کرتا ہے اُسی طرح کوئی اور اُس کے تہ خانے میں جا نقب زن ہوتا ہے اور اُس کے محفوظ خزانے سے دبی ہُوئی غلاظت کو نکال کر مقابل میں رکھ دیتا ہے + نتیجہ دونوں کے لئے بُرا ہے۔ طعنے سے بچنا چاہو تو طعنے کا جواب طعنہ نہ دو۔ خاموش رہو یا بے توجہ۔ اس سے طعنہ زن اور طیش میں آئیگا کہ اس سُست مزاج کو غصہ کیوں نہیں آتا۔ آخر پیچ و تاب کھا کر اپنی ہی جان کے درپے ہو جائیگا +

بحث و مباحثہ کا متعدی مرض تمام مہذب دُنیا میں پھیلا ہُوا ہے۔ ہماری بحثوں سے اکثر کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ اُلٹا ہر شخص اپنی ہی بات پر اڑا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرا محض خودغرض اور جاہلِ مطلق ہے + سیاسی بحثوں کو سُنو ہر بحث فرقہ بازی کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ مذہبی بحثوں کو سُنو ہر مذہب اپنے آپ کو اصلی اور دوسرے کو نقلی پکارتا ہے۔ گھر کی بحثیں بدترین جنگ و جدل کا نمونہ ہیں۔ ایک فریق نے دوسرے کو دیکھا اور بحث چھڑ گئی۔ جی میں کوئی گھنڈی ہے غریب نمک مرچ پر ہی جھگڑا ہو گیا نوکر کو ہی پیٹ ڈالا۔ ساس بہو میں چل گئی۔ بھاوج نند لڑنے لگیں گھر میں کہرام مچ گیا ہے وجہ کچھ تھی لڑائی کا بہانہ کچھ ہو گیا۔ نتیجہ کیا؟ خیالات کے اختلاف کا بڑھنا اور تعلقات کا بگڑتے جانا ؎

بحثیں فضول تھیں یہ کُھلا حال دیر میں ۔۔۔ افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

بحث مفید ہے اگر بحث کے رنگ میں نہ ہو + گھر کی خوشی کے لئے جب تم سمجھو کہ مقابل کا فریق بحثنے پر آمادہ ہے تو بحث چھوڑ دو اور بات بدل کر کوئی اور بات چھیڑ دو جس میں اتفاق رائے کی صورت

ہو اور امرِ متنازعہ فیہ کو کسی زیادہ روشن و خوشتر دن پر اُٹھا رکھو۔ سب لوگ ہمخیال نہیں ہو سکتے "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد"۔ علاوہ بریں منزلِ مقصود کو بیسیوں راہیں جاتی ہیں۔ اک تمہاری راہ ہی سیدھی نہیں اور سیدھی ہو بھی تو ممکن ہے کہ وہ اَوروں سے زیادہ دشوار گذار زیادہ خطرناک اور کم آرام دہ ہو۔

ہر شخص کو راست رو اور ہر شخص کے نُقطۂ نگاہ کو دُرست سمجھنا ضروری نہیں نہ یہ صحیح ہے لیکن اس کے برعکس ہر شخص کو احمق اور صرف اپنے آپکو عقلمند تصوّر کئے رہنا صرف غلط ہی نہیں نہایت تشویش آفریں بھی ہے۔ ایسا کرنے والا ہر وقت دوسروں کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے۔ کسی کی خوبیاں اُس کے دیکھنے پر عیبوں کی آڑ میں چُھپ جاتی ہیں۔ اُسے ہر شئے میں نقص ہی نقص نظر آتے ہیں اور نکتہ چینی اُس کی فطرتِ ثانی ہو جاتی ہے وہ جس کسی کے مکان کو لباس کو خوراک کو دیکھے گا نقص نکالے گا جس کسی کی باتیں جس کسی کی تحریر و تقریر سُنیگا چیں بہ جبیں ہو جائیگا۔ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے کون ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو۔ نکتہ چین کو جبتک کسی نکتہ چین سے واسطہ نہ پڑے وہ اپنے عیب نہیں جان سکتا اور واسطہ پڑے بھی تو جب دو سنگدل اک دوسرے سے ملیں گے نتیجہ صرف تخالف و تصادم ہو گا۔ اس لئے نکتہ چین صرف دُوسرے کی بُرائی دیکھ سکتا ہے۔ حُسن پسند ہے تو صرف حسینوں سے ملے گا خواہ وہ آپ زشت نمائی کا بُت کیوں نہ ہو۔ اپنے ہمعصروں میں کبھی کسی کی قابلیت کا معترف نہ ہو گا اگرچہ خود اُس کا شین قاف تک درست نہ ہو۔ ہر وقت اَوروں کی اخلاقی کمیوں کا اشتہار مفت تقسیم کرتا پھرے گا گو خود غرور کا پُتلا حسد کی مُورت اور خود غرضی کی تصویر ہو۔ ایسا بدنصیب کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ جب تک وہ گنہگاروں کی دُنیا میں خدا کا چوکیدار بنا رہیگا اُسے ہر رستہ چلنے والا چور اُچکا ہی معلوم ہو گا۔ بیچارہ کیونکر خوش ہو سب کی بُرائیوں کو دیکھ کر کُڑھتا ہے دُنیا بھر کی اصلاح اُس کے مدِّ نظر ہے۔ خود گرد آلود ہے لیکن اَوروں کو تو پاکیزہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی خورده بینی اک عذابِ جان ہے۔ اصلاح کرو لیکن اپنی مثال سے نصیحت کرو لیکن گاہے گاہے اور نرمی کے ساتھ نیک عمل اور محبت نکتہ چینی و خشونت سے بدرجہا زیادہ موثر ہیں۔

دُنیا اور دُنیا والوں سے بہت سی اُمیدیں وابستہ نہ رکھو ورنہ تم مایوس و نامراد رہو گے۔ نہ بہت زیادہ توقعات رکھو، نہ ایسے بڑے منصوبے باندھو جن کی تکمیل کی تم میں ہمت نہ ہو۔ بساط سے بڑھ کر قدم نہ مارو۔ اپنی جان پر کوڑا لے کر سوار نہ ہو جاؤ۔ ورنہ چند در چند دشواریاں تمہاری کمر توڑنے کو کافی ہونگی۔ ہر اچھی بات محض اس لئے نہ کیا کرو کہ دُنیا اُس کی قدر کرے۔ دُنیا کی قدر ہی ہمیشہ صحیح معیارِ زندگی نہیں ہوتا۔

دُنیا بہت سی بُری باتوں کی مدّاح ہے اور بہت سی اچھی چیزوں کی طرف وہ بے پروا رہتی ہے۔ اپنے تئیں ہر وقت مظلوم نہ سمجھے رہو ورنہ دوسروں کا اپنے کاموں میں مصروف رہنا بھی تمہیں ظلم وستم معلوم ہوگا۔ حالانکہ ساری دُنیا صرف تمہاری ہی خدمت کے لئے نہیں بنی۔

خوشامد پسندی ہر وقت خوش نہیں رکھ سکتی کیونکہ سب لوگوں کو تمہاری خوشامد کی نہ ضرورت ہے نہ اس کی فرصت خوشامد پسند جب خوشامدیوں کو اپنے گرد نہیں پاتا تو پیچ وتاب کھانے لگتا ہے کہ مجھ حاکمِ اعلیٰ کی یہ لوگ کیوں قدر نہیں کرتے۔

بہت لوگوں کی ناخوشی وتشویش کا اک بڑا سبب اُن کی زندگی کی بدنظمی وبے ترتیبی ہے۔ اِک بے ترتیب کے گھر کو جا کر دیکھو۔ اُس کی میز پر کاغذات کا حال ملاحظہ کرو۔ اُس کے کپڑے کس حال میں پڑے ہیں اُس کی کتابیں کس طرح اک دوسرے کے ساتھ مصروفِ پیکار ہیں۔ اِسی طرح اُس کے خیالوں کا حال ہے کوئی اک منصوبہ نہیں کہ کسی دوسرے منصوبے سے اُلجھا ہُوا نہ ہو۔ زندگی کا کوئی تقسیم اوقات نہیں۔ صبح سے شام دن اس طرح گذرتا ہے کہ ہر کام نامناسب وقت پر ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی میں اک طوفان برپا ہے جس کا بانی مبانی وہ خود ہی ہے۔ کہو ایسے برخود غلط کے لئے کونسی مشکل آسان ہوا اُس کا کونسا ارادہ تکمیل کو پہنچے کونسی تمنا پوری ہو؟ اتفاقاتِ زمانہ سے یا رحمتِ ایزدی سے اُسے جو مل گیا مل گیا۔ وہ خود تو اک ٹوٹی پھوٹی کشتی کی طرح ہے کہ جب تک دریا ساکن رہا وہ چلا گی اور جب موجوں میں ذرا حرکت پیدا ہوئی تو لگے ڈگمگانے۔ اپنے خیالوں اپنے ارادوں اپنے عملوں میں ہر وقت ڈانواڈول نہ رہو۔ اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی باتوں پر قائم رہو خواہ اُن میں سے بعض تمہارے لئے بالآخر ضرر رساں ہی ثابت ہوں۔ قدرت ثابت قدم ہے اُس کے کتنے اصول ہیں جو بدلتے رہتے ہیں دُنیا بھی اپنے جادۂ گردش پر رواں ہے وہ کبھی اپنے مقررہ رستے سے نہیں بھٹکتی۔ فطرتِ انسانی بھی استقلال ہی میں اپنے کمال کو پا سکتی ہے اور اسی میں اُسکے لئے پائدار مسرت ہے!

تشوش کے کچھ دماغی وروحانی اسباب بھی ہیں!

اِنسان جسمانی ورُوحانی اجزا سے مرکب ہے۔ وہ اک جسم رکھتا ہے جسم میں مختلف اعضاء ہیں جو خاص قوانین کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ وہ اک دماغ رکھتا ہے دماغ میں مختلف قوتیں ہیں جو اپنے اپنے طریق میں عمل کرتی ہیں۔ وہ اک رُوح رکھتا ہے جو اک خاص مدعا کے لئے اس جسم وجان کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے۔ یہ تمام اشیاء مقررہ قواعد کے مطابق عمل پیرا ہوتی ہیں اور مقررہ قواعد کے مطابق

ہی ترقی اور تنزل کرسکتی ہیں + اگر انسان چاہے کہ وہ فلک کے سبھی اسرار جان لے تو ایسا کرنا اُس کے بس میں نہیں اگر وہ چاہے کہ میں اپنے جسم سے آزاد ہوکر چاند تاروں کی سیر کیا کروں یا اس زندگی کو جب چاہوں چھوڑ دوں اور جوجی میں آئے کروں تو یہ بھی اُس کے اختیار میں نہیں جس طرح اُس کی جسمانی و مادّی ترقی بتدریج صدیوں میں اس حالت پر آئی ہے اُسی طرح اُس کی دماغی و روحانی ترقی بھی اک مُدت دراز میں وہاں پہنچیگی جہاں اُس کا تخیل اُسے پہلے ہی لے جاچکا ہے + لہذا انسان کو چاہیئے کہ جبتک اُس کی رُوح میں خاص غیر معمولی قوتوں کا ظہور نہ ہو جبتک وہ اس بات پر راضی نہ ہولے کہ وہ رُوحانی مسرتوں کے بدلے لاکھوں جسمانی تکلیفیں اُٹھانے کو تیار ہے اُس وقت تک جادۂ اعتدال پر قائم رہے اور سب باتوں میں میانہ روی اختیار کرکے دماغی و روحانی دُنیا میں اپنی بساط سے بڑھ کر قدم نہ مارے + اور کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ تمام وہ لوگ جو رُوحانیات میں قدم رکھتے ہیں قدرت انہیں اس جلد باز ترقی کی سزا نہیں دیتی۔ جسمانی قوانین رُوح سے ضرور انتقام لے کے رہتے ہیں۔ بہت کم حقیقت پرست ہیں جو ترکِ دُنیا کے قابل ہیں +

جسم کیا ہے رُوح کیا ہے دل کیا ہے ؟ ہم کہاں سے آئے ہیں کہاں جارہے ہیں ؟ پیدا کیوں ہُوئے کیوں مریں گے ؟ خدا نے دُنیا کو ایسا کیوں بنایا ویسا کیوں نہ بنایا ؟ ان سوالوں کو دل میں گھماتے رہنا نہ صرف بے فائدہ ہے اکثر قطعی ضرر رساں ہے + ان کا جواب نہ کسی کو معلوم ہُوا ہے نہ جب تک قدرت چاہے معلوم ہوگا۔ لاکھوں فلسفی اپنا سر کھپاتے رہے لاکھوں فقیر اپنا جسم گھُلاتے رہے مگر شاید کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ کیا تماشہ ہے اور کس لئے ہے ؟ کائنات کے معمے کو حل نہ کرتے رہو کہ وہ تم سے حل ہونے والا ہے نہیں۔ ہر شے کی تہ تک پہنچنے کی تمنا نہ رکھو ورنہ اغلب ہے کہ تم سطحی باتوں کو بھی نہ سمجھ سکو گے + قدرت کے مظاہر کو صرف دھوکے کی ٹٹی نہ سمجھو نظاروں کو فریب کاری نہ کہو۔ چیزوں کو بے اصل نہ جانو۔ اگر ذرہ بے بضاعت ہے تو آفتاب بھی بے جانے بوجھے گھوم رہا ہے اگر جسم لغو ہے تو دل کہاں خدا کا پیارا ہے۔ قدرت کی بنائی ہُوئی سبھی چیزیں اچھی ہیں سب اچھی بن رہی ہیں سب اپنے فرض ادا کرتی ہیں۔ جوکچھ بھی ہے وہ اچھا ہے اور بہتر بن سکتا ہے، جو تمہارے بس میں ہے تم اُسے بہتر بناؤ جو تمہارے بس میں نہیں اُسے قدرت پر چھوڑ دو وہ خود بخود دُرست ہو جائیگا + اسی طرح یہ نہ سمجھو کہ دُنیا میں اتنی کوتاہیاں ہیں اتنی بُرائیاں ہیں اس کارخانے کا کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں نہ اس میں کوئی ترتیب ہے نہ اصول۔ ہم لوگ کیا کریں خواہ مخواہ کی مُصیبت میں پڑ گئے۔ زندگی کتنی دُشوار ہے

باہمی مقابلے عزیزوں کی ذمہ داریاں زمانے کی صعوبتیں سب کا سامنا ہے اور کوئی عقلمند ہماری مدد کا بیڑا نہیں اُٹھاتا + اس دہریہ پن اور لاادریت نے مہذب دُنیا کے بہت سے حِصّے کو مُصیبت میں مُبتلا کر رکھا ہے۔ مذہب کے اعتقاد پُرانے ہو چکے ہیں عقل کی کُرید نے دماغ میں کیڑے پیدا کر دیئے ہیں۔ غلط قسم کے فلسفے یا اُلٹی کھوپری نے نہ اِدھر کا رکھا نہ اُدھر کا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں جس سے زندگی کا عُقدہ کُھلے اور جی ٹھکانے لگے + ایسے لغو خیالوں سے وہ لوگ بہتر ہیں جو خواہ مذہب سے بے پروا ہیں لیکن ہر وقت اس خیالی اُدھیڑ بن میں نہیں لگے رہتے۔ وہ دُنیا کو جیسا پاتے ہیں ویسا ہی سمجھتے ہیں۔ وہ اسرارِ قدرت کو سمجھنے کے درپے نہیں رہتے۔ بلکہ اپنے ضمیر کے ساتھ کام کرتے ہیں اور مطمئن ہیں +

دُنیا میں جو جو بُرائیاں ہیں وہ ظاہر ہیں۔ جو ظلم آدمی آدمی پر قومیں قوموں پر کرتی ہیں وہ پوشیدہ نہیں جیسی جیسی اخلاقی کمزوریاں غصبِ حقوق غصہ وری حرص پروری نفسانیت تکبّر زرپرستی ہٹ دھرمی نوعِ انسان میں ہیں اُن سے صبح و شام ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ ہم میں سے بعض محض ان چیزوں کو دیکھ کر ہی ناخوش رہتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ہماری ناخوشی ان خرابیوں کو بجائے کم کرنے کے زیادہ کرتی ہے کیونکہ ہماری دلی بیزاری سے ہماری عملی کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں + ہم قدرت کے بہت سے کاموں کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ لیکن یہی قدرت کا منشا ہے کہ تم غور کرو کم اور کام کرو زیادہ۔ تم جو کچھ سمجھتے ہو اُس پر عمل کرنیکو تمہاری تمام عمر بمشکل کافی ہوگی اور زندگی زیادہ تر عمل کے لیئے ہے تخیل کے لئے نہیں + اگر تم علمدوست ہو تو فلسفیت سے پرہیز کرو اور اگر تم علمی نعمتوں سے محروم ہو تو عقل کی باگ ڈور کو تھامے رہو اور زندگی سے بیزاری کو اک گناہ سمجھو +

بعض شخص ذکی الحس ہونے کے باعث یا اپنی اعصابی و دماغی کمزوری کی وجہ سے گویا تشویش کی ایک پوٹ بن جاتے ہیں + ہر آنے نہ آنے والی مُصیبت سے ڈر ڈر کر کانپتے رہتے ہیں + کوئی بیمار ہُوا اور وہ سمجھے کہ ابھی مرا۔ بارش ہونے لگی اور وہ سمجھے کہ بجلی گری کہ گری۔ معدہ خراب ہُوا تو بخار کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر کام میں دُنیا کے سب تعلقات میں اُنہیں برابر کسی نہ کسی خرابی اور کمزوری کی بُو آتی رہتی ہے۔ دراصل یہ بُو خانہ ساز بلکہ دل ساز ہوتی ہے اور اسکا سوائے اسکے کچھ علاج نہیں کہ مریض ہوش سنبھالے اور عام عقل کو کام میں لائے + بعض لوگ بے وجہ غم پسند ہوتے ہیں۔ اُنہیں دُنیا اور فانی انسان بے حقیقت قدرت خوفناک اور ہمجنس خونخوار درندے نظر آتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے فیضِ عام میں سے اُنہیں غم کا تحفہ عنایت فرمایا ہے +

لُطف یہ ہے کہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو غم سے اک گُونہ لُطف اُٹھاتے ہیں۔ یہ مشرقی طرزِ خیال حد درجہ مانعِ ترقی اور ممدِ انحطاط ہے۔ اِس سے انسان جمادات کا درجہ حاصل کر لیتا ہے انسان نہیں رہتا۔ وہ جہاں بیٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہے ہاتھ پاؤں مارنا اور چلنا سب بھُول جاتا ہے۔ ایسی "حساسیت" قاطعِ زندگی ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

غرض یہ ہیں تشویش کے اسباب جسمانی و ذاتی اخلاقی و معاشرتی دماغی و رُوحانی۔ اِن سے بچو۔ اور ساتھ ہی ایسے طریق اختیار کرو جن سے تمہاری زندگی گاہے گاہے خوشیوں کی بازی گاہ بن جائے۔

(باقی دارد) بشیر احمد

(خوش رہنے کے کیا طریقے ہیں؟ اس پر آئندہ اور آخری قسط میں روشنی ڈالی جائیگی)

اقوالِ زرّیں

آزادی سُود مند اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ محدود ہو۔

آزادی اُنہیں کو ملتی ہے جو آزادی سے محبت رکھتے ہیں۔ یہ نعمت خُدا اُنہیں کو بخشتا ہے جو ہر گھڑی اس کی محافظت کے لئے تیار رہتے ہیں!

ہر غُلام اپنے ہی ہاتھوں میں اپنی غُلامی کا خاتمہ کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

وہ آدمی خوش قسمت نہیں ہو سکتا جس کی بیوی بدمزاج ہو۔

بعض لوگ بدقسمتی کے اس قدر مشتاق ہیں کہ وہ گھر سے نکل کر دُور تک اس کے استقبال کو جاتے ہیں! (گلچیں)

غزل

جب نگاہِ مستِ ساقی کام اپنا کر گئی
موج میری بیخودی کی تالب کو تر گئی

کچھ دنوں سے دل میں تھی افسردگی سی بھر گئی
حسن کی شوخی مگر پھر کام اپنا کر گئی

اس مئے مرد آزما کو چاہیئے مجھ سا حریف
بس کر اے ساقی کہ اب یاروں کی نیت بھر گئی

حسن کی شوخی نے شہرت اُنکی چمکائی اُدھر
میری بیتابی اِدھر بیتاب مجھ کو کر گئی

بادِ مردم سوز تھی جو چلنے والی روزِ حشر
میری تربت پر وہ آ کر ٹھنڈی سانسیں بھر گئی

چھا گیا تھا صبر و خاموشی کا عالم ہر طرف
چال پھر اُس شوخ کی ہنگامہ برپا کر گئی

بڑھ نہیں سکتے مَلک جس حد سے آگے اک قدم
میری پروازِ طبیعت اُس سے بالا تر گئی

کھیلتا ہے دل مرا دوزخ کے شعلوں سے مدام
دیکھ کر بجلی مری بیتابیوں کو ڈر گئی

حسن کی دنیا کی جو وسعت دکھائی عشق نے
کرتے کرتے اُس فضا کو طے تمنا مر گئی

میری ہستی میں نہ حیرت کو ملا میرا پتہ
جستجو کرتی کبھی اندر کبھی باہر گئی

کارخانہ بجلیاں ڈھلنے کا دیکھا آنکھ سے
جب نگہ میرے دلِ بیتاب کے اندر گئی

دے سکی موجِ تمنا کی روانی کا نہ ساتھ
دوڑنے میں گو مری عمرِ رواں مر مر گئی

سلیم

ہوا

ہوا آنکھیں بند کرکے چلتی ہے۔ ریت کے ٹیلے ہوں کہ نشاط باغ کے آبشار، بنئے کا گھر ہو کہ شاہ جہانی موتی مسجد، کوڑا ہو کہ نہر لمودری یہ چڑیل پہنچتی سب جگہ ہے مگر دیکھتی کچھ نہیں۔ چلنے پر آتی ہے تو پتے، ریت، بھوبھل۔ بو، خوشبو، دھواں جو ہاتھ لگے کچھ سمیٹ کچھ بکھیرا اُڑی چلی جاتی ہے۔ کبھی کندھوں پر بادل لادے پھرتی ہے کبھی کُہر کا برقع پہنتی ہے مگر پہاڑ ہو کہ غار کہ سمندر دیکھتی کچھ نہیں۔ خدا جانے اسے کیا جلدی ہے؟

میں اسے اکثر دیکھتا ہوں۔ برسوں اس دھوکے میں رہا کہ ہو نہ ہو کم ازکم ایک دھانی دوپٹے کے ساتھ اس کی گستاخیاں عمداً ہوتی ہیں اور دستِ نازک کی رشکِ رقص جنبش کے مزے لے کر دل ہی دل میں قہقہے لگاتی ہے کہ جتنا روٹھے گا اسی قدر اسے اور بناؤنگی مگر یہ خیال غلط نکلا۔ چھوٹے دیدوں والی بنے کل اُن کی تصویر جو میز پر میری نگاہوں کا کعبہ ہے اُٹھا کر پھینک دی اور چلدی۔ ٹھہرتی تو کچّی کو کھا جاتا۔

میں اسے اکثر دیکھتا ہوں۔ باوجود اس کی بدتمیزیوں کے، باوجود اس کی جلدی کے، باوجود اس کی بند آنکھوں کے ہوا میں اک شان ہے جو میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں آجائے۔ کاش میری زندگی ایک میٹھے جھونکے کی طرح ہو۔ آہٹ چاہے کوئی سُن پائے مگر کسی پر بوجھ نہ ہو۔ دلوں کے مرغزاروں میں خفیف سا رقص، لطیف سا ترنم، بانکی سی موج تبسم پیدا کروں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلدوں۔ مجھے بھی جلدی ہے۔

(فلک پیما)



جھوٹ جو نصف جھوٹ بھی ہو قطعی سیاہ جھوٹ ہے۔

قدرت نے شرمیلے حُسن کا نقاب جنگلوں اور پھولوں اور کنوارپن پر ڈال دیا ہے۔

کوئی اک آدمی ایسا پُر رعب نہیں جیسے نوعِ اِنسان۔

(گلچیں)

شہزادی کا کفن

زہرہ جبیں غدر ۱۸۵۷ء میں ۱۷ برس کی تھی، اس کا نسب فرخ سیر بادشاہ سے ملتا تھا، چونکہ بہادر شاہ بادشاہ کے تعلقات اپنے خاندان کے دوسرے شہزادوں سے کچھ اچھے نہ رہتے تھے، اور اس لئے وہ عموماً لال قلعہ کے باہر مختلف محلوں میں رہا کرتے تھے۔ زہرہ جبیں کے والد بھی لال قلعہ کے سامنے خانم کے بازار میں عرصہ دراز سے مقیم تھے، زہرہ جبیں اپنے والد کی اکلوتی لڑکی تھی، انکے والد کو دو سو روپے ماہوار پنشن ملتی تھی، اور قدیمی زر و جواہر بھی گھر میں بہت تھا۔ زہرہ جبیں کے والد موسیقی کے بڑے قدردان تھے، اور رات دن اس شوق میں مصروف رہتے تھے۔ زہرہ جبیں بھی اپنے والد کے شوق میں حصہ لیتی تھی، اور خصوصیت سے ستار بہت اچھا بجاتی تھی ؛

زہرہ جبیں کا معمول تھا کہ روزانہ شام کے وقت سات آدمیوں کا کھانا مختلف مسجدوں میں بھیج دیتی ۔ جب خود کھانا کھاتی تھی۔ اور سردی کے موسم میں ۱۲ غریبوں کو گرم اوڑھنا بچھونا تقسیم کر دیتی اسکے بعد نئے موسم کا گرم سامان استعمال شروع کرتی ؛

زہرہ جبیں کی شادی نہیں ہوئی تھی، البتہ نسبت ہو گئی تھی، اسی اثنا میں غدر ہو گیا، اور زہرہ جبیں کے والد انگریزی فوج کے داخلہ دہلی کے وقت بیگناہ قتل کر دئے گئے ۔ اور زہرہ جبیں پنجابی سپاہیوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر پھر انبالہ گئی، اور اس کے بعد ضلع جہلم کے کسی گاؤں میں پہنچی، کیونکہ جو افسر اس کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا، وہ ضلع جہلم کا مسلمان باشندہ تھا ؛

زہرہ جبیں پر غدر میں جو کچھ گذری اور دہلی سے انبالہ اور انبالہ سے جہلم تک جانے میں جو کچھ واقعات پیش آئے ان میں اگرچہ بہت سا حصہ دردناک ہے، لیکن کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے ۔ البتہ جہلم کے گاؤں میں جانے کے بعد زہرہ جبیں کو ایسے صدمات پیش آئے جنکا معلوم کرنا تاریخی لحاظ سے بھی مفید ہے، اور ان حالات میں عبرت اور سبق بھی ہے ۔ زہرہ جبیں نے جبکہ وہ آخری مصیبت کے دن کلکتہ میں گذار رہی تھی، ایک شخص سے اپنا حال اس طرح بیان کیا ؛

"میں جہلم پہنچی، تو فوجی افسر نے مجھ سے نکاح کرنا چاہا، میں اسکے ہاتھ میں ایک قیدی کی طرح

تھی، اگر وہ نکاح کرنے کا جائز پیغام نہ بھی دیتا تب بھی میں اسکے اوڑھنے بچھونے کی طرح اسکے قبضہ میں تھی، لیکن مجھے اس کی عمر اور اس کی صورت اور اس کی آواز اور اس کی معاشرت سے کچھ خود بخود نفرت تھی، وہ پچاس برس کا ایک لمبا تڑنگا قوی ہیکل آدمی تھا، رنگت اگرچہ کالی نہ تھی، لیکن چیچک کے داغ بہت زیادہ تھے۔ مگر سب سے زیادہ مکروہ اسکی آواز تھی، میں نے موسیقی کے دلنواز اور گوش نواز نغمے سُن سُن کر ہوش سنبھالا تھا، لیکن جب میں اس فوجی سردار کی سخت آواز سنتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں تمام ساز ٹوٹ گئے۔ اور غدر کرنے والوں نے انکو تباہ کر ڈالا، اور تمام دُنیا کی بُری آوازیں اس واقعہ پر اظہارِ مسرت کر رہی ہیں +

مگر مجبوراً میں نے نکاح کے پیغام کو قبول کیا، اور با دل ناخواستہ فوجی سردار کے گھر میں رہنے لگی، سردار صاحب کو دنیا میں دہی سے شوق تھا، دودھ سے شوق تھا، گھی بہت کھاتے تھے، چھاچھ خوب پیتے تھے، اور حقہ کے تو ایسے رسیا تھے کہ رات دن ایک بہت بڑا حقہ سامنے رکھا رہتا تھا، صبح آٹھ بجے سوتے اُٹھتے اور رات کے ۱۲ بجے تک کھانا اور پینا اور گاؤں والوں سے ادھر اُدھر کی غپ شپ کرنا انکا کام تھا، گھر میں آتے تو مجھ سے کبھی شگفتہ ہو کر بات نہ کرتے، اور شاید شگفتہ اور لُطف کی باتیں وہ جانتے بھی نہ تھے، گھر میں دو عورتیں خدمت کے لئے موجود تھیں، کبھی ان سے کبھی مجھ سے حقہ بھرنے کی فرمائش ہوتی، اور سیر بھر دودھ ایک سانس میں پینے کے بعد میری طرف دیکھتے اور کہتے کہ تمکو دودھ سے محبت نہیں ہے، میں ہنس کر کہتی، دودھ پینے کی چیز ہے، محبت کی چیز نہیں ہے، تو بگڑ کر فرماتے محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ تم یہاں دلّی کی باتیں نہ کیا کرو +

ایک روز ارشاد ہُوا کہ باجرہ کی کھیر بنی لو، بُہت اچھی ہے، میں نے کہا مجھ کو نزلہ ہو رہا ہے، نقصان نہ دے۔ تھوڑی سی چکھ لونگی، اس جواب سے غصّہ آ گیا، اور کھیر کا بھرا ہُوا برتن اُٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا تیرے واسطے بادشاہی کھانے کہاں سے لاؤں؟ میں نے جھگڑا مٹانے کے لئے کہا مجھے آپ کے ہاں سب طرح کا آرام ہے، میں نے تو آجتک کسی بادشاہی کھانے کو یاد نہیں کیا، اور میں تو اب کبھی یہ خیال بھی نہیں کرتی کہ میں شہزادی ہوں۔ بولے اگر تو خیال بھی کرے تو ہم اس کی کیا پروا کرتے ہیں +

ایک دن میں نے کہا آپ کو نماز پڑھنی چاہیئے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے انکے ساتھ کھانا کھانا جائز نہیں ہے۔ اور اب آپ کا بڑھاپا ہے آخر وقت میں خدا کو یاد کرنا بہت ضروری بات ہے، بڑھاپے

اور آخروقت کے لفظ سے انکو غصہ آگیا، اور ایک دفعہ ہی چیخ کر بولے کیا میں بڈھا ہوں؟ کیا میں مرتا ہوں؟ نماز پڑھوں گا، اپنے واسطے پڑھوں گا، نہ پڑھوں گا میری خوشی ہے، تُو کون مجھ کو نصیحت کرنے والی؟ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے ہاتھ کی بید میرے ماری، اور تین چار ہاتھ اس زور سے لگائے کہ میں بلبلا اُٹھی۔

اس رات کو میں نے کھانا نہ کھایا، اور تمام رات بدن چوٹ کے سبب دُکھتا رہا۔ صبح نوکر سے میں نے کھانا منگوایا تو سردار صاحب نے منع کر دیا کہ بے نمازی کے گھر کا کھانا اسکو نہ دے۔ میں صبر کر کے خاموش ہو گئی۔ شام کو بھی انھوں نے کھانا نہ بھیجنے دیا، اور وہ رات بھوک کے سبب آنکھوں میں کٹی، تمام شب نیند نہ آئی، مگر پچھلی رات میں نے خود اُٹھ کر دُودھ پی لیا کہ میں بھی اس گھر کی مالک تھی، صبح کو میں نے سردار صاحب سے معافی مانگی، اور انھوں نے کھرکھرائی ہوئی آواز میں ایک بڑا قہقہہ لگایا، اور بطور معافی قبول کرنے کے میرے بازو میں اتنے زور سے چٹکی لی کہ میں بیدوں کی مار بھول گئی۔ اور کئی دن تک ان کی موٹی موٹی اُنگلیوں کی چٹکی کا نشان میرے بازو پر رہا۔

ایک دن کسی دوست سے ستار مانگ لائے، اور کہا تم کہتی تھیں کہ تمہیں ستار بجانا آتا ہے، ذرا ہمکو بھی سُناؤ میں نے ستار بجایا، بہت خوش ہُوئے، اکڑوں بیٹھے تھے، حقہ پیتے جاتے تھے، کبھی مُسکراتے، کبھی آنکھیں بند کرتے، کبھی آنکھیں کھولتے، کبھی کھانستے، کبھی بھاری اور کھرکھراتی ہُوئی آواز میں آہا ہا کہہ کر داد دیتے۔ جب میں ستار بجا چکی تو فرمایا تم تو کنجریوں سے بھی اچھا بجاتی ہو۔ میں سمجھی رنڈیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، میں نے کہا وہ تو شاید ستار بہت کم بجاتی ہیں: بولے یہ باجے تو کنجر ہی بجاتے ہیں، اور تمہارے باپ دادا بھی کنجروں کی اولاد تھے۔ یہ سُن کر مجھے بہت غصہ آیا، اور میں نے کہا تمہارے باپ دادا کو میرے باپ دادا نے نوکریاں دیں، جاگیریں دیں، اگر وہ کنجر تھے تو تمہارے باپ دادا کنجروں کا دیا کھانا کھاتے تھے۔ بس یہ کہنا غضب ہو گیا، اور انھوں نے میری چوٹی پکڑ کر دو تین طمانچے چہرے پر مارے۔ جس سے مجھے غش آگیا، ہوش آیا تو رات تھی، اور میں جنگل میں ایک کنوئیں پر پڑی تھی، باقی رات اسی اندھیرے میں میں نے گذاری، صبح ایک راہگیر آیا تو میں نے اس سے اپنے گاؤں کا پتہ پُوچھا کہ وہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟ اس نے کہا ایک کوس ہے۔ اور تجھ کو سردار جی نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ یہاں ڈلوا دیا تھا، وہ کہتے ہیں، میں نے اس عورت کو طلاق دے دی، یہ بہت بدزبان عورت ہے، میں نے کہا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں بھی تمہارے گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اور دوسرے گاؤں میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا مجھے بھی دوسرے گاؤں میں پہنچا دو، اس نے اس سے انکار کیا۔ آخر میں خود اکیلی ایک طرف چل کھڑی ہُوئی

اور چلتے چلتے دوپہر کو ایک گاؤں میں پہنچی، وہاں سکھ رہتے تھے۔ اور گاؤں کے پاس کھیت میں ایک عورت کام کر رہی تھی، میں نے اس سے کھانا مانگا، اور اس نے آدھی روٹی اور چھاچھ مجھ کو دی اور میرا حال پوچھا، مگر میں اس کی بولی اچھی طرح نہ سمجھی، روٹی کھا کر میں ایک درخت کے نیچے سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک سفید کپڑا نیچے آیا، جس کے چاروں کونوں پر "شہزادی کا کفن" لکھا ہوا تھا، اور بیچ میں ایک میت کی تصویر بنی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اتنے میں ایک مسلمان فقیر وہاں آیا، اور اس نے میرا حال پوچھا، میں نے اس سے ساری حقیقت سچ سچ کہہ دی، وہ میرا حال سن کر رونے لگا، اور کہا میں بھی تیموریہ خاندان میں ہوں انگریزوں نے میری گرفتاری کا اشتہار دے رکھا ہے، اس واسطے میں اس لباس میں چھپا پھرتا ہوں، اب میرا ارادہ کلکتہ جانے کا ہے، اگر تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہو تو تمکو لے چلوں، میں نے اس کا اتا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ واقعی وہ ہمارے ہی خاندان کا ہے، میں اس کے ساتھ روانہ ہوئی، اور کچھ دن کے بعد ہم لاہور پہنچے، اور یہاں آ کر اس شخص نے مجھ سے نکاح کر لیا، اس کے بعد میں اسکے ساتھ کلکتہ آئی، میرے خاوند نے ہاتھ دیکھنے کا پیشہ اختیار کیا، اور ہم دونوں نہایت اطمینان سے غریبانہ زندگی بسر کرنے لگے کہ ایک رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا کہ میرے سامنے ایک کپڑا لایا گیا، جس کے کونوں پر "شہزادی کا کفن" لکھا ہوا تھا، دوسرے دن میرے خاوند کو ہیضہ ہوا اور وہ یکایک مر گیا، اور میں نے ایک بنگالی بابو کے ہاں ماما کی نوکری کر لی، کھانا تو وہ کہیں اور کھاتا تھا، گھر کی صفائی اور چیزوں کے انتظام کے لئے اس نے مجھکو رکھا تھا، اور مجھکو اتنی تنخواہ ملتی تھی کہ بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ ایک دن رات کو میں نے پھر وہی خواب میں کفن دیکھا، اور صبح کو بنگالی بابو کسی بگڑے ہوئے گھوڑے کی جھپٹ میں آ کر مر گیا، اور میں چند دن تک دربدر بے روزگار پھرتی رہی، آخر ایک مسلمان شاہ صاحب کے ہاں کھانا پکانے کی نوکری ملی، ان حضرت کی نیت خراب دیکھی، تو میں وہاں سے چلی آئی، اور میں نے ناریل کے پتوں کے پنکھے بنا بنا کر بیچنے شروع کئے۔ مگر انکی بکری اتنی نہ ہوئی جس سے میری گذر اوقات ہو جاتی، اس کے علاوہ رہنے کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پھر میں ایک عیسائی میم کے ہاں نوکر ہو گئی۔ جس نے اپنے بچہ کو پالنے کے لئے مجھے رکھا تھا، چھ مہینہ کے بعد مجھ کو پھر وہی خواب نظر آیا، اور میں ڈری کہ اس میم یا اس کے بچہ پر کوئی آفت آنے والی ہے، مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ خود میرے سانپ نے کاٹا۔ مگر میم نے اسپتال میں میرا علاج کرایا جس سے میں اچھی ہو گئی۔ چھ مہینہ کے بعد میں نے پھر وہی خواب دیکھا، اور صبح اٹھی تو تمام گھ

میں آگ لگی ہوئی تھی، میں نے بچہ کو گود میں لے لیا، اور ایک کھڑکی کے راستہ سے باہر آگئی، میم صاحب بھی بمشکل جان بچا کر نکل سکیں، سارا مکان جل گیا، مگر میم صاحب کا روپیہ بنک میں تھا، انہوں نے پھر ایک گھر میں سب سامان خرید کر سجا لیا، دو مہینہ کے بعد پھر مجھے وہی کفن نظر آیا اور میں نے صبح میم صاحب سے کہا، اب میں آپ کے ہاں نہیں رہتی۔ ایسا نہ ہو میری وجہ سے آپکو کوئی نقصان پہنچ جائے کہ جب میں ایسا کوئی خواب دیکھتی ہوں، تو مجھکو یا میرے مالک کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ میم صاحب نے ہنس کر ٹال دیا، اور کہا ان باتوں کا کچھ خیال نہ کرو، تھوڑی دیر کے بعد میم صاحب اندر کمرہ میں گئیں، اور وہاں سے بچہ کو لے کر اوپر کمرہ میں جانے لگیں، زینہ سے پاؤں پھسلا اور سر کے بل گر پڑیں، اور بچہ بھی انکی گود سے گرا، اور دونوں تھوڑی دیر میں مر گئے۔ چندروز پولس نے پریشان کیا، اس کے بعد میں یہاں قبرستان میں چلی آئی اور اب یہیں رہتی ہوں۔ روزانہ شہر میں جاتی ہوں، اور اپنے خاوند کے ملنے والوں سے کھانے پینے کے لئے کچھ مانگ لاتی ہوں +

جن صاحب نے یہ قصہ بیان کیا، وہ کہتے ہیں، کہ جن ایام میں کلکتہ کے انگریزی اخبار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ توہین کی تھی، اور کلکتہ میں مسلمانوں نے اسکے خلاف بلوہ کیا تھا، اس زمانہ میں ایک دن شہزادی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے آج پھر خواب میں کفن دیکھا ہے، اور کوئی نہ کوئی واقعہ ہونے والا ہے، چنانچہ اسی دن وہ شہر میں گئیں، اور بلوہ کے ہنگامہ میں انکے بھی گولی لگی، اور بیچاری کا کام تمام ہو گیا +

اور کوئی نہیں جانتا کہ خواب کے کفن کا یہ کیا کرشمہ تھا!

حسن نظامی

لیتا ہے میرے دل میں غم آرام اِس طرح

سُنسان جنگلوں میں پڑے شام جس طرح

"باغبان" (ٹیگور)

جگنو کی ملکہ

شمع کی دھندلی روشنی کتاب پر ضَو فگن تھی، اور دانا شاعر مطالعہ میں مشغول۔ ماہ تاباں اپنی خوشخرامی سے سال کی ساتویں منزل طے کر رہا تھا، بھونرا اپنے سیاہ چمکیلے پر سمیٹے ہوئے انار کے پھول میں موسیقیت کا لطف بڑھا رہا تھا۔ مینڈک آبگیر سے اُچھل اُچھل کر مسرّت کے گیت گا رہا تھا۔ چاند کی منوّر شعاعیں آسمان سے زمین تک آشکار۔ ہوا فرحت بخش اور عنبر بیز تھی۔ لیکن شاعر کا دل نہ جانے کس چیز کی تلاش میں اور کہاں کہاں بھٹک رہا تھا کہ کسی چیز سے مسرّت اندوز نہ ہُوا۔ ہاں اُس کی آنکھیں ایک پُر الم منظر دیکھ رہی تھیں۔ اُسکے سامنے پروانے شمع کے گرد اپنا سر دھنتے اور فرطِ محبت سے اپنے نرم، نازک، خوبصورت اور چمکیلے پروں کو شمع کی لَو پر بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ اُدھر پروانے جل کر خاک ہو رہے تھے اِدھر شاعر کا دل ٹکڑے۔ آخر جذبات میں برانگیختگی اور تخیلات میں تلاطم بپا ہُوا اور وہ بے اختیار ہو کر کہہ اُٹھا:-

"اے ننّھا سا دل رکھنے والے وفادار سودائیو! کیا اب بھی شمع سے وصل کی تمنا رکھتے ہو؟ تم کس قدر نادان ہو! کیا تم نے "جگنو کی ملکہ" کی کہانی نہیں سُنی؟"

پروانوں نے اپنے پر پھڑپھڑائے، شاعر کی بات پر مطلق دھیان نہ دیا، وہ مایوس ہو چکا تھا شاید کچھ نہ کہتا مگر دل کی بیقراری سے ہونٹوں کو جنبش ہُوئی دل کے جذبات الفاظ بن کر زباں پر آ گئے:-

"انکے کان اِس سے آشنا نہیں اگرچہ یہ ایک افسانۂ کہن ہے۔ تاہم فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ میں سُناؤں اور تم سُنو"

"جگنو کی ملکہ" چھوٹی چھوٹی اُڑنے والی مخلوق میں سب سے سبک پرواز، درخشاں، اور سب سے زیادہ حسین تھی۔ سرخ کنول کا دل اُس کا مسکن تھا۔ وہ کنول جو ایک خاموش جھیل میں پیدا ہُوا سطحِ آب پر نشوونما پا کر پھُولا۔ جب ملکہ کنول کے آغوش میں سو جاتی تو وہ فرطِ انبساط سے جھومنے لگتا۔

پروانے فطری سوز و گداز سے ملکہ پر سو جان سے نثار ہونے کے لئے بے انتہا تعداد میں، اپنے نازک پروں سے پنکھیا کا کام لے کر کنول کی مگس رانی کرتے تھے۔ یہ اس لئے کہ اُنکے ننھے ننھے دلوں میں محبت کی چنگاریاں مشتعل تھیں۔ بعض اوقات جب صبر کی طاقت جواب دے جاتی تو وہ بے اختیار ہو کر کہہ اُٹھتے:

"رحم، رحم، اے جگنوؤں کی ملکہ، اے جھیل کے نور، اے خانۂ دل کو منور کرنے والی عروسِ ضیا، اپنی شیریں موانست کا ایک لمحہ اِدھر بھی"

لیکن ملکہ بیٹھی مسکراتی اور خوش ہوتی۔ آخر جب پروانوں کے نالہ وشیون کی کوئی حد نہ رہی تو دق ہو کر ایک رات اُس نے سب پروانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور ایک عجیب انداز معشوقانہ سے کہنے لگی:-

"میری محبت کا دم بھرنے والو! اس فضول کوشش سے تمہیں اسکے سوا کہ میرے کنول کے گھر کو برباد کرو اور مجھے ستاؤ اور کیا حاصل ہے۔ ہاں اگر واقعی تم مجھے چاہتے ہو تو اپنی محبت کا ثبوت دو۔ جاؤ میرے لئے روشنی لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں قبل از وقت میں کچھ نہ سنوں گی اور نہ اس سے زیادہ کوئی بات کرونگی"

پروانے حکم کے منتظر پروانے ہمہ تن گوش تھے۔ اضطرابِ اُمید نے اُنکے ہونٹوں پر مُہرِ سکوت لگا دی۔ وہ یہ سُنتے ہی اُڑ گئے ملکہ ہنسنے لگی۔

وارفتگانِ محبت رات کی تاریکی اور خاموشی میں، خواہشات سے لبریز دلوں کو، دامنِ استقلال میں لئے کاروانِ اُمید کے ساتھ، اِدھر سے اُدھر، اس سرے سے اُس سرے تک اُڑتے پھرے۔ اُنکو ایک مکان کی کھڑکیوں سے روشنی نظر آئی، دریچے کُھلے ہوئے تھے۔ جذبۂ بے اختیار سب کو ساتھ لے کر مکان کے اندر داخل ہوا۔ ایک کمرے میں ایک دوشیزہ شمع کی روشنی میں کسی کا محبت بھرا خط پڑھ رہی تھی۔ اُسکی سرگیں آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ یکایک پروانوں نے آکر شمع کے گرد گھیرا ڈال دیا اور جل جل کر گرنے لگے، دوشیزہ نے خط ایک طرف رکھ دیا اور اس نظارہ میں محو ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں ایک نازنین، آئینہ کے سامنے اپنی زلفوں کی آرائش میں محو تھی ایک گستاخ پروانے نے بڑھ کر شمع کی ناچتی ہوئی لَو کے سامنے اپنے پَر پھیلا دئے۔ نازنین کے ہاتھوں سے کنگھی گر پڑی اور پروانہ شمع کے قدموں میں گر کر تڑپنے لگا۔ اتنے میں اور پروانے بھی آگئے اور جل جل کر شمع کے گرد ڈھیر ہونے لگے۔ نازنین حیران ہو کر بولی "ہائیں آج ان پتنگوں کو کیا ہو گیا؟"

ایک اور کمرے میں ایک شخص پر جانکنی کا عالم طاری تھا۔ جب وہاں کی شمع کو بھی پروانوں نے گھیر لیا تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے بڑی جدوجہد کے بعد نقاہت سے کہا:-

"خدا کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ شمع روشن کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے اندھیرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

گھر والوں نے جواب دیا:-

"وہ تو عرصہ ہُوا کہ ہم روشن کر چکے ہیں۔ تمہارے سرہانے جل رہی ہے۔ ہاں اب باہر سے پتنگوں کی ایک فوج آکر اس کے گرد چکّر لگا رہی ہے۔ بیمار نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا ......

وہ پروانے جو شمع کی لَو کے قریب گئے۔ اُنکے نازک پر جل گئے۔ اور صبح کو وہ ایک کثیر تعداد میں مرے پڑے تھے۔ نوکر نے جھاڑو دیکر انہیں نالی میں بہادیا +

اِدھر ملکہ اپنے کنول میں، ساری رات اپنے عاشق سے مزے اُڑاتی رہی۔ وہ عاشق جو جگنوؤں کا بادشاہ تھا اور ملکہ سے کچھ بڑھ کر ہی حسین تھا۔ اُسے روشنی لانے کی ضرورت نہ تھی۔ خدا نے ازل ہی سے اُسکے بازوؤں کے نیچے اپنے نور کا چھوٹا سا ٹکڑا لگا دیا تھا۔

یوں شوخ، سفاک، بے وفا ملکہ نے اپنے جانبازوں کو فریب دیا۔ اور اسی لئے وہ ہنسی تھی جب اُس نے انہیں ایک کبھی نہ پُوری ہونے والی مہم پر بھیجا تھا +

جادو بیاں شاعر، یہ قصۂ الم ختم کرکے پروانوں سے مخاطب ہُوا۔

"اے رات کی ننھی ننھی مخلوق! تُو کیوں یہ جدوجہد کرتی ہے؟ ملکہ ہمیشہ سے دغا باز واقع ہُوئی ہے اسکے فریب میں نہ آ، تجھے اپنی جانیں نثار کرتے دیکھ کر وہ لُطف اُٹھاتی ہے"

لیکن پروانوں نے شاعر کی بات کی ذرا پروا نہ کی۔ وہ بڑھ بڑھ کر قربان ہونے لگے۔ شاعر اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اُس نے اپنی شمع گُل کردی اور کہنے لگا۔

"میں اندھیرے ہی میں بیٹھا کرونگا۔ بس یہی انکے بچاؤ کی ایک صورت ہے" +

غلام عباس

ہشت خُلد و ہفت چرخ و شش جہات و پنج حس
چار ارکان و سہ ارواح و دو کون از یک خُدا

آنکہ اندر راہ ما خارے نہد از دُشمنی
یا الٰہی گلشنِ اُو دائما بے خار باد

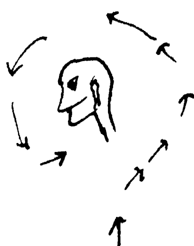
(گلچیں)

مَیں جس کو ڈھونڈتا ہُوں

۱

قصرِ فلک نشاں میں تاجِ گہر فشاں میں
دُنیائے عزّ و شاں میں عشرت کی دلستاں میں
مَیں جس کو ڈھونڈتا ہوں، وہ جلوہ گر نہیں ہے

اِس کچّی جھونپڑی میں اِس پُھونس کی کٹی میں
خاموش مُفلسی میں رُوپوش بیکسی میں
مَیں جس کو ڈھونڈتا ہوں، وہ مُسکرا رہا ہے



۲

اصواتِ دلرُبا میں نغماتِ باصفا میں
لحنِ طرب فزا میں مطرب تری صدا میں
مَیں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ ہے مگر نہیں ہے

مظلوم کی صدا میں بیکس کی اِلتجا میں
مجبُور کی ندا میں مایُوس کی دُعا میں
مَیں جس کو ڈھونڈتا ہوں، خود وہ ہی بولتا ہے

حامد اللہ افسر

جون کے مہینے میں

چاندنی رات تھی، شالامار باغ کے بڑے تالاب کے وسط میں چبوترے پر ہم چند دوست جمع تھے کھانا اور گانا ہو چکا تھا۔ آموں کی گٹھلیوں کا ایک انبار ملازم اُٹھا کر لے جا رہا تھا۔ برف کے ٹکڑوں کے ہلنے سے شیشے کے گلاس میں جو مترنم آواز پیدا ہوتی ہے وہ ہر چند سیکنڈ کے بعد اِدھر اُدھر سے آ جاتی تھی۔ بعض دوست دُور سے آئے تھے اور مُدت کے بعد مُلاقات کا اتفاق ہُوا تھا۔ اِس لئے گذشتہ صحبتوں کی یاد اور آپ بیتی کا سِلسلہ جاری تھا۔ ہمارے ایک دوست فنِ گپ کے ماہرِ خصوصی ہیں اور مورخین سے اس بنا پر نفرت رکھتے ہیں کہ انکی کتابوں میں دُنیا بھر کے سُنے سُنائے واقعات لکھے ہوتے ہیں اور جدت نام کو نہیں ہوتی وہ سفرِ کشمیر کے حالات کے سلسلہ میں گلمرگ سے ایک غیر آباد پگڈنڈی پر ٹہلتے ٹہلتے اپنے تبت میں جا نکلنے اور وہاں کے باشندوں سے عجیب و غریب گفتگو کے حالات سُنا چکے تھے۔ ایک دُوسرے صاحب نے جن کو شکار کا بہت شوق ہے ابھی ابھی اپنا قصہ ختم کیا تھا۔ وہ ایک دفعہ اتفاقاً جنگل میں انگریزوں اور یورپین لیڈیوں کی ایک پارٹی میں جا دھمکے۔ اِن لوگوں نے انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیا اور ہمارے دوست نے شکار کے دَوران میں سات بڑی مُرغابیاں اُڑتی ہُوئی ایک فائر میں گرا لیں۔ لیکن اِن میں سے دو کو تو ایک اُود بلاؤ اور اس کی ماں جو وہاں جھیل میں موجود تھے ہڑپ کر گئے۔ دو چوٹ کھا کر لمبی لمبی گھاس میں چھپ گئیں اور ہاتھ نہ آ سکیں۔ دو ایک لیڈی کو جسے کوئی شکار نہ ملا تھا۔ تحفتہً دیدی گئیں۔ اس لئے وہ صرف ایک ہی گھر لا سکے۔ غرض اس قسم کی گفتگو جاری تھی کہ ایک دوست جو عام طور پر بال کی کھال اُتارنے اور معمولی سے معمولی واقعات کی وجہ دریافت کرنے کے لئے مشہور ہیں اور "گپا ختن" میں بہت کم حصہ لیا کرتے ہیں کہنے لگے۔

"ایک عجیب و غریب واقعہ تو میرے ساتھ بھی گذرا ہے اگر آپ کہیں تو سُناؤں؟" لئے

سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں ضرور ——— "بڑی خوشی سے"

سے نہ

وہ اپنے سیگرٹ کی راکھ کو کرسی کے بازو کی مدد سے جھاڑ کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے انکسار سے بولے" اچھا لیکن ایک بات ہے مجھے جھوٹ سچ گپیں ہانکنے کی عادت نہیں ہے

سچائی کو دلچسپی پر ہر حالت میں مقدم سمجھتا ہوں۔ اِس لئے غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ میرا واقعہ بالکل سچا ہے اور مبالغے کو اس میں بالکل دخل نہیں ــــــ"

"ہاں ہاں سُنایئے"۔ "ہم ابھی سے یقین کئے لیتے ہیں"۔

"تو سُنئے۔ آپکو علم ہے کہ میں سنہ ۱۹۲۰ء میں خیبر ریلوے کی تیاری کے سلسلے میں درۂ خیبر میں ملازم تھا۔ ہم علی مسجد کے قریب کیمپ میں مقیم تھے اور ہفتے کا زیادہ حصہ وہیں گذارنا ہوتا تھا۔ میں کام سے فراغت پانے کے بعد رائفل لیکر اِدھر اُدھر کے پہاڑوں پر شکار کی تلاش میں جایا کرتا تھا۔ کیمپ سے زیادہ فاصلے پر جانا اس لئے خطرناک تھا کہ بدمعاش افریدی ہمیشہ اس تاک میں لگے رہتے کہ کوئی بھولا بھٹکا نووارد اکیلا ملجائے تو گولی سے اس کا کام تمام کرکے لُوٹ لیں۔ خصوصاً رائفل کے تو وہ ہمیشہ سے دُشمن چلے آتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ تقریباً ہر روز یا دوسرے دن ایک نہ ایک اس قسم کا واقعہ سننے میں آجاتا تھا کہ آج فلاں شخص کو مار ڈالا۔ آج فلاں جگہ سے سامان چرا کرلے گئے۔ لیکن میں ہر وقت اس قدر ہوشیار اور چوکنا رہتا تھا کہ وہ لوگ ایک حد تک مجھ سے خوف کھانے لگے تھے اور کئی مرتبہ انہوں نے کوشش بھی کی کہ میری توجہ اِدھر اُدھر ہو تو حملہ کرکے رائفل چھین لیں لیکن میں بھلا انکے قابو میں کہاں آتا تھا۔

"ایک دن کا ذکر ہے کہ میں علی الصبح شکار کی تلاش میں نکلا اور مُدت تک پہاڑوں میں بھٹکتا پھرا لیکن کوئی جانور نظر نہ آیا۔ دوپہر کے قریب کیمپ کی طرف واپس ہونے کو تھا کہ ایک چھوٹے سے چشمے کے کنارے پر ایک ہرن ــــ شاید اسے مارخور کہتے ہیں ــــ پانی پیتا نظر پڑا۔ میں نے فوراً رائفل کو سیدھا کرکے فائر کیا اور اسے گرا لیا ــــــــــ"

"بس؟" سامعین میں سے ایک بولا "اتنی بات تھی؟"

"ابھی نہیں [illegible]! میں اس کی کھال اُتار رہا تھا اور عُمدہ عُمدہ گوشت کے ٹکڑے تھیلے میں ڈالتا جارہا ہے غضب سے پتھر کے لڑھکنے کی سی آواز آئی۔ مُڑ کر دیکھتا ہوں تو تقریباً چھ سو گز کے فاصلے [illegible] ہیکل بڑی بڑی سیاہ خوفناک ڈاڑھیوں والے افریدی رائفلیں لئے ہُوئے دیوانہ وار بھاگتے چلے آتے ہیں ــــــ"

"پرانا تجربہ کار شکاری آئس کریم کا چمچہ مُنہ کی طرف لیجاتے ہوئے کہنے لگا۔ اور تم فوراً کسی درخت

پر چڑھ گئے ؟"

"نہیں جی۔ درخت وہاں کہاں تھے۔ میں نے بندوق اُٹھائی اور ایڑیوں کی لی۔ سوائے بھاگنے کے اور کیا چارہ ہوسکتا تھا۔ میں بھاگتا چلا گیا یہانتک کہ تعاقب کرنے والوں کے پاؤں کی چاپ سُنائی نہ دیتی تھی۔ دیکھا تو ان میں سے ایک تقریباً تین سو گز کے فاصلہ پر ہانپتا ہُوا آرہا تھا اور دوسرے بہت پیچھے تھے۔ میں نے جانا کہ اب موقع ہے اور اپنی رفتار ہلکی کردی۔ جب دیکھا کہ قریب آگیا ہے تو پھر کر فائر کیا۔ وہ ایک سو گز سے کچھ زیادہ فاصلے پر اوندھا ہو کر گرا ـــــ"

"تم نے اس کی جیبوں میں بھی دیکھا کچھ تھا یا نہیں ؟"

"اس کے لئے وقت کہاں تھا ـــــ ؟" سب طرف سے ہنسی کی آواز آئی اور ایک نے کہا "ہاں صاحب وقت ہوتا تو بھلا ممکن تھا کہ نہ دیکھتے ؟"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ افریدیوں کی جیبوں میں ہوتا ہی کیا ہے ـــــ" اس پر ہنسی قہقہے میں تبدیل ہوگئی "تو گویا اگر کچھ ہونے کی اُمید ہوتی تو ضرور ٹٹولتے ؟"

"اجی سُنئے تو !" (ان کا داستان گوئی کا جوش کم ہونے والا نہ تھا) "میں نے بمشکل رائفل کو بھرا ہی تھا کہ وہ دونوں افریدی بھی قریب آپہنچے اور میں پھر کیمپ کی طرف دَوڑا۔ لیکن کیمپ ابھی تین چار میل کے فاصلے پر تھا اور راستہ نہایت دُشوار گذار۔ یہ خطرہ بھی لگا ہُوا تھا کہ کہیں ٹھوکر لگی تو بچاؤ کی کوئی صورت نہیں فوراً خاتمہ ہی ہوجائیگا۔ جب سانس پھُول گئی تو مُڑ کر دیکھا دونوں دیوانے بھینسوں کی طرح ایک دوسرے سے تقریباً" سو گز کے فاصلے پر چلے آرہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کو پھر ہلکا کردیا اور جب افریدی نزدیک آگیا تو رک کر عین اس لمحے میں فائر کر کے اُسے گرالیا جب وہ مجھ پر نشانہ لگا رہا تھا۔ اتنے میں تیسرا افریدی قریب آپہنچا ـــــ"

"تم نے اسے بھی جہنم رسید کیا !"

"نہیں صاحب میں پھر بھاگ گیا۔ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ خالی کارتوس نکالنے کے لئے جب میں نے رائفل کا بولٹ کھینچا تو وہ آدھے رستے میں آکر اٹک گیا۔ بہتیرا زور لگایا لیکن اسے نہ نکلنا تھا، نہ نکلا۔ اب گویا میں رائفل بھی نہ چلا سکتا تھا۔ بھاگتا نہ تو اور کیا کرتا !

"تقریباً میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دیکھا کہ تھوڑی دور آگے مجھے ایک نشیب سے

گذر کر پہاڑی پر چڑھنا ہوگا۔ اس پر میرا دل بیٹھ گیا کیونکہ اس حالت میں افریدی کی زد سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ عین اسی وقت میرا پاؤں ایک پتھر سے رُکا اور میں اوندھے منہ گر گیا۔ ابھی اُٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ـــــــــــ"

"افریدی نے بندوق چلادی!" پرانا شکاری بولا۔

"ہاں صاحب اسکے لئے موقع نہایت اچھا تھا۔ اور مجھے بازو کے نیچے کچھ لگتا محسوس بھی ہُوا تاہم گرنے سے میری دوڑنے کی قابلیت پر کچھ زیادہ اثر نہ ہُوا ـــــــــــ"

ہماری سوسائٹی کے ملک الشعرا فرمانے لگے۔ "اجی طاقتِ پرواز کہیئے نا! بازو کے ساتھ صنعتِ تناسب پیدا ہو جائیگی"۔

"میں اُٹھ کر پھر دوڑا۔ اب کوئی سیال سی چیز قطرہ قطرہ بہتی ہُوئی میرے کپڑوں میں سے بوٹ میں جانے لگی"۔

ایک صاحب جن پر اس خوفناک واقعہ کا خاص طور پر اثر ہو رہا تھا نہایت متانت سے بولے۔ "خون ہوگا! پہلو میں گولی تو لگی تھی"۔

"نہیں صاحب خون نہیں تھا۔ آپ اندازہ تو لگائیے کیا چیز تھی؟"

ہم سب حیران تھے ـــــــــــ ایک نے کہا "پسینہ ہو سکتا ہے لیکن اس قدر ـــــــــــ؟"

"اجی نہیں۔ ہرن کی چربی گرمی سے پگھل کر بہہ نکلی اور تھوڑے ہی عرصے میں میرے بوٹوں کے اندر اس قدر چکنائی بھر گئی کہ انہیں وہیں چھوڑ دینا پڑا"۔

سب طرف سے ہنسی کی آواز آئی جس پر وہ صاحب قدرے بگڑ کر فرمانے لگے۔ "تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

ہم سب (یک زباں ہوکر) "نہیں صاحب آپ بالکل سچ فرما رہے ہیں"۔ "کہے جائیے ہم ہمہ تن گوش ہیں"۔

"خیر تو اس جگہ زمین قدرے ہموار تھی۔ بھاری بوٹوں کے علیحدہ ہو جانے سے مجھے دوڑنے میں سہولیت معلوم ہُوئی اور جب وہ نشیب تقریباً نصف میل رہ گیا تو میں نے شانے پر سے مُڑ کر دیکھا۔ افریدی مجھ سے پانچ سو گز پر آرہا تھا۔ میں ٹھہر کر رائفل کو درست کرنیکی کوشش کرنے لگا اور ایک پتھر سے بولٹ کو ٹھونک کر خالی کارتوس نکال دیا۔ دوبارہ بولٹ چڑھانے میں قدرے

دقت محسوس ہوئی اور زور لگانے سے وہ چڑھ بھی گیا۔ لیکن مجھے شبہ تھا۔ کارتوس ٹھیک طور پر چلے یا نہ چلے۔ اس لئے یہ خیال کرکے کہ نشیب پر پہنچ کر آخری وار کروں گا میں پھر دوڑا۔ افریدی اتنے میں مجھ سے صرف دو سو گز رہ گیا تھا اور غالباً اسے یقین بھی ہو چکا تھا کہ میری رائفل بیکار ہو گئی ہے کیونکہ اب وہ پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے کودتا اور چھلانگیں مارتا چلا آرہا تھا۔

اب وہ نشیب مجھ سے بمشکل تیس چالیس گز کے فاصلے پر رہ گیا اور مجھے کیمپ کا دھواں نظر آنے لگا۔ کاش میں وہاں پہنچ سکتا! افریدی بالکل قریب آگیا تھا اس لئے میں رُک کر رائفل اُٹھائی اور نشانہ باندھ کر لبلبی دبادی ـــــــــ"

"اور وہ جہنم داصل ہو گیا"؟ ایک نے ہنس کر پوچھا۔

"اجی کہاں! میرا کارتوس نہ چلا!"

متین صاحب نے نہایت خوفزدہ اور جوش بھری آواز میں پوچھا" اور افریدی؟"

"اس نے گولی مار کر مجھے مار ڈالا!"

یہ فقرہ راوی نے اس قدر سنجیدگی سے کہا۔ اور اس قدر خلاف توقع بھی تھا کہ سامعین کے قہقہوں اور چیخوں سے تمام باغ گونج اُٹھا۔ مالی اور چوکیدار وغیرہ اِدھر اُدھر سے اکٹھے ہو کر دیکھنے کے لئے آگئے کہ یہ کیا آفت برپا ہو گئی!

عطاء الرحمٰن

آں کیست کز روئے کرم با من وفاداری کُند
بر جائے بدکارے چو من یک دم نکوکاری کُند
اول بہ بانگِ نائے و نے گوید بمن پیغامِ وَے
وانگہ بیک پیمانہ مے با من ہواداری کُند
دلبر کہ جاں فرسود ازو کامِ دلم نکشود ازو
نومید نتواں بُود ازو باشد کہ دلداری کُند
گُفتم گرہ نکشودہ ام زاں طُرّہ تا من بُودہ ام
گُفتا منش فرمودہ ام تا با تو طرّاری کُند

(حافظ شیرازی)

ایڈیٹر کی شہرت

دو سال تک ایک اُردو رسالہ کے دفتر میں محرری کا کام کرنے کے بعد میرے دل میں بھی اپنی محدود قابلیت کے باوجود ایڈیٹر بننے کی امنگ پیدا ہوئی اور یہ خواہش اُس وقت اور بھی زیادہ تیز ہوگئی جب ایڈیٹر صاحب کی نوازش سے رسالۂ مذکور میں میرا لکھا ہوا ایک آدھ مضمون بھی شائع ہوگیا۔ مجھے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میرے مضامین میں ایڈیٹر صاحب کے قلم کا کس قدر حصہ ہوتا تھا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد میرے دوست مجھے ایک بہت بڑا ادیب سمجھنے لگے۔ میرا ہر دوست میرے سامنے میری ادبی قابلیت کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا تھا اور بعض خوش عقیدہ کرمفرما تو اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتے وقت یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ رسالہ کے حقیقی ایڈیٹر فقط نام کے ایڈیٹر ہیں کام کے ایڈیٹر یہی ہیں، اور اس قول پر اس حقیقتِ بیّنہ کا کچھ اثر نہ پڑتا تھا کہ دفتر کے سب لوگ چپراسی سے لے کر ایڈیٹر تک مجھے دن دہاڑے منشی منشی کہہ کر پکارتے تھے۔

چوبیس گھنٹے کی محنتِ شاقہ کے بعد مجھے مہینے میں صرف تیس پینتیس روپیہ ملتے تھے لیکن اس حقیر آمدنی میں بھی جو تھوڑا بہت آرام میں حاصل کرسکتا تھا میں نے ایک عرصہ سے اپنے لئے حرام کر رکھا تھا اور اپنی ادارت کا خواب پورا کرنے کے لئے میں ہر مہینے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر پندرہ بیس روپیہ پس انداز کرلیا کرتا تھا۔ جوں جوں میرے دوست میری تعریف کرتے تھے میرے دل میں اپنی اُن قابلیتوں کا یقین، جن کا علم مجھ سے زیادہ میرے مدحت سراؤں کو تھا، زیادہ اُستوار ہوتا جاتا تھا، رفتہ رفتہ مجھے رسالہ کے دفتر کی محرری اپنے لئے باعثِ کسرِ شان معلوم ہونے لگی اور آخر ایک دن میرا استعفا ایڈیٹر صاحب کی میز پر پڑا نظر آیا۔

اب میرا خواب پورا ہونے کے دن قریب آرہے تھے اور میں اس دن کا انتظار کر رہا تھا کہ "ایک صبح بیدار ہونے پر اپنے آپ کو آسمانِ ادبیات کا شمسِ بازغہ دیکھوں"۔ چنانچہ میرے پاس جو تھوڑی بہت پونجی تھی میں نے اُسی سے سرمایہ کا کام لیا۔ اور دھڑلے سے ایک "مجلّہ علمیہ وادبیہ" کا اشتہار دیکر دُنیائے علم وادب میں ایک غلغلہ پیدا کردیا۔

رسالہ کے اشتہار میں میرا نام منشی الف دین نہ تھا۔ بلکہ میرا ذکر حضرت مولانا ابوالمحاسن نامی جمال پوری کے نام نامی

سے کیا گیا تھا اور نام کی اس تبدیلِ ہیئت میں جو سُنہرا راز چھپا ہُوا ہے اُسے میرے ہمعصر صحافت پیشہ فضلاء حرزِ جاں بنا کر رکھتے ہیں اور میں بھی مصلحت اسی میں سمجھتا ہوں کہ عوام میں اس کا ذکر کرنے سے محترز رہوں۔

میرے ابو المحاسن ہونے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا لیکن اپنا نامی سے متخلص ہونا خود مجھے بھی ایک عرصہ تک کھٹکتا رہا کیونکہ (راز کی بات کہتا ہوں) خلوت میں گھنٹوں دماغ سوزی کرنے کے باوجود آج تک ایک مصرع بھی تو موزون نہیں کر سکا مگر تجربہ سے بالآخر مجھے معلوم ہُوا کہ اس کی کچھ زیادہ ضرورت بھی نہیں اور اس رمز سے میرے معزز معاصرین بخوبی آگاہ ہیں کہ ہمارے ہاں محض "تخلص" ہی انسان کو میدانِ شاعری کا یکہ تاز بنانے میں کس قدر مدد دے سکتا ہے ؛

ہر مشاعرہ اور ہر محفلِ ادب میں حضرت مولانا ابو المحاسن نامی مدیر "نیر درخشاں" کی شرکت لازم قرار دی جاتی تھی۔ اور اُن کے ارشادات خواہ وہ بالکل سطحی خیالات ہی سے پُر کیوں نہ ہوں خاص توجہ سے سُنے جاتے تھے، اِس خصوص میں میں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ کہ رسالہ میں اشاعت کے لئے جو مضامینِ نظم و نثر موصول ہوتے تھے اُن میں سے بعض نظمیں اور مضامین رسالہ میں شائع کرنیکی بجائے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد اپنے لئے مخصوص کر لیتا تھا۔ اور اگر خوش قسمتی سے میرا انتخاب کسی قدر صحیح ہو جاتا تھا تو ہر طرف سے مجھ پر داد کی بوچھاڑ ہونے لگتی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے مضامین کو میں رسالہ میں شائع نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اپنے ان بدقسمت معاونین کو میں یہ جواب دے کر ٹال دیا کرتا تھا کہ آپ کا مضمون معیارِ ادب پر پُورا نہیں اُترا، اِس لئے اشاعت سے قاصر ہوں۔

جوں توں کر کے میں نے چھ مہینے تک اپنے رسالے کو جاری رکھا اور اگرچہ اس مُدت میں رسالہ صرف تین ہی دفعہ شائع ہو سکا لیکن میں نے ملک کی علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی، تمدنی، طبی، صنعتی اور تجارتی خدمات بجالانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ہندوستان میں عوام کی قدر ناشناسی اور علم و ادب سے بیگانگی کا عِلاج کسی کے بس کا نہیں چنانچہ یہ نونہال بھی آخر اپنے سینکڑوں پیشرووں کی طرح آغوشِ لحد میں جا سویا ؛

اب میری مالی حالت بہت مخدوش ہو رہی ہے اور اگرچہ میرے لئے رُوح و جسم کا اتحاد برقرار رکھنا بھی دشوار ہے لیکن ایڈیٹری سے کم درجہ کا کوئی کام کرنا اب میں وضعداری کے خلاف سمجھتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میری بسرِ اوقات کا دار و مدار میرے دوستوں کی فیاضی پر رہ گیا ہے کہ ہمارے مُلک میں صحافت کا نعم البدل

گداگری ہی تو ہے ۔

مگر میری مالی حالت جیسی کچھ بھی ہے اس نے میری "علمی شہرت" پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالا میں ایک کہنہ مشق اخبار نویس اور بلند پایہ ادیب سمجھا جاتا ہوں۔ اور ایسے نوجوان عقیدتمند اکثر میرے پاس "استفادہ" کی غرض سے آتے رہتے ہیں جو مجھے علامۂ فہامہ اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ سمجھتے ہیں اکثر ایسے لوگ بھی جو کسی نئے رسالہ کے اجرا کی فکر میں ہوتے ہیں میرے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجھ سے استصواب رائے کے لئے آتے ہیں۔ اور کیوں نہ آئیں جب کہ میری کامیاب صحیفہ نگاری کا غلغلہ غالباً فلکِ ہفتمیں تک جا پہنچا ہے ۔

میں اس قسم کا مشورہ دینے میں ہمیشہ نہایت فیاضی سے کام لیا کرتا ہوں اور اس وقت "اعتمادِ علیٰ النفس" کے جو آثار میرے چہرے سے ہویدا ہوتے ہیں انکو دیکھ کر ممکن نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر بھی میری صحافتی قابلیتوں پر ایمان نہ لے آئے۔ لیکن وہ لوگ جو غلط فہمی کی وجہ سے اپنی "ادبی مشکلات" حل کرنیکے لئے مجھے علمی بحث میں گھسیٹنا چاہتے ہیں میرے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں اور میں بہ لطائف الحیل اُن سے پہلو بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن جب سر پر آبنتی ہے تو کسی نہ کسی طرح یہ مصیبت نباہنی ہی پڑتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ مجھ سے اس قسم کے سوال کرتے ہیں جن کے سمجھنے کی قابلیت بھی مجھ میں نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر میں "عالمانہ بشرہ" بنا کر فقط "ہاں" اور "نہیں" سے کام نکالتا ہوں لیکن معلوم نہیں اس ہاں اور نہیں میں اُن لوگوں کو کون سے نکات مل جاتے ہیں کہ میری ایک ایک ہاں اور نہیں کے بعد اپنی یادداشت کے صفحہ کے صفحہ سیاہ کر لیتے ہیں ۔

دو ہی چار دن کا واقعہ ہے۔ میں اپنے مکان کے صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان جس کا چہرہ غالباً کثرتِ مطالعہ سے زرد ہو رہا تھا اندر داخل ہؤا، اس نے مجھے جھک کر نہایت ادب سے سلام کیا اور عبدالقادر بیگ آتش، لکھنوی کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ مزید دریافت پر معلوم ہؤا کہ یہ نوجوان پراونشل کالج میں بی۔ اے کے سال اول کا طالب العلم ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کسی بہت بڑی آفت کا سامنا ہو گا کیونکہ نوجوان بظاہر بہت ذہین معلوم ہوتا تھا۔ لیکن تھوڑی سی گفتگو کے بعد مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہو گیا کہ یہ شخص محض کتابوں کا کیڑا اور خود بہت کم سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے۔ وہ بہت زیادہ شرمیلا تھا اور گفتگو کے وقت اس کے انداز سے پیہم ماہئِ بے آب کی سی گھبراہٹ ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ میں یہ تو سمجھ ہی گیا تھا، کہ وہ میرے پاس اپنی

"علمی مشکلات" کے "حل" کے لئے آیا ہے اس لئے میں اپنا پارٹ ادا کرنے کے لئے پُوری طرح سے تیار ہوگیا۔ اور اس سے اس کی آمد کی غرض پوچھی۔

طالب العلم: "(کچھ جھجکتے ہُوئے) میں "ادبیاتِ اُردو کے مستقبل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ مضمون کالج کے انعامی مقابلہ میں پڑھا جائیگا۔ میرا خیال تھا کہ چند اصولی امور کے متعلق جن کی بنیاد پر اپنے مضمون کے چند عنوانات قائم کرنیکا ارادہ ہے کسی فاضل ادیب سے جو تنقید ادب میں جدید علمی تحقیق کے طریقوں کو سمجھتا ہو استناد و استشارہ کروں ۔۔۔۔۔۔۔ اگر آپ تھوڑا سا وقت ۔۔۔۔۔۔۔

میں: "(اپنے سر اور داڑھی کو ایک عالمانہ جنبش دے کر) "ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور! آپ خوشی سے سوال کیجئے"

طالب العلم: "نفسیات اور ادبیات میں جو گہرا رابطہ ہے، اُسکے متعلق آپ سے کچھ عرض کرنا آفتاب کو مشعل دکھانا ہے ۔۔۔۔۔

میں: "(نہایت متانت اور سنجیدگی سے سر ہلا ہلا کر اور آنکھیں پھرا پھرا کر) بہت گہرا رابطہ ہے بہت گہرا رابطہ ہے"

طالب العلم: "(سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہُوئے) اس لئے میں نے اپنی تنقید میں علم النفس کے جدید نظریات کو بھی ملحوظ رکھا ہے"

میں: "(اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں گویا دنیا جہان کے نقاد میرے آگے پانی بھر چکے ہیں) بہت خوب! بہت خوب! آپ کی تدبیر نہایت مناسب ہے"

آتش کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے کچھ کاغذات نکالے، اور اُن کو اپنے سامنے رکھ کر مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے۔

"اقوامِ عالم کے آبا کی وہ اوّلیں موجِ گوناگوں، جو وسطِ ایشیا کے مرغزاروں سے، یا بہ خیالِ بعض اس سے بھی آگے کے اقطاعِ شمال و مغرب سے، اُٹھی تھی اور اقالیم فرنگ و ایشیا کے بڑے بڑے رقبہ جات پر چھا گئی تھی اپنے سرچشمہ کے لحاظ سے ایک تھی۔ اور خروجِ اقوام کے اس دَور میں جو متفرق شعوب و قبائل یونان، ایران اور ہندوستان میں آکر بس گئے تھے۔ وہ ازروئے

اتحادِ نسل ایک ہی متجانس اور یکرنگ جماعت کہلا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا فطری، جوہر کمال بھی تقارب قریب رکھتا ہوگا ــــ"

میں نے مربیانہ انداز میں اپنے سر کو بطورِ اثباتِ جنبش دیکر کہا" اس میں کیا شک ہے"؟ مگر اسکے ساتھ ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ میں نے جواب دینے میں جلدبازی سے کام لیا ہے کیونکہ اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا،

"لیکن اس خروج کے بعد جب یہ جماعتیں نئی سرزمینوں میں آباد ہوگئیں، تو کچھ ہی عرصہ بعد نظر ڈالنے سے ہمیں ایک نمایاں فرق بلکہ تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً ہندوستان اور یونان کے فلسفہ کو لیجئے ایک میں نفس اور دوسرے میں معروض آماجگاہِ توجہ بنایا گیا۔ جس کا اثر دونوں ملکوں کی حیاتِ اخلاقی پر یہ پڑا۔ کہ ایک نے آنا کی تربیت اور دوسرے نے غیری کی تسخیر کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ یہاں رہبانیت کا دور دورہ تھا۔ دُنیا محض ایک نقشِ فانی اور مایا خیال کی جاتی تھی، اور وہاں زندگی سے ہر ممکن ابیقوری حظ اُٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

میں:- (کچھ نہ سمجھ کر) "بالکل صحیح ہے"

طالب العلم:- کیا اِن واقعات سے میں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ کہ تطبیقِ ماحول کے اثر سے اِن قوموں کے کوائفِ نفسیہ میں کوئی عظیم الشان تغیر واقع ہوچکا تھا۔ جس نے انکے نسلی تقارب قریب کو ذہنی تقاربِ معکوس کی صورت میں بدل دیا تھا"؟

میں:- یقیناً! یقیناً!!"

معلوم نہیں مولانا ابوالمحاسن نامی کے اس جواب سے نوجوان عقیدتمند نے کیا نتیجہ نکالا" لیکن اتنا میں نے بھی دیکھا کہ اس کا چہرہ فرطِ خوشی سے دمکنے لگا، اور اس نے اپنے کاغذات پر جھک کر نہایت عجلت سے چند سطور بطورِ یادداشت قلمبند کرلیں اور اس کے بعد پھر اس طرح سلسلۂ کلام جاری کیا:-

"جدید علم النفس ہمیں سکھاتا ہے کہ نفس کے تغیرات کے ساتھ ساتھ عضویۂ انسانی میں متناظر و متجاوب تحوّلاتِ جسمانی ہوتے رہتے ہیں۔ خواہ اس تعلق کو علت اور معلول کا ربط کہیں یا شرط اور مشروط کا۔ ہر مُلک کے مخصوص طبعی حالات سے اہلِ ملک اضطراراً متاثر ہوتے ہیں نہ

بطریق فکر و استدلال۔ اس لئے کسی قوم کے افراد کے مخصوص میلانات و رجحانات کا سراغ دماغ اور مخیخ کے رقبہ جات رئیسہ کی بجائے نخاع اور نخاعِ مستطیل کے مراکزِ عصبی میں لگانا چاہیئے۔ امریکن ماہرِ نفسیات ولیم جیمز کے خیال کے مطابق یہی مراکزِ ادنیٰ جذبات کا سرچشمہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جذبات ہی مذہبی اور شاعرانہ میلان و رجحان کی تعیین کرتے ہیں۔ لہذا مختلف قوس ہائے اضطراری جو خاص خاص آلات حس سے شروع ہو کر احساسی محوریوں کے ساتھ ساتھ مراکزِ ادنیٰ میں اُنکے آخری بُرش تک پھیلتی ہیں اور یہاں کسی نہ کسی اتصال کو عبور کر کے حرکی عصبانیوں کے شجریلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح سے خلیات اور اُن عصبانیوں کے محوریوں تک پہنچ جاتی ہیں، صدیوں اور قرنوں تک مہیج کی تکرار اور تواترِ استعمال سے ایک مستقل مربوط سلسلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جذبات کے یہ عصبی سلسلے ہر مُلک کے لئے جدا جدا ہیں۔ کیونکہ آب و ہوا اور طبیعی مناظر وغیرہ خارجی مہیجات جو اُنکی تشکیل کی علت ہیں، ہر ملک میں مختلف ہیں۔ لہذا مشرق و مغرب کا ادب جو بہ ہر حال اِن دو خطوں کے جذبات و اضطرارات کا آئینہ ہے فطرتی طور پر کوئی مماثلث نہیں رکھتا"

اس موقع پر نوجوان نے جس کی آواز اپنی اس شاندار دلیل پر خود ہی جوشِ تحسین سے بھرّا رہی تھی۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں اوپر اُٹھائیں اور میری طرف اس انداز سے دیکھا کہ میں کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ خدا گواہ ہے کہ میں اس اُوٹ پٹانگ نفظی اُلٹ پھیر کو خاک بھی نہ سمجھا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے ایک عالمانہ انداز سے مسکرا کر کہا " ماشا اللہ! آپ نے خوب ذہین طبیعت پائی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ ترقی کرینگے۔ آپ کے دلائل بالکل نئے اور نہایت مضبوط ہیں۔ مجھے اُن سے کامل اتفاق ہے"

نوجوان نے پھر اپنا بیان شروع کیا "اور کے ثبوت کے بعد یہ ظاہر ہے، کہ مغربی ادبیات کی تقلید ہم لوگوں کے لئے خلافِ فطرت ہے، کیونکہ وہ عصبی سلسلے جو ہمارے جذبات کو پیدا کرتے ہیں اہل مغرب کے اسی قسم کے سلسلوں سے کلیتہً مختلف ہیں اگر ہم جذبات کا اضطراری خلوص چاہیں تو ہمیں تقلیدِ مغرب سے پرہیز واجب ہے۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا، کہ ہماری تحریر تصنع سے لبریز ہو جائے، لہذا ہمیں چاہیئے کہ خفیف ترمیمات کے ساتھ اسی ادبی طرز و روش کو اختیار کئے رہیں، جو دہلی اور علی الخصوص لکھنؤ کے اساتذہٴ فن نے قائم کی تھی۔ میں اس معاملہ میں آپکی رائے چاہتا ہوں"

میں :۔ (بات کرنیکا موقع پاکر) میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ "نیرِ درخشاں"، کے صفحات کو اہلِ زبان شعرا کی غزلیں ہی زینت دیا کرتی تھیں۔ میں نے اپنے رسالہ کے اوراق کو اس قسم کی شاعری سے بالکل پاک رکھا جس کی داغ بیل پنجاب کے شعرا ڈال رہے ہیں"

نوجوان نے سر جھکا کر میرے بیان کردہ "علمی نکات" زیبِ قرطاس کر لئے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ "ایک اور مسئلہ جس کے متعلق میں خود کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا، ابھی حل طلب ہے۔ جس نقطۂ خیال کی طرف آپ اشارہ فرمائیں، میں اسی کے مطابق استدلال کروں گا۔ ادبیاتِ انگریزی سے یہ شغف جسے تمام صاحبِ مذاق اہلِ زبان عہدِ حاضر کے ذوقِ عامہ کی طاغیت سے تعبیر کرینگے، اور جو ہندوستان میں آجکل اس قدر عالمگیر ہو رہا ہے، اس کے متعلق آپ کی رائے میں موجودہ معاشرتی اور سیاسی حالات پر نظر کرتے ہوئے ممکن ہے کہ اسی صدی میں کوئی ردِّ عمل ظاہر ہو"؟

میں کچھ عرصہ تک گہری سوچ میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ گویا مجھے بھی اُن نجومیوں کی طرح القا ہوتا ہے، جو آئے دن اخبارات میں طوفانِ نوح کی قسم کی مہلک آفات کے متعلق پیشینگوئیاں شائع کیا کرتے ہیں، میں نے اس سے کہا "یقیناً ہوگا"،

اُس نے اس دفعہ میرے ادبی اشارات کو سپردِ قلم کرنے میں پورا ایک صفحہ سیاہ کیا! اسکے بعد کہنے لگا:۔

"طاغیت کے لفظ نے مجھے ایک اور سوال یاد دلا دیا جو اگرچہ اس بحث سے غیر متعلق ہے لیکن لگے ہاتھ میں اس کے متعلق بھی تحقیق کر لینا چاہتا ہوں۔ میرے دوست مجید کو اصرار ہے۔ کہ لفظ "طاغیت" بقاعدۂ صرفِ عربی صحیح نہیں اسکی بجائے طغیان استعمال کرنا چاہیئے۔ جس سے فقرہ کے مفہوم میں بھی خلل نہیں آتا، اور طاغیت کے اشتباہ سے نکل کر ایک مستند لفظ بھی ہاتھ آجاتا ہے، لیکن مجھے طاغیت یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں آپ سے پوچھ لینا چاہتا تھا، کہ آیا طاغیت واقعی کوئی لفظ نہیں؟

یہ سوال میرے لئے بہت ٹیڑھا ثابت ہوا۔ میری یہ حالت تھی کہ نہ جائے ماندن نہ راہِ رفتن ۔۔۔ طاغیت ۔۔۔ طاغیت نہیں، ہاں طاغیت ۔۔۔ طاغیت ۔۔۔

نوجوان :۔ اگرچہ مولانا ابوالکلام کی تحریروں میں یہ لفظ میں نے دو ایک جگہ دیکھا ہے لیکن ۔۔۔"،

میں :۔ (دلجمعی سے) نہیں طاغیت بالکل صحیح ہے، اسے بے خطر استعمال کیجئے اور اگر کوئی پوچھے تو بلاتکلف سند میں میرا نام پیش کر دیجئے"

نوجوان نے مطمئن ہو کر کہا "اب صرف ایک سوال باقی ہے۔ شاعری کے مقصد اور اسکے صحیح دائرۂ عمل کے متعلق میں آپکے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں"

میں اس سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ میرے معتقد بیسیوں مرتبہ مجھ سے یہ سوال کر چکے ہیں، اور اس مسئلہ پر متعدد مصنفین کے خیالات جمع کر کے حفظ کر لینے کی ضرورت کو میں مدتوں پہلے محسوس کر چکا تھا اس لئے میں نے نہایت روانی سے جواب دیا:۔

شاعری خدا کا نور ہے۔ انسان کا سینہ اسی دن اس کی فانوس کی ضیا بار کرنوں سے معمور ہوا۔ جب اسے ادراک و احساس کا وہ مصفا آئینہ عطا کیا گیا جسے عرف عام میں "دل" کہتے ہیں۔ اور شاعری کی اوّلیں تجلّی نے اسی لمحہ سے بزم گیتی کو منوّر کر دیا، جب مدرکات و محسوسات انسانی کی پہلی شعاع نے اس آئینہ کی درخشاں سطح کو بوسہ دیا۔

شاعری لامحدود کی تحدید اور غیر متعین کی تعیین کرنیکی کوشش کا نام ہے۔ یہ ایک ازلی استعارہ اور ایک سرمدی تمثیل ہے۔ شاعر زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کا تخیل ستارہ بہ ستارہ بلند ہوتا ہوا اس مادی کائنات سے اوپر نکل جاتا ہے۔ اور خدا کی حضور میں پہنچ جاتا ہے"

آتش نے میرا بیان لفظ بہ لفظ نقل کرنیکے بعد نہایت گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوا۔

دوسرے دن صبح کے وقت جب بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے میں خیالی پلاؤ پکاتا ہوا کسی دوست کے ہاں بن بلائے چاء پر پہنچنے کی غرض سے باہر نکل گیا۔

راستہ بھر میں "ماہ تاباں" کے اجرا کی تجویزیں سوچتا رہا۔ "نیر درخشاں" کے بند ہو جانے کی وجہ سے خریدار اس نام سے تو بدظن ہو چکے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ نیر درخشاں کا دوبارہ اجرا بیکار تھا۔ بلکہ اسی غرض سے میں نے احتیاطاً اپنا نام بھی بدل دینا ہی مناسب سمجھا۔ ارادہ ہوا کہ کسی دوست سے قرض لیکر ماہ تاباں کا ایک پرچہ طبع کیا جائے، اور اس قسم کی ایک چٹھی کے ساتھ اس رسالہ کے وی پی۔ بلا طلب مختلف لوگوں کے نام بھیجے جائیں۔

مکرمی۔ رسالۂ "ماہ تاباں" جو دنیا بھر میں اپنی وضع کا بہترین رسالہ ہے آپ کی خدمت میں بصیغۂ وی۔ پی بھیج رہا ہوں۔ یہ رسالہ ملک کی علمی ادبی۔ تاریخی، طبّی، صنعتی، تجارتی، تمدنی، معاشرتی غرض کہ ہر قسم کی خدمات ادا کریگا۔ رسالہ کے ایڈیٹر حضرت الف الملت والدین مولانا شامی جلال پوری ہیں۔ رسالہ کی

خوبیاں ایڈیٹر کے نام ہی سے ظاہر ہیں۔ ہر بہی خواہِ ملک کا فرض ہے کہ اس رسالہ کا خریدار بن جائے۔ لہذا آپکی خدمت میں بھی وی۔پی۔ بھیجا جاتا ہے۔ کہ آپ اس فرض کی بجا آوری سے محروم نہ رہیں، ہمیں آپ کی عالی حوصلگی سے امید ہے کہ آپ ہمارا وی پی وصول کر لیں گے کیوں کہ آپ اس کے اخلاقاً ذمہ دار ہیں۔

نیاز کیش "مینجر ماہ تاباں"

میں نے دل میں سوچا کہ اس چٹھی کے اثر سے پچاس فیصدی وی۔ پی وصول ہو جائیں گے، اور کچھ مدت تک عسرت اور تنگدستی سے نجات مل جائیگی۔ اگر ماہ تاباں چل نکلے تو خیر لیکن اگر ملک اسکی بھی قدر نہ کرے تو پھر دو چار پرچے شائع کرنے کے بعد اسے بند کر کے کسی نئے پرچہ کا نئے نام سے اجرا کیا جائے اور اسی طرح اس ادبی کام کو جاری رکھا جائے تاکہ ملک کی خدمت بھی ہوتی رہے اور خود بھی فکرِ معشیت سے نجات مل جائے۔

یہ تجویز سوچ کر میں فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "مولانا! مولانا! ذرا ٹھہریئے! میں دیوانِ غالب کے "نسخۂ حمیدیہ" کے بعض اشعار کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے میرے دوست آتش نے بھیجا ہے جنہیں کل آپ نے بعض نہایت دشوار عقدے پل بھر میں حل کر دئے تھے"

میں "معاف فرمایئے اس وقت مجھے فرصت نہیں ایک دوست نے چاء پر بُلایا ہے۔ اُنکے ہاں جا رہا ہوں۔ آپ آج پانچ بجے میرے مکان پر تشریف لایئے۔ میں سب باتیں صاف کر دونگا"

حامد علی خاں

محفلِ ادب

غالب کا فلسفہ۔ گزشتہ پرچہ میں ہم ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے رسالۂ اُردو سے عرب کی شاعری کے متعلق کچھ دلچسپ اقتباسات "محفل ادب" کی ذیل میں شریکِ اشاعت کر چکے ہیں "اُردو" کے اسی پرچہ میں ایک اور دلکش عنوان جس نے ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف مبذول کیا "غالب کا فلسفہ" ہے کہ اس مضمون پر مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ نے قلم اُٹھایا ہے +

"اُردو کو جن گوناگوں فضائل کی وجہ سے مُلک کے رسائل میں مرتبۂ امتیاز حاصل ہے، اُنہیں ہمارے نزدیک کلامِ غالب کی شرح وتنقید کا کام بھی شامل ہے۔ جس کو ہمارے موقر معاصر نے اپنی اشاعت کے ابتدائی زمانہ ہی سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مضمون نے اس بارہ میں تنقید کا جو بلند معیار قائم کر دیا تھا۔ اسکے بعد سے ہمیں اُردو کے وہ مقالات جو تنقید غالب کا اہم اور نازک فرض اپنے ذمہ لیتے ہیں، بہت زیادہ جاذبِ توجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ لوگ جو اُردو کے گزشتہ پرچے دیکھ چکے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ مولوی سید ہاشمی صاحب کو کلامِ غالب سے خاص دلچسپی ہے۔ "فلسفۂ" غالب کی کوئی مبسوط شرح اب تک اُردو میں پیش نہ کی گئی تھی، اور کسی نقاد کو یہ حوصلہ نہ ہُوا تھا کہ مرزا غالب کی شاعری کی تحلیل وتشریح سے اُن کے نظریۂ حیات وکائنات کو مستنبط کر سکے، اس لئے سید ہاشمی صاحب کا مضمون دیکھ کر قدرۃً ہمیں خوشی ہُوئی +

لیکن مضمون کے ابتدائی دس صفحے پڑھنے کے بعد جو اصل موضوع بحث کی تمہید کے طور پر سپردِ قلم کئے گئے ہیں، ہمیں معلوم ہُوا کہ مضمون کا حقیقی مبحث "فلسفہ غالب کی بجائے تقسیماتِ کلامِ غالب" ہے۔ یہ بحث بھی کچھ کم دلفریب نہیں۔ ہاشمی صاحب نے کلامِ غالب کو سات تدریجی موضوعات میں تقسیم کیا ہے:- (۱) شوقِ تماشا (۲) عالمِ تحیر وگم گشتگی (۳) حاصلِ بے حاصلی (۴) عالمِ یاس ونومیدی۔ (۵) مقامِ تسلیم وفنا (۶) رجوع الی البقا (۷)۔ مقام ورئ الوریٰ۔

کلامِ غالب کی یہ ہفتگانہ تقسیم جو عالمِ تحیر وگم گشتگی سے شروع ہو کر مقامِ ورئ الوریٰ پر ختم ہوتی ہے کائنات کی علت العلل کی تلاش کے عام عنوان کی تحت میں رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی معقول

وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ مرزا غالب کی شاعری کے ایک اہم اور قابل ذکر حصے کو جو اُنکے نظریۂ حیات یعنے اخلاقی زاویۂ نگاہ کی توضیح کرتا ہے، کیوں اُنکے "فلسفہ" سے خارج کر دیا جائے۔ غالب کی مابعد الطبیعات کے دوش بدوش اُنکی اخلاقیات بھی موجود ہے۔ جس کو فاضل نقاد نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کے متعلق یہ عجیب و غریب خیال ظاہر کرنے سے احتراز نہیں کیا کہ "مجموعی طور پر دیکھئے تو غالب کے خیالات قوائے عملی کو مضمحل کرنے والے، یاس فزا، اور حوصلہ شکن ہیں اور مسلمانوں کے عہدِ انحطاط کی یاد دلاتے ہیں"۔

غالب جیسے "آزادہ و خود بیں" شاعر کے متعلق جو بندگی میں بھی اپنی شان سر بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا یہ نادر انکشاف دیوانِ غالب کے اکثر نکتہ فہموں کو حیرت میں ڈالدیگا کیونکہ عام رائے کے مطابق غالب کی "ہمت دشوار پسند" اقبال کے حیات افروز پیغام کی نقیب ہے۔

اپنے مقالے کے اس مقصود سے منحرف ہونے کے بعد جس کی طرف اس کا عنوان اشارہ کر رہا ہے، فاضل مضمون نگار نے "تقسیمات کلام غالب" میں بھی کوئی ایسا اصول پیش نظر نہیں رکھا جس سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ اگر سید ہاشمی صاحب کو غالب کی شاعری کے کچھ دور قائم کرنے ہی تھے، تو انہیں یہ دکھانا چاہیئے تھا کہ غالب کے خیالات میں کس طرح بتدریج تغیر ہوا پھر جس جس طرح سے اُنکے خیالات نے پلٹا کھایا اسی اعتبار سے اُنکی شاعری کے دور قائم کئے جاتے، تاکہ شاعر کے ذہنی ارتقا کا پتا چلتا۔ لیکن فاضل نقاد نے چند عنوان خود ہی قائم کر لئے ہیں، اور غالب کے مختلف زمانوں کے لکھے ہوئے اشعار کو ان متعدد عنوانات میں سے ہر ایک کے نیچے لکھ ڈالا ہے۔ چنانچہ پہلا درجہ یعنی "شوقِ تماشا" فاضل مضمون نگار کی محض خود ساختہ تقسیم ہے کیونکہ وہ اسے غالب کی شاعرانہ زندگی کے کسی خاص دَور سے جو یقیناً اُنکی زندگی کا کوئی ابتدائی دَور ہونا چاہیئے مطابقت نہیں دے سکے۔ مثلاً اس عنوان کے ماتحت اس قبیل کے بعض اشعار،

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
اس قسم کے اشعار کے ساتھ لکھے ہیں:۔

طاؤس خاک حسنِ نظر باز ہے مجھے ہر ذرہ چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہ طور تھا

پہلے دو شعر جو ہم نے یہاں نقل کئے ہیں، دوسرے دو شعروں سے یقیناً کوئی مقارنتِ زمانی نہیں رکھتے۔ اس لئے انہیں غالب کے کسی خاص دورِ شاعری سے منسوب کرنا صریحاً درست نہیں مختصر یہ کہ "اُردو" کے فاضل مقالہ نگار سے کلامِ غالب کی تقسیم وتجزیہ میں کچھ زیادہ دادِ تحقیق کی توقع تھی۔ کیونکہ چند عنوانات کے نیچے غالب کے اشعار کی یہ سطحی جماعت بندی ناظرینِ اُردو میں سے غالباً ہر ایک کے لئے بطور خود ممکن تھی۔ کیا ہم صاحبِ ممدوح سے انہیں کے الفاظ میں یہ عرض کرسکتے ہیں کہ "فلسفۂ شعر کو درسی باقاعدگی کی نظر سے جانچنا نہ چاہئیے"؟ سید ہاشمی صاحب کے طرزِ تقسیم کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ کسی عارفِ سالک کے منازلِ سلوک گنائے گئے ہیں اور ہر منزل کی کیفیاتِ واردات کے بیان میں تمثیلاً غالب کے شعر پیش کر دئے گئے ہیں لیکن خود غالب کی نفسی کیفیت کو اس خارجی نقطۂ نظر سے دیکھنا کسی طریقہ سے بھی روا نہیں ہوسکتا، صاحبِ ممدوح غالب کی تربیتِ نفس کو جب کسی مرتب ارتقائے زمانی کے سلسلہ میں منسلک نہیں کرسکے تو پھر وہ فقرے جو انہوں نے مختلف اشعار کا تسلسل اور رابطہ ظاہر کرنیکے لئے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ کلیتہً بے معنی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس ربط کا وجود فاضل مضمون نگار کے ذہن سے باہر خود شاعر کے ذہن میں کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہوتا کہ صاحبِ ممدوح فلسفۂ غالب پر قلم اُٹھانے کی بجائے کچھ منتخباتِ کلامِ غالب اُردو میں شائع کرا دیتے جن سے ہر شخص بقدرِ فہم نتائج اخذ کر سکتا۔ فاضل مقالہ نگار نے بعض اشعار کا مطلب سمجھنے میں بھی ہمارے نزدیک سخن فہمی کی داد نہیں دی۔ مثلاً مقامِ تسلیم و فنا کے باب میں یہ لکھ کر کہ "اس حال میں شوقِ تماشا ایک گناہ معلوم ہوتا ہے" مثال کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے۔

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

فاضل مقالہ نگار اس شعر میں شاعر کا مطلب یہ سمجھے ہیں کہ اسے ہر قسم کی آرزو موجبِ زحمت

تعب محسوس ہوتی ہے"، اور وہ شوقِ تماشا کو گناہ کے درجہ کا ایک بے حاصل فعل خیال کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ مرزا غالب ایک لطیف طنز کے پیرائیہ میں یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ

— درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ   باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

گویا شعر کی صحیح شرح یہ ہے کہ "(دنیا کے) گلشن کی سیر نے ہمارے دل میں پھول چننے کی خواہش پیدا کر دی، اور ہم نے اس گلزار کی گلچینی کی، اے وہ طاقت جس نے یہ تحریص آمیز رنگنیاں پیدا کیں، ہمیں تسلیم کئے لیتے ہیں۔ کہ ہم گنہگار ہیں!

یہ مضمون اپنے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نقد و تبصرہ کا محتاج ہے مگر قلتِ گنجائش کے باعث مجبوراً ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں ؎

سوز و ساز

راز کیا اس دل میں ہے کیوں اے خدا جلتا ہوں میں؟
صورتِ قرطاسِ مکتوبِ وفا جلتا ہوں میں

شمع ناپیدا، مری پروانہ خوئی مضطرب
ہائے کیا بے آرزو، بے مدعا جلتا ہوں میں؟

نالہ کر سکتا نہیں تیری طرح میں لے پسند
آگ یہ کیا ہے کہ جس میں بے صدا جلتا ہوں میں

راحت اس گلشن میں کب ہوگی نصیب اے عندلیب؟
لو لگا کر آتشِ گل سے سدا جلتا ہوں میں

یہ تپش بھی ہو گئی صرفِ جنونِ جستجو،
اک نفس مثلِ شرارِ نارسا جلتا ہوں میں

جب تری اُلفت سے ہے سوزِ شرارِ زندگی
کیوں کنشتِ غیر میں پھر اے خدا جلتا ہوں میں؟

پروانہ

دشوار تھی شمع سے جدائی میری
پروانہ ہوں آرزو بر آئی میری

دیکھا اُسے میں نے اور پہنچا میں وہاں
اُس بزم سے پھر خبر نہ آئی میری

حامد علی خاں

نئی کتابیں

فرہنگ اصطلاحات علمیہ:۔ یہ مفید کتاب حال ہی میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں انگریزی زبان کی تمام علمی اصطلاحات کا اُردو ترجمہ شامل ہے۔ ہم اس کتاب پر کسی آئندہ اشاعت میں مفصل ریویو شائع کرینگے۔ فی الحال مختصراً اس سے ناظرین کو روشناس کرادیا ہے +

ارکان الاسلام:۔ اس کتاب میں توحید نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے مسائل اس سادہ اور سلیس پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ بچے بھی انہیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں کوئی اسلامی گھرانہ اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ خدا کی ذات اور توحید کے ثبوت میں جو فلسفیانہ طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ آجکل کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کو ذات باری کا قائل کرنیکے لئے کافی ہے۔ اسکے علاوہ نماز روزہ وغیرہ کا فلسفہ بھی نہایت عالمانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور انکے متعلق تمام قاعدے اور شرعی مسائل بھی نہایت عمدگی سے سمجھائے گئے ہیں، درحقیقت یہ کتاب بہرنوع مفید ہے۔ اسکے مؤلف جناب مولوی سراج الدین احمد خاں صاحب مرحوم بانی اخبار زمیندار ہیں ہمارے زیر نظر کتاب کا پانچواں اڈیشن ہے جس کی کتابت طباعت اور کاغذ وغیرہ نہایت عمدہ ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ مع محصول۔ مینیجر اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس ۱۳۱ لاہور سے طلب فرمائیے +

توحید نماز روزہ حج زکوٰۃ

غبار افق:۔ یہ کتاب جناب سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے معتمد عمومی جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی تصنیف ہے۔ اس میں نہایت عمدگی سے تحریک ارتداد کی مجمل تاریخ اور شدھی سنگھٹن وغیرہ کی اغراض وغایات بیان کیگئی ہیں۔ کاغذ طباعت وغیرہ بہت عمدہ ہیں حجم ۱۴۰ صفحہ قیمت صرف ۶ر جو کتاب کی خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ سے طلب کیجئے +

ust of the Hori zon.

تاریخ الحرمین الشریفین:۔ از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی۔ اس کتاب میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے تاریخی حالات اہل مکہ و مدینہ کے اخلاق و عادات۔ خانہ کعبہ مسجد نبوی حج قربانی حجر اسود وغیرہ کی مفصل تاریخ بیان کیگئی ہے اسکے علاوہ متبرک مقامات کی کئی نہایت عمدہ تصاویر کتاب کو زینت دے رہی ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ سرورق نہایت نفیس حجم ۲۳۲ صفحے قیمت سرورق پر درج نہیں۔ مینیجر صوفی پنڈی بہاؤالدین پنجاب سے طلب فرمائیے +

ہمایوں کے متعلق رائیں

اُردو صحافت پر نقد و نظر اس درجہ تفصیل طلب بات ہے جسکے واسطے اک جدا فرصت درکار ہے کہئے تو کیا کہئے! بظاہر کثرت سے اُردو میں اس قدر رسائل کا اجراء اس احساس کی دلیل ہے کہ عام طور پر ملک میں علمی دلچسپیوں کے آثار پیدا ہیں ۔۔۔۔ لیکن بعض اُنگلیوں پر گنے جانے والے علمی پرچوں کو جو اپنی کاوش علمی اور اختصاص موضوع کے لحاظ سے طالبعلمانہ زندگی کی رہنمائیوں کیلئے ممتاز ہیں، اگر علیحدہ کر دیجئے تو پھر اُردو پریس کی سطح کچھ زیادہ بلند نہیں ہوئی ہے۔

پرچے نکلتے جارہے مگر تعینِ مقصد کی ذیل میں کسی مفید تر اضافے کے خانے میں صفر ہی ہے! نہ تقسیم مباحث ہے اور نہ کوئی تعینِ مقصد، وہی چند عنوانات کی بحث میں کچھ تحریریں یکجا کیں اور شائع کر دیا۔

اب خیر خواہان اُردو کی اُمیدوں کا سہارا اسی بات پر رہ گیا ہے کہ اس ہنگامۂ عام میں سے شاید کچھ صورتیں ایسی پیدا ہوں جو ملک کی صحیح علمی اور ادبی ضرورتوں کا احساس کرکے اپنا پروگرام مرتب کریں!؟

صنفِ تالیف کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ ان لوگوں کیلئے جو ضیق وقت کے لحاظ سے ضخیم کتابوں کے مطالعہ کی فرصت نہیں رکھتے، مگر علمی مسائل میں دلچسپی کا لپکا عادت میں پڑ چکا ہے تو یہ اپنے مختصر افادات سے اُنکی ذہنی شگفتگیوں کے اسباب مہیا کرے، یا ایسے انسانوں کیلئے جنکے دل و دماغ دن کی مادی مشغولیتوں سے تھک جائیں، وہ اُنکی تفریح و راحت کے سامان فراہم کر دے ۔۔۔۔ یہ چیز ادبی و علمی جرائد کے لازمہ کار میں سے ہے مگر میں نہایت ڈرتے ڈرتے دریافت کرتا ہوں کہ صحیح متانت اور وقار سے عام طور پر یہ شے کیا سلیقے کے ساتھ پیش کی جارہی ہے؟

یہ چیز ادعائی نہیں ہے بلکہ عملی ہے ہر چند ادعا بہت ہو رہا ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں صحت عمل کا امتیاز بہت کم لوگوں کو نصیب ہے!

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مذاقِ عامہ کی درستی و تہذیب کی ذمہ داری اُردو جرائد پر عائد ہے، ان پر فرض ہے ترتیب مضامین اور انتخاب موضوع میں ضرورت کا لحاظ مقدم رکھیں اور ایسی چیزیں شائع ہونی چاہئیں جن سے عام ذہنی نشو و نما میں امداد پہنچے۔ ورنہ اس تالیف ماہانہ کی کوئی عزت نہیں۔

اس مختصر سی بے عنوانی کے تذکرہ اور عدم احتیاط کے شکوہ کے بعد میں سراہتا ہوں تمام اُن رسائل کو جو اس صفت سے متصف ہیں اور جو حقیقتہً میرے رُوئے سخن سے مستثنیٰ ہیں ان میں بھی علی الخصوص مجھے اس صحبت میں نہایت اختصار کے ساتھ اعتراف کرنا ہے۔ ہمایوں کی خدمات کا جو میری تعریف ( ) مذکور کے تحت میں ایک معیاری رسالہ ہے ہم خوشہ چینانِ علم و ادب جو آپ حضرات سے کم سے کم چاہتے ہیں وہ آپ زیادہ سے زیادہ اسی قدر پیش کر دیں ۔۔۔۔!

ہمایوں نے اپنے آغازِ طلوع سے اسوقت تک جس مخصوص ادبی متانت اور انشاء کی معصوم نزاکت کو پیش کیا ہے اُسکو فراموش نہیں کیا جا سکتا، مدیرِ ہمایوں کی یہ سعی بھی قابلِ تعریف و مدح ہے کہ موجودہ فضائے ادب و شعر میں اُنہوں نے تمام خشکیات اسکے الزامات کا مقابلہ کیا اور کبھی زبان کی مستانہ عریاں بیانیوں کو اور جذبات کی غیر متین لود آرائیوں کو اپنے ہاں جمع نہ ہونے دیا اسلئے کہ حقیقتہً "یادگاری" پرچہ کا اعزاز اس سے ضائع ہو جاتا اور پھر یہ شئے تو اب اس درجہ عام ہے کہ مزہ بھی نہیں رہا!

مجھے ذاتی حیثیت سے معلوم ہے کہ بشیر احمد صاحب نے ادب اور انشاء کی اک مخصوص روش ہمایوں کیلئے مختص کر لینے میں کس درجہ کاوش کی ہے اُنکے مذاقِ ادب کی قدر داں منتوں کے جاننے والے اس ایثار کی داد دینگے کہ انہوں نے بعض اوقات ایک بہترین تحریر کی صرف اک سطر ترمیم نہ ہو جانے پر ہمایوں کے مطمحِ ترتیب کو برباد نہ کیا! پھر وقار کا یہ اعزاز بھی ہمایوں کیلئے بس ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مباحث سے کنارہ کش

رہا جو اس وقت جرائد عصریہ میں ایک جذبۂ مشترک کی طرح مستعمل ہیں یا امتیاز و تقابل کا مصرعِ طرح ۔ مضامین شگفتہ اور متین و مفید، کتابت پاکیزہ طباعت نفیس ۔ کاغذ عمدہ پھر وقت پر شائع ہو جانا ، اتنے حسن یکجا ہیں اب بُرائی کیا لکھوں ۔ صرف یہ کہ مدیر ہمایوں کو کیا سو ظن پیدا ہوا کہ مشاہیر کی رائیں طلب فرمائیں ـ دیکھ لیجئے وہ بھی بُرا نہ کہینگے !

اچھا تمام تعریفوں سے تعلق قطع کر لیجئے تو صرف میرے اس خیال میں ہمدردانِ اُردو شریک ہیں کہ اُردو کی ترقی یا اہل قلم کی کوششوں سے ممکن ہے یا اس بات کے بند و بست سے بھی کہ جہاں سے زبان کو واسطہ سیاسیات سے شروع ہوتا ہے وہاں اسکے حامی پیدا ہو جائیں ہم خوش ہیں اردو ہمایوں کی شکل میں اُن لوگوں کا پیار حاصل کر رہی ہے ، جنکی محبت اردو کی بہت سی مشکلوں میں کام آنے والی ثابت ہوگی اور اُردو کا اُن طبقات میں یہ اقتدار یقیناً اُردو کیلئے بہت سی حیثیات سے مبارک نتیجہ پیدا کریگا ۔

ابو المعانی خلیقی دہلوی

میرے محترم عنایت فرما اڈیٹر صاحب ہمایوں مجھ سے بضد ہیں کہ میں ہمایوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اس ناپسندیدہ فرض کی انجام دہی سے گریز کر جاؤں ۔ اول تو اس وجہ سے کہ ہمایوں کافی طور پر روشناس طبقۂ علم دوست ہو گیا ہے اور دوسرے اس بنا پر کہ میں اہل الرائے کی صف میں کسی قطار و شمار میں نہیں آتا ! مگر ان دونوں معقول وجوہات کے باوجود مجھے محترم موصوف کی منشائے دلی کے سامنے گردن جھکا دینی پڑتی ہے !

خدا کا شکر ہے کہ "ہمایوں" اپنے ظاہری رنگ و روغن کے اعتبار سے نہ کبھی اس درجہ سودیشی تھا کہ قدامت پسندی یا جدت سے تنفر کی بدولت از سر تا پا کھدر کا اشتہار بنگیا ہو اور دیدہ زیب نہ رہا ہو ؛ اور اب تو ماشاء اللہ اور زیادہ نکھ سے سکھ تک سنور جانیکی اُمید پیدا ہوتی جاتی ہے ! تصاویر ـ بلکہ فنِ نقاشی کے دلآویز نمونوں کا اضافہ یقیناً ترقی کی شاہراہ پر نمایاں قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ میرے عنایت فرما دیوبندی جوائنٹ اڈیٹر صاحب اسکو لہو و لعب کے تحت میں ناپسندیدہ و ناجائز قرار دینے کا تہیہ نہ کر لیں ! کاغذ اور چھپائی نہایت خوب ، سرورق کا رنگ نہایت موزوں اور حجم بالکل مناسب ؛ البتہ تقطیع کسی قدر قابل غور ہے ! مجھے بذات خود تقطیع پر بھی اعتراض نہیں مگر اکثر اہل نظر اسکو رسالہ کیلئے ناموزوں سمجھتے ہیں اور تصویر والے البم سے مشابہ بتاتے ہیں ! سرورق کا کاغذ اور رنگ نہایت خوب ہے سرورق کا بہت بڑا حصہ اکثر اسمائے گرامی کے جلی قلم سے لکھے جانیکے نذر ہوتا رہا مگر شکر ہے کہ حال ہی میں اس کمی کو پورا کرنیکی کوشش شروع کر دیگئی ـ ممکن ہے کہ اب بھی انتہائی سادہ پسند نظر کسی قدر زیادہ حذف و اسقاط کو بہتر سمجھے تاہم موجودہ صورت میں غیر پسندیدہ مواد بہت کچھ دور ہو چکا ہے ـ بہتر ہو کہ سرورق کیلئے ایک نظر فریب نمونہ کسی نقاش کے مشورہ سے حاصل کیا جائے اور جہانتک ممکن ہو صفحہ اول کا کم از کم ایک تہائی حصہ عبارت آرائی یا غیر ضروری بیل بوٹوں سے محفوظ رہکر محض سادہ رہے ! ادبی کوشش کے لحاظ سے ہمایوں اپنے ہم عمر رسائل میں کسی سے پیچھے نہیں رہا اور اکثر سے بازی لیگیا ! اسکو نئے مضمون نگار پیدا کرنیکا فخر بھی بجا طور پر حاصل ہے ! مضامین کے اعتبار سے ننھی ننھی پھول کی پتیوں سے لیکر ہمالیہ کے بھاری بھاری چٹانوں تک اُس نے ہر قسم اور ہر مذاق کے مضامین بہم پہنچانے میں یقیناً کامیابی حاصل کی ؛ وہ کبھی کبھی قہقہہ زن بھی ہوا اور معقول حد تک متین بھی رہا ! شکر ہے کہ اُس نے شگفتہ نگاری کے میدان میں جعفر زٹلی کی تقلید سے بہت جلد گلوخلاصی حاصل کر لی ! اس میدان میں پنچانہ رنگ کسی طرح ایک ادبی رسالہ کیلئے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا ـ شگفتہ نگاری اور پھکڑ ـ یا ہذل میں ایک بین حدِ فاصل ہے جو کبھی نظر انداز نہ ہو نا چاہیئے !

افسانوں کے لحاظ سے ہمایوں نے اس قلیل مدت میں متعدد افسانے ایسے شائع کئے جو کسی طرح دوسرے رسائل سے

کم نہ تھے! بعض اہل الرائے ہر افسانے اور مضمون کو ایک ہی اشاعت میں ختم ہو جانا ضروری تصور کرتے ہیں مگر میرے خیال میں اسکی پابندی کرنا کسی قدر مشکل ہے! تاہم اس میں شک نہیں کہ ایک ماہواری رسالہ کیلئے اکثر و بیشتر مضامین کے "آخر باقی دارد" کا اعلان حسن نہیں سمجھا جا سکتا! غیر معمولی طور پر طویل افسانے اور مضامین بہتر ہو کہ جداگانہ ناول یا تاریخی داستان کی حیثیت سے شائع کئے جائیں! بہرحال اس کا لحاظ حتی الامکان ہونا چاہیئے! پابندی اشاعت کے تحت میں "ہمایوں" ہمیشہ اپنے معمول میں آگے رہا۔ دو دو مہینے کے یکجائی نمبر نکالنے کی آرام طلبی اور اس کے لئے نت نئے عذر تراشنا ہمایوں کا شیوہ نہیں رہا! تمام اعتبارات کے لحاظ سے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمایوں نے سنہ ۲۵ء میں سنہ ۲۴ء سے نمایاں ترقی کی اور یقیناً اس کے کارپرداز عموماً اور میاں بشیر احمد صاحب خصوصاً مستحق داد و ہمت افزائی ہیں! اگر موجودہ بدمذاقی کس مپرسی کو پیش نظر رکھا جائے تو ان حضرات کی مسلسل و متواتر کوشش اور زیادہ چار چاند لگائے جانے کی قابل نظر آتی ہے!

سلطان حیدر (جوش)

اخبار زمیندار لاہور ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

یہ گرانمایہ ادبی رسالہ چار سال سے زبان اردو کی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے اسکے مدیر مسئول میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا خلف الرشید آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب مرحوم اور جائنٹ ایڈیٹر مولوی حامد علیخاں صاحب بی اے (نیشنل) برادر کوچک مولانا ظفر علیخاں ہیں، پہلے مولانا تاجور صاحب نجیب آبادی اسکے جائنٹ ایڈیٹر تھے۔ مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اب وہ بعض وجوہ سے عملاً علیحدگی اختیار فرما چکے ہیں لیکن چونکہ انکی امداد و اعانت ابتک شامل حال ہے۔ اس لئے انکا اسم گرامی بدستور سرورق پر درج ہو رہا ہے۔

اس وقت اس رسالے کے پانچویں سال کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے اور بلا مبالغہ کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ نمبروں سے بڑھ چڑھ کر ہے میاں بشیر احمد صاحب نے بزم ہمایوں کے عنوان سے اسکا ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں رسالے کے ماضی و مستقبل پر نظر ڈالی ہے "جہان نما" کے عنوان سے بعض جرائد و رسائل کے اقتباسات درج کئے گئے ہیں جناب علامہ اقبال کے تین تازہ اشعار بھی زیب رسالہ ہیں ملک کے مشہور ادیب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے مصنف "خواب ہستی" ("دیا سیمین") کا مضمون "ہندی بھاشا کا جدید ادب" نہایت عالمانہ و ناقدانہ ہے۔ معترضہ جملے "خوش گو" "تذکرہ" "رسیلے" "انگشتری" خوب مضامین ہیں خواجہ حسن نظامی صاحب اور ادیب شہیر سید سجاد حیدر کے دو مختصر مضامین بھی اچھے ہیں۔ چند نظمیں بھی ہیں جن میں جناب فاخر کی نظم "انسان" اور مولوی حامد علیخاں صاحب کی "حیات جاوداں" نہایت عمدہ ہیں میاں عطاء الرحمٰن صاحب کا افسانہ "انتہائے یاس" یوں تو اچھا ہے لیکن انداز تحریر کی انگریزیت ہمیں پسند نہیں۔

بہرکیف اس وقت ملک میں جو دو تین اچھے ادبی رسالے جاری ہیں ان میں "ہمایوں" ایک خاص و بلند درجہ رکھتا ہے۔ اس نمبر کی ضخامت ۹۲ صفحے۔ کاغذ کتابت و طباعت نفیس ہے ایک رنگین تصویر بھی شامل ہے قیمت پانچ روپے سالانہ۔

اخبار سیاست لاہور ۲ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

یہ اردو کا ایک علمی ادبی ماہوار رسالہ ہے جو زیر ادارت بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے یہ رسالہ ان ادبی علمی تمدنی و اخلاقی مضامین سے مملو ہوتا ہے جو معیار ادب پر پورا اترتے ہیں ملک کے مشہور و معروف اہل قلم کے مضامین اور شعرائے عالی خیال کی نظمیں خاص آب و تاب سے مندرج ہوتی ہیں یہ رسالہ ملک کے ممتاز صحائف میں سے چوٹی کا رسالہ ہے کاغذ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ہے ضخامت کم از کم ۷۲ صفحات ہمایوں واقعی ہمایوں ہے اور بلا مقابلہ لاجواب رسالہ ہے باوجود ان خوبیوں کے چندہ سالانہ صرف ۵ روپیہ ششماہی تین روپیہ فی پرچہ ۸/ اور نمونہ ۶/۔

فہرستِ مضامین

جلد ۹	بابت ماہ مارچ ۱۹۲۶ء	نمبر ۳

جہاں نُما

نواب حیدر نواز جنگ کا خطبہ بتقریب جلسۂ تقسیم اسناد پنجاب یونیورسٹی۔ گزشتہ دسمبر میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کی تقریب پر حیدر آباد سے نواب حیدر نواز جنگ بہادر خاص طور پر مدعو کئے گئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جو جامع اور بلیغ خطبہ پڑھا وہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ ہر وہ شخص جسے ہندوستان میں مسئلہ تعلیم سے کچھ دلچسپی ہے اسے اپنے لئے چراغِ راہ بنائے ؛

پنجاب یونیورسٹی کے معزز مہمان کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اگر ہماری یونیورسٹیاں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو ملکی ضروریات سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مفید نتائج مترتب ہو سکتے ہیں ہمیں ایف اے یا بی اے کے سند یافتہ طبقہ کی تعداد میں اضافے کی ضرورت نہیں ہے جس کا مقصدِ وحید محض سرکاری ملازمت کا حصول ہے اس قسم کے لوگ ایک کثیر تعداد میں پہلے ہی سے موجود ہیں اور ملک کو ان کی اب قطعاً حاجت نہیں۔ ملک کے موجودہ حالات کے لحاظ سے سرکاری ملازموں اور کلرکوں سے زیادہ تربیت یافتہ کاشتکاروں کی ضرورت ہے۔ ہمیں کلرکوں سے زیادہ انجینیروں ڈاکٹروں صناعوں اہل حرفہ اور ارباب فنون لطیفہ کی ضرورت ہے ہمیں کلرکوں سے زیادہ لوہاروں نوربافوں کوزہ گروں اور ہر قسم کے دوسرے پیشہ وروں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ملک میں تربیت یافتہ یا کم از کم سند یافتہ منشی متصدی اور محرر ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن کاروبار کے تمام سودمند اور مفید شعبے غیر تربیت یافتہ ہاتھوں میں ہیں۔ ملک کی فلاح بہبود کے لئے حکومت کے دفاتر کی توسیع کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس سے ملک کی دولت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اب اُن شعبوں کے احیاء اور نشو و ارتقا کی طرف توجہ دینی چاہیئے جو ملک میں ازدیادِ دولت کا ذریعہ بن سکیں بعض تاریخی حادثات کی وجہ سے ہمارا تمام نظامِ تمدن و معاشرت تہ و بالا ہو چکا ہے۔ اس کے بحال کرنے میں یونیورسٹیاں ہمیں بہت بڑی مدد دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ نظامِ تعلیم میں ملکی ضروریات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ملک کی ضروریات کے لحاظ سے اس میں بہت سے نقائص و معائب موجود ہیں۔ یہاں نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے نظامِ تعلیم کی اصلاح کے متعلق ایک قابلِ قدر لائحہ عمل پیش کیا جسے ہم ذیل میں بالاختصار پیش کرتے ہیں ؛

ابتدائی تعلیم۔ ہماری موجودہ ابتدائی تعلیم کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ طلبہ ثانوی مدارس میں داخل ہونیکے قابل ہو جائیں۔ حالانکہ ابتدائی تعلیم کے بعد طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد اس ملک میں تعلیم سے کنارہ کش ہو کر مختلف پیشے اختیار کر لیتی ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ تعلیم کے اس اہم ترین حصے کو طلبہ کی ضروریات سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس زمانہ میں تمام اہم اور ضروری مضامین کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ ابتدائی تعلیم محض ثانوی مدارس تک پہنچنے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ یہ خود ایک جداگانہ نظام تعلیم اور بذاتِ خود مکمل ہو اس تعلیم کے اہتمام میں اُن مختلف پیشوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے، جو طلبہ اس کے بعد اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً ابتدائی تعلیم میں زراعت، باغبانی، دستکاری اور اسی قسم کے مختلف پیشوں کے لئے تربیت کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔ یعنی ابتدائی تعلیم زندگی کی جدوجہد کے تمام شعبوں پر محیط ہو +

ثانوی تعلیم۔ ثانوی تعلیم میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ طلبۂ آئندہ جن خاص مضامین میں کمال حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں، انہیں اُن خاص مضامین کے حصول کے لئے خاص طور پر تیار کیا جائے۔ مثلاً جو لوگ ڈاکٹر بننا چاہیں اُن کے لئے طبی تعلیم کا خاص انتظام ہو۔ جو لوگ صنّاع بننے کے خواہشمند ہوں، اُن کے لئے صنعتی تعلیم کا خاص انتظام ہو۔ اسی طرح دوسرے شعبوں کی طرف جانے والوں کے لئے خاص خاص انتظامات کئے جائیں +

اعلیٰ تعلیم۔ اگر مندرجہ بالا نظامِ عمل کے مطابق تعلیم دی جائے تو یونیورسٹی کا کام بہت ہلکا ہو جائیگا۔ اور اسے اعلیٰ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت مل سکیگی۔ اعلیٰ تعلیم کا حقیقی مقصد خاص خاص علوم میں صاحبِ کمال محقق و مجتہد پیدا کرنا ہے، اور محولہ بالا طریق کار سے اس مقصد کے حصول میں بہت سی سہولتیں پیدا ہو سکتی ہیں +

مختصر طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں، کہ ابتدائی تعلیم اس اسلوب پر ہونی چاہیئے، کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام آسکے۔ ثانوی تعلیم اس قسم کی ہو جس سے خاص خاص علوم و فنون مثلاً صنعت و حرفت اور انجینئرنگ وغیرہ میں قابلیت پیدا کرنے کی مہارت حاصل ہو جائے اور اعلیٰ تعلیم (یونیورسٹی ایجوکیشن) میں اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ وہ دل و دماغ کی اعلیٰ ارتقائی تربیت میں بروئے کار آسکے۔

حیدر نواز جنگ بہادر نے اس امر کو خاص اہمیت دی، کہ ذریعۂ تعلیم غیر ملکی زبان نہیں ہونی چاہیئے اول تو اس سے طلبہ کو حصولِ علم میں دُگنی محنت اُٹھانی پڑتی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ دُگنا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور طلبہ کئی باتیں نہ سمجھنے کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ایک غیر زبان کو اس قدر

اہمیت دینا ضروریاتِ وطنی کے اعتبار سے بھی بالکل بے معنی ہے۔ دقت اور محنت کی تضیع سے بچنے اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ مادری زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے اس موقع پر نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے حیدرآباد کی جامعۂ عثمانیہ کا ذکر کیا انہوں نے بیان کیا کہ وہاں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے بہت سے خوشگوار نتائج ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ صاحبِ ممدوح کا یہ قول آبِ زر سے لکھا جائے تو بجا ہے کہ ہر قوم کی دماغی اور ذہنی خصوصیات مختلف ہوتی ہیں اور ہر قوم کو قابلیت کے بعض خاص خاص جوہر ودیعت ہوتے ہیں۔ جن کے اظہار کے لئے قدرتی طور پر صرف اُسی ملک کی زبان موزوں ہو سکتی ہے۔ کوئی قوم ایک غیر زبان کے استعمال سے بنی نوع انسان کے مشترکہ مفاد کے متعلق اُن فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی، جو فطرت کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں +

اس کے بعد معزز خطیب نے بتایا کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کو اپنے قدیم علوم و فنون اپنی تاریخ اپنے فلسفے اپنے فنونِ لطیفہ کی تجدید و احیاء کی طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ مغرب میں ہندوستان کی قدر و منزلت محض اس کے قدیم علوم اور اس کی صنعت کے احیاء ہی سے ہو سکتی ہے +

اس کے بعد موصوف نے تعلیم نسواں پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ اور اس امر پر زور دیا۔ کہ ہندوستانی خواتین کی تعلیم ملک کے حالات اور اس کی خاص ضروریات کے مطابق ہونی چاہیئے کیونکہ موجودہ طریقۂ تعلیم جو محض مغرب کی تقلید ہے ہندوستانی گھروں سے خالص ہندوستانی خصوصیات کو جو ملک کی فلاح کے لئے ازبس ضروری ہیں، عنقا کر رہا ہے +

آخر میں نواب ممدوح نے یہ زریں اصول بیان کیا کہ ملک کے نشوونما و ارتقا کے لئے اتحاد، یکجہتی، مسالمت اور رواداری نہایت ضروری ہیں۔ فساد و افتراق جو ہماری وطنی زندگی کے لئے سم قاتل ہیں، جہالت سے پیدا ہیں۔ ہمیں اپنے ملک میں علم و حکمت کی شمعیں روشن کرنی چاہئیں، تاکہ جہالت کی وہ تاریکیاں کافور ہو جائیں، جن کی وجہ سے ہم اپنے صحیح راستے سے بھٹک رہے ہیں +

انگلستان میں امدادِ یتامیٰ ۔ حکومتِ انگلستان نے ایک قانون نافذ کیا ہے، جس کی رُو سے ایسی بیوہ عورتوں کو جن کے بچے چودہ سال سے کم عمر کے ہوں ہفتہ میں ۱۰ شلنگ (تقریباً ۷ روپے آٹھ آنے) وظیفہ ملا کریگا اسی طرح چودہ سال سے کم عمر کے یتامیٰ کے لئے ۷ شلنگ ۶ پنس ہفتہ وار وظیفہ مقرر ہوگا۔ اس قانون کی رُو سے اور بھی مختلف وظائف دئے جائینگے، جن کے لئے بعض خاص خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں۔

اگرچہ ان میں سے اکثر ہمارے خیال کے مطابق نامناسب طور پر سخت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انگلستان نے معاشرتی اصلاح و انتظام کا ایک بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ہندوستان کے لئے اس میں ایک بہت اچھا سبق ہے۔ اہلِ ہند یقیناً اس معاملہ میں بہت غافل ہیں، ہم میں سے اکثر اس قسم کا سوال پیدا ہونے پر یہ کہدیتے ہیں، کہ ہندوستان کو اس معاملے کی طرف توجہ دینے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یہاں یہ کام خود بخود نہایت عمدہ طریقہ سے ہو رہا ہے۔ یہاں کی بیواؤں کو اُن کے اعزّہ و اقربا اپنے گھروں میں پناہ دیتے ہیں۔ اور تمام عمر اُن کو اور اُن کے بچّوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ بیوائیں ایسے حالات میں بلا تنخواہ تمام گھر کی خدمتگار بنی رہتی ہیں۔ زندگی کی تمام خوشیاں، زندگی کے تمام آرام اُن پر حرام ہو جاتے ہیں۔ آخر عمر تک دوسرے لوگ اُن پر حکومت کرتے ہیں۔ اور ان کو ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ بجز خال خال مستثنیات کے ہندوستان میں بیواؤں کی عام طور پر یہی حالت ہے، ہاں بعض تعلیمیافتہ بیوائیں ملک کے لئے بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ لیکن اس قسم کے خوشگوار نتائج اسی صورت میں مترتب ہو سکتے ہیں، کہ ملک تعلیم نسواں پر خاص توجہ دے۔ اور تعلیم کے علاوہ عورتیں مختلف قسم کی دستکاریوں سے واقف ہوں۔ تاکہ ضرورت کے وقت وہ اپنے لئے عزت کے ساتھ روزی پیدا کر سکیں۔ اگر ملک کے اقطاع میں بیوہ عورتوں کی امداد و حفاظت کے لئے دارالایامیٰ قائم ہو جائیں تو ملک کو ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے، دارالایامے کا فرض نہ صرف بیواؤں کی امداد و نگہداشت ہو بلکہ یہاں انہیں دستکاری وغیرہ کی تعلیم بھی دی جائے، تاکہ اُن میں اپنا پیٹ خود پالنے کی قابلیت پیدا ہو سکے۔ اور وہ اہلِ ملک پر کسی قسم کا بار نہ ہوں۔

سر میاں محمد شفیع کا خطبۂ صدارت ۔ اس سال جنوری کے آخری دنوں میں پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس باہتمام ریواڑی منعقد ہوئی۔ اس موقع پر سر میاں محمد شفیع صاحب نے اجلاس پنجم کے صدر کی حیثیت سے جو بلیغ خطبہ پڑھا وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لئے ایک حوصلہ افزا پیغامِ عمل تھا آپ نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو حصول تعلیم میں سہولت میسر ہو سکے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کے قابل ہو جائیں۔ آپ نے بتایا کہ انگلستان میں جو وسعتِ آبادی کے لحاظ سے ہمارے وطن کے ایک صوبہ کے برابر ہے اس وقت اُنیس یونیورسٹیاں نوجوانانِ انگلستان کو مختلف قسم کی تعلیم دے رہی ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں جو درحقیقت ایک برِّاعظم

ہے اور جس کی آبادی ۳۱ کروڑ ہے ۱۹۱۹ء تک تو صرف سات یونیورسٹیاں تھیں اور اس کے بعد ۳ ساڑھے تین سال میں جب صاحب موصوف ایجوکیشن ممبر تھے چھ نئی یونیورسٹیاں جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ڈھاکہ یونیورسٹی شامل ہیں اور ایزاد ہیں ؛

موصوف نے بتایا کہ ذرائع تعلیم کو کامیاب بنانے میں حکومت اور رعایا کی مشترکہ کوشش درکار ہے حکومت ہند بمقابلہ دوسری مہذب حکومتوں کے ہندوستانیوں کی تعلیم پر اتنا خرچ نہیں کرتی جتنا کہ اس کا فرض ہے صاحبِ ممدوح نے یہ بالکل بجا فرمایا کہ ہندوستان کے خزانے پر جو فوجی مصارف کا بوجھ ہے وہ بہت کچھ کم ہو سکتا ہے اور اس طرح حکومت رعایا کی تعلیمی ترقی اور حفظانِ صحت کے لئے موجودہ خرچ سے بہت زیادہ روپیہ صرف کر سکتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ مسلمانانِ ہند تعلیم میں برادرانِ وطن سے کس قدر پیچھے ہیں پنجاب یونیورسٹی میں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے لحاظ سے بہت کم حقوقِ نیابت حاصل ہیں۔ آپ نے کانفرنس سے استدعا کی کہ وہ اس سال پھر سر میلکم ہیلی چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو رزولیوشن کے ذریعہ سے اس امر کی طرف توجہ دلائے کہ سینٹ میں مسلمانوں کی نیابت کا پورا انتظام ہونا چاہیئے ؛

آپ نے قوم کو توجہ دلائی کہ نادار مسلمان بچوں کو حصولِ تعلیم میں مدد دینے کی غرض سے مختلف انجمنیں قائم کیجائیں جو ایسے طلبہ کو جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں، قرض حسنہ دے سکیں آپ نے انجمنِ حمایت اسلام اور انجمنِ راعیانِ ہند کی تعلیمی سرگرمیوں کی بہت تعریف کی اور اپنا خطبہ صدارت کانفرنس کی کامیابی کی دعا پر ختم کیا ؛

گورنمنٹ کالج لاہور میں ہندی اور اردو کا مشاعرہ ۔ پچھلے دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک اہم اور قابلِ ذکر مشاعرہ منعقد ہوا اس مشاعرہ میں دو قسم کی نظمیں پڑھی گئیں یعنی ہندی نظمیں اردو کے اوزان میں اور اردو نظمیں ہندی کے اوزان میں اس مشاعرہ میں مختلف کالجوں کے طلبہ نے نہایت گرمجوشی سے حصہ لیا۔ اور دونوں قسم کی اچھی اچھی نظمیں پڑھی گئیں ۔ ہندی اور اردو کے اتحاد کیلئے اس قسم کی کوششیں بہت مستحسن ہیں اور ہم گورنمنٹ کالج کی ہندی سوسائٹی کو اس سعی کیلئے قابل مبارکباد سمجھتے ہیں دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ صاحب اور خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے دو تمغے بھی عنایت فرمائے ؛

نامعلوم سرزمین کو

کہا میں نے مرا بچہ کہاں لے جا رہے ہو تم   اُسے یوں چھین کر مجھ سے بھلا کیا پا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا تھا، نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اَور بڑھتی گئی کشتی

کہا میں نے جدا ماؤں سے بچّے رہ نہیں سکتے   مجھے بھی لے چلو اُس کو جہاں لے جا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اور بڑھتی گئی کشتی

"مٹا سکتے نہیں ہو تم بھی کیا قسمت کے لکھے کو؟   اس اپنے ظلم پر جب آپ ہی شرما رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اور بڑھتی گئی کشتی

"قیامت کے لئے بھی آخر اک ساعت مقرر ہے   قیامت وقت سے پہلے ہی پھر کیوں ڈھا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اور بڑھتی گئی کشتی

"مرے بچّے پہ گہری نیند طاری ہو رہی کیوں ہے؟   اسے تھپکا رہے ہو اور مجھے تڑپا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اور بڑھتی گئی کشتی

"کئے جاتے ہو کیوں پامال میری آرزوؤں کو   ہزاروں حسرتوں کو کس طرح ٹھکرا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی ناچار، اور بڑھتی گئی کشتی

"مجھے بس ایک ہی پل کے لئے دے دو مرا بچہ   ہمیشہ کے لئے اُس کو اگر لے جا رہے ہو تم
"فرشتہ چُپ رہا، تھامی نہ کشتی ناخدا نے بھی
میں روتی رہ گئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی کشتی

حامد علی خاں

فلسفۂ مغرب کی اجمالی تاریخ

فلسفۂ یونان

دیمقراطیس

دیمقراطیس (Democritus) ۴۶۰ ق م میں بمقام ایبڈیرا (Abdera) واقع بر سرحد تھریس (Thrace) پیدا ہوا، یہ شخص لیوسیپس (Leucippus) کا شاگرد تھا جو سالمات مادہ کے نظریہ (Atomic Theory) کا بانی گذرا ہے، اکثر لوگ لیوسیپس کے وجود سے بھی انکار کرتے ہیں مگر ارسطو اُسے ایک تاریخی انسان تسلیم کرتا ہے، اور واقعی بات بھی یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اپنے اُستاد سے اِس قدر بڑھ گیا کہ لوگ اِسی کو فلسفۂ سالمات مادہ کا بانی خیال کرتے ہیں۔ دیمقراطیس اپنے زمانہ کا بڑا زبردست فاضل تھا اور ریاضی، طبیعات، مابعد الطبیعات، ہیئت، اخلاق اور تاریخ کا بڑا ماہر تھا۔ اُس نے بہت سفر کیا اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن اس کی کل تصانیف یا کوئی مستقل تصنیف ہمارے سامنے موجود نہیں ۳۷۰ ق م میں وفات پائی ؛

اس کا فلسفہ

دیمقراطیس اس امر میں پارمینا یڈیز سے متفق ہے کہ تغیر مطلق یا کامل محال ہے حقیقتِ اشیا بالذات، غیر متغیر، مستقل، اور ناقابل فنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی مسلم ہے کہ تغیر ہر آن جاری ہے یعنی اشیائے خارجی میں حرکت موجود ہے اور مسلسل ہے حرکت اور تغیر بغیر خلاء محال ہے لہذا (Space) خلاء موجود ہے۔ لیکن پارمینا یڈیز کا خیال یہ تھا کہ صرف ایک ہی حقیقی وجود ہے، دیمقراطیس کا مذہب یہ ہے کہ حقیقی وجود، واجب بالذات ایک نہیں بلکہ بہت ہیں یعنی اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ان غیر محدود اور اَن گنت وجودوں میں سے ہر ایک وجود، غیر قابل تقسیم (ἄτομα) یعنی (atom) ہے اور بسیط ہے، نیز ان میں تداخل (Penetration) محال ہے، یہ سالمات جسم رکھتے ہیں اور خواص کے اعتبار سے سب یکساں ہیں لیکن شکل و صورت، مقدار اور جسامت میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یہ سالمات مادہ قائم بالذات غیر قابلِ فنا، غیر متغیر اور قدیم (ازلی) ہیں، جیسے ازل سے ہیں ویسے ہی ابد تک رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں جو صفات پرمینا یڈیز نے ایک واجب بالذات، وجود کے بیان کئے تھے، وہی صفات ان بیشمار سالمات کے ہیں جو باعتبار ذات لاتنجزی ہیں انقسام قبول

نہیں کرتے اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

جس طرح ایک انگریزی حروف تہجی سے، مختلف ڈرامے شکسپیئر نے تیار کر دئے اسی طرح ان سالمات مادہ سے مختلف اشیاء ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ تمام اجسام انہیں سالمات کے اتحاد combinations ہیں ان کے امتزاجِ باہمی کا نام حیات ہے، انہیں کے افتراق کا نام موت ہے۔ چونکہ سالمات مادہ بلحاظ شکل و صورت، جسامت و مقدار ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی لئے مختلف اجسام اور اشیائے خارجی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ امتزاج اور افتراق کی علّت، وہ حرکت ہے جو ان سالمات میں بالذات موجود ہے یعنی سالماتِ مادہ متحرک بالذات ہیں، حرکت ان کی ذات کا تقاضا ہے، جو ان سے منفک نہیں ہو سکتی" جس طرح سالماتِ معلول (caused) نہیں اسی طرح اُن کی حرکت معلول نہیں ہے، ازل سے متحرک ہیں اور ابد تک متحرک رہیں گے۔ ان سالمات کی ازلی حرکت کی بناء پر دنیا بنی ہے (slime) یعنی چکنی مٹی یا کیچڑ سے زندگی پیدا ہوئی۔ رُوحِ انسانی، سالمات ناریہ (Fiery atoms) سے مرکب ہے، انہیں سالمات کی مختلف تراکیب سے انسان میں مختلف قوا ظہور پذیر ہوئے۔ دماغ میں خیال پیدا ہوا، دل میں غصہ اور جگر میں خواہشات و ارادہ۔ موت کے وقت روحانی سالمات منتشر ہو جاتے ہیں، اور انسان مر جاتا ہے۔ اور ψυχη یعنی نفس ناطقہ اور νους یعنی عقل دونوں ایک شے کے دو نام ہیں۔

نوٹ:۔ جس طرح پارمینائیڈیز فلسفہ وحدۃ الوجود کا بانی ہے، اسی طرح دیمقراطیس فلسفہ مادیت کا موجد ہے، اور جس طرح وحدۃ الوجود کے حامی آج بھی دنیا میں موجود ہیں مثلاً اسپنوزا، اور ہیگل اسی طرح مادیت کے وکیل بھی دنیا میں موجود ہیں مثلاً لامیٹری (La mattrie)[1] اور (Hobbes) دیمقراطیس کے نزدیک نہ خدا کوئی شے ہے نہ اُس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ حرکت کو قدیم مانتا ہے۔ اگرچہ اسجگہ مادیت (materialism) پر بالاستیعاب بحث کرنیکا موقعہ نہیں تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیمقراطیس کا مذہب اور اس کے عقاید تمام و کمال نمبروار لکھ دئے جائیں اور ساتھ ساتھ اُن پر تنقیدی نظر ڈالدی جائے۔ دیمقراطیس کہتا ہے :۔

(۱)۔ واجب الوجود، ایک نہیں بلکہ بے شمار ہیں۔

فلسفہ میں یہ بات بدلایل نیرہ ثابت ہو چکی ہے کہ تعدد وجباء محال ہے، دیکھو موجودہ فلاسفہ الٰہیین

---

[1] لامیٹری (La mattrie) فرانس کا مشہور مادہ پرست

مثلاً فشر[1]، فاسٹر[2]، فلنٹ[3]، فایڈز[4]، کلارک[5]، کڈورتھ[6]، ہملٹن وغیرہ بھی اسی امر پر متفق ہیں کہ واجب الوجود ایک سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔

قانون علت (Law of causation) بھی یہی بتاتا ہے کہ کائنات کی علت واحد ہے اور اس امر پر ڈیکارٹ، اسپنوزا، لیبنگ، شیلنگ، ہیگل، کانٹ اور اسپنسر[7] سب متفق ہیں۔

(۲)۔ جزو لایتجزیٰ (سالمہ یا پرمانو (atom, ٥٧ ســـــ ٢٥٣) غیر قابل انقسام ہے۔

یہ امر بھی غلط ہے، تین اجزاء ملا کر رکھو، دو نیچے ایک اوپر، مثلث بن گیا، اب اس مثلث کے تینوں زوایا منقسم ہو سکتے ہیں۔ لہذا تینوں اجزاء بھی تقسیم ہو گئے۔

تینوں اجزاء برابر برابر رکھو، اگر پہلا تیسرے کو چھوتا ہے تو دوسرا کدھر ہے، اگر نہیں چھوتا تو فاصلہ ثابت ہے اور فاصلہ بذریعۂ خط ناپا جا سکتا ہے، خط اقلیدس کی رو سے تقسیم ہو سکتا ہے۔ وہ جزو بھی تقسیم ہو گیا۔

(۳)۔ ہر جزو مجسم ہے۔ لیکن ہر جسم قسمت قبول کرتا ہے دعوے نمبر ۲ باطل ہو گیا۔

(۴)۔ ہر جزو ازلی ہے۔ لیکن اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ ہر جزو تقسیم ہو سکتا ہے یعنی اس میں اجزاء ثابت ہیں۔ پس مرکب ہے اور ہر مرکب حادث ہے کیونکہ ترکیب پانے سے پہلے اس کا وجود نہ تھا (ہر مرکب پر اس کا ترکیب دینے والا مقدم ہے)۔

(۵)۔ ہر جزو غیر متغیر ہے۔ لیکن صورت رات دن بدلتی رہتی ہے لہذا قدیم محل حادث ٹھیرا۔

---

[1] ۔ فشر (Fisher G.) انیسویں صدی کا مشہور فاضل الہیات امریکن تھا۔ حال میں وفات پائی ہے اسکی مشہور تصنیف Ground of Theistic Belief

[2] ۔ فاسٹر (Forter F.) امریکن فاضل الہیات، موجودہ زمانہ کا، اسکی مشہور تصنیف Theism ہے

[3] ۔ فلنٹ (Flint R.) انگریز فاضل الہیات موجودہ زمانہ کا۔ اس کی مشہور تصانیف Theism اور Anti Theistic ہیں

[4] ۔ فایڈز (Fiddes R.) اٹھارھویں صدی کا انگریز فاضل الہیات (1671 —— 1725)

[5] ۔ کلارک (S. Clarke) مشہور فاضل الہیات اور زبردست فلسفی، انگریز (1675—1729) اسکی شہرۂ آفاق تصنیف اثبات واجب الوجود بدلایل عقلیہ ہے۔ (Demonstration of the Being & attr of God)

[6] ۔ کڈورتھ (Ralf Cudworth) مشہور فاضل الہیات اور فلاسفر، انگریز (1617—1688) اسکی شہرۂ آفاق تصنیف (The True Intellectual System of the Universe) ہے جس نے اسے غیر فانی شہرت عطا کر دی

[7] ۔ اسپنسر (H. Spencer) یورپ کا انیسویں صدی کا مشہور فلاسفر اور سائنسدان، مسئلہ ارتقا کا مؤید (1820 —— 1903)

(۶) - تمام اجزاء بلحاظ خواص وصفات یکساں ہیں۔ لیکن گرمی کا خاصہ اور ہے سردی کا اور ہے، پانی کا خاصہ اور ہے، آگ کا خاصہ اور ہے، گلاب کی صفات اور ہیں، چنبیلی کی صفات اور ہیں۔ اور پانی اور آگ کچھ نہیں ہیں، مگر وہی ذرات جو یکساں نہیں بلکہ ایکدوسرے کی ضد ہیں تھوڑا سا پانی آگ پر ڈال کر دیکھ لیجئے ۔

(۷) - تمام اجزا، بلحاظ شکل وصورت، جسامت ومقدار مختلف ہیں، لیکن اختلاف کا سبب؟ اختلاف کہاں سے آیا؟

(۸) - اجزاء وزنی ہیں۔ لہذا بلندی سے پستی کی جانب آئے۔ اِس طرح دُنیا بنی۔

سوال یہ ہے کہ بقید زمان آئے یا نہ۔ اگر بقید زمان آئے تو اس زمانے سے پہلے کیوں نہ آئے اب کون محرک ہو گیا؟ اور اگر بقید زمان نہیں آئے تو کائنات یعنی دُنیا ازلی ہے لیکن موجودہ سائینس اور علم طبقات الارض ہمیں بتلاتے ہیں کہ دُنیا بقید زمان بنی ہے، رفتہ رفتہ بنی ہے۔

(۹) - دُنیا میں جو کچھ ہے، اور جس قدر عناصر ہیں سب انہیں اجزاء سے مرکب ہیں۔

لیکن موجودہ تحقیقات کی رُو سے (۶۴) چونسٹھ سے زیادہ بساط ثابت ہوئے ہیں۔

(۱۰) - Slime یعنی نم مٹی سے حیات، ظہور پذیر ہوئی۔

لیکن نم مٹی، اجزاء سے مرکب ہے، جو چیز اجزا میں نہیں وہ مرکب میں کہاں سے آگئی؟

(۱۱) - رُوح (Spirit or Soul) یا (Psyche) انہیں اجزا سے مرکب ہے جسم میں ہر جگہ جاری وساری ہے۔

اگر انسان کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے تو وہ حرکت نہیں کرتا، پس معلوم ہوا کہ رُوح ہاتھ میں نہیں۔

اگر انسان کا ہاتھ کاٹ ڈالا جاوے تو انسان میں بحیثیت نفس مدرک کمی نہیں ہوتی پس معلوم ہوا کہ رُوح جسم نہیں، ورنہ اسی قدر کم ہو جاتی۔ اگر کل انسان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دئے جائیں تو کسی میں بھی حرکت یا جان کے آثار نہ ہونگے، لہذا معلوم ہوا کہ رُوح جسم سے علیحدہ کوئی چیز ہے اور جسم نہیں ورنہ وہ بھی کٹ جاتی ۔

(۱۲) - اجزاء لایتجزیٰ نہ دیکھے جا سکتے ہیں، نہ سُنے جا سکتے ہیں، نہ چھوئے جا سکتے ہیں۔ الغرض بذریعہ حواس خمسہ محسوس نہیں ہیں۔ لیکن یہ تمام صفات منافی جسمیت ہیں۔ اور اجزاء جسم ہیں۔ علاوہ بریں ہر مرکب محسوس ہے لہذا لازم ہے کہ اجزاء بھی محسوس ہوں۔ غیر محسوس سے محسوسات کس طرح نکل سکتے ہیں۔ (Like Breeds Like) آم کے پیڑ سے آم اور امرود کے پیڑ سے امرود پیدا ہوتا ہے

(۱۳) - اجزاء ازل سے متحرک ہیں' حرکت اُن کی ذات کا تقاضا ہے یا متحرک بالذات ہیں۔ کوئی اور متحرک نہیں - عالم اجسام میں کلیہ قاعدہ ہے کہ حرکت بغیر متحرک کے نہیں ہوتی - اور اجسام انہیں متحرک اجزائے مرکب ہیں لیکن تمام اجسام' جبتک کوئی متحرک نہ ہو حرکت نہیں کرتے، گو حرکت ان میں بالقوۃ موجود ہو جیسے ریلوے انجن میں حرکت کی قابلیت موجود ہے لیکن جبتک ڈرایور اُسے حرکت نہ دے حرکت نہیں کرتا +

اگر حرکت اجزا کی ذاتیات میں سے ہے تو اجزا مرکب ہو کر ذاتیات کیوں اور کیسے کھو بیٹھے، اول تو ذاتیات شئے ذاتِ شئے سے منفک نہیں ہو سکتی، دوسرے اگر منفک ہو گئی جیساکہ ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہُوا کہ حرکت ان میں باہر سے آئی تھی، ورنہ ذاتی ہوتی تو زائل نہ ہوتی۔

نفس ناطقہ انہیں اجسام یعنی اجزاء سے مرکب ہے جن میں حرکت ذاتی اور ازلی ہے، لیکن اسی نفس ناطقہ کا یہ فیصلہ ہے کہ حرکت از مقولۂ معلول ہے اور معلول علت کا محتاج ہُوا کرتا ہے - عجب تماشہ ہے کہ جب چند اجزا مرکب ہو کر ایک شکل اختیار کرتے ہیں تو اپنی ذاتیات بھی کھو بیٹھتے ہیں، حالانکہ خواص اور صفات دُور نہیں ہُوا کرتے، پھر غور کیجئے' حرکت ایک شئے کی دوسری شئے کی طرف (جیساکہ ان اجزا لایتجزیٰ میں ہے) کسی وجہ سے ہوتی ہے، بلا سبب نہیں ہوتی - ان سالمات کی حرکت کی کیا وجہ ہے؟ اگر کہو کہ ان کا تقاضائے ذاتی ہے تو وہ پہلے باطل کیا جاچکا ہے' اب دو صورتیں ہیں حرکت بلا وجہ ہے یا بوجہ خاص - اگر بلا وجہ ہے تو معلول بلا علت ہے جو محال ہے ہر معلول کے لئے علت ہونا ضرور ہے اور اگر کوئی وجہ ہے تو وہ 'وجہ' باعث حرکت ہے اور 'وجہ' خود متحرک نہیں بلکہ وہ اُس جسم یا جزو کے لئے باعث حرکت ہے لہذا وہ جسم متحرک سے غیر ہے، اور یہی ہمارا مقصود تھا -

(۱۴) - اجزاء بے شعور ہیں - لیکن انسان میں شعور، عقل و فہم، ارادہ، مقصد، پیش بینی، تخیل و توقف ذاتی، یہ ساری باتیں کہاں سے آگئیں - کوئی شخص آجتک اس معمہ کو حل نہیں کر سکا کہ بے شعور مادہ سے ذی شعور انسان کس طرح اور کیونکر پیدا ہو گیا - خود انسان کے جسم میں تناسب ہے، اور اس کا ہر عضو ایک مقصد کے ماتحت بنا ہوا ہے' یہ ساری بحث ہم نے (Argument from design) میں کی ہے +

پھر قوانین فطرت کو دیکھئے ان میں استحکام اور پائداری پائی جاتی ہے جبکہ مادہ، اور اسکی حرکات دونوں اندھا دھند کام کرتے ہیں، نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ - عجب تماشہ ہے کہ اجزا میں تو کوئی قانون کام

نہ کرے لیکن مرکبات سب کے سب قانون میں جکڑے ہُوئے ہیں۔ اسکے لئے علوم ہیئت و ریاضی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، موٹی سی دلیل، جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان میں ایک چیز یعنی رُوح ایسی ہے جو نہ جسم ہے نہ جسم سے مشارکت رکھتی ہے اور نہ ان اجزاء دیمقراطیسی سے مرکب ہے۔ اجسام سے تا وقتیکہ پہلی شکل زائل نہ ہو دوسری وہاں نقش پذیر نہیں ہوسکتی، لیکن دماغ میں، ایک وقت میں ایک دو نہیں سینکڑوں باتیں ماضی حال اور استقبال کی جمع رہتی ہیں اور کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ لہذا رُوح، جسمانی نہیں، مجرد عن المادہ ہے ؛

(۱۵)- جس طرح ملاحدہ اور منکرین باری تعالیٰ عزاسمہٗ، مادہ میں شعور نہیں ثابت کر سکتے، اسی طرح وہ مادیت کے اصولوں کی بناء پر یہ نہیں سمجھا سکتے کہ مادہ میں حیات کہاں سے آئی۔ انسان میں جو ان بیجان اجزاء سے مرکب ہے، زندگی کہاں سے اور کیسے آگئی ؟ جب کل میں زندگی نہیں شعور نہیں تو جزو (انسان) میں یہ باتیں کہاں سے آسکتی ہیں ؟ پس معلوم ہُوا کہ انسان محض جسم نہیں بلکہ جسم و روح کا نام ہے اور رُوح کو مادہ سے کوئی علاقہ نہیں ؛

(۱۶)- اگر انسان فانی ہے، روح کوئی چیز نہیں، مرنے کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا تو

(ا)- انسان میں مذہب کا خیال کیونکر پیدا ہُوا۔ مذہب کی حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب سے انسان ہے اُسی وقت سے مذہب ہے اور مذہب سے مراد، ایک خیال، کسی زبردست طاقت کا، جو دُنیا میں کام کر رہی ہے۔ اس خیال سے کوئی ملک، کوئی زمانہ، کوئی قوم خالی نہیں رہی ہے۔ اب خُدا کا تصور، مادہ کا تصور نہیں، لہذا انسان میں ایسے وجود کا جو مادی نہیں تصور کیوں آیا ؟ مادہ سے بنے ہوُئے انسان نے مادہ سے اوپر کس طرح پرواز کی ؟ اور کس طرح اپنے سے زبردست اور طاقت والی ہستی کا دھیان قائم کیا ؟

(ب)- انسان میں اخلاق فاضلہ کی تکمیل کی خواہش کیوں ہے ؟ وہ نیکی کیوں پسند کرتا ہے، بدی سے کیوں متنفر ہے۔ (Morality) یعنی پاکیزہ زندگی کا خیال کیوں پیدا ہُوا ؟ دُنیا میں ایپکورس کا مذہب کیوں نہ چلا ؟ جب مرنے کے بعد کچھ نہیں تو یہ بکھیڑا کیا ؟ ضمیر کی آواز کہاں سے آئی ؟ پوشیدہ طور پر گناہ کرو لیکن انسان شرماتا ہے، دل میں پشیمان ہوتا ہے ! ندامت ہوتی ہے ! افسوس کرتا ہے ! کیوں ؟ اُسے کون دیکھ رہا ہے ؟ اُس نے کسی کا کیا بگاڑا ؟ وہ کس سے ڈرتا ہے ؟

جب مرنے کے بعد کچھ نہیں تو تزکیۂ اخلاق سے فایدہ ؟ انسان صداقت کو کیوں ڈھونڈتا ہے ؟

اس کے لئے کیوں سرگرداں ہے؟ اس کی خاطر جان دیتا ہے مگر کیوں؟ مرنے کے بعد تو کچھ بھی نہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ تزکیۂ اخلاق اس لئے کرتا ہے کہ زندگی عمدہ طور پر بسر ہو۔ جواب سُنئے۔

(و)۔ آرام و آسایش کی زندگی، عیش و طرب کی زندگی، لذایذ دُنیاوی سے تمتع۔ بیفکری، فارغ البالی، تن آسانی، بہت سے ڈاکوؤں، قزاقوں، بدمعاشوں، خراب چلن والوں، دغابازوں، مکاروں، غداروں، بے ایمانوں کو حاصل ہوئی ہے، لیکن کیا چوری، قزاقی، بدمعاشی اچھی بات ہے؟ کیا کوئی شخص چوری، قزاقی وغیرہ کو عمدہ بات قرار دیتا ہے؟ حالانکہ اگر مرنے کے بعد کچھ نہیں اور انسان اپنے افعال کا جوابدہ نہیں تو اُس کی بلا سے خواہ کچھ ہو اُسے تو وہ کام کرنا چاہیئے جس سے زندگی آرام، لطف، عیش و طرب کے ساتھ بسر ہو، یہی تعلیم اپی کیورس نے دی، یہی وعظ اہل سفسطہ نے کیا، کیا آج کوئی سلیم الطبع انسان اس پر کاربند ہونے کے لئے تیار ہے؟

(ب)۔ علاوہ بریں، صادق، راستباز، نیکوکار کی زندگی اکثر تکلیف و رنج و راحت و نکبت و افلاس کی زندگی ہوتی ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں، پھر کیوں محنت کرتا ہے، کیوں رنج اُٹھاتا ہے، کیوں دُکھ سہتا ہے اور جھوٹ نہیں بولتا، چوری نہیں کرتا، کیوں دنیا اس کلبہ کی طرف دوڑتی ہے، نیکی کرد کیونکہ نیکی اچھی بات ہے؟ بدی مت کرد کیونکہ بدی، بُری بات ہے! جب مرنے کے بعد کچھ نہیں تو نیکی سے حاصل؟

"ضرور ہم باقی ہیں۔ ضرور ہم ذمہ دار ہیں! ضرور نیکی اور بدی کا بدلہ ملیگا؟ جس نیکوکار کو اس دُنیا میں آرام اور خرمی نہیں ملی، ضرور ہے کہ اس کا اجر آئندہ زندگی میں ملے" یہ وہ خیال تھا جو ایمانئل کینٹ کے دل میں پیدا ہُوا، یہ وہ خیال تھا جس نے اُسے خدا کی ہستی منوا دی۔ اور آج اگر ہم ان باتوں پر غور کریں تو ہمیں بھی خدا کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ۱۲

آخری بات یہ ہے کہ اجزا کی حرکت یا امتزاجی ہے یا افتراقی یا دونوں۔

(ل)۔ اگر صرف امتزاجی ہے تو افتراق ظہور پذیر نہیں ہونا چاہیئے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کتاب کو کسی صندوق میں رکھ چھوڑیں تو ایک عرصہ دراز کے بعد وہ کتاب وہاں نہ ہوگی۔ معلوم ہُوا کہ ذرات منتشر ہوگئے۔ اور کسی پھول سے ہمیں خوشبو بھی نہیں آنی چاہیئے کیونکہ خوشبو اسی وقت آسکتی ہے جبکہ اجزا منتشر ہو کر ہماری ناک تک بذریعۂ ہوا پہنچتے ہیں۔ لیکن خوشبو آتی ہے۔

(ب) - اگر صرف افتراقی ہے تو پھر کوئی جسم یا چیز نہیں بنی چاہیئے مگر اجسام بنتے رہتے ہیں -
(ج) - اگر دونو طرح ہے تو یا ایک حرکت زیادہ اور دوسری کم ہوگی یا دونوں برابر ہونگی -
(۱) - اگر ایک زیادہ ہے مثلاً امتزاجی زیادہ ہے تو اسی کا اثر غالب ہونا چاہیئے، اور بگاڑ نہ ہونا چاہیئے -
(۲) - اسی طرح اگر افتراقی زیادہ ہے تو ترکیب نہیں ہونی چاہیئے -
(۳) - اور اگر دونوں برابر ہیں تو پھر بھی دُنیا نہیں بن سکتی کیونکہ اگر دو برابر کی طاقتیں آپس میں مقابل ہوں تو دونوں کا اثر زائل ہو جائیگا - ایک طاقت کے دو انجن مقابل ہیں چلا ئیے - دونوں اُسی جگہ رہیں گے جہاں پہلے کھڑے تھے - حرکت ہی نہ ہوگی +

سب سے آخر میں اس دلیل پر غور کیجئے :-

ہر متحرک جاندار ہے، جزو لایتجزیٰ متحرک ہے، لہذا جزو لایتجزیٰ جاندار ہے - جزو لایتجزیٰ جاندار ہے، اجزائے لایتجزیٰ بلحاظ خواص یکساں ہیں، لہذا اجزائے لایتجزیٰ جاندار ہیں - (مرکب ہو کر اجزا، کا خواص باقی رہنا ہے) لیکن پتھر، جو ان اجزا، سے مرکب ہے جاندار نہیں +

لہذا معلوم ہُوا کہ جس میں جان نہیں اس میں حرکت بھی نہیں .

جزو لایتجزیٰ میں جان نہیں، لہذا حرکت بھی نہیں +

اور دوسری بات پر مفصل بحث اگرچہ (Design Argument) کے ماتحت ہو سکتی ہے جس کا یہاں موقعہ نہیں، تاہم اس کے متعلق اس قدر کہنا کافی ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے خود بخود نہیں بن گئے بے شک ایک ہی حروف تہجی سے مختلف نظمیں تیار ہُوئیں، مگر حروف تہجی، شیکسپیر کے بغیر رومیو اور جولیٹ مرتب نہیں کر سکتے تھے - یہی ۲۶ حروف اگر کسی جاہل آدمی کو دیدئے جائیں تو وہ کبھی رومیو جولیٹ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں کہ لفظ "رومیو" کن حروف سے مل کر بنتا ہے جبتک ایک صاحب عقل و شعور ہستی تسلیم نہ کی جائے، ڈرامہ نہیں لکھا جا سکتا، اسی طرح بے شعور مادہ یہ کائنات از خود بلا امداد و تصرف غیرے ترتیب نہیں دے سکتا - اگر شیکسپیئر نہ ہوتا تو رومیو اور جولیٹ، کا وجود بھی نہ ہوتا - ڈراموں کی ترکیب اگر خود بخود ہو گئی ہوتی تو ہم یہ خیال کر سکتے تھے کہ کائنات بھی خود بخود مرتب ہو گئی - جس طرح حرکت، متحرک کو چاہتی ہے اُسی طرح ترکیب اور ترتیب، مرکب اور مرتب کو چاہتی ہے - حرکت، بغیر متحرک محال عقلی ہے، اسی طرح ترتیب، بغیر مرتب محال عقلی ہے - سالمات مادہ تو بے شعور ہیں وہ مقصد کے ماتحت کس طرح کام

کر سکتے ہیں؟ جب کوئی عقلمند صاحب شعور فاعل نہیں تو انسانی آنکھ دیکھنے کے مقصد کو کس طرح پورا کر سکی؟ جب علت بے شعور ہے تو معلول کس طرح صاحب شعور ہو گیا، جو بات کل میں نہ تھی وہ جزو میں کس طرح آگئی، بلکہ کس طرح آسکتی ہے؟ بے وقوف مادہ نے باوقوف انسان کیسے بنا دیا؟

ایک بچّے سے کہو کہ وہ فارسی حروف تہجی کے امتزاج باہمی سے دیوان حافظ کا پہلا شعر ہی بنا دے! اور جب تک وہ بنا کر نہ دکھلا سکے اس وقت تک کسی مادہ پرست کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس امر کا ادعا کرے کہ دُنیا خود بخود بن گئی یا بے شعور مادہ نے باہمی امتزاج کی بنا پر اشیائے خارجی مرتب کر دیں۔ انسان میں ایک صفت ہے جسے ہم غور و فکر کہتے ہیں۔ کیا کسی سالمہ میں غور و فکر کا شائبہ پایا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم بدل و جان دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں، اور درحقیقت نہیں تو چند سالمات کی ترکیب سے انسانی دماغ میں قوتِ متخیلہ کیسے موجود ہو گئی، کہاں سے آگئی، جو چیز علت میں نہیں وہ معلول میں کیسے آگئی لامحالہ ماننا پڑیگا کہ انسان میں سالماتِ مادہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اسی کو علم روح کہتے ہیں۔ جو مجرد عن المادہ ہے ۰

سفسط کا دَور گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ یونان میں ضمیر اور خیال دونوں کو کامل آزادی حاصل تھی، اور ہر شخص مجاز تھا کہ علمی تحقیق میں قدم اُٹھائے، فلسفہ میں بے لوث تحقیقات یعنی Free enquiry کا اثر دیگر علوم پر بھی پڑا، ان میں بھی آزادانہ بحث و تمحیص ہونے لگی چنانچہ اس دَور کے مصنفین مثلاً ایسطیکس[۵۱] (Aeschylus 456-525) سوفوکلیز[۵۲] (Sophocles 405-596) یوری پائڈیز[۵۳] (Euripedes 406-480) اور مورخین مثلاً تھیوسیڈائیڈیز (Thucydides) ہیروڈوٹس (Herodotus) اور اطباء مثلاً ہپوکریٹیز[۵۴] سب کے سب قدماء میں اس شان میں ممتاز تھے کہ انکی تصانیف میں تحقیق کا رنگ غالب ہے ۰

۵۱ ہپوکراٹیس:۔ یونان کا مشہور ماہر طب اور عالم طبیعات ۱۲

۵۲ ۔ پروٹے گورس (Protagoras) یونان کا مشہور سفسطی فلاسفر ۴۴۵ء ق م میں ایتھنز آیا اور شہرۃ حاصل کی۔

۵۳ سرسید (۱۸۹۸ — ۱۸۱۷) مسلمانوں کا تعلیمی ریفارمر، ایک زبردست شخصیت اور قومی خدمتگذار، محتاج تعارف نہیں۔

۵۴ آرنلڈ (J. M. Arnold) انیسویں صدی کا فاضل الٰہیات اور دین مسیحی کا پیشوا، اسکی مشہور تصنیف اسلام اور عیسائیت ہے عربی فارسی، عبرانی یونانی، جرمنی لاطینی، وغیرہ زبانوں میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ سرسید سے خط و کتابت تھی ۰

فلسفہ میں کوئی جدید اضافہ اس دور میں نہیں ہُوا۔ جو کچھ اگلوں نے لکھا تھا، اسی پر غور و خوض ہوتا رہا اور شرح و بسط کے ساتھ اُن پر تفاسیر و شروح لکھی گئیں۔ یونان کو پانچویں صدی قبل مسیح میں فارس پر فتوحات حاصل ہُوئیں اور دُنیا کی طاقتوں میں شمار ہونے لگا، دولت نے آ کر قدم چومے اور اس کی خادمہ اور سہیلی یعنی عیاشی اور خود غرضی دونوں اسکے ساتھ آئیں۔ یُونان کے لوگ اُن سے ہم آغوش ہو گئے، اور پُرانی سادگی پاکیزگی، صداقت پسندی، عفت شعاری، پابندئ قانون، سب رخصت ہو گئی، ایسی حالت میں مذہب اور اخلاق (Religion and morality) دونوں نے شرم کے مارے سمندر میں ڈوب مرنا، غنیمت سمجھا اور ہر شخص بکلی تمام قیود سے آزاد ہو گیا۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں، جو میں سچ خیال کرتا ہوں وہ سچ ہے، جو میں مناسب اور جائز خیال کرتا ہوں وہ جائز ہے۔ یعنی اخلاقی قوانین، ہر شخص کی مرضی کے موافق، درست یا غلط ٹھیرے۔ اس روش نے لاادریت کا باب کھولدیا۔ تھوسیڈ ایڈیز لکھتا ہے" لوگ اپنی منشاء کے موافق الفاظ کے معنی کیا کرتے تھے۔ اور سارا وقت لفظی کج بحثیوں میں صرف کرتے تھے، حقیقت پژوہی اُن کا مقصد نہ تھا۔ بلکہ دوسرے پر اپنی علمیت کا سکہ جمانا، دغابازی، غداری، مکاری، بے ایمانی، جھوٹ، فریب، دھوکا یہ سب داخل حسنات تھے، اور ایمانداری بیوقوفی کا دوسرا نام تھا۔ دولتمند عیاش، مفلس بدمعاش نوجوان، گستاخ، عورتیں آزاد اور بچے نافرمان ہو گئے تھے"

ایسی صورت حال میں، ایک گروہ معلموں کا اُٹھا، جنہوں نے علم و حکمت سکھانا ذریعۂ معاش بنا لیا، انہوں نے اپنا لقب (Sophist) یعنی عقلمند اور ہوشیار آدمی رکھا۔ واضح ہو کہ ان سے پہلے، کوئی فلاسفر، تعلیم فلسفہ کو ذریعہ معاش نہیں بناتا تھا۔ اول تو جتنے قدیمی فلاسفر گذرے ہیں نوّے فیصدی دولتمند تھے، اور جو نہیں تھے وہ اپنی بسر اوقات کے لئے کوئی شغل کرتے تھے مگر تعلیم مفت دیتے تھے۔ یہ سوفسٹ لوگوں کا طبقہ نبض شناس مردم تھا، انہوں نے دیکھا کہ لوگ ظاہر بینی اور ظاہر پرستی میں مشغول ہیں، پس انہوں نے اشتہار دیا۔

پروٹیگورس[1] (Protagoras) کہتا ہے اگر تم ایک دن میری صحبت میں بیٹھ جاؤ تو دن بھر کی صحبت تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا دے، گویا ان لوگوں کو کوئی منتر یاد تھا کہ سارا علم و

[1] پروٹےگورس یونان کا مشہور سفسطی فلاسفر ۴۴۵ ق م میں ایتھنس آیا اور شہرت حاصل کی۔

فضل ایک دن میں دوسرے کو پہنچ جاتا تھا، پھر نوجوانوں کو تقریر، فصاحت و بلاغت، منطق، مناظرہ اور صرف و نحو کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ ان باتوں کے جاننے بغیر حکومت میں دخل نہیں مل سکتا تھا، اس لئے سوفیسٹ لوگ یا "سفسطائیہ" انہیں باتوں کے سکھانے کا اعلان کرتے تھے۔ اور ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگوں میں دانائی، ایمانداری، حق پرستی، صداقت پژوہی پیدا کریں بلکہ اُنکو ایسے راستہ پر ڈالتے تھے جس میں انہیں دوسروں سے محاربہ و مکابرہ کرنیکی خو پڑ جاتی تھی اور جھوٹی بات کو مغالطات منطقی اور لفظی ہیر پھیر کے ذریعہ سے سچی ثابت کرنیکی ترکیبیں بتائی جاتی تھیں۔ چنانچہ لفظی معنی کی رُو سے سوفیسٹ اچھا لفظ ہے، "معلم حکمت" مگر اُن کی ان ذلیل حرکات کی وجہ سے سوفزم یا سفسطہ، آج، انگریزی و عربی زبانوں میں، مکاری، فریب خوردانی اور مغالطہ دہی کا مرادف ہے۔

ان لوگوں کی خاص تعلیم یہ تھی کہ صداقت حقیقت و علم، فی نفسہ کوئی شئے نہیں، جو بات جسے سچ معلوم ہو وہی سچ ہے، اگر وہی دوسرے کو جھوٹ معلوم ہو، جھوٹ ہے۔ مثلاً ایک شخص کو چوری اچھی معلوم ہوتی ہے، تو چوری اچھی چیز ہے، دوسرے کو بُری معلوم ہوتی ہے، اس کے لئے بُری ہے، چوری کا علم کہ وہ درحقیقت اچھی ہے یا بُری، حاصل نہیں ہو سکتا، کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی کا کوئی معیار نہیں۔ "انسان خود ہی ہر چیز کا معیار ہے" (قول پروٹیگورس)

لہذا اخلاقیات، قوانین، ضمیر اور اقوال بزرگان، احکام مذہب سب باطل اور دھوکا ہیں، ہر انسان اپنے لئے بمنزلہ قانون ہے، اسے کسی اور کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ اور جب علم ناممکن ہے تو لاادریت بھی آ گئی۔ اس لئے کہ جب علم فی نفسہ ناممکن ہے تو جائز و ناجائز Right & wrong کا بھی علم ناممکن ہے پس دنیا میں (Universal right & wrong) کوئی راستی یا ناراستی کلیہ طور پر نہیں پائی جاتی، اخلاقی اصول محض رسمی باتیں ہیں، جنکی پابندی ضروری نہیں، جو بات تمہارے مفید مطلب ہو، تمہارے مقاصد ذاتی میں معاون ہو وہی اچھی ہے اور اگر وہ بات دوسرے کے مقاصد میں مخل ہو تو وہی بُری ہے۔ مثلاً اگر تم دیکھتے ہو کہ فلاں شخص کے قتل کر دینے سے تمہارا کام بنتا ہے تو بلاشک اُسے قتل کر دو۔ ع درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست، جب یہ حالت ہو تو سقراط کا پیدا ہونا ضروری ہے،

آئندہ قسط میں سقراط اور اس کے فلسفہ سے بحث کیجائیگی۔

محمد یوسف خاں سلیم

جذباتِ آزاد

اچانک نزولِ بلا ہو گیا — یکایک ترا سامنا ہو گیا
ترے لطف سے جان پر آبنی — ہمارا مرض لا دوا ہو گیا
وہ کافر نگاہیں خدا کی پناہ — جدھر پھر گئیں فیصلہ ہو گیا
زہے آپکی بے نیازی کے ڈھنگ — ہر اُمید کا خاتمہ ہو گیا
مری بیکسی قابلِ رحم تھی — مجھے بھول کر کیا بھلا ہو گیا
کچھ اب بھی تلافیِ مافات کر — ترحم کہ جو ہو گیا۔ ہو گیا
طبیعت ہی درد آشنا ہو گئی — دوا کا نہ کرنا دوا ہو گیا
اُسے اب ستانے میں بھی عذر ہے — ستم بھی مرا مدعا ہو گیا
جو سچ پوچھو دل ترکِ دنیا کے بعد — نکمّا نہیں۔ کام کا ہو گیا
فقط ایک دل آنکی دیر تھی ق — درِ صد بلیات وا ہو گیا
وہ دل جو کبھی خرم و شاد تھا — غمِ عشق میں مبتلا ہو گیا
وہ گھر جو کبھی عشرت آباد تھا — جہانِ ہجومِ بلا ہو گیا

وہ ذکرِ مسرت جو مرغوب تھا — مبدل بہ آہ و بکا ہو گیا
وہ سامانِ عشرت جو محبوب تھا — الم آفریں۔ صدمہ زا ہو گیا
وہ پاسِ وفا جسکا سودا نہ تھا — دلِ زار کا مدعا ہو گیا
وہ شکرِ جفا۔ جو گوارا نہ تھا — فرائض سے بھی کچھ سوا ہو گیا
وہ سر جو کہیں جا کے جھکتا نہ تھا — یہانتک جھکا جبہ سا ہو گیا
وہ جوشِ طبیعت جو رکتا نہ تھا — رُکا اور رُک کر فنا ہو گیا
وہ لطفِ مقدر کہ مبندل تھا — فقط قصۂ مامضے ہو گیا
وہ عیشِ دمادم کہ معمول تھا — فقط عالمِ خواب سا ہو گیا
ستم تھی ستم شوق کی ابتدا — غضب ہے غضب کیا سے کیا ہو گیا

تم آزاد! کس خوابِ غفلت میں ہو
زمانے کا رُخ دوسرا ہو گیا

آزاد انصاری

عالی حوصلگی

اس سمت بھی نظر ڈال۔ اُس سمت بھی نظر ڈال — ہر چیز سے اثر لے۔ ہر چیز پر اثر ڈال
بیکاریوں سے رغبت یکلخت ترک کر ڈال — طاقت نہیں مگر اُٹھ۔ عادت نہیں مگر ڈال
اظہارِ عزم و ہمت کر اور بے دھڑک کر — بنیادِ اوجِ عزت ڈال اور بے خطر ڈال
ہر خطرہ کو مٹا کر خوف و خطر مٹا چھوڑ — ہر روک کو ہٹا کر میدان صاف کر ڈال
ذرات کی چمک پر کب تک مٹا رہیگا — اُٹھ اور اُٹھ کے اکدم ہاتھ آفتاب پر ڈال
آزاد! گو جفائیں پامال کر کے چھوڑیں — لیکن فضائے عالم شورِ وفا سے بھر ڈال

آزاد انصاری

جذباتِ ہمایوں

دُنیا مقام رہنے کے قابل تو ہے مگر
بیگانہ ہو نہ اپنا - عدو ہو نہ یار ہو

گُل ہو نہ برگِ خُشک ہو بُلبل ہو اَور نہ زاغ
غم کی خزاں نہ ہو نہ خوشی کی بہار ہو

جوہر نہ ہو نہ عرض - نہ کُل ہو نہ جزوِ کُل
کون و مکاں نہ ہو نہ یہ لیل و نہار ہو

حد ہو نہ جسم کی - نہ کوئی روح کی ہو قید
مجبُور ہو نہ کوئی - نہ با اختیار ہو

آزاد بندِ شوق سے آلائشوں سے پاک
بندہ بھی پھر تو بندۂ پروردگار ہو

ہُو کا ہو عالم اَور نہ کچھ ہو سوائے نور
اَور تیر بن کے وہ مرے سینے کے پار ہو

روشن ہو نُور سینے میں اِک شمع کی طرح
قربان اس پہ دل مرا پروانہ وار ہو

یکساں ہیں اہلِ دل کے لئے انبساط و غم
باغِ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو

ہے رہ نمائے خلق عمل جسکے نیک ہوں
کافر ہو وہ عقیدے میں یا دیندار ہو

ہمایوں (مرحوم)

قلبِ مضطرب

اللہ اللہ! یہ دلِ بیتاب بھی کیا چیز ہے
ضبط کا خوگر بھی ہے فریاد کا دیوانہ بھی

مجمرِ سوزِ محبت، رونقِ بزمِ جمال
شمع بھی ہے اور شمعِ حُسن کا پروانہ بھی

محشرستانِ تمنّا، بے نیازِ آرزو
کعبۂ اُمید بھی ہے یاس کا بُت خانہ بھی

مثلِ مینا ہے کبھی گریاں کبھی خاموش ہے
اور خنداں ہے کبھی یہ صُورتِ پیمانہ بھی

انبساط اندوز ہے گاہے کبھی غم کوش ہے
محفلِ عشرت بھی ہے یہ اور ماتم خانہ بھی

آرزوئیں سینکڑوں ہیں اور پھر کچھ بھی نہیں
کیا تماشا ہے کہ ہے آباد بھی، ویرانہ بھی

حُبِّ دُنیا ہے کبھی اس میں کبھی فکرِ مآل
کعبے کا کعبہ بھی ہے بُتخانے کا بُتخانہ بھی

ناشناسِ رازِ ہستی، محرمِ رازِ حیات
غافل و دیوانہ بھی ہے عاقل و فرزانہ بھی

منزلِ اسرارِ مخفی، موردِ انوارِ قُدس
انجمن کی انجمن ہے اور خلوت خانہ بھی

ہے کبھی لاہوت میں پرّاں کبھی ناسوت میں
جلوہ گاہ عشق بھی ہے حُسن کا کاشانہ بھی

مجتمع ہیں حق و باطل اس میں مثلِ آئینہ
مطلعِ انوار بھی ہے اور ظُلمت خانہ بھی

باہمہ ہے شان اسکی، بے ہمہ اِس کی صفت
آشنا کا آشنا بیگانے کا بیگانہ بھی

الغرض سب کچھ ہے یہ اے رازؔ اور کچھ بھی نہیں
اک انوکھی چیز ہے میرا دلِ دیوانہ بھی

رازؔ چاندپوری

خوش کیونکر رہیئے؟

خوش رہنے کی تمنا سے اپنے جی کو بھر لو اور تم خوش رہو گے۔ ہر شئے کوشش سے حاصل ہوتی ہے خوش رہنے کی کوشش کرو اور تم خوش رہو گے! خوشی کی طرف خوش خوش جاؤ تو تم دیکھو گے کہ وہ اک لاڈلے بچے کی طرح تمہاری طرف ہنستی ہوئی دوڑی چلی آئے گی۔ خوشی تمہاری جانب کیونکر آئے جب تمہارا منہ پہلے سے باسی دال یا پھٹے ہوئے بوٹے کی طرح پژمردہ ہے؛ خوشی وہ دلبر ہے کہ اپنے عاشق پر سو جان سے نثار ہے لیکن کوئی عاشق ہو بھی کوئی جی سے چاہے تو وہ آگے قدم بڑھائے چہرے پر اُسے دیکھ کر تبسم ہو تو وہ تکلم کا دم بھرے۔

صرف یہی ضرورت نہیں کہ تم تشویش سے بچے رہو۔ اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ تم خوشی کی تلاش کرو۔ انسانی زندگی اک پہاڑ کی مانند ہے۔ سعی و ایمان صبر و انہماک تخیل و محبت وہ راہیں ہیں جو ہمیں اس کی چوٹی پر لے جاتی ہیں وہاں خوشی کی دیوی کا مندر ہے جس کا کلس آسمان سے جا ملتا ہے۔ تم گھاٹیوں سے بھٹک کر جنگلوں میں سرگرداں ہو۔ آؤ اور ان راہوں پر چلو جن کی طرف فطرت تمہاری رہبری کرتی ہے!

ان میں سب سے سیدھی راہ راہِ ایمان ہے۔ یقین کئے رہو کہ خدا موجود ہے وہ قوت جو ہم سے بالاتر ہے وہ ہستی جس کے اندر جس کے ساتھ اور جس کے لئے ہم زندہ ہیں اور وہ جو ہمارے اندر ہمارے ساتھ اور ہمارے لئے زندہ ہے جو ہماری طرف آتی ہے اور ہمیں بُلاتی ہے کہ آؤ ہم تم ایک ہی ہیں۔ وہ جو کائنات میں ہے وہ جس میں کائنات ہے وہ جو نظارے میں خوبصورتی ستارے میں عظمت اور انسان کے دل میں نیکی بن کر چھپی ہے اور وہ جو چھپ چھپ کر بھی ظاہر ہوئی جاتی ہے! غور کرو کہ وہ خدا جس کے بل پر پہاڑ قائم ہیں آبشار گرتے ہیں سیارے گردش کرتے ہیں وہ تمہاری زندگی کو بھی کسی خیال کے مطابق چلا رہا ہے وہ جو زمین کو لاکھوں سیاروں کی ٹکر سے روکے ہوئے ہے تمہاری رُوح کو بھی کبھی فنا نہ ہونے دیگا۔ جس کے کروڑوں انتظامات جاری ہیں اُس کے سلسلے میں تم بھی منسلک ہو۔ تمہاری زندگی کا وہ ہمیشہ کے لئے بیمہ کر چکا ہے تو تم کیوں ڈرو اور دُنیا کے غم و تشویش کے آگے اپنا سر کیوں جھکاؤ؟ اُس پر یقین رکھو۔ وہ جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے اور خوب کرتا ہے۔ اُس نے تمہیں اس دُنیا میں چھوڑا ہے۔ یہاں کی آفتیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہیں یہاں

محدود کیا ہے لیکن ان حدود میں تم آزاد ہو۔ نتیجے اُس کے ہاتھ ہیں لیکن ذریعے تمہارے ہیں۔ آخرش بُرائی میں بھی تمہارے لئے اچھائی اور تباہی میں بھی تمہاری فلاح و بہبودی ہے۔ پھر فکر کاہے کا اور غم کیسا؟ جب تک تم اپنا فرض انجام دیتے ہو دل و دماغ سے سوچتے سمجھتے ہو ہاتھ پاؤں سے کام کرتے ہو جب تک تمہاری نیت نیک ہے اور تم مصروف کار تب تک فکر کاہے کا اور غم کیسا؟ تم اپنا کام کئے جاؤ خدا تمہارا انجام نیک کریگا۔ نماز پڑھو اور دُعا مانگو۔ سچی نماز اور پُرخلوص دُعا کے اثر کو وہی جانتے پہچانتے ہیں جو صبحوں کے تڑکے اور راتوں کے سناٹے میں اپنے پروردگار کے آگے سر جھکاتے اور ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ اے سب قوتوں سے بالاتر ہماری نقاہت کو طاقت کا راستہ دکھا اور ہمیں نیکی کی توفیق دے۔

ہاں اور کبھی تم نے غور کیا ہے کہ دُنیا کی کائنات میں کیا حقیقت ہے آفتاب اُس سے ساڑھے بارہ لاکھ گُنا بڑا ہے اور ہزاروں ستارے آفتاب سے اسی نسبت سے بڑے ہیں۔ کائنات کتنی طویل و عریض ہے۔ روشنی ۱۸۶,۰۰۰ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہے اور سورج سے جو ہم سے نو کروڑ میل پر واقع ہے صرف آٹھ نو منٹ میں ہم تک پہنچ جاتی ہے لیکن صدہا تارے ہیں جن کی روشنی ابھی تک ہماری زمین پر نہیں پہنچی تو مادی کائنات میں بھی کیا کچھ ہے جو ابھی ہمارے وہم و گمان میں نہیں۔ سوچو کہ دیگر اجسام سماوی کے مقابل میں زمین کی کیا حیثیت ہے! پھر اس زمین پر تم کس گنتی میں ہو۔ اگر تم انگلستان کے وزیراعظم بھی بن جاؤ تو دو چار برس کے بعد تمہارے اپنے بھائی بند تمہیں نہ پوچھیں اور قدرت تو اپنے اک ننھے سے زلزلے میں تمہیں دائمی نیند کا مزا چکھا دے۔ اس بے بضاعتی اور ہیچ میرزی پر غرور کیسا اور اپنی حالت پر فکر و تشویش کس لئے؟ جب تک دم میں دم ہے خوش رہو۔ وہ جو لاانتہا دُنیاؤں کو سنبھالے ہُوئے ہے وہی تمہاری خوشی کا ذمہ دار وہی تمہاری تکلیفوں کے دُور کرنے والا ہے۔ اس عظیم الشان عالم میں اپنی ذرا ذرا سی مصیبتوں کو بڑا نہ سمجھو۔ جو تم سے بن آئے کرو اور باقی ماندہ کی فکر نہ کرو۔ کتنے ننھے کیڑوں کو تم روز پاؤں تلے کچل دیتے ہو اگر تم کسی بڑی ہستی کے نیچے پس گئے تو کیا ہُوا تمہارے سر پر پہاڑ آ پڑے اور چیخنے چلانے سے باز نہ رہ سکو تب بھی جی میں جان لو کہ خدا کی یہی مرضی ہے لیکن یہ دن گذر جائیں گے اور جو اُسے منظور ہے آخر وہی ہوگا اور اچھا ہی ہوگا۔ غم کرنا اُسے بجا ہے جو غافل ہے کاہل ہے یا جان بوجھ کر کام سے جی چُراتا ہے۔ وہ بدنصیب کیوں کڑھے جو اپنی سی بہت کوشش کرے مگر نتیجہ خاطرخواہ نہ ہو۔ نہ اُسے اپنے خلاف شکایت کا حق ہے نہ دوسرے کو اُس کے خلاف گلہ ہو سکتا ہے پھر وہ کس لئے اپنے جی کو ناحق دُکھ دے پھر کوئی کیوں اُس کی

نیت پر حرف رکھے؟ غرض تمام رنج و محن تمام دُکھ درد ہیں یہ اپنے پیشِ نظر رکھو کہ دُنیا کی تکلیفیں انسان کے گناہوں کی سزائیں ہیں اور اُس کی ترقی کا ذریعہ اور ان کا خوشی سے برداشت کرنا خوشنودیٔ پروردگار کا طریقہ اور اپنے اطمینان و مسرت کا باعث ہے۔ یہ سمجھے رہو کہ جب تک دُنیا میں رہنا ہے تب تک کچھ نہ کچھ دُکھ بھی سہنا ہے۔ کوئی مُصیبت اتنی بڑی نہیں اس قابل نہیں کہ انسان اپنی قیمتی ہستی کو اُس کی نذر کر دے۔ یہ کہتے رہو کہ میری جان دُکھ سہا کرے میرا دل تو خوشی کے لئے بنا ہے! یہ کہو اور خوش رہو کہ تم خدا کی وسیع دُنیا میں زندہ ہو!

جہاں تک ہو سکے نیکی کرو۔ جہانتک ممکن ہو بُرائی سے اجتناب کرو۔ نیکی خوشی کا سرچشمہ اور بُرائی رنج و غم کا ٹھکانہ ہے۔ نیک دل کتنا بدنصیب بھی کیوں نہ ہو اُس کا دل آخر خوشی کا آشیانہ بن کے رہتا ہے خودغرض نفس پرست کتنا خوش قسمت کیوں نہ ہو آخر اُس کا دماغ تشویش ناک خیالات کی آماجگاہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات آج تک کسی فلسفی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ نیکی سے کیوں خوشی ہوتی ہے صرف یہ نہیں کہ لوگوں کی تعریف نیک شخص کو خوش رکھتی ہے ہزاروں نیکیاں ایسی ہیں کہ دُنیا نے کبھی اُن کی داد نہ دی پھر بھی اُن کے کرنے والے اپنے دل میں جنت کی خوشیاں لئے ہُوئے یہاں سے سدھارے۔ شاید بات یہ ہے کہ نیکی میں اُس کا جلوہ ہے جو یُوں نگاہوں سے مستور رہتا ہے تو جب ہم نیکی کرتے ہیں جب نیکی سے ہمارا دل لبریز ہوتا ہے فی الحقیقت ہمارا دل خدا کا گھر بن جاتا ہے اور جس کے گھر میں اُس گھر کے بنانے والا اُس کے آراستہ پیراستہ کرنیوالا آ جائے وہ کیونکر خوش و خرم نہ ہو وہ کس طرح زندگی کی اونچ نیچ اور زمانے کے دُکھ درد کو بھُول نہ جائے! — کسی کا دِل نہ دُکھاؤ کسی کا حق نہ مارو کسی سے نفرت نہ کرو، غرور کو سر سے نکالو حسد کو جی میں جگہ نہ دو، ایسا نہ ہو کہ حرص کا کیڑا تمہارے جسم و جان کو لگ جائے ایسا نہ ہو کہ خودغرضی نفع کی صورت دکھا کر اُلٹا تمہارا نقصان کرے۔ نفسانی خواہشات کو دبائے رکھو غصّے کو ہنس کر ٹال دو خوف سامنے آئے تو بے خوف ہو کر اُس پر حملہ کرو۔ پھر ہر میدانِ جنگ میں فتح تمہارے ہی ہاتھ ہے +

علالت کے دنوں میں تکلیف کی ساعت میں مُصیبت کے وقت صبر و حوصلہ سے کام لو اور دیکھو تکلیف برداشت کئے سے کتنی جلد رفع ہو جاتی ہے۔ جی سے کہو کہ آخر یہ کچھ ایسا خوفناک درد نہیں آخر یہ کچھ ایسی بھاری مصیبت نہیں، تم حیران ہو جاؤ گے کہ اس پر گو یاد رہی ہمدرد اور مُصیبت ہی تمہاری مُونس بن جائیگی۔ خدائے کارساز کا تو ازل سے ابد تک یہی کہنا ہے کہ مانگ کیا مانگتا ہے، مگر کوئی مانگے بھی کوئی ہاتھ پھیلائے تو سطے کوئی نعرہ زن ہو تو جواب بھی پائے۔ جسمانی تکلیف کی تو خصوصیت

ہے کہ کہا دہ کم ہورہی ہے دُور ہورہی ہے اور واقعی کم ہونی شروع ہوگئی اِس کے بعد دل کی کیفیت کے بدل جانے کا کون قائل نہ ہوگا۔ جسے شبہ ہو کرکے دیکھ لے۔ صابر اور بے صبر شخص میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے وہ دُکھتی ہو تو بیوی تک کو زیادہ پتہ نہیں چلتا اور یہ ذرا بے آرام ہوں تو پڑوسی بھی نعوذ باللہ کہہ اُٹھیں۔ جب تمہیں کوئی مشکل آپڑے، جب تم کسی درد میں مبتلا ہو تو اپنے سے کسی زیادہ حوصلہ مند کی صحبت تلاش کرو اور جب تنہا ہو تو ایسے لوگوں کو یاد کرو جنہوں نے مصیبت کی گھڑیوں میں دُنیا میں شاندار کام کئے خود فنا ہوگئے کہ دوسرے زندہ رہیں یا مُصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اُسے پچھاڑا ایک جست میں کہیں کے کہیں نکل گئے کہ ترقی بھی شاباش و مرحبا کہتی دوڑی۔ وہ آگ میں گرے، مسِ خام تھے کندن بنکر نکلے۔ غربت سے امارت پائی گمنامی سے نیکنامی حاصل کی کس طرح ؟ اُن کے دل میں ہمت کی دولت اور کوشش کا خزانہ تھا جس کام پر ہاتھ ڈالا ہوگیا جس بات سے واسطہ پڑا انجوبی نبھ گئی ایسے ہی حوصلہ مندوں نے دُنیا کو جو کبھی درندوں کی بستی تھی آج انسانوں کی جنت بنا دیا ہے!

یاد رکھو کوئی غم کوئی مصیبت کوئی تکلیف تباہ کر دینے والی نہیں۔ بُرے وقت میں ایسا خیال کرنا مشکل ضرور ہے لیکن یاد کرو کہ کتنی بار عمر میں تم دقت میں پڑے اور بعد میں تمہارا خوف چھوٹا ثابت ہوا، ایک وقت تھا کہ گذر گیا حادثہ تھا واقعہ تھا کہ ہوگیا اور بس۔ وقت کسی شئے کو چین سے نہیں رہنے دیتا اگر خوشی آنی جانی ہے تو غم بھی فانی ہے۔ زمانے کی چکی سب کو پیسے جاتی ہے اور سوائے حقیقتِ خداوندی کے بقا کسی کو نہیں۔ غم نے تم کو تنگ کیا تو غم کی بھی خیر نہیں۔ تمہاری زندگی کے سمندر میں یہ ذرا ذرا سی موجیں ہیں اِن سے ڈرنا نہ چاہیئے آتی ہیں چھو چھو کے چلی جاتی ہیں۔

آڑے وقتوں میں اپنے دل کو سمجھاؤ کہ اس کرب و اندوہ سے پہلے مجھے کتنی نعمتیں حاصل تھیں اب بھی کتنی اور مسرتیں میری باندی بنی بیٹھی ہیں یہ ملال و غم کب تک رہیگا" زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائیں گے دن"۔ مذہبی لوگ کہتے ہیں خدایا تیرا شکر کہ تُو نے ہمیں دیکھنے کو آنکھیں سننے کو کان چکھنے کو زبان اور کام کاج کو ہاتھ پاؤں دیئے۔ متمدن دہریئے اور تعلیمیافتہ عقلمند اس پر مسکراتے ہیں کہ لوگ کیسی عام چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کارلائل کہتا ہے کہ یہی ہمارا بڑا نقص ہے کہ ہم قدرت کی عام چیزوں کو معمولی سمجھنے لگتے ہیں کوئی بات ہمیں تعجب میں نہیں ڈالتی۔ پینے کے لئے صاف و شفاف تازہ پانی سانس لینے کو ہلکی پھلکی تازہ ہوا، دیکھنے کو سبزہ زار پھولوں کی جھاڑیاں درختوں کے جھنڈ یہ کیسی کیسی

دل آویز چیزیں ہیں مشکل یہ ہے کہ یہ بغیر کسی مشکل کے آسانی سے بافراط ہمیں ملتی ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ ہم جبتک توجہ نہ کریں ان کی پوری طرح قدر نہیں کر سکتے۔ ورنہ سچ پوچھو تو زندگی کی ایک ایک بظاہر معمولی سی چیز فی الحقیقت ہزاروں غیر معمولی عجائبات سے زیادہ پُرلطف وسودمند ہے لیکن انسان کی حیوانی عجوبہ پسند فطرت اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی +

گذشتہ کی یاد اور آئندہ کی فکر سینکڑوں کو پریشان حال رکھتی ہے اور حاصل دونوں سے بجز "حسرتِ حاصل" کچھ بھی نہیں + تم زندہ ہو اور زندگی سے لطف اُٹھانا چاہتے ہو تو حال میں زندہ رہو گذشتہ کو یاد نہ کرو اور آئندہ کے لئے مطلق تشویش نہ کرو + بہت لوگ پُرانے پیارے وقتوں کو ہی یاد کیا کرتے ہیں "آہ کیا اچھے تھے وہ دن کتنی بے فکری تھی کس قدر آرام تھا لوگوں کے مزاج اچھے تھے معیشت کی فکر نہ تھی زندگی کا نام خوشی تھا" اور یونہی زمانہ حال کے آرام ہیچ نظر آتے ہیں اور اچھائی میں بھی بُرائی کا پہلو دکھائی دیتا ہے + اکثروں کو آج شام کل صبح یا اگلی بہار کا فکر لاحق رہتا ہے "ہائے کیا ہونے والا ہے فلاں شخص مجھے کیا کہے گا فلاں کام خدا معلوم ہو گا کہ نہیں۔ عزت کا معاملہ ہے کیا جانے دُنیا میں میں کتنا رسوا ہو جاؤں گا۔ یہ کام جو میں کر رہا ہوں اس کا اچھا انجام ہوتا نظر نہیں آتا" اور اسی طرح حال کے اطمینان میں بے اطمینانی کے طوفان برپا ہوتے رہتے ہیں اور بڑی سے بڑی خوشی سے لطف اندوز ہونے کی مہلت نہیں ملتی + کمزور اعصاب والے اور کم حوصلہ شخص تو خاص طور پر اس مرض کا شکار بنے رہتے ہیں اُن کے دل میں طرح طرح کے وسوسے انجراتِ فاسدہ کی مانند اُٹھتے رہتے ہیں لیکن آج کل عام طور پر بھی دُنیا فکرِ مستقبل میں گرفتار نظر آتی ہے جس کا بڑا سبب مصنوعات ولذات پرستی اور اعلیٰ معیارِ زندگی ہے + آنے والے زمانے سے اچھی اُمیدیں وابستہ رکھو۔ سمجھو کہ خدا تمہارا کام اچھا کریگا۔ تمہاری محنت پھل لائیگی، دو دن خزاں ہے تو بہار کے دن بھی آیا ہی چاہتے ہیں + جس وقت جو کام کرو اُس وقت میں اور اُس کام میں ہمہ تن منہمک رہو۔ تم تمہارا کام تمہارا وقت یہ تینوں زندگی کے لئے بس ہیں گذرے ہوئے کل کے جھگڑے آنے والے کل کے مخمصے تم ان سے فی الحال بے تعلق ہو۔ جو ہوا سو ہو گیا اب زندگی پر اُس کی حکومت کیوں رہے؟ اور جو ہو گا زندگی خود اُس پر کیوں حکومت نہ کرے + جو شخص محض حال میں مصروف ہے اُسکی تمام قوتیں اُس کی معاون بنی رہتی ہیں جو گذشتہ وآئندہ کے جال میں پھنسا ہے اُس کی بہت سی طاقتیں قید سے رہائی پانے میں مصروف ہیں اُس کی توجہ تمام تر موجودہ کام کاج کی طرف مبذول نہیں ہو سکتی

اگر کل کا بھوت تمہارے دماغ پر سوار رہے گا تو آج تمہارا دل تمہارے کام سے اُچاٹ رہے گا۔ کل کی فکر کل کی مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ آج کے کام کو ناتمام چھوڑ کر وہ کل کے کاموں اور فکروں میں اضافہ کر دیتی ہے اور یونہی یہ بار گراں بڑھتا جاتا ہے اور انسانِ ناہنجار کے دل و دماغ فضول کاموں اور غیر ضروری فکروں کے شکنجے میں ڈبے چلے جاتے ہیں۔ وہ جو صرف حال میں منہمک ہے اگر مفلس بھی ہے تو اُسے صحیح مصروفیت کی دولت نصیب ہے وہ جو گذرے ہوئے اور آنے والے میں مبتلا ہے اگر مالدار بھی ہے تو تشویش و فکر کے قزاق اُس کا مال متاع اڑائے لئے جاتے ہیں۔ اُس کی ملکیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کی جائداد میں کمی کہ دنیا میں سب سے بڑی جائداد دل کا اطمینان ہے یا زندگی کی خوشی!

دُنیا کی ہر چیز میں منہمک ہونا زندگی کی ہر بات سے لُطف اُٹھانا اور ان میں خوش رہنا سیکھو۔ صبح سویرے تم اُٹھو تو سوتے رہنے اور سو چکنے کے خیال سے لُطف حاصل کرو۔ بستر میں پڑے ہوئے بھی اس پڑے رہنے میں خوش رہو۔ مُنہ دھوؤ مسواک کرو کپڑے بدلو تو دیکھو کہ جسم ان باتوں سے کتنا خوش ہے۔ ٹہلنے جاؤ تو اعضا کی چستی تم کو اک نئی مسرت کا پتہ دے گی۔ بھوک لگنے پر کھانا کھاؤ تو ایک ایک لقمے سے حظ لو۔ نوالے کو چباؤ دیکھو معمولی یا روغنی روٹی یا دال یا پلاؤ جو تمہارے نصیب میں ہے ان سب میں کیسا خوش کن ذائقہ چھپا ہوا ہے جو تم پر ظاہر ہو رہا ہے۔ غسل میں مالش میں کھانے پینے میں چلنے پھرنے میں کرسی پر بیٹھنے میں چارپائی پر لیٹنے میں کتاب پڑھنے میں خط لکھنے میں کسی عزیز سے باتیں کرنے میں کوئی عمدہ تقریر سننے میں ان سب باتوں میں کتنی خوشیاں ہیں جن سے اک سمجھدار شخص صبح سے شام تک لطف حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کی عام مسرتوں سے اپنے جی کے خزانے کو بھر لو اور آڑے وقت پر اس سے مدد لیتے رہو۔ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو تمہاری زندگی روز بروز خوش تر و خوش نصیب ہوتی جائے گی۔ کسی شے سے لطف حاصل کر سکنے کا راز صرف یہ ہے کہ اُس وقت میں کسی اَور شے کا خیال بھی تمہارے ذہن میں نہ ہو۔ کھانا کھاتے ہو تو دُنیا کی اَور سبھی چیزیں بھول جاؤ کھانا کھانے میں اس قدر منہمک ہو جاؤ کھانے کو اس درجہ خوش ذائقہ اور اک ایسی نعمت سمجھ بیٹھو کہ اس وقت اس کے مقابل میں لاکھوں روپے کے خیال سے بھی تمہارے مُنہ میں پانی نہ بھر آئے۔ کسی دوست سے باتیں کرتے وقت ظلم ہے کہ تمہارا دل کسی اَور فکر میں پھنسا ہُوا ہو۔ اک نظارہ دیکھتے وقت مقام شرم ہے کہ تم کسی عالیشان مکان یا گھر کے بکھیڑوں کی سوچ میں غرق ہو۔ کسی شے کی حقیقت ہمیں تبھی سمجھ میں آتی ہے کسی شے سے تبھی پوری خوشی حاصل ہوتی ہے جب ہم اس میں ہمہ تن منہمک ہو جائیں۔ جب ہم اَور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے تئیں اُسکے

سپرد کردیں گے تو وہ بھی اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ صرف ہماری ہوجائیگی۔ ہر شے یہاں تک کہ روٹی کے اک نوالے میں بھی اتنی خودداری ہے کہ جب تک ہم اُس کی طرف توجہ نہ کریں گے وہ بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے گا ہم اُسے نگل جائیں گے تو وہ بھی یونہی نگلا جائیگا۔ ہمیں اُس کی پروا نہیں تو اُسے ہماری کیا پروا؟

کام کرو لیکن کام کے بعد آرام بھی اک ضروری کام ہے جس کے بغیر کوئی کام اچھی طرح سرانجام نہیں ہوسکتا۔ یورپ والوں کی ترقی کا اک بڑا سبب اُن کی تفریحات ہیں سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرنیکے بعد وہ فوراً اپنے کلبوں، باغوں، سیرگاہوں یا ناٹک گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کوئی موٹر گاڑی میں سیر کو نکلا کوئی ریل میں سوار ہوکر پاس کی ندی کے قریب جا اُترا کوئی سحر تصاویر دیکھنے کو گیا کوئی ٹینس کھیلنے کوئی دوستوں سے ملنے کوئی بازار کی سیر کرنے ہی چل نکلا۔ دماغ جو دن بھر کے کام سے تھک چکا تھا تھوڑی دیر میں تازہ دم ہوگیا، دل جو روزانہ فرائض سے اُکتا گیا تھا پھر بشاش ہوگیا یعنی کولھو کا بیل ذرا سے دلاسے پر پھر کولھو کا بیل بننے کو تیار ہوگیا اور پہلے سے بھی زیادہ مستعدی دکھانے لگا۔ یہ درست ہے کہ یورپ کی بعض تفریحات عیش و عشرت کے بدترین نمونے ہیں لیکن سبھی لوگ ان میں منہمک نہیں اور اگر اُن کی چند عام رسومات ہمارے نزدیک نفسانیت اور لغویت کا درجہ رکھتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی باتوں کے ساتھ ہم اُن کی بُری باتیں بھی ضرور سیکھیں۔ خُذ ما صَفَا وَعِ ما کَدَر (اچھی شے لے لے بُری کو چھوڑ دے)۔ ہماری غم پسندی اور توہم پسندی ہماری صحت کی خرابی اور ہمارے دماغ کی نقاہت کا ایک ذریعہ یقینی طور پر یہی ہے کہ ہم دن بھر کے کام کے بعد زندگی کے فکر و محن کے ساتھ کوئی شغل نہیں رکھتے کسی غیر نقصان دہ تفریح میں حصہ نہیں لیتے۔ ہمارے دلوں میں اک نہایت لغو خیال پیدا ہوگیا ہے کہ شغل اک چوچلا ہے تفریح تضیع اوقات ہے جس کا نتیجہ ہے کہ ہم یا عمر بھر گدھے کی طرح متین بنے رہتے ہیں یا روز و شب مور کی طرح ناچتے پھرتے ہیں۔ یا ہم میں افراط ہے یا تفریط۔ موسیقی ہمارے ہاں بھانڈوں کا شغل سمجھا جاتا ہے ناٹک ہمارے ہاں اوباشوں کا مشغلہ خیال کیا جاتا ہے عورتوں سے زیادہ باتیں کرنا مردوں کے لئے خلافِ شان ہے بال بچوں پر رُعب لازم ہے بڑوں کے سامنے بولنا بے ادبی ہے زور سے قہقہہ مارنا مجلسی قانون کا توڑنا ہے پھر ہم کریں تو کیا کریں ہنسیں کیسے۔ مسکرائیں کیونکر دل کس طرح بہلے؟ جی کیونکر زندگی سے اُچاٹ نہ ہوجائے؟ موجودہ مہذب آدمی کا جُوا کھیلنا شراب پینا ناچ کرنا اُس کی عورتوں سے دل لگی مذہب سے بیزاری زر پرستی جاہ طلبی بے شک انتہا درجہ انسانیت سوز اور شیطنت آموز ہیں لیکن خدا کی دُنیا کو دن رات دھوکے کی ٹٹی کہتے رہنا اکثر قبرستانوں کی زیارت کرتے

رہنا بات بات پر آہیں بھرنا ذرا سے غم پر آنسو بھر لانا اپنے آپ کو سب سے بڑا بدنصیب سمجھنا کیا یہ خدا پرستی ہے؟ کیا جنت میں جانے کی یہی راہ ہے؟ کیا یہ اپنے پروردگار سے بغاوت نہیں؟ کیا یہ اُس کی دی ہُوئی چیزوں کو رد کرنا اور اُس کے فرمودہ حکموں کی خلاف ورزی نہیں؟ یقیناً اس سے بڑھ کر کوئی جہالت نہیں بلاشبہ اس سے زیادہ کوئی حماقت نہیں!

اپنے بال بچوّں میں کھیل کھیلو اپنے دوستوں سے ہنسی خوشی باتیں کرو کوئی اچھی متحرک تصویر دیکھو، کوئی علم آموز ناٹک دیکھو کبھی کبھی تاش یا شطرنج یا پچیسی کھیلو باجہ یا ستار یا مُرلی بجاؤ اور کوئی پیارا سا گیت گاؤ دوستوں کے ساتھ سیر کو نکلو کسی خوش طبع سے لطیفے سُنو، کبھی مداری کے ہتھکنڈے دیکھو کبھی چڑیا گھر یا عجائب گھر کے طلسمات ملاحظہ کرو۔ کبھی کبھی اپنی متانت کو اپنے رُتبے کو اپنے رُعب کو بھول جاؤ۔ دُنیا کو اپنے ساتھ شکنجے میں نہ دبائے رکھو۔ کبھی نہ کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑو اور دیکھو کہ دل کا پھُول کیسے مہکتا ہے؟

تفریح تکمیل کار ہے شغل کے بغیر دُنیا اک قید خانہ ہے۔ کارلائل شیکسپیئر کو اک ولی سے بھی برتر سمجھتا تھا محض اس لئے کہ اُس کے نزدیک شیکسپیئر میں ولی کی عقلمندی کے علاوہ انسانی ظرافت بھی تھی۔ تفریح ہمیں دُنیا کے بہت سے فکر و تشویش بھلا دیتی ہے وہ زندگی کے کل میں تیل دیتی ہے جس سے کل پھر چلنے اور کام کرنے کے قابل ہو جاتی ہے +

اپنی طبیعت میں باتوں کو بھول جانے کی صلاحیت پیدا کرو کہ اس سے دل پر سے بہت سا بوجھ ہلکا ہو جائیگا اور تم زیادہ خوش رہو گے + کلامُ اللیل یمحوہُ النہار (رات کی باتیں دن مٹا دیتا ہے) اگر انسان بھی گذرے ہُوئے سے اس طرح بغل گیر نہ ہو تو ہوتی ہُوئی باتیں اُسے اس طرح پریشان نہ کریں + کل کی شکر رنجی بہتوں کے آج کو تُرش رُو کر دیتی ہے جس سے دل کی گھُنڈی کھُلنے نہیں پاتی + آنے والی مصیبتوں سے ڈرتے رہنا گئی گذری تکلیفوں کو یاد کرتے رہنا انسان کو خوش و خرم نہیں ہونے دیتا + کل تم کسی سے چیں بجبیں تھے پرسوں تمہارے سر میں درد تھا اترسوں اک بھونچال آیا تھا ان سب چیزوں کا ذکر کر کے اپنے آپ کو اور دُنیا بھر کو زندگی سے بیزار نہ کرتے رہو + مانا کہ دس برس تم نے صعوبتیں اُٹھائیں۔ تمہارا ایک پیارا سا بچہ بھی جاں بحق ہُوا، ممکن ہے آئندہ سال تمہاری پونجی کم ہو جائے تمہارا کوئی دشمن تم پر فتح پالے لیکن اِس گردشِ افکار سے حاصل؟ اس چکّی پیسنے سے مطلب؟ صرف بے سود تفکر بے فائدہ تردد! جو ہُوا سو ہُوا۔ جو ہو گیا سو ہو چکا جو ہوگا ہو جائیگا تو دیکھا جائیگا۔ برائے خدا اپنے آج کو گذرے ہُوئے اور آنے والے کل

کی کلفتوں سے بچاؤ۔ وہ زندہ ہے اور یہ یا مردہ ہیں یا ناپید۔ تو زندگی کو زندہ درگور نہ کرو کہ نیم مُردہ ہستی مُردوں سے بدرجہا زیادہ بدنصیب ہوتی ہے + باتوں کو بھلا دو، واقعات کو فراموش کر دو۔ بھُلانا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ذرا کر دیکھو!

کبھی کبھی اپنے مقررہ کام کو چھوڑ کر کوئی اور کام کرو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو ایک ہی کام کے مختلف اجزا کو باری باری کیا کرو۔ کام کی تبدیلی کام کی کلفت کو ہلکا کر دیتی ہے اور دماغ کو تازگی بخشتی ہے گویا دماغ کے مختلف خانے ہیں کبھی کسی کو بند کر دو کبھی کسی کو کھول لو تو اس سے سب کی طاقتیں برقرار رہیں گی + طالب علم ریاضی کو چھوڑ کر جغرافیہ پڑھنے لگے نثر کو چھوڑ کر نظم کا مطالعہ کرے۔ تھیٹر کا ایکٹر ناٹک چھوڑ کر بازاروں میں گھومے اور دوکان دار منڈی چھوڑ کر ناٹک جا دیکھے۔ جج گھوڑے کی سواری کرے اور ضلعدار کسی مشاعرے میں جا بیٹھے۔ کسان لاہور جا کر انار کلی و ٹھنڈی سڑک کی سیر کرے اور بنیا شالامار باغ کے پرے باغبانپورہ کے کھیتوں میں گاجر مولی کھائے۔ مصنف کبھی کبھی مسخروں کی محفل میں وقت ضائع کرے اور بھانڈ گویئے کسی ریش دار مولانا کا وعظ سُنیں + آٹھوں پہر ہنستے رہنا بھی مسرت کا باعث نہیں۔ ہر رات تماشہ دیکھتے رہنا کچھ لُطف آور نہیں۔ کسی شے کی زیادتی اچھی نہیں۔ یہاں تک کہ ہر وقت خوشیوں کا مجنوں بنے رہنا بھی فی الحقیقت خوشی کا باعث نہیں ہوتا۔ ادل بدل کر کام کرو پھر تم دیکھو گے کہ تم کتنے مختلف کاموں کے قابل ہو۔ انسان عموماً اپنے مقررہ کام کو چھوڑ کر دوسرا کام نہیں کر سکتا نہ اِس کی فرصت ملتی ہے نہ موقع۔ موجودہ دُنیا کے تقسیمِ کار اور ذاتوں کے نظام نے عام طور پر جُدا جُدا کام لوگوں کے سپرد کر دیئے ہیں اس کے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کام کے بعد تفریح اسی لئے ضروری ہے کہ یہ تبدیلی دل و دماغ کے لئے مفرح ثابت ہوتی ہے + تم جب کبھی زندگی سے اُکتا جاؤ تو کوشش کرو کہ زیادہ یا تھوڑے عرصے کے لئے اپنی طرزِ زندگی کو بالکل بدل دو۔ تم دیکھو گے کہ اس سے دُنیا کا اک قطعی نیا منظر تمہارے سامنے جلوہ پیرا ہو جائیگا اور زندگی تمہارے لئے زیادہ دلچسپ ہو جائے گی + بلاشبہ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل کر سکتا ہے + باقاعدگی اور تنظیم انسان کے لئے ازبس ضروری اور سودمند ہیں لیکن کبھی کبھی زندگی کی شاہراہ سے الگ ہو کر آس پاس کی پگڈنڈیوں پر سیر کے لئے نکل جانا مراحلِ حیات کے طے کرنے کے لئے لابدی ہے +

قدرت کی خوبصورتیوں اور نوعِ انسان کی صنعتوں سے حظّ اُٹھانا سیکھو!

قدرتی مناظر کا حُسن کس قدر مسرت خیز ہے! کسی سرسبز و شاداب پہاڑ کی گھاٹیوں میں سبزۂ آویزاں کے درمیان جا بجا ننھّے ننھّے جھرنے ہیں۔ کہیں عمودی چٹانوں میں ایک بڑے آبشار کے شفاف پانیوں کا زور شور دُنیا بھر کے جھگڑوں جھمیلوں کو غرقِ آب کر رہا ہے۔ کہیں برف سے ڈھکی ہُوئی چوٹیوں پر آفتاب کی آخری کرنوں کا زرّیں سہرا ہے سونا نچھاور ہو رہا ہے یا اک آگ سی لگی ہے جس سے دل کو پناہ نہیں ملتی کہیں دامنِ کوہ کے مرغزاروں میں پہاڑی چڑیوں کے چہچہوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ پیرس کے ناچ گھروں کے راگ رنگ سامنے سرنگوں ہوں کشمیر کی وادیوں میں دائیں بائیں پہاڑیوں کے سلسلے کے بیچوں بیچ اک ندی رنگ رنگ کے سنگریزوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہُوئی چلی جاتی ہے بیدِ مجنوں کے درخت کناروں پر اپنی شاخوں کے ساتھ جھکے پڑتے ہیں اور اُن کی ننھی ننھی پتیاں مور دلنج کی کشتیاں بن کر ندی کے ساتھ ساتھ بہے جاتی ہیں۔ آس پاس کے پہاڑوں کی عظمت ندی کے پانی کی روانی اس کی میٹھی میٹھی شورش اُودی اُودی بدلیوں کی پھوار، جنگلی پھول پتّوں کی مہک طیورِ رنگیں ادا کی چہک ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ۔۔۔ همین است و همین است و همین است

کراچی کے ساحل پر بحیرۂ عرب کی موجوں کے تھپیڑے رُودبارِ انگلستان میں طوفانی سمندر کی فلک پیمائیاں سوئیٹزرلینڈ میں جھیلوں کے کنارے انگور کی کھیتیاں برفانی دریاؤں کی براق صفت پاکیزگی کوہستانی نظاروں کی گوناگونی اور بوقلمونی! بدقسمت ہیں وہ جن کو ان رنگینیوں کی خوشیاں جن کو ان حسن آفرینیوں کی جنت نمائیاں دیکھنی نصیب نہیں۔ مگر یاد رہے کہ قدرت صرف امیروں کے طبقے کے لئے مخصوص نہیں ایک زبردست مصنف نے کہا ہے کہ "تم دُنیا بھر میں خوبصورتی کا تماشا کرنے کو گردش کرتے رہو، لیکن جب تک تم خوبصورتی کو اپنے ہمراہ دل میں نہ لئے جاؤ گے کسی شے کو خوبصورت نہ پاؤ گے۔ ایک اور جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ خوبصورتی کہاں نہیں ہے حسن ہر سمت جلوہ گر ہے بکھرا پڑا ہے کوئی دیکھنے والا ہو تو نظر آئے کوئی گلچیں ہو تو بہ گل ملے۔ کسی دیہاتی خطۂ مُلک میں کسی معمولی گاؤں کے قرب و جوار میں دیکھئے تو بے نظیر نظارے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ صبح گیہوں یا دھان کے کھیتوں میں سُورج کا نکلنا رات کو لق و دق میدانوں میں چاند کا کھیت کرنا دوپہر کو دیہاتی چراگاہوں کا منظر اندھیری رات کو ننھے تاروں کی جھلملاہٹ یہ جنتِ نگاہ کس کے نصیب میں نہیں لیکن کوئی چشمِ مسرت بھی وا کرے کوئی ربِّ دو جہاں کی ان نعمتوں کے لئے ہاتھ بھی تو پھیلائے! کسی کا قول ہے کہ اگر ستارے دس ہزار برس میں

صرف ایک رات نکلتے تو لوگ صدیوں تک اُن کی متبرک یاد میں خدا کا شکریہ ادا کرتے اور کبھی نہ بھولتے اُس ہوش رُبا حسین منظر کو جس نے اُن کی رُوحوں میں ایک شیریں سی لرزش پیدا کر دی۔ اب حقیقت یہ ہے کہ یہ حسین شمعیں ہر رات ہمارے سر پر جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور ہم ہفتے میں ایک بار بھی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے + پھر کہو کون زیادہ بے نیاز ہے خدا یا انسان۔ خدا اپنے خوشنما ہدئے ہر وقت ہر جگہ لئے کھڑا ہے لیکن انسان شکریہ تو کجا التفات بھی نہیں کرتا، خوش نصیب ہیں وہ انسان جو مناظرِ قدرت سے خوشہ چینی کرتے ہیں اور قدرت کی شادمانیوں میں اُس کی بے ساختہ خوشی کے حصّہ دار ہیں! ملک ملک کی سیر کو نکلو باغ باغ میں گلگشت کرو میدانوں میں دوڑو پہاڑوں پر چڑھ جاؤ۔ نُور کے تڑکے بیدار ہو کر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھو رات کے سناٹے میں اُٹھ کر ضیاءِ ماہتاب کی ٹھنڈک کا لُطف اُٹھاؤ۔ سبزے کی بہار دیکھو پرندوں کا گانا سنو ہوا کے جھونکوں میں جھومو رنگین پھولوں کو چُوسو اور کہو کہ کتنی پیاری ہے یہ زندگی!

پھر دیکھو خدا نے انسان کو بنایا اور انسان نے بھی اُس کی قدرت کو کیا سجایا! بے آب و گیاہ صحراؤں میں ریل چلائی بے پایاں سمندر میں جہاز تیرائے۔ شہر بسائے اُن میں فراخ سڑکیں پُر رونق چمن نفیس روشیں بنائیں کیڑوں سے ریشمی کپڑا دھاتوں سے سونے چاندی کے زیور درختوں سے چوب کاریاں مٹی روڑوں سے پکی عمارتیں پھولوں سے عطر سمندر سے موتی پہاڑوں سے ہیرے اور معمولی چیزوں سے دخانی اور برقی قوت حاصل کی + نقاشوں نے کیسی کیسی تصویریں بنائی ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ واٹس کی "اُمید" گرز کا "ٹوٹا ہُوا برتن" "یا دُودھ بیچنے والی" "ڈانتی کا خواب" "کھوئی ہُوئی فریب کاریاں" نپولین کی تصویر جہاں وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہے ژان دارک کا سراپا جہاں وہ آگ کے شعلوں میں جل رہی ہے اگر تم متمدن انسان ہو تو ان کو دیکھ کر اپنی زندگی کی دلچسپی کو بڑھاؤ اور اپنے دل و دماغ کی دُنیا کو وسعت دو + کبھی کبھی موسیقی کی دل نوازیوں سے محظوظ ہوتے رہو کہ انسان کی صنعتوں میں صحیح موسیقی سے بڑھ کر کوئی شے حقیقت آشنا نہیں۔ انسان ساز بجانے یا گیت گانے میں محو ہو جاتا ہے اور بے غرض محویت زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے پاکیزہ خوشی ہے + اپنے بچّوں کو گانا سکھاؤ اور خود ساز بجاؤ۔ تیسرے چوتھے اپنے دوستوں کے ساتھ گانے بجانے کی ایک پاکیزہ محفل قائم کرو + موسیقی کے ذریعے سے اخلاق کی تربیت بطریقِ احسن ہو سکتی ہے۔ ارسطو نے موسیقی کو اپنے نظامِ تعلیم میں خاص جگہ دی ہے اور لکھا ہے کہ موسیقی رُوحانی ترقی کا ایک عمدہ ذریعہ ہے جس کا صحیح استعمال نوجوانوں کے لئے ازبس سود مند ہے۔

کتابوں کی دُنیا میں اس کے لئے جو چاہے کتنی خوشیاں منتظر ہیں۔ مذہبی اور روحانی کتابوں کا

نوکیا کتنا کران کی ہدایات زندگی کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ اور بھی بیشمار تصنیفات
سے کم درجہ نہیں رکھتیں۔ سنسکرت میں رامائن و مہا بھارت عربی میں
میں تلسی داس و کبیر کی نظمیں۔ بنگالی میں ٹیگور کی گیتان جلی۔
نظیری کی غزلیات فرانسیسی میں وکٹر ہیوگو اور ڈیوما کے
تصنیفیں۔ اطالوی میں دانتے کی "جہنم" انگریزی
ہیروز و رشپ" ایمرسن کی خلوت و جلوت، او
غالب کی غزلیات، اقبال کی نظمیں
ہیں۔ تاریخ کی معجز بیانیاں
جغرافیہ کی سمت نمائیاں
مسرور مشغولیت
دُنیا کی حسید
خوشی پنہاں۔
سر
کی شان
خواب
کار
کا

۔بنا رکھا ہے۔

ر زندگی کی سبھی مشکلیں اک محبت و ایثار سے حل ہوتی ہیں۔ اگر تم دُنیا کے عام

آغوش میں عمر بسر کرنا چاہتے ہو تو محبت کے قدم پکڑ لو۔ محبت کو اپنے

بُرے اچھے کے لئے سچی محبت پیدا کرو۔ پھر دیکھو کہ تمہاری

ارے لئے راست ہو جاتی ہے!

کی عادت ڈالو باہمی ہمدردی سے زندگی کی پیپو

دں کے دُکھ میں ہاتھ بٹاؤ گے اوروں کو صبر

تمہارے حق میں ہوگی۔ دُکھی لوگوں کی

ل لوگوں کی صحبت تلاش کرو

دُنیا فانی ہے خوشیاں ہیچ

باس پسند ہو جائیگا اور

آتی ہی ہیں لیکن خدا

بس تو تم دیکھو گے

سکنے کی قابلیت

و انسان اپنے

نے کے

دں کی

رمزے

ہے تو

نچی

لف

نے سے

*

اپنی زندگی کا کوئی نصب العین بناؤ۔ ارادہ کرو کہ تم کوئی نہ کوئی مفید کام کرو گے۔ ارادہ کرو کہ تم آج ہی سے اپنے خیالات میں اک تبدیلی اپنے اعمال میں اک انقلاب پیدا کرنا شروع کرو گے۔ اپنے روزانہ تقسیم اوقات کے علاوہ مستقبل پر نظر رکھو کہ آنے والے زمانے میں تمہیں اس دُنیا میں کچھ کام کرنے ہیں کسی نوجوان کو ترقی کے میدان میں بڑھانا ہے کسی غمزدہ عزیز کے لئے کوئی شغل پیدا کرنا ہے خود کوئی عزت کوئی مرتبہ حاصل کرنا ہے بعض لوگوں کو رُوحانی تعلیم دینی بعض کی اخلاقی اصلاح کرنی ہے۔ روز بروز اپنے آپ کو جسمانی و روحانی دماغی و عقلی حیثیت سے بہتر بنانا تمہارا منتہائے نظر ہو۔ دیکھو کہ تمہاری صحت کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے دماغ کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے دل کا اطمینان کیونکر بڑھ سکتا ہے رُوح کی مسرت میں کیسے اضافہ ہو سکتا ہے روز بروز وہ کام کئے جاؤ جو تمہیں کارزارِ حیات میں ہمیشہ آگے کو بڑھائے جائیں، تمہارا قدم آگے کو پڑے پیچھے کو نہ جائے۔ اپنے محلے میں ایک کتب خانہ اپنے گاؤں میں اک شفاخانہ اپنے شہر میں کسی قسم کی ادبی یا معاشرتی یا سیاسی انجمن قائم کرو جس سے نوعِ انسان کے جسمانی اور عقلی ارتقا اور لوگوں کی مسرتوں میں اضافہ ہو۔ اک انجمن زندہ دلاں بناؤ جس کے رُکن اپنے اور دوسروں کے غم غلط کرنے کا بیڑا اُٹھائیں جس کا اثر گھروں کی چار دیواری میں محسوس ہو جس کے باعث روزمرہ کے قضیئے زیادہ آسانی سے طے ہونے لگیں۔ کسی اچھے اخبار یا رسالے کی اشاعت کسی اچھی رسم کی ترویج کسی اچھے آدمی کی حوصلہ افزائی کرو۔ کسی مظلوم کو بچاؤ انسان کو جانوروں پر ستم نہ ڈھانے دو مار پیٹ کی عادت کے خلاف ہدایت کرو۔ پھر دیکھو تمہارے دل میں کیسے خوشبو کی ہوائیں چلتی ہیں کیونکر اطمینان کی ننھی ننھی بوندیں پڑتی ہیں! تمہارا ضمیر تمہارے دل سے صلح کرلیگا، تمہارے باہر اور اندر تسلی کی حکومت کا دَور دَورہ ہو جائیگا۔

"خوش کیونکر رہیئے؟"

زندگی خوشی ہے زندگی خوشی کے لئے ہے۔ خوش رہنے کی کوشش کرو اور تم خوش رہو گے۔ خوش رہنے پر اصرار کرو خوشی کو بُلاؤ اور جب وہ آئے اُسے اپنے دل میں جگہ دو۔ خوشی اک نعمتِ خداوندی ہے لیکن وہ اک اِنسانی صنعت بھی ہے وہ خود بھی آتی ہے اور بُلائی بھی جاسکتی ہے۔ وہ خدا کے ہاتھوں ملتی ہے لیکن لی جاتی ہے انسانی ہاتھوں سے۔ خوشی کے لئے بعض اوقات سعی لازم ہے لیکن بعض وقت اپنے تئیں چھوڑ دو اور قدرت کو اپنے نفس میں اپنا کام کرنے دو۔ خوشی کے پھول کبھی خود تیار کئے جاتے ہیں کبھی آپ سے آپ اُن کی بارش ہوتی ہے۔ اگر تم خود خوشی کو حاصل نہیں کرسکتے تو

کم ازکم یہ تو کرو کہ خوشی کو اپنے پاس آنے سے نہ روکو۔ رستہ کھلا چھوڑ دو کہ وہ موقع پاکر کبھی نہ کبھی خود ہی تم تک آپہنچے گی۔ اپنے غموں کو نیکیوں کی مدد سے دُور کرو اپنی تکلیفوں کو صبر و ہمت سے کم کرو دُنیا کے بکھیڑوں کو اپنی عقل و سعی سے سلجھاؤ۔ زندگی کے جھمیلوں کو قسم قسم کی تفریحوں سے منتشر کردو۔ اور اگر تم اپنے دُکھ درد کو کم نہیں کر سکتے تو کم سے کم یہی ہو کہ اُن کے بہت سے شغلوں اور بہت سی خوشیوں کو اپنے جی میں گھُلا ملا دو کہ مرکب میٹھا نہ سہی کھٹمٹھا سا ہو جائے۔ دُنیا جنت نہ سہی جہنم بھی نہ رہے زندگی شہد نہیں لیکن زہر بھی تو نہ ہو*

جب تم فکرمند ہو جب کوئی مُصیبت آ دھمکے تو سمجھو کہ جس طرح پہلی مصیبتیں گذر گئیں یہ بھی گذر جائے گی جیسے دُنیا میں پہلے بہار تھی اب بھی آرہے گی ۔؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آج سے اس خوشنما خیال سے اپنے دل کو معمور کرلو کہ میں خوش رہوں گا میں کسی کا بُرا نہ چاہونگا جہاں تک ہو سکے میں ہر ایک کا بھلا کروں گا۔ جہاں تک ہو سکے میں ہر شے اور ہر شخص کی سیرت کا اچھا پہلو دیکھوں گا۔ جو کچھ کہوں گا خوشی سے جو کچھ سُنوں گا خوشی سے اور جو کچھ کروں گا خوشی سے اور اچھی طرح! گذرے زمانے کو یاد نہ کروں گا آئندہ کا فکر نہ کرونگا حال میں منہمک رہوں گا اور خدا کا شکر کروں گا۔ اپنی زندگی کو خوش سمجھوں گا اور خوش بنانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اور جب کبھی میری زندگی میں بے معنی فکر و تشویش کا دورہ ہوگا میں فوراً اپنے آپ کو کسی مفید کام میں مشغول کروں گا اور خوش رہوں گا خواہ وہ کام ذرا سا ہی کیوں نہ ہو خواہ وہ یہی ہو کہ اپنے بھائیوں سے کہا کروں کہ بھئی خوش رہو اور سب کو خوش رکھو اور اک مضمون لکھ دُوں کہ خوش کیونکر رہیئے؟

ب ث جمیر

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر   کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما   گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

(مولانائے روم)

ہمایوں ۔۔۔۔۔

۱ :

بہار ہے، نگار ہے
فضائے کوہسار ہے
نسیمِ خوشگوار ہے
پلائے جا پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

۲ :

ستارے ہیں یہ سُو بسُو — چھلک رہے ہیں یا سبو
رواں ہے چاندنی کی جُو — ہر ایک شے ہے مشکبُو
یہ بزمِ حسن ہُو بہُو — ہے اِک طلسمِ رنگ و بُو
پلائے جا پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

یہ محفلیں یہ
پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

غزل

توڑ کر دم زندگی کی کلفتیں کم کیجئے — آج اِس شیرازۂ حسرت کو برہم کیجئے
سُننے بیٹھے ہیں وہ میرا ماجرائے دردِ دل — ہائے کن لفظوں میں ذکرِ قصۂ غم کیجئے
زندگی سے لطف اُٹھانا کچھ اگر منظور ہو — سوزِ اُلفت اور سازِ دل کو باہم کیجئے
قلب کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لئے — جس قدر ممکن ہو صرفِ سوزشِ غم کیجئے
مجھ پہ مرنے کا بجا الزام لیکن آپ بھی — اِک ذرا اندازۂ صدمات پیہم کیجئے

صادق ایوبی

۔مارچ ۱۹۲۶ء

بانے ضیائے بنگالہ" کا خاص
ب ہدایات دے رہا تھا۔ کہ
"لما" چلو دارجلنگ چلیں"
یک ساتھ بیٹھتے اور اکٹھے کام کیا

ں۔ لیکن اس وقت ہم دونوں کی زندگیوں نے
ں یہی کوشش تھی کہ مغربی طور وطریق کو اختیار کرلے
ں ربان پر فریفتہ تھا۔ ستیش میرے بنگالی کتابیں پڑھتے رہنے
یں بھی اس کی انگریزوں کی نقالی پر اکثر چوٹیں کیا کرتا تھا۔ آخر ستیش
ں سے بیرسٹر ہو کر لوٹا۔ تو اس نے تمام انگریزی رسم ورواج کو کلیتہً اختیار کرلیا تھا
ہ ہماری وہ حالت نہ تھی جیسی کہ بچپن میں کہ اس وقت گویا ایک جان اور دو قالب تھے۔ کیونکہ ستیش
و بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اور اگرچہ ہم اب بھی بہت اچھے دوست تھے لیکن اب وہ مجھ سے اپنی راز کی سب
باتیں نہیں کہہ دیا کرتا تھا۔ اس وقت جو وہ میرے پاس آیا تو آتے ہی اس نے کہا کہ چلو دارجلنگ چلیں۔
میں نے پوچھا۔ "تم کب جاؤ گے"
"آج"
"خوب! وقت کہاں ہے؟"
ستیش نے گھڑی نکالی۔ اور سگرٹ کو دانتوں میں داب کر بولا کر
"ابھی تو دس بجے ہیں۔ گاڑی چار بجے چھوٹتی ہے۔ چھ گھنٹے ۲۰ منٹ۔ وقت کی کوئی حد ہے"
"میں نے جواب دیا حضرت آپ تو خیر سے صاحب بہادر بن گئے ہیں۔ کیا میں ایک کالا آدمی آپ کی

برق رفتاری کا ساتھ دے سکتا ہوں، وقت پر نہاؤں گا۔ اور پھر کھانا کھاؤں گا۔ اتنے میں ۱۲ بج جائینگے اور پھر کچھ آرام بھی کرنا ضروری ہے"

"مرد آدمی! میں تمہاری ایک نہ سنوں گا"

"اگر تمہیں دارجلنگ جانا ہی تھا۔ تو دو روز قبل ہی کیوں نہ کہدیا؟"

"آج ہی تو مجھے ڈاکٹر سین کا دعوتی رقعہ ملا ہے"

میں نے تعجب خیز لہجہ میں سوال کیا" ہائیں! کیا ڈاکٹر سین اپنے عیال کے ساتھ دارجلنگ میں ہیں؟ اور ان کی لڑکی بھی؟

"یقیناً" وہ ہلکا سا مُسکرا دیا۔

یہ ایک کھلا ہُوا راز تھا کہ ڈاکٹر سین کی تعلیمیافتہ لڑکی "نرملا" نے میرے دوست کو اپنا فریفتہ کرلیا ہے میں نے کہا۔

"انوہ۔ ہمیں چار بجے تک ٹھیرنا ہوگا۔ کیا اس سے پہلے چلنے والی کوئی اور گاڑی نہیں؟

ستیش" نے ایک ایکٹر کی طرح شرماتے ہُوئے کہا "نہیں"۔

اگرچہ مجھے کبھی کسی عورت سے محبت نہیں ہُوئی۔ لیکن پھر بھی میں واردات محبت سے ایک بڑی حد تک واقف ضرور ہوں۔ ایک دن کی تعویق کی تجویز بھی ستیش کے لئے ایسی ہی تھی جیسا کہ شیر کو گھاس کھانے کا وعظ کیا جائے۔ اس لئے میں بھی چلنے کو تیار ہوگیا۔ چنانچہ بسرعت تمام اپنا اسباب جمع کرکے ہم چار بجے کی گاڑی سے روانہ ہو گئے۔

ــــــــ :: ۲ :: ــــــــ

گاڑی جب دارجلنگ ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر آہستہ چلنے لگی تو میری نظر ڈاکٹر سین پر پڑی جو اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ایک بنگالی خاتون کا انگریزی بوٹ اور جرابوں کے ساتھ کھلے بندوں عام پلیٹ فارم پر کھڑے ہونا ایک ایسا نظارہ تھا جس سے میرے زخم ہرے ہو گئے۔ میں نے بہت سی برہمو خواتین کو دیکھا تھا۔ چنانچہ اب بھی دو ایک سے واقف ہوں اس لئے یہ فیشن میرے لئے بالکل نیا نہ تھا۔ تاہم ان خواتین کی ملاقات جن میں سے ایک ستیش کی ساس اور دوسری اسکی بی بی بننے والی تھی۔ میرے لئے ایک نیا تازیانہ ثابت ہُوئی۔ میں تعلیم نسواں کا بہت بڑا حامی ہوں۔

مگر آزادیِ مطلق ایک ایسی چیز ہے جس کا میں گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی ابھی ایک مضمون میں نے اسی موضوع پر اپنے رسالہ میں شائع کیا ہے۔ اور اس وقت بھی اس نظارہ سے متاثر ہو کر اپنے دماغ ہی میں ایک مضمون ترتیب دے رہا تھا۔ اور کچھ تیز و تند الفاظ اپنے سر میں جمع کر رہا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ سب خیالات رخصت ہوئے۔

گاڑی سے اترتے ہی ستیش نے مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ چونکہ آجتک مجھے کبھی اس قسم کی خواتین سے تعارف کی عزت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کیا کرنا چاہیئے یہی وجہ تھی کہ میری زبان سے ایک بھی لفظ نہ نکل سکا۔ اور میں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر محض ایک بے وقوف کی طرح جھاڑیوں کے پاس کھڑا رہا۔

اسی وقت "نرملا" میرے پاس آ کر بولی "من متھا بابو" میں آپ کا رسالہ باقاعدہ پڑھتی ہوں" اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کچھ اور بھی کہیگی مگر نہیں۔ ہاں "نرملا" کی ماں بولی "من متھا بابو آپ کے رسالے ضیائے بنگالہ کا پوجا نمبر کب تک شائع ہوگا"۔

میں نے کہا "پوجا نمبر تو تقریباً شائع ہو چکا ہے"

مسز سین نے نرملا کی طرف دیکھ کر دریافت کیا۔

"کیا تمہیں رسالہ مل گیا ہے"

"ابھی تک تو نہیں ملا"

"میں نے عذر خواہی کے طور پر کہا۔ ہاں ابھی آپ کو رسالہ کیونکر پہنچ سکتا تھا۔ کل ہی تو شائع ہوا ہم سب پرچے ایک ہی دن ڈاک میں نہیں ڈال سکتے۔ نرملا نے کہا۔ ہاں میرا رسالہ پہلے ڈھاکہ جاتا ہے اور پھر وہاں سے یہاں بھیجا جاتا ہے۔ من متھ بابو۔ کیا آپ کے پاس کوئی کاپی ہے"

میری روحِ ادارت "ضیائے بنگالہ" میں نرملا کی اس قدر دلچسپی سے مسرور ہو گئی۔ اور میں نے جلدی سے جواب دیا۔ ہاں ہاں۔ میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ ایک رسالہ میں صبح آپ کی خدمت میں بھجوا دونگا"

"کچھ زیادہ تکلیف کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے کسی وقت بھیجدیئے"

مسز سین نے کہا "من متھ بابو اگر آپ کل سہ پہر ہمارے ساتھ چائے پئیں تو ہمیں بہت ہی

خوشی ہوگی"

اس کے بعد حسب دستور وہ لوگ اپنی دلکش اور شیریں آواز میں خدا حافظ کہتے ہُوئے جدا ہو گئے ہیں اس امر پر غور کرتا ہُوا۔ کہ یہ تعلیم ہی کا اثر ہے کہ اب ایک بنگالی خاتون۔ اس طرح بغیر کسی قسم کی گھبراہٹ کے ایک اجنبی کے ساتھ گفتگو کرسکتی ہے۔ سنو ٹوریم کی طرف چلا گیا۔ رات کے وقت جب میں تھک کر لیٹا۔ تو میں نے بہت سے معاشرتی امور پر غور کیا۔ کہ ان مغربی اطوار و رسوم کا کیا انجام ہوگا جو مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم لوگ اختیار کرتے چلے جارہے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان باتوں پر غور کرتا ہُوا کہیں سے کہیں نکل جاؤں۔ نیند نے مجھ پر غلبہ پالیا ◆

ـــــ :: ۳ :: ـــــ

صبح کے وقت چائے پیتے ہُوئے۔ میں نے یوم گذشتہ کے پیش آمدہ واقعات پر غور کیا۔ چونکہ میں مرد عورت کے اس آزادانہ میل ملاپ کو معاشرتی نقطۂ نگاہ سے بہت خطرناک سمجھتا ہوں اس لئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ ڈاکٹر سین کے ہاں چائے پینے کے لئے نہیں جاؤنگا۔ بھلا میں اپنے عقاید کے خلاف کس طرح کوئی کام کرسکتا ہوں؟ میں رسالہ "ضیائے بنگالہ" کسی ملازم کے ہاتھ بھیجدوں گا۔ یا "ستیش" ہی آتا ہوگا۔ اسی کے ہاتھ بھیجدوں گا۔ مگر "ستیش" بھی عجب آدمی تھا کہ آج آیا ہی نہیں۔ میں نے خیال کرلیا کہ بھلا وہ "نرملا" کو چھوڑ کر کیسے یہاں آسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے آپس کے برتاؤ کی دل ہی دل میں تصویریں بنانی شروع کیں۔ اور اس خیال میں مجھے بہت دلکشی محسوس ہُوئی ◆

جب میں صبح کے کھانے سے فارغ ہوچکا۔ تو معاً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بہت نازیبا بات ہے کہ چائے پر نہ جاؤں۔ چونکہ میں نے دعوت کو قبول کرلیا تھا۔ اس لئے اخلاقاً میں جانے پر مجبور تھا اور اگر یہ بات میرے عقیدہ کے خلاف تھی۔ تو وقت پر ہی انکار کردینا چاہیئے تھا۔ خیر آج تو مجھے ضرور جانا چاہیئے۔ البتہ آئندہ اس قسم کی دعوتیں قبول کرنے میں محتاط رہوں گا۔ بہرحال دوپہر کے بعد میں وہاں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اور پھر میں نے اپنے سنگھار کے سامان سے پورا کام لیا۔ اور دل میں کہا کہ اگر یہ مجمع صرف مردوں کا ہوتا۔ تو اتنے بناؤ چناؤ کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یہ عورتوں کی مجلس ہے۔ اور یہاں نسبتاً زیادہ اپنی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے ◆

مجھے اکثر دارجلنگ میں آنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اسی لئے یہاں کے راستوں سے میں خوب

واقف تھا۔ چنانچہ میں ڈاکٹر سین کے مکان پر چار بجے سے دس منٹ قبل پہنچ گیا۔ دعوت کا صحیح وقت چار بجے تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ تو انگریزی راہ و رسم برتے ہوئے ہیں۔ اگر میں مقررہ وقت سے کچھ بھی پہلے مکان میں داخل ہوگیا۔ تو یہ لوگ ضرور مجھے وحشی خیال کرینگے۔ اس لئے میں تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اور پورے چار بجے میں نے اپنا کارڈ اندر بھیجدیا +

سب نے میرا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور نرملا تو آج غیر معمولی طور پر حسین معلوم ہوتی تھی۔ جب میں نے اسے سٹیشن پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ انگریزی ٹوپی اور بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کا یہ لباس مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اور اب وہ سرخ مخمل کا ہندوستانی جوتا پہنے ہوئے تھی۔ اور نارنجی رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ جس میں گل سیوطی ٹکا ہوا تھا۔ درحقیقت آج تو نرملا کا حسن آنکھوں میں بیٹھا چلا جاتا تھا +

پہلے پہل تو ستیش مجھے نظر نہ آیا۔ اور میں نے دل میں ٹھان لیا۔ کہ وہ ذرا الگ ملے تو اس کی قابل پرستش دیوی کے لالہ[1] رنگ پاؤں کے متعلق کچھ دل لگی کے فقرے کہوں۔ لیکن وہ جلد ہی اندر آگیا۔ جب چائے پی جا چکی۔ اور کچھ وقت اِدھر اُدھر باتوں میں بھی گذر گیا۔ تو ہم سب کے سب سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ واپسی پر جب میں نے رخصت چاہی۔ تو مسز سین نے کہا کہ "من متھ بابو" اگر آپ کل بھی چائے پر تشریف لائیں۔ تو پھر بھی ہم سب مل کر سیر کو چلیں گے۔ مجھے خیال آیا کہ اب وقت ہے کہ میں دعوت قبول کرنے سے انکار کر دوں۔ کیا مجھے اپنی عدم قبولیت کی صحیح وجہ بتا دینی چاہیئے! کیا مجھے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیئے؟ کہ میرے خیالات معاشرت کے متعلق کیا ہیں تا کہ وہ بھی اس حقیقت کو سمجھ لے۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ کیا یہ سب باتیں کیا صرف ایک دعوت ہی پر ختم ہو جائینگی۔ اگر تم آؤ بھی۔ تو یہ ایک دعوت سے زیادہ اور کیا کہا جائیگا۔

اس اندرونی کشمکش کے باعث میں کچھ بھی جواب نہ دے سکا۔ اور وہ لوگ اب مجھے رخصت ہوتے ہوئے خدا حافظ کہہ رہے تھے +

—— :: ۴ :: ——

دوسرے دن صبح کے دس بجے ستیش میرے پاس آیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ بھئی اسوقت

---

[1] آلی ہندو دیوی کے پاؤں سرخ رنگ کے ہوتے ہیں +

نرملا سے جدائی کس طرح گوارا کی۔ تو وہ بولا۔ کہ وہ تو تمہارے نکمّے پرچہ میں جو تم نے اسے دیا ہے اور جسے تم "آئینہ بنگال" یا "ضیائے بنگال" خدا جانے کیا کچھ کہا کرتے ہو۔ اس قدر محو ہے کہ میں تو تنگ آکر وہاں سے چلا آیا۔

میں دل میں بہت خوش ہُوا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا "نرملا" کو ادبیات سے اس قدر ذوق ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر نرملا خود کچھ لکھے تو میں مناسب اصلاح کے بعد اس کا مضمون ضرور "ضیائے بنگالہ" میں شائع کر دوں گا۔

ستیش نے اسکے متعلق اور بھی بہت کچھ بیان کیا۔ ان دو نوجوان طالب و مطلوب کی مسرتوں نے میرے دل میں بھی جوانی کی ترنگ تازہ کر دی۔ ستیش نے کہا میں تو اب چلتا ہوں۔ وہاں جا کر آپ لوگوں کے لئے کمروں کی دیکھ بھال کروں گا۔ اب ہماری ملاقات چائے کے وقت ہو گی۔ مجھے امید ہے تم بھی جلد ہی آؤ گے؟

"چائے کے وقت؟ نہیں۔ آج نہیں۔ اور مسز سین نے تو مجھے دعوت بھی نہیں دی"

"یقیناً انہوں نے تمہیں مدعو کیا ہے۔ اور انہیں دعوت دیتے میں نے خود سُنا ہے"

"وہ کس طرح؟ انہوں نے تو کہا تھا کہ "اگر تم آؤ"

"بے شک یہی تو دعوت ہے۔ کیا تم اسی کو دعوت سمجھتے ہو کہ کوئی شخص اپنی گردن پر کپڑا ڈال کر تمہارے دروازے پر آئے۔ جیسا کہ شاستر میں بیان کیا گیا ہے۔ تم بھی عجیب دقیانوسی خیال کے آدمی ہو"!

"بھئی بات یہ ہے کہ میں آج جانا نہیں چاہتا۔ کیا میرا نہ جانا بد اخلاقی پر محمول کیا جائیگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے آپ حضرات کے اس انگریزی رسم و رواج سے نہ پورا اتفاق ہے نہ مجھے یہ لغویات پسند ہیں۔

ستیش نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو انتہا درجہ کی ناشائستگی ہے"۔

اس وقت مجھے اپنے آپ ہی پر غصہ آیا۔ کیونکہ مجھے مسز سین سے اسی وقت کہدینا چاہیئے تھا۔ کہ "میں کل بوجہ عدیم الفرصت ہونے کے حاضر نہ ہو سکوں گا" بجائے اسکے اب میں خواہ مخواہ اس بات پر بحث کر رہا ہوں کہ مجھے یوں دعوت دی گئی اور اس طرح نہ دی گئی۔

ستیش نے ہنستے ہُوئے کہا "تمہیں اس قدر آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات تو اتنی ناشائستگی کی نہیں۔ اگر تم دوبارہ ملاقات میں عذر معذرت کر سکو تو یہ بات رفت گذشت ہو جائیگی۔ مگر بھلے آدمی آخر تم آج کیوں نہیں آؤ گے"؛

گو ستیش کو اس وقت صحیح وجہ بتلانے میں مجھے کوئی تامل نہ تھا۔ مگر میں نے کہا کہ "مجھے کچھ ضروری کام ہے"۔

"ضروری کام تو کل بھی کر لیا جائیگا۔ مگر آج تمہیں ضرور آنا چاہیئے" اور یہ کہہ کر وہ فوراً غائب ہو گیا۔

میں نے دل میں کہا "تم کچھ بھی کہو میں تو اب مطلق نہ جاؤں گا" لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ مجھے تنہائی محسوس ہوتی جا رہی تھی۔ نیز میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نرملا کا ضیائے بنگالہ کے اس نمبر کے متعلق کیا خیال ہے۔ خصوصاً میرے اس مضمون کے متعلق جس کا عنوان ہے "قابل تقلید عورت کی زندگی"

کیا یہ مضمون میں نے نرملا کے مذاق ہی کی عورتوں کے فائدے کے لئے نہیں لکھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس مضمون نے اس کے خیالات پر کیا اثر کیا۔ اب میرے جانے کا فیصلہ ہو گیا۔

جب میں وہاں پہنچا تو ڈرائنگ روم میں کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن جلد ہی نرملا آ گئی۔ اور مسکراتے ہوئے مجھے سلام کہہ کر بولی۔ "مجھے آپ کے آنے سے بہت ہی خوشی ہوئی ہے کیونکہ مجھے تو آپ کے آنے سے مایوسی ہو چکی تھی۔ ابا۔ اماں اور بیتش بابو ٹل کر باغ میں گئے ہیں بیتش بابو نے کہا تھا کہ آج آپ اس قدر مصروف ہیں کہ نہ آ سکیں گے۔ میں خیال کرتی ہوں کہ کچھ نئے مضامین لکھے جا رہے ہونگے"

"ہاں۔ نہیں۔ مجھے کچھ کام تھا"

"میں سمجھ گئی۔ کیا میں دریافت کر سکتی ہوں من متھ بابو آپ روزانہ کتنے گھنٹے "ضیائے بنگالہ" کو دیتے ہیں"

"تقریباً سارا وقت۔ میں تو پیدا ہی اس کے لئے ہوا ہوں"

"اس انہماک کے کیا کہنے میں بھی ادبیات کے لئے وقف ہونا چاہتی ہوں۔ خواہش ہے کہ رات دن اسی کام میں لگی رہوں۔ مگر کیا آپ کے سامنے یہ بات کہنا غلطی نہیں"

"یہ کیوں"

"کیونکہ آپ اپنے مضمون "قابل تقلید عورت کی حیات" میں جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں عورت کی دنیا صرف اس کا گھر ہے۔ خانگی امور میں اسے اتنی محویت ہونی چاہیئے کہ باقی ساری دنیا کو بھول جائے۔ بس آپکے نزدیک تو عورت کی پیدائش کا صحیح منشا یہی ہے"

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سارا مضمون پڑھ لیا ہے"

"پڑھ لیا ہے! یقیناً۔ میں نے تو سارا رسالہ ختم کر لیا ہے" گزشتہ رات تو پڑھتے پڑھتے مجھے نیند ہی آ گئی بیدار ہوئی تو دیکھا کہ موم بتی جلتے جلتے بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ اور اس کا شعلہ اس طرح لرز رہا تھا کہ میں پہلی نگاہ میں سخت خوف زدہ ہو گئی۔ شکر ہے کہ آگ نہیں لگی" اگر رسالہ پڑھتے پڑھتے میرے کمرے کے

پردوں کو آگ لگ جاتی اور میں بھی جل کر مر جاتی۔ تو اس حادثہ کا اعلان مختلف اخبارات میں آپ کے رسالہ "ضیائے بنگال" کے لئے ایک عجیب و غریب اشتہار ہوتا"

پہلے تو مجھے اس تقریر کا کوئی جواب نہ سوجھا۔ صرف ایک قسم کا کنایہ سا دماغ میں چکر لگا رہا تھا کہ شمع کی طرح جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ خاتون بھی نرم و نازک اور شعلہ رُو ہے۔ تاہم میں نے ایک بے معنی قہقہہ لگایا اور بالآخر کہا کہ "جب آپ کو بنگالی ادبیات سے اس قدر شغف ہے تو پھر آپ خود کیوں نہیں لکھتیں"

"اگر میں لکھوں بھی۔ تو پڑھیگا کون" اور پہلا سوال تو یہ ہے کہ اسے شائع کون کریگا"

مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ شاید نرملا مخفی طور پر کچھ ضرور لکھتی ہوگی۔ لیکن مجھے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی اب گفتگو کا رخ مختصر افسانوں کی طرف پھر گیا۔ میں نے کہا کہ ایک ایڈیٹر کے لئے ہر ماہ مختصر افسانے بہم پہنچانا بہت بے ڈھب سوال ہے کیونکہ اچھے افسانے ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔

نرملا نے کہا "میرے ایک دوست مختصر افسانے لکھا کرتے ہیں" چنانچہ اُن کا ایک افسانہ اب بھی میرے پاس ہے۔ کیا آپ بھی اسے دیکھیں گے"؟

میں گھبرایا کہ ناحق افسانے کا ذکر چھیڑ کر یہ دماغ سوزی مول لی۔ فرائض ادارت کے باعث مجھے اکثر مبتدیوں کے افسانے پڑھنے پڑتے ہیں۔ لیکن اب تو میں ایک مہینہ کی تعطیل منا کر پہاڑ پر آیا تھا۔ مگر یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ اس لئے میں نے کہا "میں اسے ضرور پڑھوں گا جو آپ پڑھنے کو دینگی"

"آپ اپنی صحیح صحیح رائے مجھے بتایئے"

"ضرور ضرور"

"چونکہ لکھنے والا میرا دوست ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی بھی لگی لپٹی نہ رہے"

اگر درحقیقت آپ صحیح رائے سُننے کے لئے تیار ہیں تو میں ضرور اپنے ناچیز خیالات پیش کر دونگا"

نرملا فوراً افسانہ لینے چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس نے نہایت خوبصورتی سے تیار کئے ہوئے قلمی مسودہ کا پلندہ جو فلسکیپ کاغذ پر لکھا ہوا تھا لاکر میرے ہاتھ میں دیا۔ ہر صفحہ کا نصف سادہ چھوڑا ہوا تھا۔ اور تمام کاغذ ایک کنارے پر ریشمی دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ پہلی ہی نظر دیکھ کر میں نے کہا "یہ ایک نو آموز لکھنے والا ہے"

"ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

نئے لکھنے والے ہمیشہ اپنے مسودہ تیار کرنے میں بہت سردردی اُٹھاتے ہیں۔ مشہور مصنفوں کا خط بالعموم اچھا نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر میں نے آخری صفحہ مصنف کا نام دیکھنے کے لئے پلٹا۔ کیونکہ ایڈیٹروں کا یہ بھی رسمی طریقہ ہے۔ مگر وہاں نام کی جگہ کچھ نہ تھا۔ میں نے ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ آخری صفحہ پر دوڑائی کہ دیکھوں عاشق ومعشوق نے اپنی زندگیوں کا خاتمہ زہر سے تو نہیں کیا۔ کیونکہ نئے مصنف اپنے ہیرو اور ہیروئن کو مشکل ہی سے زندہ رہنے دیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس فسانہ میں زندہ رہنے دیا گیا تھا۔ اب مجھے کچھ توقع ہوئی۔ ایک شک یہ بھی پیدا ہوا کہ نرملا ہی لکھنے والی نہ ہو۔ کیونکہ اکثر شرمیلے مزاج کے مصنف اپنی ابتدائی تحریروں کو دوستوں ہی کے نام سے پیش کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا "آج تو میں اس مضمون کو گھر لیجاتا ہوں۔ اور کل اس کے متعلق اپنی رائے آپ سے بیان کردونگا"

مجھے غالب گمان یہی تھا کہ یہ افسانہ نرملا ہی کا لکھا ہوا ہے۔ وہ الفاظ جن میں میں اپنی رائے ظاہر کیا کرتا ہوں مخصوص اور خشک ہیں، مجھے عموماً یہ کام کرنا پڑتا ہے اور اپنے دوستوں کے ادبی کارناموں پر رائے زنی کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ میری زندگی میں تقریباً روز کا مشغلہ ہے۔

"ضرب الامثال موجود ہیں۔ البتہ ان کو موقع ومحل پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض مقامات پر واقعی پڑھنے کے قابل ہے" "آپ مشق کرتے کرتے ضرور کامیاب لکھنے والے ہوجائینگے" وغیرہ ذالک یکے بعد دیگرے سب گھر کے لوگ اندر داخل ہو گئے۔ جب چاء پی جاچکی تو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر ان باتوں میں سیر کے متعلق کوئی تذکرہ نہ تھا۔

--- ۵ ---

گھر پہنچ کر میں نے افسانہ پڑھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں نے بہت غلطی کی تھی۔ یہ افسانہ کسی عورت کا کارنامہ نہ تھا۔ اس کی انشاء ایک مشاق مصنف کا پتہ بتاتی تھی۔ اندازِ بیان نہایت پرشوکت تھا۔ مگر بھنچا ہوا۔ پھر یہ لکھا ہوا بھی نرملا کا نہ تھا۔ لکھنے والے کا نام "گوری کانتا رائے" تھا۔ میں اب تک اس سے شناسا تو نہ تھا۔ مگر میں نے سُنا تھا کہ یہ شخص ڈھاکہ کی طرف رہتا تھا۔ میں نے اس کے مضامین بھی بہت سے پڑھے تھے۔ یہ شخص نئے لکھنے والوں میں بہترین لکھنے والا تھا۔ گو اس کے مضامین میں خامیاں بھی بہت ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا باعث غالباً تقاضائے سن قرار دیا جاسکتا تھا کہ رفتہ

رفتہ اس کی اصلاح خود بخود ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن اس افسانہ کے متعلق میں نے نرملا پر بہت اچھی رائے ظاہر کی البتہ ایک یا دو مقامات پر میں نے بعض غلطیاں بھی دکھائیں۔ لیکن تعریف کا پہلو غالب رہا چنانچہ میں نے کہا کہ "کیا لکھنے والا بالکل ہی نوجوان ہے"

"ہاں مجھ سے عمر میں کچھ ہی بڑا ہے"

"میرا خیال ہے کہ وہ آپ کا بہت بڑا دوست ہو گا؟"

"ایسا ہی ہے"

"میں تو اس کو پسند نہیں کرتا۔ بھلا یہ کیوں کر گوارا کیا جا سکتا ہے کہ ایک عورت اور مرد میں بڑی دوستی ہو"

میں نے دریافت کیا۔ کیا ہمیں گوری کانتا رائے کے ایک دو اور مضامین بھی مل سکتے ہیں"

"کیوں؟ کیا آپ کے نزدیک ان میں کوئی خاص دلکشی ہے"

"واقعی بات تو کچھ ایسی ہی ہے"

"بہتر میں تلاش کروں گی۔ مگر اس وقت نہیں"

"کیا آپ کے پاس اسکے بہت سے مضامین ہیں"

"ہاں بہت سے۔ جب کبھی وہ اپنا کوئی نیا فسانہ مکمل کر لیتا ہے تو مجھے پڑھنے کو بھیج دیتا ہے"

میں نے دل میں خیال کیا "اس بات میں تو مطلق شائبہ صداقت نہیں۔ کیا اتنے گہرے تعلقات شناسائی؟ بلند آواز سے میں نے کہا "تب تو آپ اس کے مضامین پڑھنے والوں میں درجہ اختصاص رکھتی ہیں"

"کم ازکم میں ان کی پہلی پڑھنے والی تو ضرور ہوں۔ مجھے خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص اس کے مضامین کا مداح نہیں"

"کیا میں اس کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

نرملا کسی قدر ہچکچائی۔ اور پھر بولی "گوری کانتا رائے" یہ لفظ کہتے ہوئے اسکے رخسار گلنار ہو گئے"

اب مجھے ستیش کی حالت پر کچھ افسوس سا آیا۔

پھر گوری کانتا رائے کی شائع شدہ تصنیفات پر بحث شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں میں نے بیان کیا کہ مجھے اس کا تازہ مطبوعہ ناول "نندرانی" ریویو کے لئے وصول ہوا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اکثر میں نے گوری کانتا کے مضامین پر آزادانہ نرملا سے گفتگو کی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ تو اسکی پرستار معلوم ہوتی تھی۔ اور ادھر نا قابل توضیح جذبہ عناد اس شخص کے خلاف میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا +

۔۔۔۔۔۔۔ ۶ ۔۔۔۔۔۔۔

ستیش نے ابھی تک نرملا کے والدین کے سامنے اپنی درخواست ازدواج پیش نہیں کی تھی لیکن جب بھی پیش کی جاتی ۔یہ یقین کرنے کے وجوہ تھے کہ یہ درخواست خوشی سے قبول کر لیجائیگی۔ اور نرملا کو ستیش سے بیاہ دیا جائیگا۔ مجھے پورا بھروسا تھا کہ ڈاکٹر سین کو ستیش کا خسر بننے کی بھی اتنی ہی تمنا تھی جتنی کہ خود ستیش کو ڈاکٹر سین کی فرزندی میں داخل ہونیکی آرزو۔ یہ بات ان چند روز ہی میں مجھ پر بالکل کھل گئی تھی۔ لیکن گوری کانتا کے معاملہ سے میں بہت بے چین تھا۔ یہ عمیق دوستانہ تعلقات میرے فہم سے بالا تھے۔ معاملہ کی نوعیت جو میں سمجھا تھا یوں بیان کیجا سکتی ہے۔ کہ ستیش اور نرملا کی شادی ہو جائیگی۔ نرملا بنگالی ادبیات پر فدا ہے۔ اور ستیش کو بنگالی ادب کے نام سے بھی نفرت ہے۔ دوسری طرف گوری کانتا رائے ایک شاندار مصنف ہے۔ اس نے دُنیا بھر کی عورتوں میں سے اپنی ادبی گلباریوں کے لئے نرملا ہی کو اپنا ہمراز بنایا ہے۔ ادھر نرملا بھی دل و جان سے اس پر مفتون ہے۔ یہ حقیقت گو اس وقت ایک نامعلوم بیج کی طرح ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے کیسا درخت پیدا ہو گا +

میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے دوست کی حیاتِ ازدواجی کو کانٹوں سے پاک کر دینا چاہیئے گوری کانتا کی پرستش کا وہ معبد جو نرملا نے اپنے دل میں تعمیر کر لیا ہے۔ میں "تنقید" کے زبردست حملوں سے اسکی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا۔ میں یہ بات اظہر من الشمس کر دونگا کہ نئے لکھنے والوں میں گوری کانتا سے بھی بڑھ چڑھ کر لکھنے والے موجود ہیں۔ میں گوری کانتا کی زبان اور صرف ونحو کی غلطیاں دکھاؤنگا۔ میں قدیم وجدید ادبیاتِ مغرب کے دفتروں میں سے ایسے شواہد پیش کرونگا کہ معلوم ہو جائے کہ گوری کانتا کے خیالات انہی چمنستانوں کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہیں۔ اور اسی کے پہلو بہ پہلو میں اس اعلان کے ساتھ بہت سے اقتباسات بھی شائع کرونگا کہ گوری کانتا ادبی دُنیا میں محض ایک چور ہے۔ اور یہ بات بہ کرات ومرات بیان کر کے نرملا کے دل میں یہ احساس پیدا کر دونگا کہ اسکا "دیوتا" مٹی کی ایسی مورت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں جس کا سرمایہ محض گھانس پھونس ہو' میں نے ضیائے بنگالہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ میرا تنقیدی گرز ہر چھوٹے بڑے مصنف

کے لئے ایک خطرۂ عظیم تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسی گرز کی مدد سے دوستی کا حق ادا کرونگا۔ دفعتہً میرے دل میں وسوسہ بھی پیدا ہوا کہ میرا یہ کام فرائض ادارت کے خلاف ہوگا۔ مگر میلانِ خاطر چونکہ اسی طرف تھا اس لئے میں مقدم الذکر کا خیال دل میں قائم کر کے اطمینان سے سو گیا۔

اسی منصوبہ کے مطابق میں نے ایک نہایت خطرناک ریویو "نندرانی" پر لکھا اور باقساط کلکتہ بھیجدیا کہ میرے رسالہ کے اکتوبر نمبر میں شائع ہو جائے۔

ٹھیک وقت پر اس کے پروف میرے پاس آئے۔ متعدد مقامات پر میں نے نیشِ تنقید کو تیز کیا۔ اسی دن دوپہر کے بعد ستیش میرے پاس آیا۔ میری میز پر "نندرانی" پڑا تھا اس نے اسے اُٹھالیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "اسے ہاتھ نہ لگائیے۔ یہ تو بنگالی کتاب ہے"

تم پچھلے دنوں اسی لغو کتاب میں اس قدر محو رہے ہو کہ ہم سے بھی ملاقات نہیں کی۔ جب بھی میں یہاں آیا میں نے تمہیں اسی میں مشغول پایا۔ میں تو اسی لئے آیا ہوں کہ اس کتاب کو تمہارے پاس سے لیجاؤں"

"میں اس پر ریویو کر رہا تھا چونکہ اب وہ میں نے مکمل کر لیا ہے تم اِسے لیجا سکتے ہو"

"ریویو مکمل ہو گیا؟"

"ہاں۔ میں نے آخری پروف چند منٹ پیشتر ہی ڈاکخانہ میں بھجوائے ہیں"

اب ستیش کو بنگالی ادبیات میں کسی قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "آخر یہ کیا ہونے والا ہے؟"

مگر ستیش نے مجھے دیکھ کر مسکرانا شروع کیا"

میں نے پوچھا" یہ بات کیا ہے؟"

"میں تمہیں اپنے متعلق ایک راز بتانا چاہتا ہوں۔ میں ابتک اسی لئے متوقف تھا کہ یہ ریویو تمہارے رسالے میں شائع ہو جائے"

از خود رفتہ ہو کر میں نے دریافت کیا" نندرانی کا ریویو! اس میں اور تمہارے کسی راز میں کیا تعلق ہے"

"گہرا تعلق ہے میں ہی تو گوری کانتا رائے ہوں"

اب میری یہ حالت ہوئی گویا میں آسمان سے گر پڑا ہوں" تم!!!"

ہاں۔ میں۔ کیا تم نہیں سمجھتے "ستی" کے معنے ہیں "گوری" اور "اِش" کے معنے ہیں "کانتا"

میں نے پھر دہرایا "تم!" اور یہ کہتے ہوئے میں نے نوکر کے لئے گھنٹی بجائی۔ جب وہ آیا تو میں نے ایک ٹیلیگراف فارم طلب کیا۔ ستیش نے مجھے بتایا کہ جب وہ انگلستان میں تھا۔ تو برٹش میوزیم میں بیٹھ کر نہایت توجہ سے بہترین بنگالی کتابوں کو پڑھا کرتا تھا پھر اس نے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کی بھی مشق کی۔ وہ یہ بات بتانے کے لئے اس وقت کا منتظر تھا کہ میرے رسالہ میں اسکے ضخیم ناول پر غیر جانبدارانہ ریویو شایع ہو جائے ورنہ بصورت دیگر معلوم ہونے کے بعد دوستی سے متاثر ہو کر کتاب پر جانبدارانہ ریویو ہونے کا امکان تھا۔

ملازم ٹیلیگراف فارم لے آیا۔ میں نے مینیجر کو تار دیا کہ آخری پروف اسی ڈاک سے بھیجدیا گیا ہے۔ لیکن یہ چھپیگا نہیں۔ بلکہ بجائے اس کے کوئی دوسرا مضمون درج کر دینا چاہیئے۔

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلہ

نیازِ ناز

چمن میں پھاڑ کر میرے گریباں اور دامن کو
دلِ وحشی نے صحرا کر دیا ہے صحنِ گلشن کو

گریزاں پھول ہیں گلچیں خفا ہے۔ باغباں دشمن
کہاں لیجاؤں یارب آرزوئے سیرِ گلشن کو

گلوں کی بھولی بھالی صورتوں پر رحم آتا ہے
وگرنہ آہِ سوزاں سے لگا دوں آگ گلشن کو

کبھی جو قصدِ آبادی میں ویرانے سے کرتا ہوں
تو کانٹے پاؤں پڑتے ہیں پکڑ لیتے ہیں دامن کو

یہانتک بڑھ گیا ہے ہمنشیں اب شوقِ بربادی
تلاشِ برقِ سوزاں میں لئے پھرتا ہوں خرمن کو

امیر حسن ناز

بُلبلِ ہند سے خطاب

اے روح افروز شاعرہ! صدیوں سے تاریخ جس ہستی کا انتظار کر رہی تھی ــــــ وہ تیری ہی شاندار شخصیت ہے

مصوّروں کے قلم جس نور کی جھلکی کو دکھانے کے لئے تڑپ رہے تھے ــــــ وہ تیری ہی تصویر ہے!!

تو دُنیا کے لئے خدا کا بہترین پیغام ہے۔ تیری زندگی قوموں کی زندگی کا راز۔ تیرے لبوں کی جنبش انسانوں کے لئے

قلمبسامِ حیات۔ تیرے دست و بازو کی حرکت زندہ شاعری اور تیرا رواں رواں بولتا ہُوا شعر ہے!!

جو ے عدیم النظیر ہستی! تیرے آغوش خاموش میں فصاحتوں کی ایک دُنیا پوشیدہ ہے اور تیری گویائی سینکڑوں قیامتوں

وہ ناولوں اور بے الفاظ وہ سنہری الفاظ ہیں جو تیرے نازک لبوں سے ادا ہو کر دُنیائے ادب کے لئے سرمایۂ ناز بن گئے!!

قِصّہ نویسی میں طوفانوں کی شوکت ہے تیری صدا دل سے نکل کر دل میں اُتر جاتی ہے تیرے بول شاعری کے وہ

اسلوب پر نمودار کر آزادی کی بشارتیں رقص کر رہی ہیں تیرے امرت بھرے بچن کشتِ قومی میں جان ڈال رہے ہیں!!

ہوتی ہے مگر وہ قِصّہ نویس لینے والی کوئل! کوکتی رہ اور کوکتی رہ دم کے لئے بھی نہ ٹھیر۔ پھر وہی نغمہ شیریں سُنا جو کبھی میں نے

اِنسان اپنے ہی دماغ کے پاک اور تنہا گوشوں میں ابھی تک گونج رہا ہے!

ہوتی۔ تفریح تو قِصّہ پڑھ کر یوں ہنو جو بہتے ہُوئے چشموں اور پھولوں کی پھنکڑیوں کی طرح صاف اور شفّاف ہے

اپنی زندگی کو ایسا خلافِ فطرت بنانیکا خیال لر جو مرغانِ فردوس کی ترنم ریزیوں سے بھی دلفریب و رنگین ہے!!

اِس لئے قِصّے سے تفریح ہو جاتی ہے ✦ ... کو چھیڑنے والی گائن تیرے سُریلے، جذبیلے اور دلکش

اب جھوٹ کو بھی حیرت زدہ دیکھا جاتا ہے کہ اِنسان سچ کا ملمع تیری ہر ادا جو خود ایک شعر ہے، صبحِ نشاط کی کرنوں

جھُوٹ مانگتا ہے جو بچوں کو جھُوٹ نہ معلوم ہو ✦

اخبارات ایسے ہی جھُوٹ بولتے ہیں۔ لیڈر ایسے ہی جھُوٹ کے طومار کھڑے کر دنیا کی مخالف قوتوں سے لڑتے

مانا جاتا ہے جو سب سے زیادہ سچ نما جھوٹ بول سکے ✦ احت کی نیند حاصل کروں!!!

کیا حال ہوگا اس دماغ کا جو کسی سچّی ہستی نے سچ بولنے سچ سوچنے اور سچ کا حکم دینے کے۔ محمّد امیر بی۔ اے

تمام دُنیا اس کی مرضی کے خلاف اس سے کام لے رہی ہے ✦ اورنگ آبادی

*

رتیملہ کی سڑکوں

کے متعلق

ست کی مغرور رکشا

یہ صدر مجلس کی جگہ اب

سے تنقیح ترے۔ کہہ رہی ہے

رے لوہے کی جوتی پہن کر چلتے ہیں مگر

فلک پیما

ہے درآئینہ پرکار عیب جوئی خویشم ہر آئینہ

ب دیدہ زبیتابی دلست سیماب راحقیست ہمانا بر آئینہ

رئی مابر دہد فروغ گوئی سپردہ ایم بہ روشن گر آئینہ

غالب

بلبلِ ہند سے خطاب

اے روح افروز شاعرہ! صدیوں سے تاریخ جس ہستی کا انتظار کر رہی تھی ـــــ وہ تیری ہی شاندار شخصیت ہے مصوّروں کے قلم جس نور کی جھلکی کو دکھانے کے لئے تڑپ رہے تھے ـــــ وہ تیری ہی تصویر ہے!! تو دُنیا کے لئے خدا کا بہترین پیغام ہے، تیری زندگی قوموں کی زندگی کا راز، تیرے لبوں کی جنبش انسانوں کے لئے پیغامِ حیات، تیرے دست و بازو کی حرکت زندہ شاعری اور تیرا رواں رواں بولتا ہُوا شعر ہے!!

اے عدیم النظیر ہستی! تیرے آغوش خاموش میں فصاحتوں کی ایک دُنیا پوشیدہ ہے اور تیری گویائی سینکڑوں قیامتوں کی حامل، تیرے الفاظ وہ سنہری الفاظ ہیں جو تیرے نازک لبوں سے ادا ہو کر دُنیائے ادب کے لئے سرمایۂ ناز بن گئے!! تیری گونج میں طوفانوں کی شوکت ہے تیری صدا دل سے نکل کر دل میں اُتر جاتی ہے تیرے بول شاعری کے وہ نغمے ہیں جن میں آزادی کی بشارتیں رقص کر رہی ہیں تیرے امرت بھرے بچن کشتِ قومی میں جان ڈال رہے ہیں!!

اے دل کو موہ لینے والی کوئل! کوکتی رہ اور کوکتی رہ دم کے لئے بھی نہ ٹھیر۔ پھر وہی نغمہ شیریں سُنا جو کبھی میں نے سُنا تھا اور جو میرے دل کے پاک اور تنہا گوشوں میں ابھی تک گونج رہا ہے!

آہ پھر سنا اور پھر سُنا وہ نغمہ جو بہتے ہوئے چشموں اور پھولوں کی پھنکڑیوں کی طرح صاف اور شفاف ہے جو شبنم کے قطروں کی طرح لطیف و نازک ہے اور جو مرغانِ فردوس کی ترنم ریزیوں سے بھی دلفریب و رنگین ہے!!

اے نغمۂ زندگی کو الاپنے والی مطربہ! اے سازِ آزادی کو چھیڑنے والی گائن تیرے سُریلے، جذبیلے اور دلکش زمزمے ابھی تک میرے خیالات کے ہلکوروں میں تیر رہے ہیں اور تیری ہر ادا جو خود ایک شعر ہے، صبحِ نشاط کی کرنوں کی طرح میری رُوح کی تاریکیوں کو روشن کر رہی ہے!!

بس اب میری تمام اُمیدیں ایک ہی نقطہ پر سمٹ کر آ گئی ہیں کہ جب میں دنیا کی مخالف قوتوں سے لڑتے لڑتے تھک جاؤں تو تیرے رس بھرے نغمے کے گہوارے میں آ کر لیٹ جاؤں اور راحت کی نیند حاصل کروں!!!

محمد امیر بی۔ اے

اورنگ آبادی

سیاہ بلّی

جو خوفناک واقعات میں اس وقت حوالۂ قلم کرنا چاہتا ہوں، اگر وہ ناقابلِ یقین تصوّر کئے جائیں تو میری توقع کے خلاف نہ ہوگا۔ اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ خود میری عقل میرے مشاہدہ پر اعتماد کرنے سے ہچکچاتی ہے، اگر میں اس قسم کی توقع رکھوں، تو یقیناً میں دیوانہ سمجھا جاؤں گا، باوصف اسکے دیوانہ میں یقیناً نہیں ہوں، اور نہ میرا بیان عالمِ رویا کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن کل مجھے مرنا ہے، اس لئے آج میں اپنی رُوح کو اس بارِ عظیم سے سبکدوش کرنا چاہتا ہوں میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دُنیا کے سامنے اپنی طرف سے اظہار رائے کے بغیر بالاجمال چند ایسے سلسلۂ واقعات پیش کردوں، جو تمام کے تمام ایک گھر ہی کی چار دیواری میں وقوع پذیر ہُوئے اور جن کے نتائج میرے لئے نہ صرف ہیبت انگیز اور روح فرسا بلکہ تباہ کن صورت اختیار کرتے گئے۔ ان واقعات نے میرے دل پر ہیبت طاری کردی ہے۔ ممکن ہے، کہ دوسرے لوگوں کے دل میں میرا بیان ہیبت اور خوف سے زیادہ تعجب اور تحیّر پیدا کرے۔ اور ممکن ہے کہ بعد میں کوئی ایسا شخص جس کا دماغ مجھ سے زیادہ قوی جس کا دل مجھ سے زیادہ ٹھنڈا اور جس کی طبیعت مجھ سے زیادہ منطقی ہو۔ ان واقعات کو جو میرے لئے اس قدر مہیب ہیں، بالکل معمولی ثابت کردے، اور اس کے نزدیک یہ باتیں محض چند قدرتی اسباب و نتائج کے ایک عام سلسلے سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہ رکھیں۔

میں اپنے بچپن کے زمانہ سے نرم دل اور سریع الاحساس سمجھا جاتا تھا اور میری رقیق القلبی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، کہ اس پر میرے دوست میرا مضحکہ بھی اُڑایا کرتے تھے۔ مجھے جانوروں سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ چنانچہ میرے والدین نے میرے لئے مختلف قسم کے جانور پال رکھے تھے۔ میرے وقت کا ایک بڑا حصہ انہیں کے ساتھ گزرتا تھا۔ اور انہیں کھلانے پلانے اور اُن کے ساتھ کھیلنے سے زیادہ مسرت مجھے اور کسی بات میں حاصل نہ ہوتی تھی۔ میری طبیعت کی یہ خصوصیت میری عمر کے ساتھ ہی ساتھ نشوونما پاتی رہی اور سنِ بلوغ کے بعد بھی جانوروں کے پالنے کو میں اپنے مرغوب ترین مشاغلِ تفریح میں شمار کرتا رہا۔ اس قسم کی باتوں میں مجھے جو مسرت اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ اس سے وہ لوگ خوب واقف ہیں جن کے دل میں اپنے کسی وفادار اور دانا کُتّے کے لئے جذبۂ اُنس پیدا ہو چکا ہے۔ کسی جانور کی بے غرض محبت اور بے لوث وفا میں ایک خاص بات ہے، جس سے ایسے اشخاص کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہیں اپنی زندگی میں کسی انسان کی خود غرضانہ محبت اور مطلب آشنا وفاداری سے سابقہ پڑ چکا ہو۔

میں نے اوائلِ شباب ہی میں شادی کرلی اور یہ بات میرے لئے باعثِ اطمینان ثابت ہُوئی کہ میری بی بی کی طبیعت میں بھی مجھ سے کچھ اختلاف نہ تھا۔ اس نے میرے مزاج سے شناسا ہوکر میرے لئے بہترین قسم کے پالتو جانور فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھانہ رکھا۔ پرندوں کے علاوہ ہمارے پاس سُنہری مچھلیاں، خرگوش ایک نہایت عُمدہ قسم کا کُتّا ایک بندر اور ایک بلّی بھی تھی۔

یہ بلّی نمایاں طور پر بڑے قدوقامت کی تھی اور نہایت خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اور یہ حیرت انگیز طور پر ذہین اور ہوشیار تھی۔ اس کی ذہانت اور ہوشیاری کا تذکرہ کرتے وقت میری بی بی ہمیشہ اُس قدیم خیال کی طرف اشارہ کیا کرتی تھی، جس کے مطابق تمام سیاہ بلّیاں دراصل بدلے ہُوئے بھیس میں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ میں یہ اسلئے نہیں کہتا کہ میری بی بی اس خیال کو بالکل سنجیدگی سے پیش کیا کرتی تھی لیکن اسوقت جو واقعہ پیش آیا ہے اس نے اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

پلوٹو (بلّی کا نام) سے مجھے بہت اُلفت تھی اور اس کے ساتھ کھیلنے میں مجھے خاص لُطف حاصل ہوتا تھا۔ میں اسے ہمیشہ خود اپنے ہاتھ سے کھلاتا پلاتا تھا وہ ہروقت میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتی تھی، یہانتک کہ بعض اوقات بازاروں میں اُسے اپنے پیچھے آنے سے روکنے میں مجھے بہت دقت ہُوا کرتی تھی۔

بلّی سے میری یہ دوستی کئی سال تک رہی، اس دوران میں (میں شرم سے اقرار کرتا ہوں) بے اعتدالیوں کی وجہ سے میرے مزاج میں ایک نامطبوع تغیر پیدا ہوتا چلا گیا۔ میری طبیعت رفتہ رفتہ ملول، چڑچڑی اور دوسروں کے جذبات کی پاسداری سے عاری ہوتی گئی۔ میری حالت یہانتک خراب ہوگئی، کہ میں اپنی بی بی کے ساتھ بھی درشت کلامی سے پیش آنے لگا۔ اور بالآخر میں نے اس پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی پہلو تہی نہ کیا میری طبیعت کے اس تغیّر کو میرے پالتو جانوروں نے بھی یقیناً محسوس کیا۔ میں نے اُن سے نہ صرف بے التفاتی اختیار کرلی، بلکہ بارہا اُن سے بہ درشتی بھی پیش آیا۔ البتہ پلوٹو کے لئے میرے دل میں ابتک اتنی جگہ موجود تھی۔ کہ میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے محترز رہوں، حالانکہ خرگوش بندر اور یہانتک کہ کتا بھی اگر کبھی اتفاق سے میری راہ میں آجاتا تھا، تو میں اس غریب کو لاتیں رسید کرکے دھتکار دیا کرتا تھا رفتہ رفتہ میرے مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا (اور شراب کی عادت سے زیادہ مہلک مرض اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟) آخر نوبت یہانتک پہنچی۔ کہ پلوٹو بھی جس پر اب بڑھاپا چھا رہا تھا اور جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں بھی سختی پیدا ہو رہی تھی۔ میری درشت مزاجی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔

ایک رات جب میں شراب خانے سے بہت مخمور ہو کر گھر پہنچا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ بلّی مجھ سے گریز کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ اسی وقت اس نے میرے اس تند طرزِ عمل سے خوف کھا کر میرے ہاتھ پر اپنے دانتوں سے ہلکا سا زخم لگایا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر طیش و غضب کا بھوت سوار ہو گیا، اور میں اپنے آپے میں نہ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری اپنی روح میرے جسم سے پرواز کر گئی تھی اور کوئی شیطان سے بھی زیادہ خبیث روح میرے جسم کے ذرہ ذرہ کو لرزا رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے چاقو نکالا، اور غریب جانور کو اس کی گردن سے پکڑ کر نہایت دلجمعی کے ساتھ اس کی ایک آنکھ کاٹ کر خانۂ چشم میں سے باہر نکال لی۔ اس ظلمِ عظیم کا تذکرہ کرتے وقت میں عرقِ انفعال سے آب آب ہو رہا ہوں مجھے سخت عذاب ہو رہا ہے اور میری روح کپکپا رہی ہے +

علی الصباح جب رات کی بے اعتدالیوں کا نشہ ہرن ہو چکا، اور میرے ہوش و حواس بجا ہوئے، تو میرے دل میں اپنے جرم کے متعلق خوف اور پشیمانی کا ایک مخلوط سا جذبہ پیدا ہُوا۔ لیکن یہ جذبہ کچھ زیادہ قوی نہ تھا، اس لئے میں نے ایک اور جام لنڈھا کر گناہ کی تمام پشیمانیوں کو بادۂ ناب میں غرق کر دیا +

اس دَوران میں بلّی کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہوتا رہا ضائع شدہ آنکھ کی خالی جگہ اگرچہ اب ڈراؤنی سی نظر آتی تھی لیکن بلّی اب درد و کرب سے نجات پا چُکی تھی۔ وہ اب پھر حسبِ معمول گھر میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی، لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ انتہائی خوف سے بھاگ جاتی تھی۔ میرے دل میں اب بھی کچھ احساس موجود تھا اور میں اوّل اوّل اس جانور کو جو مجھ سے اس قدر مانوس رہ چکا تھا اپنے سے یوں علانیہ نفرت کرتے دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس احساس نے برافروختگی کی صورت اختیار کر لی اور بالآخر شاید میری آخری اور مکمل ترین تباہی کے لئے مجھ میں ضد کا جذبہ پیدا ہُوا۔ فلسفہ اس جذبہ کو نظرانداز کرتا ہے۔ لیکن مجھے اس امر پر کہ سورج روز طلوع ہوتا ہے، اس سے زیادہ یقین نہیں۔ جتنا اس بات پر، کہ ضد اور ہٹ انسانی دل کے قدیم ترین جذبات میں سے ہے۔ اِس کا شمار انسانی طبیعت کی اُن ناقابلِ تجزیہ خصوصیات یا ناقابلِ تشریح جذبات میں ہو سکتا ہے، جن کا انسان کے مزاج اور اس کی عادات کی تشکیل میں نہایت اہم حصہ ہوتا ہے۔ کیا ہم میں سے ہر شخص بیسیوں مرتبہ یہ تجربہ نہیں کر چکا کہ اس نے محض اس لئے کسی نامناسب اور درجۂ انسانیت سے گرے ہوئے فعل کی

طرف قدم بڑھایا کہ وہ ممنوع تھا۔ کون ہے جو یہ کہے کہ اس کے دل میں قانون کو پائمال کرنیکی خواہش مسلسل طور پر پیدا نہیں ہوتی رہتی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ضد ہی کا جذبہ میری آخری تباہی در بربادی کا موجب بنا یہی پراسرار جذبہ جس میں میری روح خود اپنے آپ کو ایذا پہنچانا چاہتی تھی، یا اپنی فطرت کے خلاف ایک کام کرنے پر آمادہ ہو رہی تھی اور جس کی وجہ سے محض گناہ ہی کے لئے ایک گناہ کا اقدام کیا جانے والا تھا، میرے لئے اس سزا وعقوبت کو جو غریب بلّی میرے ہاتھوں اس سے قبل سہہ چکی تھی، جاری رکھنے اور انجام تک پہنچانیکا محرک بن گیا

ایک دن علی الصباح میں نے اُٹھ کر نہایت دلجمعی سے اس کی گردن میں پھندا ڈالا اور اسے ایک درخت کی ٹہنی سے لٹکا کر پھانسی دیدی۔ جب میں نے اسے پھانسی دی میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں اپنے دل میں سخت پشیمان ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، اور محض اسلئے کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے محبت کر چکی ہے اور آجتک اس نے مجھے کوئی رنج کا موقع نہیں دیا مگر محض اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میں ایک گناہ، ایک نہایت خوفناک گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں جو مجھے خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت اور بخشش کی انتہائی وسعتوں سے بھی پرے لیجائیگا۔ میں نے اسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا +

جس دن یہ ظلمِ عظیم برپا ہُوا، اسکی شب کو "آگ! آگ!!" کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میری مسہری میں آگ لگ رہی ہے، اور تمام گھر شعلوں سے روشن ہے۔ میں، میری بی بی، اور ایک ملازم بہ دِقتِ تمام اس آگ سے بچ کر نکل سکے۔ مَیں کامل طور پر تباہ و برباد ہو گیا۔ میری تمام دنیوی متاع آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی اور میں نے اپنے آپ کو یاس و نا امیدی کے سپرد کر دیا +

اس تباہی خیز واقعے کے بعد دوسرے دن میں اپنے گھر کے کھنڈر دیکھنے کو گیا۔ بجز ایک دیوار کے سب دیواریں گر گئی تھیں۔ یہ میری خوابگاہ کی وہ دیوار تھی جو میرے پلنگ کے سرہانے کی طرف واقع تھی۔ دیوار کی سفیدی ابھی ایک حد تک قائم تھی، اور اس کی وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ دیوار کی لپائی اور سفیدی ہُوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے۔ اس دیوار کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو رہے تھے اور ایک خاص جگہ کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اکثر لوگ کسی بات پر بہت تعجب اور حیرت کا اظہار کر رہے تھے ان باتوں نے میری توجہ بھی اُدھر مبذول کرائی۔ میں نے دیکھا کہ دیوار کی سفید سطح پر ایک بہت بڑی بلّی کی تصویر اُبھری ہُوئی ہے۔ اس کے نقوش حیرت انگیز طور پر صاف اور واضح تھے۔ اور اُسکی گردن

ہیں ایک رسّی پڑی تھی۔

میں اس خوفناک تصویر کو دیکھ کر سخت متعجب اور سخت دہشت زدہ ہُوا۔ لیکن آخر ایک خیال سے میری کچھ تسکین ہُوئی۔ مجھے یاد آیا کہ بلّی میرے گھر کے متصل ایک باغ میں لٹکائی گئی تھی۔ آگ کو دیکھ کر بہت سے لوگ باغ میں آ گئے تھے۔ شاید انہیں میں سے کسی نے بلّی درخت سے کھول کر مجھے بیدار کرنے کے لئے کمرہ میں پھینکی ہوگی اور غالباً دوسری دیواروں کے گرنے سے بلّی کی لاش دیوار کے تازہ تازہ لیپ میں دھنس گئی ہوگی۔ جس کے چُونے نے شعلوں اور لاش کے ایمونیا سے مل کر اس پیکر کو وہ صورت دیدی، جسے میں دیکھ رہا تھا۔

اس استدلال سے اگرچہ میں نے اپنے ضمیر کو نہیں، تو ادراک کو ضرور تسلی دے لی۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ میرے واہمہ پر ایک گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکا۔ مہینوں بلّی کی خیالی روح مجھ پر سوار رہی۔ اور اس دَوران میں مجھ پر ایک اور جذبہ طاری ہُوا۔ جو بظاہر پشیمانی کا جذبہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے بلّی کے ضائع ہونیکا افسوس ہونے لگا۔ اور میں اُن آوارہ مقامات میں جہاں اب میں اکثر پھرتا رہتا تھا کسی اور اسی وضع وقطع کی بلّی کی تلاش کرنے لگا۔ جسے میں اپنی ضائع شدہ بلّی کا بدل سمجھ سکتا ایک رات جب میں بحالتِ مدہوشی ایک شراب خانے میں بیٹھا تھا۔ مجھے شراب کے ایک بہت بڑے مٹکے پر کوئی سیاہ چیز نظر آئی۔ میں بہت دیر سے مٹکے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ میں نے زیادہ جلد اُس چیز کو کیوں پہچان نہ لیا۔ میں نے اُٹھ کر اُسے ہاتھ سے چھُوا۔ یہ ایک سیاہ بلّی تھی۔ یہ بھی بہت بڑی اور بجز ایک بات کے ہر بات میں پلُوٹو سے مشابہ تھی۔ پلوٹو کے جسم کے کسی حصّہ پر کوئی سفید بال نہ تھا۔ لیکن اس بلّی کے تمام سینے پر سفید بالوں کا ایک نشان پھیلا ہُوا تھا میرے چھُونے سے وہ اُٹھ کر خُر خُر کرنے لگی، اور اپنا سر میرے ہاتھوں سے ملنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ میری توجہ اپنی طرف مبذول ہوتے دیکھ کر بہت خوش ہُوئی ہے۔ مجھے اس بات سے مسرت ہُوئی کہ جس قسم کی بلّی کی مجھے تلاش تھی، وہ مجھے مل گئی۔ میں نے اسے شراب خانے کے مالک سے خرید لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن دریافت کرنے پر اُس نے اِس بلّی کی ملکیت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں اور نہ میں نے اسے کبھی دیکھا ہے۔

میں برابر پیار سے اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا، اور جب میں گھر جانے کے لئے اٹھا۔ بلّی اس وقت تک میرے پیچھے آنے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ راستے میں بھی اُس کے جسم پر جھک جھک کر ہاتھ پھیرتا رہا۔ گھر میں پہنچتے ہی یہ بہت جلد مانوس ہو گئی۔ اور میری بی بی

بھی اسے بہت پسند کرنے لگی +

لیکن میرا دل بہت جلد اُس سے کھنچنے لگا۔ یہ بات خود میری توقع کے خلاف تھی، لیکن معلوم نہیں کیوں' مجھے اُس کا لاڈ پیار بُرا معلوم ہونے لگا، اور میں اس سے تنگ آ گیا۔ آہستہ آہستہ میرے اِن جذبات نے سخت نفرت کی صورت اختیار کر لی۔ میں اُس سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے پچھلے گناہ اور ظلم کی موجب شرم یاد مجھے اسکو علانیہ طور پر کوسنے سے روکے رکھتی تھی۔ چند ہفتوں تک میں نے اس پر ہاتھ اُٹھانے یا سختی کرنے سے احتراز کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے اُس سے انتہائی نفرت ہو گئی۔ اور میں اس سے اس طرح بھاگنے لگا، جس طرح کوئی کسی متعدی مرض سے بھاگتا ہے +

میری نفرت میں اس بات کو بھی دخل تھا، کہ جس دن میں اسے گھر لایا اُس سے دوسرے ہی دن بعد مجھے صبح کے وقت معلوم ہُوا کہ پلوٹو کی طرح اس کی بھی ایک آنکھ موجود نہیں ہے۔ بخلاف اس کے میری بی بی کو اسی وجہ سے اور بھی زیادہ چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے دل میں احساس کا وہ مادہ موجود تھا، جس سے کسی زمانے میں میرا دل بھی عاری نہ تھا، اور جس کے پیدا کئے ہُوئے جذبات سے میں بھی کبھی بہت سی سادہ اور پرخلوص مسرتیں حاصل کر چکا تھا +

لیکن جوں جوں بلّی سے میری نفرت بڑھتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اسے مجھ سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس مستقل مزاجی سے قدم قدم پر میرے پیچھے پیچھے چلتی تھی، کہ دوسروں کے لئے اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ جب میں بیٹھتا تھا تو وہ یا میری کرسی کے نیچے گھس جاتی تھی، یا اچھل کر میری گود میں آبیٹھتی تھی، اور مجھ سے خود بخود لاڈ کرنے لگتی تھی۔ اس سے میری نفرت میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ جب میں چلنے پھرنے کے لئے اُٹھتا تو وہ میرے پاؤں کے درمیان آجاتی تھی اور بعض اوقات میں بہ مشکل گرتے گرتے بچتا تھا۔ پھر کبھی وہ اپنے لمبے اور تیز ناخن میرے کپڑوں میں چبھو کر میری چھاتی کے ساتھ چمٹ جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں چاہتا تھا کہ ایک ہی ضرب سے اس کا خاتمہ کر دوں۔ لیکن کچھ اپنے پہلے گناہ کے خیال سے اور کچھ (میں بلا تامل اقرار کرتا ہوں) اس وجہ سے بھی کہ میرے دل میں اس جانور کی طرف سے انتہائی خوف جاگزیں ہو چکا تھا۔ میں اس فعل سے باز رہا +

یہ خوف کوئی مادی خوف نہ تھا۔ لیکن میں بجز اس کے اسے کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا۔ مجھے یہ ظاہر کرتے ہُوئے شرم آتی ہے، کہ اس دہشت و خوف کا باعث محض ایک وہم تھا۔ میری بی بی نے کئی مرتبہ میری

توجہ سفید بالوں کے اُس نشان کی طرف منعطف کرائی۔ جس کا ذکر میں اس سے قبل کرچکا ہوں۔

پہلے اس نشان کی کوئی خاص صورت نہ تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک غیر معلوم طور پر وہ ایک خاص صورت اختیار کرتا گیا۔ ابتدا میں اس تبدیل صورت کو میں اپنا وہم سمجھتا رہا۔ لیکن آخر کار نشان نے ایک نہایت واضح صورت اختیار کرلی۔ یہ ایک ایسی چیز کا نقش تھا جس کا نام لیتے ہوئے میں کانپتا ہوں یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں اس بلائے مہیب سے سخت نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ اس سے کسی طرح نجات مل جائے۔ یہ ایک ہیبت ناک اور دہشت خیز چیز کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ یہ پھانسی کا خوفناک کھمبا تھا۔

اب میری حالت نہایت ابتر رہنے لگی۔ یہ کیسی قیامت تھی کہ ایک وحشی جنگلی جانور جس کے ایک ہم جنس کو میں موت کے گھاٹ اُتار چکا تھا۔ میرے لئے کہ خدا کی اشرف ترین مخلوق میں سے ہوں اس درد وکرب کا موجب بن رہا تھا۔ میرے دن اور رات اب نہایت عذاب میں گزرتے تھے۔ دن کے وقت تو خود بلّی کسی وقت میرا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اور رات کے وقت بھی میں لحمہ بہ لحمہ نہایت خوفناک خواب دیکھ کر چونکتا رہتا تھا۔ مجھے اپنے چہرہ پر بلّی کا گرم گرم سانس محسوس ہوتا تھا۔ اور وہ ایک خوفناک قابوس کی طرح میرے سینے پر سوار ہوتی تھی، یہ ایک ایسا بوجھ تھا، جس سے میرے دل کو ایک لمحہ نجات نہ ملتی تھی۔

اس قسم کے عذاب کے اثر کے ماتحت نیکی کا جو تھوڑا بہت کمزور سا جذبہ میرے دل میں باقی رہ گیا تھا، وہ بھی دب گیا۔ میرے دل میں ہر وقت بدی کے جذبات موجزن رہنے لگے۔ میری خلوت پسندی تمام بنی نوع انسان سے نفرت کے جذبہ میں تبدیل ہوگئی اور میری صابر وشاکر بی بی پہلے سے بھی زیادہ میرے طیش و غضب کے عناں گسیختہ اور ناگہانی حملوں کا شکار ہونے لگی۔

ایک دن کسی کام کے لئے وہ میرے ساتھ اس خستہ وخراب اور پرانے مکان کے تہ خانے میں گئی، جو ہماری بربادیوں کے بعد ہمارا مسکن بنا تھا۔ بلّی بھی سیڑھیوں پر میرے پیچھے پیچھے آئی، اور اس کے پاؤں میں آنے سے میں سر کے بل گر پڑا۔ اس واقعہ نے مجھے سخت غضب آلود کردیا۔ اس وقت وہ بچوں کا سا خوف میرے دل سے بالکل نکل گیا، اور میں نے ایک کلہاڑی اُٹھا کر اس پر اس زور کا وار کیا کہ اگر میری بی بی میرا ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو بلّی کا کچومر نکل جاتا۔ اس رکاوٹ نے میرے جوش غضب کو اور بھی بڑھا دیا میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا کر ایک تلا ہوا وار اس کے سر پر کیا، کلہاڑی اس کے مغز میں گھس گئی، اور وہ ایک اُف تک کئے بغیر مردہ ہو کر زمین پر گر پڑی۔

اس خوفناک قتل کے بعد میں فوراً نہایت دلجمعی سے لاش کو چھپانے کا انتظام کرنے لگا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ میں لاش کو دن یا رات کے کسی حصہ میں بھی ہمسایوں کی نگاہ کے خطرے میں پڑے بغیر باہر نہیں لے جاسکتا۔ مجھے اس کے متعلق کئی مختلف طریقے سوجھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ لاش کو قیمہ قیمہ کرکے آگ میں جلادوں۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ تہ خانے میں گڑھا کھود کر لاش اس میں دبا دی جائے۔ صحن میں ایک کنواں تھا، مجھے یہ بھی خیال آیا کہ لاش کو اس میں پھینک دوں۔ ایک خیال یہ بھی تھا، کہ تجارتی سامان کی طرح اسے کسی صندوق میں بند کردوں اور کسی مزدور کے سر پر اٹھوا کر اسے باہر لیجاؤں لیکن آخر مجھے ایک اور طریقہ سوجھا جسے میں نے بہترین خیال کیا۔ وہ یہ کہ لاش کو اسی طرح دیوار میں بند کردوں جس طرح بعض بیانات کے مطابق قرون وسطیٰ کے راہب اپنے مجرموں کو سزا دینے کے لئے کیا کرتے تھے۔

اس مقصد کے لئے یہ تہ خانہ بہت موزوں تھا۔ اس کی دیواریں بالکل سیدھی سادی بنی ہوئی تھیں ان پر لپائی ہوئے بھی بہت کم دن گزرے تھے اور نم آلودہ جگہ کے باعث ابتک لیپ خشک بھی نہ ہونے پایا تھا۔ ایک دیوار میں ایک مقام پر ایک ابھار سا موجود تھا۔ غالباً یہ کسی آتش دان کی جگہ تھی، جو اب بند کردیا گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے اینٹیں اکھاڑنے کے بعد لاش کو آتش دان میں رکھ کر دوبارہ اینٹیں چن دوں۔ تاکہ کسی شخص کے لئے کسی قسم کے شبہ کا موقع باقی نہ رہے۔ میں نے ایک اوزار کے ساتھ اینٹوں کو بہ آسانی اکھیڑ لیا۔ اور لاش کو اندرونی دیوار کا سہارا دے کر اس میں رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے نہایت احتیاط سے لپائی کا مسالہ تیار کیا، تاکہ اس دیوار میں اور باقی دیواروں میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔ اور اینٹوں پر ویسا ہی لیپ کردینے کے بعد میں مطمئن ہوگیا، کہ مجھے اپنے کام میں پوری کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ دیوار کو دیکھ کر قطعاً کسی قسم کی دست اندازی کا شبہ نہ ہوسکتا تھا۔ فرش پر گری ہوئی غلاظت کو بھی میں نے نہایت احتیاط سے جمع کرلیا۔ اس کے بعد میں نے غرور سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور دل میں کہا کہ کم ازکم اس موقع پر تو میری کوشش رائگاں نہیں گئی ؎

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اس منحوس بلّی کی تلاش کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا جو اس تمام بدبختی کا موجب بنی تھی۔ اب میں مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ اس کو جان سے مار ڈالوں گا۔ اگر اس وقت وہ کہیں مجھے مل جاتی، تو لمحہ بھر میں اُس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

یہ مکار میرے جوش و غضب کو دیکھ کر اس حالت میں میرے سامنے نہ آنا چاہتی تھی۔ اس نفرت انگیز جانور کی غیر موجودگی سے میرے دل میں جو اطمینان کے جذبات پیدا ہوئے، وہ حیطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔ رات بھر اُس نے مجھے اپنی صورت نہ دکھائی۔ اور میں گھر میں اسکے داخل ہونے کے بعد آج رات پہلی دفعہ آرام سے سویا، باوجودیکہ میری رُوح پر قتل کے گناہ کا بار پڑ چکا تھا۔

دوسرا دن گزر گیا، اور پھر تیسرا بھی، لیکن بلّی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چڑیل خوف کھا کر ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑ گئی ہے۔ اس پر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرا سیاہ کارنامہ بھی میرے آرام میں بہت کم خلل انداز ہوا۔ بعض لوگوں نے کچھ سوال کئے، لیکن میں نے بہت جلد اپنے جوابات سے اُن کی تشفی کر دی۔ جس کے بعد میں اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔

قتل کے چوتھے دن بعد پولیس کے سپاہیوں کی ایک جماعت غیر متوقع طور پر گھر میں داخل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ گھر کا چپہ چپہ چھان مارینگے۔ لیکن چونکہ مجھے مقام اخفا کے ناقابلِ شناخت ہونے کے متعلق بالکل اطمینان تھا، اس لئے میرے چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار مطلق نہ پیدا ہوئے پولیس والوں نے تلاش میں مجھے اپنے ساتھ شامل ہونیکا حکم دیا۔ ان لوگوں نے گھر کے کونے کونے اور چپے چپے کی خوب دیکھ بھال کی۔ آخر کوئی تیسری یا چوتھی مرتبہ وہ تہ خانے میں اُترے۔ میں بالکل مطمئن تھا۔ میرا دل بالکل ایک معصوم شخص کے دل کی طرح پہلو میں حرکت کر رہا تھا۔ اور میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آخر پولیس والے اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد جانے کو تیار ہوئے۔ اس وقت مسرّت و ابتہاج سے میرے دل کی جو کیفیت ہوئی، اُس کا چھپانا مشکل تھا۔ میں نے مزید احتیاط کے لئے مناسب سمجھا، کہ انکے رخصت ہونے سے قبل انہیں اپنے متعلق اور بھی اطمینان دلادوں۔ چنانچہ جب وہ باہر جانے کے لئے تہ خانے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا صاحبو! میں اس بات سے خوش ہوں کہ میں آپکے شکوک و شبہات کو رفع کر سکا ہوں۔ خدا آپ کو صحت اور اس کے ساتھ کچھ زیادہ خلق و مروّت عطا کرے۔ ہاں صاحبو! میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں، کہ یہ مکان نہایت مضبوط اور پختہ مسالہ سے بنا ہے۔

(معلوم نہیں اس خیال سے کہ میری باتوں میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ پیدا نہ ہو۔ جوش کی حالت میں میں نے کیا کیا کہہ ڈالا) یہ مکان غیر معمولی طور پر عمدہ اور پختہ بنا ہے۔ یہ دیواریں ـــــ کیا

آپ لوگ جا رہے ہیں؟ ———— یہ دیواریں بالکل ٹھوس ہیں۔

یہاں میں نے جوش میں آکر اپنی لاٹھی زور سے دیوار کے اس مقام پر ماری جس کے پیچھے میری بی بی کی لاش کھڑی تھی۔

لیکن جونہی میری لاٹھی پڑنے کی آواز فرو ہوئی۔ مجھے قبر میں سے ایک آواز آئی۔ پہلے یہ آواز کچھ بند اور اکھڑی اکھڑی سی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی بچہ رو رہا ہے، لیکن اس کے بعد اس نے ایک مسلسل چیخنے چلانے کی صورت اختیار کر لی۔ یہ آواز بالکل خرقِ عادت اور غیر انسانی سی معلوم ہوتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وحشت ناک چیخیں، یہ واویلا اور یہ خوف و دہشت کی صدائیں جہنّم کے اسفل السافلین سے اُٹھ رہی ہیں۔ اس صورت میں میری جو حالت ہو سکتی تھی، ناقابل بیان ہے۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ اور میں نے مقابل کی دیوار کا سہارا لے لیا۔ پولیس کے سپاہی ایک لمحہ تک متحیر اور خوف زدہ ہو کر سیڑھیوں پر کھڑے رہے۔ دوسرے لمحہ میں ایک درجن مضبوط ہاتھ دیوار گرانے میں مصروف نظر آئے۔ دیوار کا ایک خاصا حصّہ گر چکا تھا اور میری بی بی کی لاش خاک و خون میں لتھڑی ہوئی سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے سر پر وہ مکروہ اور خوفناک بلی جس کی ایک حرکت نے مجھے ارتکابِ قتل پر آمادہ کر دیا۔ اور جس کی غماز صدا کے باعث اب میں جلاد کے حوالے ہو چکا ہوں۔ اپنے کھلے ہوئے سرخ منہ اور انگارہ سی کانی آنکھ کے ساتھ سوار تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ بلائے بے درماں بھی میری لاعلمی میں دیوار کے اندر بند ہو گئی تھی۔

(ایڈگر ایلین پو) (ترجمہ) (حامد علی خاں)

جس طرح آفتاب طلوع ہوتا ہے اور تمام کائنات کو جگمگا دیتا ہے، اسی طرح میری زندگی میں تو نمودار ہوا، اور تیرے پرتو سے میری خاک کا ذرہ ذرہ منور ہو گیا۔

مجھے معلوم نہیں، تو اب کہاں ہے۔ لیکن میرا دل تیرے نور سے اب بھی اُسی طرح مُستنیر ہے پھر مجھے فرقت کی شکایت کیوں ہو۔

حامد

---

*

محفلِ ادب

اُردو زبان کا پہلا مُسدّس۔ دُنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں اُن کی اَدبی تاریخ کے موضوع کے متعلق معتد بہ علمی مواد موجود ہے، جس سے زبان کے تدریجی نشوونما اور مختلف اصنافِ نظم و نثر کے ظہور و ارتقا کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ادبیاتِ اُردو کے طالب العلم کے دل میں بھی اس نوع کے سوالات پیدا ہوتے ہیں لیکن اصولِ تنقید پر چونکہ ابھی کافی توجہ نہیں دی گئی اس لئے محققانہ انداز میں لکھی ہوئی ایک بھی تاریخ ادبِ اُردو ہمیں میسر نہیں۔ شاعری کے متعلق البتہ تذکرہ نویسی کی خدمت ایک حد تک انجام دی جاتی رہی ہے، اور اس زمرہ میں دورِ قدیم کی بعض فارسی اور بعد کی لکھی ہوئی اُردو تصانیف کا شمار رہے۔ لیکن اس قسم کی کسی کتاب کو "شعر کی تاریخ" کی بجائے "شعرا کی تاریخ" کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ آزاد مرحوم کی "آبِ حیات" جو اس خصوص میں بہت زیادہ مقبول ہوئی ہے، اس پر بدرجۂ اتم ہمارا یہ قول صادق آتا ہے۔ ان متعدد کتبِ تذکرہ میں سے ایک نے بھی قابلِ اطمینان طور پر اس بنیادی سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی کہ اردو شعر کا آغاز کب ہوا؟ اور کس شکل میں ہوا؟ یعنی کونسی صنفِ سخن اظہارِ خیال کے لئے پہلے پہل استعمال کی گئی۔ اس سوال کے جزوِ ثانی کا حل جزوِ اول کے جواب کے ساتھ ہی واضح ہو جائیگا۔ مگر ابھی تک اردو ادب کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کے متعلق بھی کوئی مستقل اور قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اور نگاہیں محمدّ شاہ اور پھر شاہانِ گولکنڈہ کے دَور سے گزر کر خلجیوں کے عہد تک پہنچ رہی ہیں +

اِس صورتِ حالات میں اُردو کے کسی ایسے تاریخی پہلو پر قلم اُٹھانا جو معروفِ عوام نہ ہو، بہرحال موجب دلچسپی ہوتا ہے۔ خواہ یہ قول کسی گہری تحقیقی کوشش کا نتیجہ نہ ہو۔ مثلاً اسی تعلق میں یہ معلوم کرنیکی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ مختلف اصنافِ شعر کب اور کس شاعر کے استعمال سے اردو میں داخل ہوئیں؟

"مرثیہ کی عہد بہ عہد ترقی" کے عنوان سے امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے نے "شمع" آگرہ کی اشاعت اکتوبر میں ایک قابلِ قدر مضمون لکھا ہے۔ جس میں ضمناً یہ بحث بھی آگئی ہے، کہ اُردو میں سب سے پہلا مسدّس کب لکھا گیا۔ اس مضمون میں یہ ظاہر کیا گیا ہے، کہ سب سے پہلا مسدس مرثیہ کے طور پر بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ایک پنجابی شاعر نے لکھا۔ سودا کا۔ ایک مرثیہ نقل کرنیکے بعد امیر احمد صاحب فرماتے ہیں:-

یہ مرثیہ مسدس ہے حالانکہ اُس سے پہلے مرثیے چومصرعے ہُوا کرتے تھے معلوم نہیں کہ ٹیپ لگانیکی جدت مرزا ہی کو سوجھی یا یہ شرف میاں سکندر کو نصیب ہُوا، جو پنجاب کے رہنے والے مرزا کے ہمعصر تھے۔ اور تلاشِ معاش میں لکھنو آبسے تھے اُنہوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس کے طرز میں کہا جو آج تک مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور یقیناً اُردو زبان میں پہلا مسدس ہے جس کو قبول عام کی سند ملی۔ سودا کا مرثیہ اُن کے دیوان میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ نواح لکھنؤ میں سَو برس کے بعد بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے

سٹیرولاں پنجاب فخر کریں کہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا دوسرا دَور اُن کے ایک ہموطن کے کلام سے شروع ہوتا ہے اور جس عالیشان عمارت کو شعراء لکھنؤ نے "تابہ ثریا" پہنچایا اُس کی داغ بیل میاں سکندر ہی کی ڈالی ہُوئی تھی"

مثال کے طور پر ہم سکندر کے مسدس کا پہلا بند یہاں نقل کرتے ہیں:۔

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسُول ایک جگہ شہر مدینہ میں ہُوا اُسکا نزول
جس محلّے میں کہ رہتے تھے حسین ابنِ بتول ایک لڑکی کھڑی دروازہ پہ بیمار و ملول
خط لئے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار
اِدھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

نئے رنگ کی ایک پرانی نظم:۔ فطرتی جوش زمانۂ حال کی شاعری کی ملکِ خاص تصور کیا جاتا ہے جدّتِ خیال، جدتِ ترکیب، جدتِ اسلوبِ بیان نئے شعرا کا طغرائے امتیاز ہیں۔ لیکن کسی مغربی نقاد نے سچ کہا ہے کہ شاعر حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہے، وہ زمان و مکان کی قیود میں اسیر نہیں ہو سکتا۔ کسی اچھے شاعر کے لئے قدیم و جدید کی تمیز کرنا بے معنی ہے۔ شمع کے متذکرۃ الصدر مضمون میں جناب امیر احمد نے فصیح کا ایک سلام درج کیا ہے۔ جو اپنی آزادیٔ فکر خلوص و صداقت اور صحیح و سلیم ذوقِ شعر کے اعتبار سے یقیناً نئی شاعری سے بہت قریب کی مشابہت رکھتا ہے۔ فصیح میر خلیق کے معاصر تھے اور لکھنؤ کے رہنے والے۔ لکھنؤ کی قدامت پسندی اور بات بات پر سند طلبی مشہور ہے۔ لیکن ایک پرخلوص جذبہ کے جوش نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر شاعر کی ابدی طور پر آزاد فطرت کو ظاہر کر ہی دیا۔

مرزا فصیح جو حج بیت اللہ کے لئے مکہ پہنچے ہیں۔ حرمِ محترم میں بیٹھے سلام لکھ رہے ہیں۔

کالی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں اور تیز و تند ہوا صحنِ حرم میں فراٹے بھر رہی ہے۔ وفورِ جذبات شاعر کی زبان سے یہ الفاظ کہلواتا ہے:۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگِ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے
گھرے ہیں بادل سے شام کے دل کھچی ہے حیدر کی سیفِ برّاں
گھٹائیں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے
سکینہ پیاسی تڑپ رہی ہے پڑی ہے بیہوش بنتِ مسلم
اِدھر کو اصغر سِسک رہا ہے اُدھر کو باقر بلک رہا ہے
کہا یہ عابد نے ماں سے رو کر بچے نہ اصغر رہا میں زندہ
لگا گلے پر جو تیر اُن کے جگر میں میرے کھٹک رہا ہے
خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے
فصیح مشتاق اس قدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے

دُنیا کی اہم زبانوں میں اُردو کا مرتبہ۔ دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اردو کی عمر سب سے کم ہے اور ترقی کے وہ وسائل جو دوسری اہم زبانوں کو میسر آ چکے ہیں اُردو اُن سے اب تک قطعاً محروم رہی ہے اُردو نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ اُردو والوں کی سلطنت جاتی رہی، اردو کے چمن میں ابھی بہار آنے بھی نہ پائی تھی کہ خزاں نے اُسے تاراج کر دیا نہ وہ محفلیں رہیں، نہ وہ چرچے رہے۔ زمانہ بدل گیا اور اُس کے ساتھ زمانہ کی روش بھی بدل گئی۔ ایسی حالت میں کچھ تعجب نہ تھا۔ کہ یہ ناشگفتہ کلی بھی بادِ صرصر کے تُند جھونکوں کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لئے اجل کی آغوش میں سو جاتی، لیکن اُردو کو اپنی جانفزا شمیم سے زمانہ بھر کو بسانا تھا اُردو ناموافق فضا میں بھی بڑھتی اور پھولتی رہی ع

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

اردو کا دلپذیر حسن غلامی میں بھی دلوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ اور اس نے چپکے چپکے نہ صرف اپنے وطن میں بلکہ وطن سے باہر بھی اپنے بیشمار نغمہ خواں پیدا کر لئے۔

دنیا میں اس وقت اس زبان کا جو مرتبہ ہے وہ محتاجِ تصریح نہیں۔ تاہم فروری ۱۹۲۶ء کے رسالۂ عصمت

تبصرے

نور جہاں - یہ ماہوار رسالہ امرتسر سے خواتین کی تعلیمی اور اصلاحی خدمات سرانجام دینے کی غرض سے جاری ہُوا ہے رسالہ کے ڈائرکٹر مشہور اخبار نویس جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب منہاس ہیں اور ایڈیٹر محترمہ سعادت سلطان صاحبہ ہیں۔ نومبر میں اس رسالہ کا ایک نمونہ کا پرچہ طبع ہُوا تھا۔ اور جنوری ۱۹۲۶ء سے اسکی باقاعدہ اشاعت شروع ہُوئی ہے اس رسالہ کے بیشتر مضامین مفید اور دلچسپ ہیں اور بلاشبہ یہ خواتین کے بہترین رسالوں میں شمار کیا جاسکتا ہے بعض مستقل عنوانات کی تحت میں ہر مہینے مفید معلومات بہم پہنچائی جائینگی مثلاً "ماں اور اس کا بچہ" کے عنوان سے بچوں کی نگہداشت کے متعلق ہدایات درج ہونگی تندرستی اور صحت کے ماتحت خود ماں کی صحت اور اس کی تندرستی یعنی بال چہرے ہاتھ اور دانتوں وغیرہ کے متعلق ہدایات درج کیجائینگی دوسرے مستقل عنوان "خوان نعمت" "دنیائے نسواں" "رفتار زمانہ" "صنعت و دستکاری" "باب تفریح" وغیرہ ہیں۔ یہ رسالہ عورتوں اور لڑکیوں کیلئے ہر نوع مفید ہے اور ہم اہل ملک سے اسکی قدردانی کی سفارش کرتے ہیں کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ حجم تقریباً ۸۰ صفحے سالانہ قیمت قسم اوّل پانچ روپے ششماہی تین روپے قسم دوم سالانہ تین روپے ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے۔

مینجر رسالہ نور جہاں امرتسر سے طلب فرمائیے۔

سہیل - یہ انجمن اردوئے معلیٰ علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اسوقت ہمارے سامنے سہیل کا جوبلی نمبر رکھا ہے کہ یہی اس رسالہ کا پہلا نمبر ہے۔ رسالہ کے مرتب جناب رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) ہیں۔ رسالہ کے ظاہری و باطنی حسن و ترتیب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اعلیٰ درجہ کے علمی مضامین کے علاوہ مشہور مصوّر مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کی متعدد تصاویر بھی رسالہ کی زینت کا سامان بہم پہنچا رہی ہیں، علامۂ اقبال کی تصویر اور اُنکی ایک غیر مطبوعہ نظم بھی رسالہ میں شامل ہے، کاغذ لکھائی چھپائی سب چیزیں قابل تعریف ہیں۔ اس پرچہ کا حجم ۱۶۲ صفحات ہے چندہ سالانہ چھ روپے اور فی پرچہ دو روپیہ قیمت مقرر ہے۔ مینجر سہیل مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے طلب فرمائیے۔

علی گڑھ میگزین کا جوبلی نمبر - علی گڑھ میگزین نے جوبلی کی تقریب پر اپنا یہ نمبر خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسکا حجم ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور تمام مضامین اہم اور بلند معیار کے ہیں کہیں کہیں علیگڈھ کی مخصوص ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ نظمیں بھی بہت اچھی ہیں۔

ڈاکٹر اقبال، خواجہ حسن نظامی۔ سید سجاد حیدر، مولانا عبدالحلیم شرر کی عکسی تصاویر بھی رسالہ کو زیب دے رہی ہیں

علیگڑھ کالج کے قدیم وجدید بانیوں اور سرپرستوں کا ایک گروپ اور کچھ عمارات کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ کاغذ، لکھائی چھپائی نہایت نفیس ہے، میگزین کا انگریزی نمبر بھی اسی اہتمام سے شائع ہُوا ہے اس میں بھی بہت سی دوسری تصویریں ہیں اور مضامین بھی بہت اچھے ہیں دونوں پرچے مینجر علی گڑھ میگزین علیگڑھ سے مل سکتے ہیں +

نشاطِ رُوح ۔ جناب اصغر حسین صاحب اصغر کا مجموعۂ کلام ہے۔ مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے ایل ایل بی نے دیباچہ لکھا ہے اور مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی نے ۷۰ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں شاعری پر ایک مشرح بحث کرنیکی کوشش کیگئی ہے آخر میں جناب اصغر کی غزلیات درج ہیں۔ کلام اصغر کے شائقین کیلئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت اچھا ہے۔ قیمت سرورق پر درج نہیں۔ پتہ بھی درج نہیں غالباً مطبع معارف اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے +

ریویو ۔ حافظ قمر الدین اینڈ سنز تاجران کتب اندرون موچی دروازہ لاہور نے مختلف قسم کے نہایت نفیس رنگین قطعات ہمیں ریویو کیلئے بھیجے ہیں۔ بڑے قطعات کا سائز "۲۰ × "۱۶ ہے اور اُن پر دس قسم کے علیحدہ علیحدہ مضامین درج ہیں چھوٹے قطعات کا سائز "۱۴ × "۱۰ ہے اور اُن پر بیس قسم کے مختلف مضامین درج کئے گئے ہیں، یہ قطعے دبیز روغنی کاغذ پر مختلف رنگ کے خوبصورت حاشیوں میں مندرج ہیں بڑے قطعات پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے نقشے بھی موجود ہیں ۔ یہ قطعے مکانوں کی آرائش کیلئے نہایت موزوں ہیں حافظ قمر الدین نے ان پر ایک کثیر سرمایہ صرف کیا ہے ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ان متبرک قطعوں کو خرید کر انکی حوصلہ افزائی فرمائیں کیونکہ درحقیقت یہ قطعے قابلِ قدر ہیں قیمتِ کلاں ۴ر فی عدد، خرد ۲ر فی عدد حافظ صاحب ممدوح سے مندرجہ بالا پتے سے منگوائیے +

نویں شلپ مالا ۔ یہ کتاب شریمتی ہیمنت کماری چودھرانی پرنسپل گرل سکول پٹیالہ نے ہندی زبان میں لکھی ہے سلائیوں کی مدد سے لڑکیاں اون، سوت، ریشم سے جو جو بینظیر چیزیں تیار کرسکتی ہیں شریمتی چودھرانی جی نے بڑی اچھی طرح سے انکے طریقے سمجھائے ہیں، اس کتاب میں سو سے زیادہ تصویریں ہیں جو لڑکیاں ہندی بھاشا سے بالکل ناواقف ہیں وہ صرف تصویروں ہی کو دیکھ دیکھ کر کام بخوبی کرسکتی ہیں مصنفہ کی ہدایات کو سمجھنے کیلئے زیادہ لیاقت درکار نہیں۔ ہندی حروف کو پڑھ لینے والی لڑکیاں انکی زبان کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہیں جس خوش اسلوبی سے مصنفہ نے قاعدے سمجھانیکی کوشش کی ہے قابل تعریف ہے موزے، دستانے، بنیان، فراک، واسکٹ، ٹوپی، کوٹ وغیرہ ہر ایک کے بنانیکی ترکیب بہت آسان طریقہ سے بتائی گئی ہے ہر ایک لڑکی کے پاس جسے سلائیوں کے کام کا شوق ہے اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیئے۔ کتاب کے ساتھ ایک فٹ رولر بھی دیا جاتا ہے قیمت صرف ؏ ریشمی جلد ۳ر ملنے کا پتہ۔ شریمتی ہیمنت کماری چودھرانی ۔ لال باغ ۔ پٹیالہ

ہمایوں کے متعلق رائیں

علامۂ اقبال

رسالۂ ہمایوں ہر اعتبار سے اُردو کے بہترین رسالوں میں سے ہے خواجہ حسن نظامی صاحب نے خوب کہا ہے کہ ہمایوں بڑھ رہا ہے بڑھیگا اور اُسکو کوئی شیر شاہ زک نہ دے سکیگا۔ (محمد اقبال)

"بمبئی کرانیکل" (بمبئی)

جنوری نمبر کا افتتاح بشیر احمد صاحب کی حمد سے ہوا ہے عہد حاضر میں ہندی اور اردو کی ترقی کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے قابل قدر ہے اور اُردو زبان کے بہی خواہوں کو چاہیئے کہ محمد سعید صاحب کی مفید تجاویز کو جامۂ عمل پہنانیکی پوری کوشش کریں انتہائے یاس اور داماد کا انتخاب اچھے افسانے ہیں "تدبیر منزل" میں جناب خلیق طوسی نے بجا طور پر کہا ہے کہ جبتک مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے دماغی و ذہنی ارتقا کی طرف توجہ نہ کیگئی گھروں میں اطمینان و سکون کی زندگی میسر نہیں ہوسکتی اس نمبر میں سر اقبال کے فارسی اشعار خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ (ترجمہ بمبئی کرانیکل ۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء)

مشہور انگریزی ادیب سردار جوگندر سنگھ صاحب وزیر زراعت پنجاب

میں ہمایوں کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اسکی وسعت خیال اُسکی بے تعصبانہ روش اور اُسکے مضامین کی دلاویز معقولیت کا معترف ہوں میں آپکو اس بلند پایہ رسالہ کا مدیر ہونے پر قابل مبارکباد سمجھتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ زمانۂ مستقبل میں اسکا اثر و رسوخ بہت بڑھ جائیگا اسکی مساعی ملک میں اتحاد اور یکجہتی کا خوشگوار ماحول پیدا کردینگی۔ (ترجمہ)

جناب سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ہمایوں متانت اور دلچسپی کو دوش بدوش لئے، ماہ بماہ ترقی کر رہا ہے مجھے خوشی ہے کہ اُسکے فاضل ایڈیٹر نے اُس کی دلکشیوں میں اضافہ کرنیکا تہیہ فرمایا ہے۔

علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

میں نے ہمایوں کا جنوری نمبر دیکھا ہے ادبی محاسن کا جو بلند معیار قائم کرنیکی کوشش آپنے کی ہے اس کے لئے آپکو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں۔ مجھے اس امر سے مسرت ہوئی ہے کہ آپکے رسالہ کی تصاویر میں خصوصیت کی شان جھلکتی ہے میری دلی خواہش ہے کہ آپکی مساعی کامیاب ہوں۔

فطرت نگار سُدرشن کو پانچسو روپیہ انعام

گورنمنٹ پنجاب نے فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کتاب پر اُنہیں پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ کتاب کیسی ہوگی اور اس میں کیا ہوگا۔ مگر سچ کہا جائے تو اُن کی ہر ایک کتاب اس قابل ہے۔ کہ اُس پر کئی ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔ یہ کتاب مُصنّف نے ہندی میں لکھّی تھی۔ اور اب احباب کے اصرار پر خود ہی اسکا اُردو ترجمہ کرکے شائع کرادیا ہے۔ اس اُردو کتاب کا نام **محبّت کا انتقام** ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ محبّت جب انتقام کی بھُوکی ہو جاتی ہے۔ تو کیا کرتی ہے۔ محبّت کا ایثار کئی مصنّفوں نے لکھّا ہے مگر محبّت کا انتقام لکھنا قُدرت نے سُدرشن کیلئے اُٹھا رکھّا تھا۔ اور اب وہ چیز تیار ہے اگر آپ کو عورت کی فطرت اور محبّت کا فلسفہ نیز انسانی دل کی بلندیوں اور پستیوں کا علم حاصل کرنا ہو۔ تو محبّت کا انتقام دیکھئے۔ زبان پُرسحر۔ کاغذ چکنا۔ کتابت حسین۔ چھپائی پیاری۔ عورت مرد۔ بچے بوڑھے سب کے کام کی چیز ہے۔ **قیمت** عمر

چندن

اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی پندرہ دلچسپ کہانیاں درج ہیں۔ ہر کہانی پڑھ کر یہی خیال گزرتا ہے۔ کہ اس سے اچھّی کہانی مصنّف بھی نہ لکھ سکیگا۔ مگر ہر دوسری کہانی اس خیال کو ردّ کردیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب نے **محبّت کا انتقام** پر انعام دیا ہے لیکن سُدرشن کی نگاہوں میں چندن کا درجہ اُس سے بہت بلند ہے۔ اور اُنہیں اس کتاب کے مصنّف ہونے پر فخر ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھّا ہے۔ **قیمت** عہ سُنہری ریشمی جلد عمر

بہارستان

فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ جو مصنّف کو خود ناز ہے اور جسکے متعلق کئی دوستونکی رائے ہے کہ یہ سُدرشن کا ماسٹر پیس ہے۔ اگر آپکو بہترین کہانیاں دیکھنا ہو تو بہارستان دیکھئے۔ جسکے مقابلہ کی کتاب اُردو زبان میں آجتک شائع نہیں ہوئی۔ بینظیر کہانیاں ہیں۔ زبان صاف، پلاٹ دلکش۔ نتیجے دل میں اُتر جانیوالے۔ کاغذ خوبصورت۔ طباعت نہایت حسین اور چھپائی پیاری۔ دیباچہ منشی پریم چند صاحب نے لکھّا ہے۔ **قیمت** عہ سُنہری ریشمی جلد عمر

قوم پرست

یہ کتاب بنگال کے شہرہ آفاق ڈراماٹسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کے ایک ناٹک کا ترجمہ ہے مگر خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی جذبات کا موجیں مارتا ہُوا سمندر دیکھنا ہو۔ تو یہ کتاب پڑھیئے۔ جو آپکی آنکھوں سے زبردستی آنسو نکلوا لیگی۔ **قیمت** (عمر)

چُٹکیاں

نئی طرز، نئی ادا، درختوں، پتھروں اور ندی نالوں کے سرمن۔ چاند تاروں کے اور پھُولوں پھلوں کے لذّت آشنا خیالات، ایک ایک مضمون میں مصنّف نے دل نکال کر رکھ دیا ہے دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ **قیمت** چار آنے ۔ ۔ (۴ر)

کُنجِ عافیت

یہ ناول غضب کا دلفریب ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا بلند ترین چلن دکھا کر اُس کے ساتھ یوروپین عورت کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس ناول کو خود پڑھیئے آپ ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے لگیں گے۔ اپنی بیوی کو پڑھائیے اُس کی زندگی اور بھی بلند ہو جائیگی۔ **قیمت** ۶ر

فہرستِ مضامین

جلد ۹	بابت ماہ اپریل ۱۹۲۶ء	نمبر ۴

جہاںؔ نُما

تحفظ اطفال اور تعلیم۔ دوسرے مُلکوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی آبادی کا سالانہ اضافہ بلحاظِ اوسط، غالباً سب سے زیادہ ہے لیکن اسکے باوجود بحیثیتِ مجموعی اس مُلک کی آبادی میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوتا جسکی وجہ یہ ہے کہ نوزائیدہ بچّوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی نہنگِ اجل کا شکار ہوجاتی ہے اسکی ایک وجہ تو طبقۂ عامہ کی خستہ حالی اور بے مائگی ہے، فلاکت اور ادبار کی وجہ سے ماؤں ہی کو قوتِ لایموت میسّر نہیں ہوتی تو بچّے کیا پھلیں پھولیں گے، اسکے علاوہ افلاس کے باعث بیمار بچّوں کو طبّی امداد بھی میسّر نہیں ہوسکتی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ملک کی مائیں بالعموم بالکل ناتربیت یافتہ ہوتی ہیں اور انہیں بچّوں کے رکھ رکھاؤ کے متعلق کچھ علم نہیں ہوتا ۔

موت کے اس بیرحم ہاتھ کے مقابلہ کے لئے ملک میں مختلف قسم کی کوششیں جاری ہیں اور ماؤں کی تربیت کے لئے مختلف قسم کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، تاکہ وہ بچّوں کی نگہداشت کرسکیں۔ اسکے علاوہ بچّوں کو طبّی امداد بہم پہنچانے میں آسانیاں پیدا کیجاتی ہیں لیکن ایک سب سے بڑا مرض جو ہندوستانی بچّوں کو تباہ کررہا ہے اسکی طرف کوئی قابلِ ذکر توجہ صرف نہیں کیجاتی ۔

ڈاکٹر جر بالو نے پچھلے دنوں ایک انگریزی اخبار میں لکھا تھا کہ "ہندوستانی بچّوں کی فلاح اور بہبود کے لئے جو کوششیں جاری ہیں اُنکا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کو موت سے بچایا جائے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ صرف ماؤں کی تربیت یا طبّی امداد کی بہم رسانی ماؤں کو بغیر کسی دوسری بیرونی امداد کے اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ صحیح طریقہ سے بچّوں کی پرورش کرسکیں۔ اگر اس صیغے میں کام کرنے والے، بچّوں کی طبّی امداد کے لئے کوئی کوشش صرف کرتے ہیں تو اس سے محض چھوٹی چھوٹی بیماریوں ہی کا علاج ہوسکتا ہے لیکن جب تک اُس سب سے بڑے مرض یعنی جہالت کا علاج نہ ہوگا اس وقت تک محض طبّی امداد سے بچّوں کی نگہداشت کوئی مفید مطلب نتیجہ نہ پیدا کریگی۔ بچّوں کے تحفظ و فلاح کا کام کرنے والوں کو بچّوں کی تعلیمی ضروریات سے کبھی غفلت نہ کرنی چاہیئے"۔

فرقۂ بہائیہ - ہندوستان میں بہاء اللہ کے پیرو عام طور پر مسلمان سمجھے جاتے ہیں مسٹر اصفہانی نے اس فرقہ کے مولد و منشا یعنی ایران میں رہ کر اسکے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں جن کا ملخص ہم رسالہ اسلامک ورلڈ لاہور سے لیکر ذیل میں درج کرتے ہیں۔ مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں:- "بابیوں یا بہائیوں کا اصولِ مذہب بہاء اللہ کی الوہیت پر مبنی ہے جو بنیادی طور پر اصولِ اسلام کے سراسر متناقض ہے، وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آخری نبی نہیں سمجھتے اور نہ قران کو آخری کتاب مانتے ہیں، اُنکا طریقِ عبادت بھی مُسلمانوں سے جداگانہ ہے وہ سجدہ نہیں کرتے بلکہ عیسائیوں کی طرح محض گھٹنے ٹیک کر عبادت کرنے کا دستور اُن میں رائج ہے۔ وہ عبادت کے وقت مکہ کی طرف رخ نہیں کرتے ہندوستان میں وہ مُسلمانوں سے تشبہ کریں تو یہ بھی اُنکے اسلام کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ یورپ اور امریکا میں وہ عیسائیوں کے ساتھ مشابہت پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ محض اُنکے طریقے ہیں۔ ایران میں نہ تو وہ یوں مُسلمان سمجھے جاتے ہیں اور نہ سرکاری طور پر حکومت انہیں مُسلمان سمجھتی ہے ؛

ہندوستان میں سوراج کا خیال کب پیدا ہُوا؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سوراج کا خیال حال ہی میں پیدا ہُوا ہے اور اس کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں۔ پچھلے دنوں لاہور کے ایک انگریزی اخبار نے لکھا تھا کہ سوراج کے حصول کے لئے پہلی آواز رائے بہادر کرسٹو داس پال نے بلند کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اس اَمر کا اظہار کیا کہ ہندوستان سوراج کا حق رکھتا ہے، معاصر مذکور نے "ہندو پیٹریاٹ" سے ذیل کا مقالہ نقل کیا تھا جو رائے بہادر کرسٹو داس پال نے ۱۸۷۴ء میں لکھا تھا:-

"ہمیں اپنی توجہ ہوم رول کی طرف منعطف کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں ہندوستان کے لئے آئینی حکومت کا قیام نہایت ضروری اَمر ہے۔ بہت سی برطانوی نو آبادیوں کو یہ نعمت حاصل ہو چکی ہے لیکن ہندوستان ابتک اس سے محروم رکھا گیا ہے، حالانکہ بلحاظِ وسعتِ رقبہ، بلحاظِ آبادی اور بلحاظِ ذرائع آمدنی اس کی فوقیت مسلمہ ہے۔ اگر کینیڈا میں پارلیمنٹ قائم ہوسکتی ہے اور اگر پرنس ایڈورڈ آئلینڈ، نیوفاؤنڈ لینڈ، نیو ساؤتھ ویلز، نیوزیلینڈ اور سینٹ کرسٹوفرز آئلینڈ جیسی غیر ترقی یافتہ نو آبادیاں حکومت کی اہل سمجھی جاسکتی ہیں تو ہندوستان بدرجۂ اولیٰ اس کا اہل ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان سے دوسری تمام نو آبادیوں کا سا سلوک روا نہیں رکھا جاتا"؟

ایک ہندوستانی مدبر اور اخبار نویس نے آج سے پچاس سال قبل ہوم رول کی جس خواہش کا اظہار کیا

تھا، وہ آج بھی محض ایک "خواہش" ہے جواب تک پوری نہیں ہوئی۔ اسکے باوجود ہندوستان کے ناصح مشفق اسے بے صبری کا طعنہ دیا کرتے ہیں +

کیا نیند ایک بیکار چیز ہے ؟ ہم اپنی زندگی کا تقریباً ایک ثلث بالکل بیکار نیند میں گزار دیتے ہیں۔ یہ امر غور طلب ہے کہ کیا نیند ہمارے نظامِ جسمانی کے قیام و تقویت کے لئے واقعی ضروری ہے۔ یا ہم اپنے اوقاتِ گرامی کا ایک بہت بڑا حصہ محض ایک افسوسناک طریقے سے ضائع کر رہے ہیں" رسالہ "ماڈرن ریویو" لکھتا ہے کہ چند ہفتے گزرے جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے آٹھ طلبہ نے، جن میں سے چار عورتیں اور چار مرد تھے۔ پروفیسر موس کی نگرانی میں جو شعبۂ نفسیات کا صدر معلم ہے، ساٹھ گھنٹے کی متواتر بیداری کے تجربہ کے لئے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا +

اس تجربہ کا ایک مقصد اسی سوال کا حل تھا کہ کیا نیند واقعی ایک ضروری چیز ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا کوئی قطعی حل نہیں ہو سکا لیکن فیصلہ کا رخ وہی تھا جس پر چند مہینے قبل بعض دوسرے محققین پہنچ چکے تھے یعنی نیند کوئی موجب برکت چیز نہیں ہے۔ بلکہ فضول اور موجب نقصان عادت ہمیں اپنے اوّلیں آبا سے ترکے میں ملی ہے +

پروفیسر موس کہتا ہے کہ ابھی میرے تجربات کی محض ابتدا ہے لیکن مذکورہ بالا تجربے میں جو حیرت انگیز نتائج اس نے اخذ کئے ہیں۔ وہ ناظرین کے لئے موجب دلچسپی ہونگے۔ اس کا خیال ہے کہ نیند بھی دراصل ایک قسم کا نشہ ہے۔ شراب وغیرہ کی طرح اس کا بھی خمار ہوتا ہے، جو سونے سے ٹوٹتا ہے جس طرح شراب کی زیادہ عادت مضر ہے اسی طرح زیادہ سونا بھی مفید نہیں۔ اور اس سے جسمانی اور دماغی قویٰ معطل ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ تین سال کے عرصے میں پروفیسر موس اپنی نیند کا وقت کم کرتے کرتے چھ گھنٹے پر لے آیا ہے، لیکن اس سے اس کی صحت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا۔ اگرچہ کثرتِ بیداری سے سستی اور کاہلی طاری ہو جاتی ہے، لیکن جسم پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ مذکورہ بالا آٹھ طلبہ جب اپنی بیخوابی کا طویل عرصہ ختم کر چکے تو دو طالب العلم ڈاٹسن نامی عمر ۱۷ سال اور لسٹر پٹری عمر ۳۵ سال مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی بیخوابی کے عرصہ کو ساٹھ کی بجائے اسی گھنٹے تک کی طوالت دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس میعاد کے گزر چکنے پر وہ اور بیدار رہنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی اہیں

اجازت نہ دی گئی۔

جن لوگوں نے خواب کے اسرار پر غور کیا ہے اُن میں ڈاکٹر ایچ۔ ایل۔ ہالنگورتھ پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم بیدار رہنے والوں کی ایک پشت تیار کر سکتے ہیں، اسکا خیال ہے کہ نیند کی عادت کو کم کرتے کرتے بتدریج ہم اسے بالکل زائل کر سکتے ہیں۔ اسکے لئے جو طریقہ اس نے تجویز کیا ہے، یہ ہے کہ ہر دو مہینے کے بعد سونے کے وقت میں پانچ منٹ کی کمی کر دی جائے، اس طرح اگر ہم آٹھ گھنٹے کی میعاد سے ابتدا کر کے میقاتِ خواب کی تخفیف شروع کر دیں تو سولہ سال میں نیند کا نشہ (بشرطِ امکان) بالکل کافور ہو جائیگا۔ ڈاکٹر ہالنگورتھ کا خیال ہے کہ نیند ایک بہت بڑی بیماری ہے۔ اور ہمیں اسکے ازالہ کی طرف اتنی ہی توجہ منعطف کرنی چاہیئے، جتنی توجہ ہم دوسرے امراض کے دفاع پر صرف کرتے ہیں اس کا خیال ہے کہ نیند کی عادت ہمیں اپنے اوّلیں آبا سے ترکے میں ملی ہے۔ چونکہ اُنکے زمانے میں بجلی کی روشنی اور لمپ وغیرہ نہ تھے۔ اس لئے رات کے وقت وہ اپنا کام چھوڑ دینے پر مجبور ہوتے تھے۔ اور سورج کی روشنی کے رجوع کے وقت تک وہ ایک بےمعنی سی غفلت میں پڑے رہتے تھے۔ پروفیسر ہالنگورتھ کا خیال ہے کہ رات کے آتے ہی ہمارے اونگھنے اور سونے کی عادت کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

بعض اور محققین نیند کا کوئی بدل تجویز کرنیکی کوشش میں ہیں۔ اُنکا خیال ہے کہ دماغ کے خلّیات میں برقی کیمیائی ردِّعمل نیند کی ضرورت کا باعث ہوتا ہے کیونکہ اس سے خلّیات کی قوّت زائل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر کاٹن بجلی کا ایک آلہ تیار کر رہا ہے اور اب نیند کی بجائے اس آلہ کے ذریعہ سے از کار رفتہ خلّیات کو دوبارہ تقویت پہنچانے کی کوشش کیجائیگی۔

بہرحال اس تمام تحقیقات کا نتیجہ کچھ بھی ہو اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ کہ بعض لوگ ایک بڑی حد تک نیند کی ضرورت سے مستغنی ہوتے ہیں اور اسکے باوجود وہ بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں ٹامس ایڈیسن کا خیال ہے کہ نیند کوئی بہت زیادہ ضروری چیز نہیں ہے۔ نپولین، فریڈرک اعظم اور شلر وغیرہ روزانہ صرف تین سے لے کر چار گھنٹے تک سوتے تھے۔ اگر وہ اس قدر کم نیند سے مطمئن ہو سکتے تھے، تو کیا وجہ ہے کہ دوسرے لوگ نہ ہوں۔

تاج

شاہانِ مغلیہ نے اپنے شاندار عہدِ حکومت کی جو عدیم المثال یادگاریں چھوڑی ہیں ان میں تاج محل کو بلندترین درجہ حاصل ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہی وہ عمارت ہے جس کی تعمیر کے لئے شاہجہاں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کے تمام ذرائع استعمال کر دئے تھے۔ یہ شاہجہاں جیسے جلیل القدر بادشاہ کی انتہائی توجہ ہی کا طفیل ہے کہ "تاج" صنعت وحرفت کا وہ بہترین نمونہ ہے جو انسانی عقل فنِ تعمیر کی تکمیل میں اب تک ظاہر کرسکی ہے آج "تاج" کی بدولت اکبرآباد کی سرزمین مرجع عوام وخواص بنی ہوئی ہے۔ دُنیا کے گوشے گوشے سے ہر ملک کے سیاح اس حیرت انگیز عمارت کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور اپنے دل ودماغ پر ایک ناقابلِ اظہار اثر لے جاتے ہیں۔ تاج محل کی تاریخی حیثیت اور اس کے بنانے والوں کے متعلق مستند تاریخی کتابوں اور بعض مشاہیر کے مضامین سے مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ ناظرینِ ہمایوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ؛

ممتاز محل

ممتاز محل جس کا مقبرہ "تاج محل"، "تاج گنج"، "تاج بی بی کا روضہ"، یا صرف "تاج" کے نام سے مشہور ہے مرزا ابوالحسن آصف خاں یمین الدولہ[1] کی بیٹی اور مرزا غیاث الدین قزوینی آصف خاں[2] کی نواسی تھی۔ ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۷ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہزادہ خرم (جو جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے لقب سے بادشاہ ہوا) کی نسبت اسکے ساتھ کی۔ نام ارجمند بانو بیگم تھا اور خطاب نواب عالیہ بیگم قرار پایا۔ نسبت کے وقت حسبِ دستور ومراسم جہانگیر نے سونے کی انگوٹھی نواب عالیہ بیگم کو اپنے ہاتھ سے پہنائی۔ نسبت کے پانچ سال بعد ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں نہایت تزک واحتشام کے ساتھ شادی ہوئی اس وقت شاہجہاں کی عمر ۲۰ سال ۳ مہینہ چھ روز کی تھی اور عالیہ بیگم

---

[1] مرزا ابوالحسن یمین الدولہ آصف خاں مرزا غیاث بیگ طہرانی الملقب بہ اعتماد الدولہ کا بیٹا تھا۔ یہ اعتماد الدولہ وہی ہے جس کا مقبرہ آگرہ میں مشہور ہے اور جو اکبر کے عہد میں وارد ہندوستان ہوا تھا۔ اسکی بیٹی نورجہاں جہانگیر کی بیوی تھی اور اسکا لڑکا ابوالحسن وزیر تھا۔ بڑا زبردست فاضل و مدبر تھا اور امورِ سلطنت میں خاص دخل رکھتا تھا۔ شاہجہان نے اسے خانخاناں کے درجہ تک پہنچایا تھا ؛

[2] ممتاز محل کی ماں کا نام دیوانجی بیگم تھا جو غیاث الدین قزوینی کی بیٹی تھی۔ غیاث الدین کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے ؛

۱۹ سال ایک ماہ چھ روز کی تھی۔ شاہجہان اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ نواب ممتاز الزمان ممتاز محل کا خطاب عطا کیا۔ جب تخت نشینی کا موقع آیا تو دو لاکھ اشرفیاں اور چھ لاکھ روپیہ بیگم کو نقد دے کر دس لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا اور اکثر امورِ سلطنت میں مشورہ لیتا۔ ممتاز محل بھی حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھی۔ اپنے خلق۔ اطاعت اور دینداری کے باعث ہر وقت بادشاہ کا دل اپنے قبضہ میں رکھتی اور وہ اس پر جان نثار کرتا۔

۱۰۴۰ھ میں جبکہ شاہجہان دکن کی فتوحات میں مشغول تھا۔ برہان پور میں ممتاز محل کے دردِ زہ ہوا اور ۳۰ گھنٹے مسلسل تکلیف جاری رہی۔ آخر کار منگل کے دن ۱۷ ذیقعد ۱۰۴۰ھ مطابق ۷ جون ۱۶۳۱ء کو گوہر آرا بیگم پیدا ہوئی اور اس کے پیدا ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ممتاز محل نے دنیا کو خیرباد کہی۔

عبدالحمید لاہوری نے اپنے بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ:۔

"جب بیگم کو معلوم ہوا کہ اس کی موت یقینی ہے تو اس نے شہزادی جہاں آرا بیگم کو بادشاہ کے بلانے کے لئے بھیجا۔ بادشاہ نہایت رنج و فکر کے ساتھ فوراً آیا۔ بیگم نے اپنے بیٹوں اور اپنی ماں کو اس کے سپرد کر کے سفرِ آخرت اختیار کیا"۔

ایک فارسی قلمی کتاب[1] میں اس موقع کے متعلق مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

"بیان کیا جاتا ہے کہ آخری لڑکی کی پیدائش سے قبل ممتاز محل کے رحم میں بچہ کے رونے کی آواز آئی جسکے سنتے ہی بیگم اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی اور بادشاہ کو پاس بلا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ ایک مشہور بات ہے کہ جب بچہ رحم میں روتا ہے تو اس کی ماں زندہ نہیں رہ سکتی" اب چونکہ میری قسمت میں اس دارِ فانی کو چھوڑ کر سفرِ آخرت اختیار کرنا ہے اس لئے اگر کوئی بات میری زبان سے خلافِ مزاج نکلی ہو تو معاف کیجئے اور میرے قصور سے درگذر فرمائیے۔ یہ اب میرا آخری سفر ہے۔ آپ کے والد کے عہدِ حکومت میں جب آپ قید تھے اور دوسری مصیبتیں آپ کو گھیرے ہوئے تھیں تو میں آپ کی شریکِ قسمت رہی لیکن آج جبکہ خدائے بزرگ و برتر نے دنیا کی حکومت آپ کو بخشی ہے میں رنج و اندوہ کے ساتھ رخصت

---

[1] دیوان آفریدی مصنفہ قاسم علی آفریدی پروفیسر جدوناتھ سرکار نے اپنے مضمون میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ دیوان کے ساتھ مصنف نے اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی شامل کی ہے جس میں تاج کے متعلق تذکرہ کیا ہے یہ کتاب خدابخش لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ اس کا آگے بھی حوالہ دیا گیا ہے۔

ہو رہی ہوں۔ آپ وعدہ کیجئے کہ میری دو آخری وصیتوں پر عمل کیجئے گا" بادشاہ نے ان وصیتوں کو دریافت کیا اور وعدہ کیا کہ دل و جان سے بجالاؤں گا۔ بیگم نے کہا "خدا نے آپ کو چار بیٹے اور چار بیٹیاں[1] عطا کی ہیں۔ وہ آپ کے نام و نمود کے لئے کافی ہیں۔ اب دوسری بیوی کا خیال نہ کیجئے۔ مبادا اسکے اور میرے بچے تخت و تاج کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوں۔ میری دوسری التجا یہ ہے کہ میری قبر پر ایک ایسا مقبرہ تعمیر کرائیے جو تمام دنیا میں عدیم المثال ہو"

اس گفتگو کے ایک لمحہ کے بعد دہر آرا (گوہر آرا) پیدا ہوئی اور بیگم مر گئی"[2]

اس مشہور افسانہ کے مقابلہ میں عبدالحمید لاہوری کا بیان صحیح ہے اور اسی کو منتخب اللباب نے نقل کیا ہے۔

شاہجہاں کا صدمہ

بیگم کی وفات سے شاہجہاں کو جس قدر صدمہ ہوا اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک ہفتہ تک جھروکے میں نہ آیا اور نہ حکومت کا کوئی کام سرانجام دیا۔ رنگین کپڑے پہننا عطر لگانا اور جواہرات کا استعمال کرنا دو سال تک چھوڑے رکھا۔ دنیا کی کوئی چیز اچھی نہ معلوم ہوتی تھی سارا راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو جانے کو تیار تھا مگر حکومت کو اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر اس خیال سے باز رہا سالانہ درباروں کے موقع پر گانا بجانا یک قلم ترک کر دیا گیا۔ نغمہ و سرود کی آوازیں نوحہ و ماتم کی صدائیں معلوم ہونے لگیں۔ اس دردناک سانحہ سے قبل اس کی ڈاڑھی کے صرف دو بال سفید تھے مگر اب اس کے بعد ساری ڈاڑھی جلد سفید ہو گئی۔ بیگم کو یاد کر کرکے بار بار روتا تھا اور بے چینی اور کرب کی حالت میں یہ شعر پڑھتا تھا ؎

زندگی بہر دیدنِ یار است
یار چوں نیست زندگی عار است

جب کبھی بیگم کی قبر پر جاتا تو آنسوؤں کے دریا بہا دیتا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس نے مظفر حسین مرزا اور شاہ نواز خاں کی لڑکیوں سے بھی شادی کی مگر ان شادیوں میں محبت کے جذبات کو دخل نہ

---

[1] یہ بیان غلط ہے۔ ممتاز محل کے کل چودہ بچے تھے۔ جن میں سے سات تو اسکی زندگی ہی میں مر گئے اور سات اس کے بعد زندہ رہے۔

[2] یہ قصہ عام طور پر مشہور ہے مگر اس کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں اکثر دوسری فارسی کی کتابوں میں بھی کم و بیش انہیں الفاظ کے ساتھ اس قصہ کو بیان کیا گیا ہے مگر مستند کتبِ تواریخ اس کے باب میں خاموش ہیں۔

تھا۔ وہ تو محض "باقتضائے مصلحت" تھیں[1]۔

ممتاز محل کی نعش

برہانپور میں بیگم کی نعش دریائے تاپتی کے کنارے بطور امانت دفن کی گئی اور قبر پر ایک عمارت بھی تعمیر کر دی گئی۔ بادشاہ ہر جمعہ کو قبر پر جاتا تھا اور فاتحہ پڑھ کر خیرات کراتا تھا۔

چھ مہینہ کے بعد ۱۷ جمادی الاوّل (یکم دسمبر) کو شاہ شجاع۔ وزیر خاں اور ستی النساء بیگم ممتاز محل کی نعش کو آگرہ لائے۔ بادشاہ نے حکم دیدیا تھا کہ "راستہ بھر خیرات کی جائے اور آگرہ پہنچ کر راجہ مان سنگھ کے باغ میں جواب اس کے پوتے جے سنگھ کے پاس ہے بیگم کو دفن کیا جائے"۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ۲۰ دسمبر کو نعش آگرہ پہنچ گئی اور ۱۵ جمادی الاخر ۱۰۴۱ھ کو دفن کی گئی۔ قبر پر ایک قبہ بنا دیا گیا اور سترہ سال تک یہ نعش اسی جگہ دفن رہی۔

کرنل اینڈرسن (Colonel Anderson) نے ایک فارسی کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے اس کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ بیگم کی نعش کو آگرہ لاکر چوک کے قریب دفن کیا گیا اور تاج کی تعمیر کے دوران میں یہ نعش اسی جگہ دفن رہی۔ تاریخی حیثیت سے اس غیر مصدقہ بیان کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔

شاہجہان کی دکن سے واپسی

ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ میں بادشاہ دکن سے واپس آکر دارالخلافہ آگرہ میں داخل ہوا۔ ممتاز کی یاد دل کو بے چین کئے ہوئے تھی۔ آتے ہی حکم دیا کہ عرس کی تیاریاں کی جائیں۔ "پچاس ہزار روپیہ خیرات کیا گیا پچاس ہزار محتاج اور عفیفہ عورتوں کو دیا گیا"۔

۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ کو پھر عرس کیا گیا۔ قبر کی عمارت زیر تعمیر تھی۔ چاروں طرف خیمے نصب کئے گئے۔ شاہجہان اہل حرم اور اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر آیا اور عرس میں شریک ہوا۔ مقررہ رقم کا نصف یعنی پچیس ہزار روپیہ[2] تقسیم کیا گیا۔

---

[1] منتخب اللباب (خافی خاں)۔

[2] تاریخ ہند مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ جلد ہفتم۔

تاج کی تکمیل

شاہجہان کی تخت نشینی کے چار سال بعد ۱۶۳۱ء میں تاج کی بنیادیں کھدی گئی تھیں اور ۱۷ سال کے بعد ۱۶۴۸ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوگئی۔

منتخب اللباب اور بادشاہ نامہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا مگر دیوان آفریدی کے مصنف نے مصارف کا اندازہ نو کروڑ سترہ لاکھ روپیہ لکھا ہے اور ایک دوسرے بیان کے مطابق یہ اندازہ چار کروڑ گیارہ لاکھ اڑتالیس ہزار آٹھ سو چھبیس روپیہ سات آنے چھ پائی ہے۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ پچاس لاکھ کا اندازہ بہت کم ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا پچاس لاکھ کی رقم تو اس قدر کم ہے کہ شاید محض بنانے والوں کی تنخواہوں کو کافی ہوئی ہو گی۔ ٹریورنیر (Tavernier) نے جو ایک فرانسیسی سیاح تھا اور شاہجہان کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:۔

"بائیس سال تک بیس ہزار آدمیوں نے متواتر کام کیا ہے اس کے بعد تاج کی عمارت تکمیل کو پہنچی ہے اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مصارف کس قدر کثیر ہوئے ہونگے۔ کہا جاتا ہے کہ جتنا روپیہ تمام عمارت کی تعمیر میں صرف ہوا ہے اسی قدر صرف پاڑ بنانے میں خرچ ہوا ہے کیونکہ لکڑی کی کمی کے باعث تمام پاڑ اینٹوں سے بنانی پڑی ہے حتی کہ محرابوں کی ڈاٹیں بھی اینٹوں ہی کی بنائی ہیں، اس دشواری کے باعث روپیہ کے ساتھ ساتھ محنت بھی بہت زیادہ صرف ہوئی ہے"[1]

عمارت کی مختصر تشریح

تاج کی عمارت آگرہ کے جنوب میں دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ ایک سنگ سرخ کا دروازہ جس میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے جلوخانہ[2] کی عمارتیں پڑتی ہیں۔ ان سے گذر کر ایک دوسرا بلند دروازہ سنگ سرخ کا ہے جس پر آیات قرآنی پچیکاری کی ہوئی ہیں۔ اس دروازہ کے گنبد کے نیچے متعدد دالان ہیں۔ ایک زینہ کے اوپر عجائب خانہ ہے۔ یہ تاج کا صدر دروازہ ہے اس میں

---

[1] Tavernier's Travels, Vol I pp 110, 111

[2] یہ عمارتیں ۱۲۸ دالانوں اور کمروں پر مشتمل ہے جو کنیزوں کے لئے تاج کی تکمیل کے پانچ سال بعد مکمل ہوئی تھیں ان میں ممتاز محل کی خاص کنیز کا مقبرہ ہے۔

داخل ہونے کے بعد ایک وسیع قطعۂ زمین میں ایک پُرفضا باغ لگا ہُوا ہے، سامنے تاج کی عمارت نظر آتی ہے بیچ میں ایک روش پتھر کی تاج کی عمارت تک جاتی ہے۔ اس روش کے بیچ میں ایک نہر ہے اور دونوں جانب سرو کے درخت ہیں۔ اصل عمارت سنگ مرمر کی بنی ہُوئی ہے جس کی بنیادیں نہایت گہری کھودی گئی ہیں بنیادوں کے اوپر سطح زمین سے ۶ اگز اونچا ایک چبوترہ بنایا گیا ہے جس کا طول ۴۷۳ گز اور عرض ۱۴۱ گز ہے اور جس کے چارکونوں پر چار مینار ہیں اس چبوترہ پر ایک دوسرا چبوترہ سات گز اونچا اور ۱۲۰ گز مربع ہے۔ دوسرے چبوترہ پر ایک گز کی کرسی دے کر روضہ کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ ایک مثمن ایوان کے اوپر گنبد تعمیر کیا گیا ہے قطر اس کا ۲۲ گز اور بلندی ۳۰ گز ہے اس گنبد پر ایک چھوٹا گنبد اور ہے جس کے اوپر گیارہ گز لمبا خالص سونے کا کلس چڑھا ہُوا ہے۔ گنبد کا دور ایک سو دس گز ہے۔ ایوان کے اندر چاروں طرف متعدد دالان در دالان ہیں اور اس کے نیچے سطح زمین تک پہنچنے کے واسطے زینے ہیں۔ یہاں تاریک تہ خانہ میں ممتاز محل اور شاہجہان کی اصلی قبریں ہیں اور بالکل اس کے اوپر صرف قبروں کی صورتیں بنی ہُوئی ہیں۔ شاہجہان کی قبر بیگم کی قبر سے کسی قدر اونچی ہے دونوں قبروں کے گرد سنگ مرمر کے مثمن مجحر لگے ہُوئے ہیں، بیگم کی قبر کے گرد جو مجحر ہے" اس کا دروازہ سنگِ یشم کا ہے۔ بطرح بیند رومی؟ اس کے مفاصل کو تنکھا آہنی؟ سے بنایا ہے اور اس کو زرافشاں کیا ہے، اور دس ہزار روپیہ اس میں خرچ کیا ہے[1]؛ قبر پر ایک مصری صنعت کا جھاڑ لٹکا ہُوا ہے جو لارڈ کرزن نے لٹکوایا تھا اور جس پر چاندی سونے کا کام ہو رہا ہے۔ عمارت کے اندر نہایت بیش بہا پتھروں سے جن کا ذکر آگے آئیگا پچیکاری کا کام ہو رہا ہے۔ روضہ کی عمارت سے مشرق اور مغرب کی جانب دو عمارتیں سنگِ سرخ کی ہیں۔ مغربی عمارت ایک مسجد ہے اور مشرقی عمارت مہمان خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دونوں عمارتیں ہو بہو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مہمان خانہ کی دیواریں محرابدار نہیں ہیں اور نہ اس کا فرش بشکل جانماز ہے۔

اگر جلو خانہ سے لیکر جمنا تک کے چپہ چپہ کی مفصل تشریح کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب کیجا سکتی ہے اس لئے میں یہاں بخوفِ طوالت زیادہ تشریح نہیں کر سکتا۔ اور تاج کی تشریح کے متعلق ایک

---

[1] الفنسٹن نے لکھا ہے کہ پہلے اس جگہ خالص سونے کا مجحر لگا ہوا تھا اس کو ہٹا کر اورنگ زیب نے دوسرا پتھر کا لگوا دیا۔ مگر مولوی ذکاء اللہ نے بادشاہ ناموں کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلا مجحر جو شاہجہان نے دکن سے واپسی پر تیار کرایا تھا وہ چار لاکھ روپیہ میں تیار ہُوا تھا۔ اسے خود بادشاہ نے چوروں کے خوف سے تبدیل کرا دیا اور یہ دوسرا مجحر لگوا دیا۔

قابل مورخ[1] کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس نے لکھا ہے کہ :-

"یہ تقریباً ناممکن ہے کہ تاج کے متعلق ان لوگوں کے دماغ میں کوئی صحیح اندازہ پیدا کیا جائے جنہوں نے اسے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے کیونکہ اس کی عمارت نہ صرف اپنے حسن و نزاکت میں بے نظیر ہے بلکہ اسکی وضع وقطع بھی نہایت پیچیدہ ہے۔ اگر تاج صرف ایک مقبرہ ہوتا تو اس کی تشریح کی جا سکتی تھی لیکن وہ چبوترہ جس کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں، بذات خود فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے اس کے علاوہ دونوں جانب دو عمارتیں اور ہیں جن میں سے ایک مسجد ہے خود یہ مسجد ایک ایسی عمارت ہے جو اگر دوسرے ممالک میں ہوتی تو نہایت اہم خیال کی جاتی ...... اگرچہ تاج خود بھی نہایت خوبصورت ہے لیکن اس کے اردگرد کی عمارتوں۔ میناروں اور چبوترے نے اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ حقیقت میں وہ بہت سی خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسری کے ماتحت نہایت مکمل طریقہ پر وابستہ ہیں۔ یہ مجموعہ تمام دنیا کی عمارتوں میں عدیم المثال ہے جو لوگ عام طور پر عمارتوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتے وہ بھی اسے دیکھ کر اپنے دل پر عجب اثر محسوس کرتے ہیں"

شاہجہان نے ایک ایسا ہی دوسرا مقبرہ اپنے لئے جمنا کے بائیں کنارے پر بنانے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس کہ اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا اور اس کی زندگی کا آخری دور اپنے تمام آلام و مصائب کے ساتھ آپہنچا

تاج کے بنانے والے

جب شاہجہان نے تاج کی تعمیر کا ارادہ کیا ہے تو اس نے نہایت قابل قابل انجینیروں اور ماہرین فن عمارت کو طلب کر کے نقشے تیار کرنے کا حکم دیا۔ سب نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق خاکے تیار کئے اور جب ایک خاکے کو شاہی منظوری حاصل ہوگئی تو ایک لکڑی کا نمونہ تیار کیا گیا۔ اور عمارت کی بنیادیں کھودی جانے لگیں ؛

کہا جاتا ہے کہ ۱۶۴۱ء میں ایک ہسپانوی راہب آگرہ میں رہتا تھا اس کا بیان ہے کہ تاج کے معماروں میں ایک اٹلی کا باشندہ مسمی جیرونیمو ویرونیو (Geronimo Vera) بھی شامل[2] تھا۔ اس بیان کے مطابق اُن متعصب مورخین کو جو دنیا کی تمام خوبیاں اپنی طرف منسوب کر لینے میں کمال رکھتے ہیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور

---

[1] History of India by Elphinstone

انہوں نے اس کا اعلان کرنا شروع کر دیا کہ تاج اطالوی صنعت کا نمونہ ہے پھر دوسرے لوگ اپنے قیاسات کو دخل دے کر اس بنیاد پر عمارت کھڑی کرنے لگے۔ یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ تاج پر جو پچیکاری کا کام ہو رہا ہے اس کے چند خاص بیل بوٹے اٹلی کی ایک مخصوص بیل سے مشابہ ہیں اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ اٹلی کا کوئی ماہر ہندوستان آیا ہوگا اور اس کی ہدایات کے ماتحت تاج کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی ہو گی۔ مگر جہانتک تاریخی شہادت کا تعلق ہے اس بیان میں ذرہ برابر صداقت نہیں معلوم ہوتی عہد شاہجہانی کے تمام مورخین اس کے متعلق خاموش ہیں۔ خود یورپ کے سیاح برنیر (Bernier) اور ٹیورنیر (Tavernier) کسی اٹلی کے معمار کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ ٹیورنیر تو خود تاج کی تعمیر کے دوران میں ہندوستان میں موجود تھا۔ اگر اٹلی کا کوئی انجینیر ہندوستان بلایا جاتا یا خود یورپ سے سفر کر کے یہاں آتا اور اس قدر دلفریب نقش و نگار بناتا تو بادشاہ ناموں کے مورخین ایسے نہ تھے کہ اس کا ذکر بھی نہ کرتے اور یہ لکھ کر خاموش ہو جاتے کہ تاج کی تعمیر مکرمت خاں اور میر عبدالکریم کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچی۔ ان مستند تواریخ کے علاوہ بعض فارسی کی قلمی کتابوں سے اب تاج کے بنانے والوں کی ایک فہرست بھی معلوم ہوگئی ہے جو ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ اس میں بھی کہیں کسی یورپین معمار کا ذکر نہیں ہے :-

نمبر شمار		نام	کام	تنخواہ ماہانہ
۱	×	امانت خاں شیرازی	طغرا نویسی	ایک ہزار روپیہ
۲	×	موہن لال لاہوری	نامعلوم	۸۰۰ روپیہ
۳	×	محمد خاں بغدادی	سنگتراشی	۹۰۰ روپیہ
۴	×	محمد حناف خاں	معماروں کی نگرانی	۵۰۰ روپیہ
۵	⁂	اسمعیل خاں رومی	گنبد اور دیوار کی تیاری	۵۰۰ روپیہ
۶	×	موہن لال	پچیکاری	۵۰۰ روپیہ
۷	×	منوہر لال لاہوری	نامعلوم	۵۰۰ روپیہ
۸	×	خاتم خاں لاہوری	گنبد کی تیاری	۲۰۰ روپیہ
۹	⁂	استاد عیسیٰ اکبرآبادی	معماری	نامعلوم
۱۰	⁂	استاد پیرا دہلوی	نجاری	″

نمبر شمار		نام	کام	تنخواہ ماہانہ
۱۱	*	بنو ہرد ہلوی	سنگتراشی	نامعلوم
۱۲	*	جھٹ مل دہلوی	"	"
۱۳	*	زورآور "	"	"
۱۴	*	رام مل کشمیری	باغبانی	"

تاج کے پتھّر

تاج کی عمارت میں انواع و اقسام کے عجیب و غریب پتھر لگائے گئے ہیں جن کی صحیح تعداد اور اقسام کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ ان پتھروں کو ممالک دور و دراز سے فراہم کیا گیا ہے۔ اب تک ان کی اقسام اور اوزان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

نمبر شمار	نام	مقام جہاں سے لایا گیا	وزن
۱	عقیق	قندھار و بغداد عرب	۹۱۰ من ۲۴۰ من
۲	لاجورد	سیلون	۲۸۰ من
۳	سنگ سلیمانی	×	۵۴۰ من
۴	پنو سنجا (؟)	دریائے نیل	۹۱۵ من
۵	سنگ زر	بصرہ۔ بحر ارمز	۹۷۰ "
۶	خانو (؟)	کوہستان جودھپور	نامعلوم
۷	عجوبہ	کمایوں کے پہاڑی چشمے	"
۸	سنگ مرمر	×	"
۹	مریم	شہر بصرہ	"
۱۰	سنگ بدل	دریائے بالنس	"

× ترجمۂ کرنل اینڈرسن

* دیوان آفریدی

نمبر شمار	نام	مقام جہاں سے لایا گیا	وزن
۱۱	یمنی	یمن	نامعلوم
۱۲	مونگا	بحر الکاہل	"
۱۳	غوری	ملک غور	"
۱۴	نمرہ (؟)	دریائے گنڈک	"
۱۵	فیروزہ	بابا بدھان کی پہاڑیاں	"
۱۶	سنگِ موسیٰ	کوہ سینا	"
۱۷	گوالیاری	گوالیار	"
۱۸	سنگِ سرخ	ہر چہار سمت	"
۱۹	سنگِ یشب (یشم)	ایران	۴۵ من
۲۰	دلچنا (؟)	دریائے آسن	نامعلوم
۲۱	سنگِ مرجان	بحر اعظم	۱۱۰ من
۲۲	یاقوت نقلی	دریائے گنگا	۲۴۵ "
۲۳	سنگِ اسود	جھری	۸۴۵ "
۲۴	دودھیا	جھری	۴۵ "
۲۵	سنگِ جراحت	ماکران	نامعلوم
۲۶	حجر الدم	نامعلوم	۴۵ من
۲۷	سنگِ نخود	"	۲۲۵ "
۲۸	نکیانہ	بصرہ	نامعلوم

تاج کے مصارف کیلئے وقف

ممتاز محل کی بارھویں برسی کے موقع پر ۲۷ جنوری ۱۶۴۳ء کو شاہجہان بیگم کی قبر پر گیا اور آگرہ و نگرچین کے ۳۰ پرگنوں کی آمدنی تاج کے مصارف کے واسطے وقف کردی۔ ان پرگنوں کی فہرست اور مالگزاری تفصیل وا

بادشاہ نامہ میں لکھی ہوئی ہے۔ کل آمدنی ایک لاکھ روپیہ تھی۔ اس کے علاوہ تاج کی عمارتوں سے ملحق جو مکانات اور سرائیں تھیں ان کے کرایوں کی آمدنی (تقریباً ایک لاکھ سالانہ) بھی تاج ہی کے لئے وقف کر دی۔ اس وقف کا مصرف مجاوروں وغیرہ کی تنخواہیں اور مقبرہ کی عمارتوں کی نگہداشت قرار دیا۔ چنانچہ ہر جمعرات کو خیرات کی جاتی تھی اور چند حافظ اس لئے مقرر تھے کہ بیگم کی قبر پر قرآن خوانی کیا کریں۔ برنیر (Bernier) نے جہاں تاج کا ذکر کیا ہے وہاں خیرات (ایصال ثواب) کا بھی ذکر خاص طور پر کیا ہے[1]۔

بیگم کی قبر پر ہر سال ایک نہایت بیش بہا موتیوں کی چادر چڑھائی جاتی تھی۔ جس میں قیمتی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ چادر قلعہ میں محفوظ تھی۔ رفیع الدولہ شاہجہان ثانی کے عہد میں امیر الامرا حسین علی نے دوسرے سامان کے ساتھ اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

تاج کے متعلق رائیں

تاج نے دنیا کے ہر ملک و ہر ملت کے سیاحوں اور مورخوں سے اپنے بنانے والوں کے لئے خراج تحسین و آفرین حاصل کیا ہے اور اگر ان سب کی رائوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ میں اس موقعہ پر بعض مشہور مورخوں اور سیاحوں کی رائیں نقل کرتا ہوں جو خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔

سلیمین (Sleeman) نے اپنی کتاب (Rambles & Recollections) میں لکھا ہے کہ جب میں اور میری بیوی دونوں تاج کو دیکھنے کے لئے گئے تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ "تمہاری تاج کے متعلق کیا رائے ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "میں اپنے خیالات کے اظہار سے قاصر ہوں کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی حیرت انگیز عمارت پر کیونکر تنقید کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہاں میں تم پر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی ہوں۔ تاج کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر ایک ایسی ہی عمارت میری قبر پر بھی بنا دی جائے تو میں کل مرنے کے لئے تیار ہوں"

وائسی (Voysey) نے ایشیاٹک ریسرچز جلد پنجم (Asiatic Researches Vol. V) میں لکھا ہے کہ "ایک ایک پھول میں سو سو پتھر لگائے گئے ہیں اور انہیں اس قدر مناسبت کے ساتھ

---

[1] Bernier's Travels in the Moghul Empire pp. 295, 298

تراشا اور چمکدار بنایا گیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے "

برنیر (Bernier) نے لکھا ہے کہ "اہرام مصری کے مقابلہ میں تاج کو اس کا بہت زیادہ حق پہنچتا ہے کہ اسے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جائے"

الفنسٹن (Elphinstone) نے اپنی کتاب تاریخ ہند (History of India) میں لکھا ہے کہ "تاج کا شاندار و بیش قیمت سامانِ عمارت اور اس کی اچھوتی وضع و قطع ایک عجیب و غریب اثر ڈالتی ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس اثر کا مقابلہ نہ یورپ کی کوئی عمارت کر سکتی ہے نہ ایشیا کی بیرڈ ٹیلر (Bayard Taylor) نے لکھا ہے کہ "اگر ہندوستان میں اور کچھ نہ ہوتا تو صرف تاج کا نظارہ ہی اِن تمام صعوبتوں کی تلافی کر سکتا تھا جو یورپ سے ہندوستان تک سفر کرنے میں برداشت کرنی پڑتی ہیں میں نے جب اس بینظیر عمارت کو دور سے دیکھا تو میرے قلب کو اطمینان ہو گیا کہ اس کی تمام شہرت حق بجانب ہے۔ یہ شاندار عمارت مجھے اس قدر پاک و صاف معلوم ہوتی تھی کہ اسکے قریب جاتے ہوئے میرا دل ہچکچاتا تھا اور یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں اس کا سحر نہ ٹوٹ جائے"

کین (Keene) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "موجودہ باغ اور گرد و نواح کے شاندار و روشن ماحول نے تاج کے ساتھ مل کر ایک ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جسکی پراسرار جاذبیت تمام دنیا میں بے نظیر ہے۔ اس کیفیت کو ہم صرف "سحر" کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ زوفنی (Zoffany) کا قول ہے کہ "تاج کے لئے صرف ایک شیشے کے صندوق کی ضرورت ہے"

پادری ہیبر (Bishop Heber) نے لکھا ہے کہ "اگر تاج کی ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو وہ نہایت بھڑک دار معلوم ہوتی ہے اور کسی ڈرائنگ روم کی آراستگی کا کام دے سکتی ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے پوری عمارت کا جو اثر پڑتا ہے وہ نہایت متین و عمیق ہے"۔

تاج کو اکثر "خوابِ مرمریں" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہلال احمد زبیری

---

*

نوائے شاعر

دلِ من برقص آید، زجمالِ نوبہاراں | بروم بکوہساراں، بدوم بہ لالہ زاراں
زشرابِ حُسن مستم، زسُرودِ عشق ہستم | دلِ من چو کوہساراں، لبِ من چو آبشاراں
چمنم جمال گیرد، سخنم کمال گیرد | زفضائے سبزہ زاراں، زہوائے گلعذاراں
دلِ من بسینہ لرزد، چو رُخِ گُلے ببینم | چو شعاعِ آفتابے، زجمالِ جُوئباراں
ہمہ قلبِ پُر شرارم، ہمہ جانِ بیقرارم | پئے بزمِ نو بگردم، چو نسیمِ کوہساراں
مَلَک است ہمنوایم، فلک است زیرِ پایم | بپرم بہ صحنِ جنّت، بہوائے غمگساراں
بہ ضیائے ماہ و اختر، بہ چراغِ مہرِ انور | چو فلک ہمی بگردم، بہ سُراغِ رازداراں
چو غزالہائے وحشی، دلِ شاعرے نگردد | نہ اسیرِ لالہ رُویاں، نہ شکارِ شہریاراں
سخن است قطرۂ خون، سخن است پارۂ جاں | سخنم زراہِ دیدہ، چکد از دلم چو باراں

چو سُرودِ دلکشائے، بزنم بروزگارے
چو صبا ہمی بگردد، بہ فضا بروزگاراں

محمد اکبر مُنیر

فلسفۂ مغرب

دورِ ثانی

سُقراط

سُقراط فلسفہ کی تاریخ میں ایک عظیم الشان شخصیت ہے، وہ ان فلاسفہ کا سرتاج اور استاد ہے جنہوں نے یورپ پر قریب قریب دو ہزار برس تک علمی لحاظ سے حکمرانی کی، اور آج بھی فلسفہ اُن کا ممنونِ احسان ہے۔ یہ شخص ۴۶۹ سنہ ق م میں بمقام ایتھنز (دارالسلطنت یونان) ایک غریب گھرانے میں پیدا ہُوا، اس کا باپ بت تراش تھا اور ماں دائی کا کام کرتی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت کا حال مطلق معلوم نہیں۔ اس امر کا پتا بھی نہیں چلتا کہ اسکا استاد کون تھا۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ سقراط ان لوگوں میں سے تھا، جو کسی مدرسہ یا استاد کے ممنونِ احسان نہیں ہوتے، بلکہ فطرت انکی مُربّی اور استاد ہوتی ہے۔ جس طرح نبی میں ملکۂ نبوۃ ہوتا ہے، اسی طرح فلاسفر میں ایک فلسفیانہ ملکہ ہوتا ہے، اور سقراط ایک موقعہ پر کہتا ہے" میں مامور من اللہ ہوں اصلاحِ خلق کے لئے میرا کام یہ ہے کہ لوگوں کو سفسطہ اور شرارت سے نکالوں، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ" ولکل قومٍ ہاد" کے ماتحت سقراط کو ہم مُلہم اور منذر تسلیم کرنے میں کسی غلطی کے مرتکب ہوں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ 'صداقت' کی خاطر اس نے موت کی تلخی گوارا کی، تو ہمیں اپنے قیاس کے اقرب من الصواب ہونیکا، اور بھی یقین ہوتا ہے۔ سقراط جنگوں میں بھی شریک ہُوا۔ جہاں اس نے بڑی مردانگی، جفاکشی اور دلاوری دکھائی۔ لیکن وہ تلوار کے ساتھ ساتھ دماغی قواء پر بھی صیقل کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ صبح کے وقت ہوا خوری کے لئے گیا اور ایک مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا، تو راستہ میں ٹھہر گیا وہیں کھڑے کھڑے ۲۴ گھنٹے گذر گئے۔ لوگوں سے ہر مسئلہ پر رسمی، مُلکی، قومی، تجارتی، مذہبی، فلسفیانہ، اقتصادی، خانگی، تمدنی اور خاصکر اخلاقی مسائل پر، گفتگو کیا کرتا تھا، اور لوگوں کو ان کے غلط خیالات، سے مطلع کیا کرتا تھا۔

حاسدوں نے اُس پر کفر کا فتویٰ لگایا اور وہ الزام جس کی بناء پر عدالت نے اُسے کافر ٹھہرایا اور

سزائے موت کا حکم سنایا یہ تھا کہ سقراط، ملحد یعنی دہریہ ہے اور جوانانِ ایتھنز کا چال چلن بگاڑتا ہے ان بدبخت لوگوں کے الزام کی حقیقت سراسر بیدینی اور مکاری پر مبنی ہے۔ یہی دونوں باتیں تو سقراط میں نہ تھیں، وہ موحد اور خدا پرست تھا، اگر خدا پرست نہ ہوتا تو پھر اس کا شاگرد افلاطون ضرور ہمیں اطلاع دیتا اور اخلاق کی اصلاح تو اس کا فرضِ منصبی تھا۔ الغرض ۳۹۹ ق م میں اس نے حکومت کے حکم سے زہر کا پیالہ پی کر شہادت حاصل کی ۔

نوٹ:- اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی اللہ کا بندہ، مخلوق کی ہدایت پر کمر ہمت باندھتا ہے تو مخالفین کا ایک گروہ، اسکی مخالفت پر کھڑا ہوتا ہے، یہ سُنۃ اللہ ہے شروع ہی سے ایسا ہُوا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہیگا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" لوگ پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص اُن کے عیوب بیان کرے، اور ان کی رسموں کو بُرا بتائے۔ اور خاصکر وہ لوگ جن کی گذر اوقات اور رعب و وقار محض اسی پر منحصر ہے کہ لوگوں میں غلط عقاید کی تلقین کرتے رہیں، ایسے شخص کی بڑی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں، ہمارے زمانہ میں فخرِ اسلام ڈاکٹر سر سید احمد خان[1] سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہندوستان میں پیدا نہیں ہُوا، جن کے کارنامے اگر بیان کرنے لگوں تو مستقل رسالہ ہو جائے، اس کا ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ غیر مسلم اصحاب مثلاً ڈاکٹر جے ایم آرنلڈ[2] بشپ جزائر فلیپائن، ڈاکٹر ولیم ہو[3] پرشنری سی ایم ایس سر ولیم میور[4]، وغیرہ نے اعتراف کیا کہ اس زمانہ میں سر سید سے بڑھ کر اسلام کا خیر خواہ دوسرا نہیں ہے لیکن اُس پر ملانوں نے بڑا اعتراض یہی کیا تھا کہ ملحد ہے بیدین ہے کافر ہے دجال ہے، دہریہ ہے چنانچہ پُرانے زمانے کے لوگ جنہوں نے دنیا کے انقلابات اور مذہبی معاملات کا مطالعہ بچشمِ خود نہیں کیا بلکہ سُنی سُنائی باتوں پر ایمان رکھتے چلے آرہے ہیں، وہ آج تک اس مقدس انسان کو دہریہ ہی سمجھتے ہیں ۔

سقراط کے اخلاق و عادات	سقراط ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے اقوال اور افعال میں مطابقت

[1] سر سید (۹۸-۱۸۱۷ء) مسلمانوں کا تعلیمی ریفارمر، ایک زبردست شخصیت اور قومی خدمتگزار، محتاجِ تعارف نہیں۔

[2] انیسویں صدی کا فاضلِ الٰہیات اور دینِ مسیحی کا عالم متبحر۔ عبرانی اور یونانی کا فاضل تھا۔

[3] انیسویں صدی کا فاضل الٰہیات اور دین مسیحی کا پیشوا اس کی مشہور تصنیف اسلام اور عیسائیت ہے ۔

[4] سابق لفٹننٹ گورنر یو۔پی۔ اس کی مشہور تصانیف سیرتِ محمد اور تاریخ خلافت وغیرہ ہیں ۔

کلی رکھتے ہیں۔ نہلی[1] لکھتا ہے "سقراط نیکوکار، عالی دماغ، صاحبِ حوصلہ، شریف النفس، جفاکش، اور قابلیت مجسم تھا" دماغی قابلیت غیر معمولی تھی، اور جرأتِ اخلاقی اسکی رگ رگ میں جاری و ساری تھی، صداقت کا پجاری تھا اور اسکی خاطر جان دینی اس نے بڑی خوشی سے گوارا کی، سیرۃ کے مقابلہ میں صورۃ اچھی نہ تھی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے قابل تعریف نہ تھا۔

اسکا فلسفہ | سقراط کا کام سفسطہ کا مقابلہ کرنا تھا، جسکا منشا یہ تھا کہ دنیا سے اخلاق کا نشان مٹ جائے اور اس لئے اسکا مطمح نظر یہ نہ تھا کہ کوئی فلسفیانہ نظریہ پیش کیا جائے بلکہ یہ تھا کہ لوگوں میں صداقت اور نیکی کی تبلیغ کی جائے۔ اسکا کام اسقدر علمی نہ تھا جسقدر عملی تھا۔ اس نے کوئی نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ صداقت آمیز اور نیکوکارانہ زندگی کا ایک عملی نمونہ پیش کیا تاکہ لوگ اُسے دیکھ کر اپنی اصلاح کریں۔

وہ کہتا ہے دنیا میں بہت سی باتیں بلا ثبوت مان لی گئی ہیں، ایسی باتوں کو سچ سمجھ لیا گیا ہے جو درحقیقت جھوٹ ہیں، لہذا ہمارا علم صحیح اور تسلی بخش نہیں ہے جب ہمیں صحیح علم حاصل نہیں تو راستبازی بھی حاصل نہیں ہو سکتی، علم نیکی ہے اور جہالت بدی ہے، نیک بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں صحیح علم حاصل ہو، اگر ایک شخص یہ اچھی طرح جان لے کہ چوری بری بات ہے، وہ کبھی چوری نہ کریگا، اہل سفسطہ کہتے ہیں ہمیں صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، صداقت کو علم نہیں جان سکتے کیونکہ دنیا میں اتفاق آراء نہیں کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، لیکن یہ بات غلط ہے، اگرچہ اختلافات آراء موجود ہیں لیکن ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم مختلف اقوال میں غور و فکر کرکے ایک صحیح اصول دریافت کریں جو ہر جگہ کام دے سکے۔ اور اسکے لئے ہمیں جرح و تعدیل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر ہم مناسب طریقہ استعمال کریں تو علم حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ علم کلیات سے متعلق ہے نہ کہ جزئیات سے اور اہل سفسطہ نے اسی جگہ غلطی کھائی ہے ہمیں چاہیئے کہ سُنی سُنائی باتوں پر آنکھ میچ کر ایمان نہ لے آئیں بلکہ ہر لفظ پر غور کریں اور اسکے مفہوم کو معلوم کریں۔

اُس نے تمام عمر صحیح علم کے حصول کے طریقوں سے بحث کرنے میں صرف کی اسکے سامنے یہ سوال تھا کہ صداقت کیا ہے اور صداقت (method) کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ بس یہ طریقہ ہی اسکا فلسفہ ہے جس معنی میں ہم ارسطو کے فلسفے افلاطون کے فلسفے کا ذکر کرتے ہیں، اس معنی میں سقراط کا کوئی فلسفہ نہ تھا۔ مگر واضح ہو کہ فلسفہ کا بنیادی پتھر اُسی نے رکھا، جس پر افلاطون اور ارسطو نے عالیشان عمارات بنا دیں۔

اس نے دیکھا کہ جبتک دماغ کی اصلاح نہ ہو، اخلاق کی اصلاح ناممکن ہے، جبتک لوگوں کو حصولِ علم کا طریقہ نہ معلوم ہوگا وہ صحیح علم حاصل نہیں کر سکتے، اور جبتک صحیح علم حاصل نہ ہو، کوئی اخلاقی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

---

[1] نہلی موجودہ دور کا مشہور فاضلِ الٰہیات منطق اور فلسفہ میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ مشہور تصنیف فلسفہ یورپ ہے۔

جبتک میں یہ نہیں جانتا کہ صداقت کیا ہے، صداقت کسے کہتے ہیں، اسوقت تک میں صادق کس طرح بن سکتا ہوں؟

ارسطو اپنی مابعد الطبیعات باب ۱۳ فصل ۴ میں لکھتا ہے سقراط، کلیات (General Terms) کی تعریف اور منطق استقرائی، ان دو باتوں کا موجد ہے۔ افلاطون (Symp p 219) ص ۲۱۹ پر لکھتا ہے "اگرچہ اُس نے بڑے بڑے مدعیانِ علم و فضل (مراد از اہل سفسطہ) کی قلعی کھول کر رکھ دی، اور انکی ناواقفیت اور جہالت کا راز طشت از بام کر دیا اور اس لئے وہ اسکے دشمن ہوگئے، لیکن جو لوگ درحقیقت طالب علم تھے، ان میں اس شخص نے اپنی علمیت، اور جرح کی بدولت طلبِ علم کے علاوہ، خود اپنی ذات سے اس قدر وابستگی پیدا کر دی۔ جس کی نظیر نہیں ملتی"۔ گروٹ[1] کہتا ہے سقراط پہلا اخلاقی معلم یا فیلسوف (Ethical Philosopher) ہے جسکی تمام عمر اسی بات میں صرف ہوئی کہ کس طرح لوگوں میں پاکیزہ اخلاق پیدا ہوں۔ کس طرح ان میں نیکی کرنیکا شوق پیدا ہو۔ اگسٹائن[2] اپنی کتاب میں گروٹ کے خیال کی ترجمانی کرتا ہے

دوسری جگہ گروٹ سقراط کو بیکن اور ڈیکارٹ سے تشبیہ دیتا ہے، اور یہ تشبیہ واقعی بہت ٹھیک ہے، کیونکہ سقراط کی طرح بیکن اور ڈیکارٹ دونوں نے ازسرِنو فلسفہ و حکمت کی بنیاد صحیح اصولوں پر رکھی۔

سسرو (Tux Lisp 5:41) میں لکھتا ہے، ارسطو اور افلاطون سے زیادہ قابلِ ستایش سقراط ہے۔ جو آسمان سے فلسفہ کو دنیا میں اُتار لایا تاکہ یہ آسمانی چیز، ارضی ہو جائے یعنی انسانوں کے ساتھ رہے" دنیا میں جسقدر بڑے بڑے انسان گذرے ہیں، انہوں نے سقراط کو دنیا کے چند بڑے آدمیوں میں سے ایک تسلیم کیا ہے۔ اور میری رائے میں اُسکی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ سفسطہ کا کامیاب مقابلہ نہ کرتا تو آج دنیا کی حالت اور تہذیب و شائستگی اور لوگوں کی ذہنی کیفیت وہی ہوتی جو دو ہزار برس پہلے تھی۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ سقراط وہ شخص ہے۔ جس نے دنیا کو صحیح فلسفہ (Genuine Philosophy) کا اور صداقت کو محض صداقت کی خاطر حاصل کرنیکا، درس دیا، اور اگر وہ نہ ہوتا تو نہ ارسطو و افلاطون ہوتے نہ یونانی فلسفہ۔

اُس نے اس امر کے اثبات میں اپنی قیمتی جان بخوشی دیدی کہ سفسطہ انسان کی انسانیت اور ذہنیت دونوں کے لئے مہلک ہے۔ اور اگر ہم صحیح معنی میں انسان بننا چاہتے ہیں تو ہمیں صداقت کی تلاش کرنی چاہیئے۔

محمد یوسف خاں تسلیم
بریلوی

---

[1] ایک یونانی مورخ
[2] زبردست مسیحی متکلم فلسفی، منطقی فاضل الٰہیات اور دینی پیشوا تھا سنہ ۴۳۰ — ۳۵۴

چاندا اور سمندر

چاند ہے تو اور میں ہوں سمندر — اے آسایشِ جانِ مضطر!
تیرے رُخِ پُر نور کی کرنیں — ہوتی ہیں عکس فگن جب دِل میں
برپا ہوتا ہے اک ہیجاں — اُٹھتا ہے جذبات کا طوفاں
بڑھتی ہے موجِ امید کی چادر — چھُپ جاتی ہیں جس میں یکسر
تیرہ و تار منازلِ ہستی — ناہموار چٹانیں جس کی
روح کے واسطے ہیں اک سوہاں — دیکھ کے جن کو ہوش ہوں پرّاں
لیکن جب وہ رُخِ مہ طلعت — ہو خورشید کو جس سے خجلت
ہو جاتا ہے نظر سے اوجھل — پھر نہیں پڑتی دل کو مرے کل
دریائے جذبات مں اُس دم — گرنے لگتی ہیں لہریں پیہم
سارا چڑھاؤ اُتر جاتا ہے — ساحلِ بحر نظر آتا ہے
ہو جاتی ہیں چٹانیں عریاں — اَور میں ہو جاتی ہوں ہراساں

اے آسایشِ جانِ مضطر
چاند ہے تو اور مَیں ہوں سمندر

(ایلا ویلر ولکاکس) — (ترجمہ) — "منصور"

حریّت اور اسلام[لہ]

چودہ سو برس گزرتے ہیں کہ متمدن دنیا کے ہنگاموں سے دُور ریگستانِ عرب کی ایک بستی میں جو جاہلیت کا گہوارہ اور بت پرستی کا مرکز تھی ایک ننھی سی جان اپنے خالق کے آغوشِ رحمت سے جدا ہو کر اولادِ آدم کے آئینِ فطری کے مطابق روتی ہوئی اس کارگاہِ خیر و شر میں داخل ہوئی۔ عجب نہیں ہے کہ جس وقت عبدالمطلب نے اپنے یتیم پوتے کو گود میں اُٹھایا ہو اور اس نوخیز معصوم نے انگوٹھا چوستے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اپنے دادا کے چہرے پر جما کر اُسی روشنی کی جھلک اُنہیں دکھا دی ہو جو چند ہی ماہ قبل اُن کی زندہ امیدوں کے ہونہار مجسمہ عبداللہ کی شکل میں اُن کے نہاں خانۂ دل کو منور کر دیا کرتی تھی اور اُنکی آنکھوں کو اُنکے مرحوم بیٹے کی عزیز یاد سے پُرنم کر دیا ہو۔ اُسوقت اُن کا ذہن اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف بالکل منتقل نہ ہوا ہو کہ یہ بظاہر ضعیف و ناتواں روح جو حیاتِ انسانی کی محفل میں آ کر شریک ہوئی ہے، دنیا کے عظیم ترین رُوحانی انقلاب کا سرچشمہ ہوگی۔ یہ بات اُس وقت اُنکے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزری ہوگی کہ اُنکی آنکھیں عبداللہ ابن عبدالمطلب کے بیٹے اور خاندانِ قریش کے ایک یتیم بچے کو نہیں بلکہ تاریخِ عالم کی اُس حیرت انگیز شخصیت کو دیکھ رہی ہیں جس کی ذات سے کارفرمائے قضا و قدر نے نسلِ آدم کی دُنیوی اور اخروی نجات وابستہ کر دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنابِ افضل البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کا واقعہ ارتقائے تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں

لہ یہ مضمون دراصل ایک انعامی مقابلہ کے لئے لکھا گیا تھا اور اسی رعایت سے ایک محدود وقت اور محدود گنجایش کی مقتضیات اِس کی تحریر کے وقت پیشِ نظر تھیں۔ اس قسم کے انعامی مقابلوں میں بسا اوقات مضمون نگار کو پوری آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال کا موقع میسر نہیں ہوتا اور مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنیکا مقصد ادائے مطالب کے بارہ میں لکھنے والے پر چند در چند پابندیاں عاید کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس مضمون کی اشاعت کا مطلق خیال نہ تھا مگر "ہمایوں" کے جائنٹ ایڈیٹر صاحب کے بزرگانہ حسنِ ظن کو اصرار ہے کہ مضمون جیسا کچھ بھی ہے انکے رسالہ میں شایع کر دیا جائے۔ اگر ناظرین "ہمایوں" مضمون کو پڑھ چکنے کے بعد موضوعِ سخن کو تشنہ اور ناتمام پائیں تو امید ہے کہ وہ اُس حقیقت کو نظر انداز نہ کرینگے کہ تحریر کنندۂ مضمون کو خود اس نقص کا اعتراف ہے۔

اس قدر عظیم الشان، اس قدر بدیع المثال، اس قدر انقلاب آفریں اور پھر اس قدر عالمگیر اثرات کا محرک ہے کہ دنیا آجتک اُسکا جواب پیش نہیں کرسکی، اس واقعہ پر ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اُس قوم نے جس کی جاہلیت ضرب المثل تھی، اپنے عقاید باطلہ کی ظلمت کدہ سے نکل کر مشرق سے لیکر مغرب تک حریت و مساوات اور حق و صداقت کے چراغ روشن کردئے صحرانشین تہذیب و تمدن کے علم بردار بن گئے۔ شتربان جہاں بان ہو گئے اور ہندوستان سے لے کر اندلس تک حکمرانی کرنے لگے

مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا



عربی تمدن نے تمام اسلامی دنیا کو جس طرح متاثر کیا ہے اُس کا لحاظ کرتے ہوئے تاریخ حریت اسلام کا کوئی نقاد آزادی کے اُس عنصر کو جو زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب قوم کی فطرت کا نہایت روشن پہلو تھا۔ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس جذبۂ آزادی و خودمختاری کا اثر عربوں کو بسا اوقات غلط کاری اور طغیان و تمرد کی طرف لے جاتا تھا۔ اسلام کی حکیمانہ دقیقہ سنجی نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح و توضیح کرکے حریت صادقہ کا صحیح مفہوم اُن کے سامنے پیش کیا۔ عربی خودداری اور اسلامی حریت کی آمیزش سے جو نتائج مترتب ہوئے اُن کی غایت کو سمجھنے کے لئے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا کہ جب یزید سلطنت کا ولیعہد قرار دیا گیا اور مسجد نبوی کے خطیب نے اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی وفات سے پہلے اپنے جانشین نامزد کرگئے تھے" تو حضرت عبدالرحمن ابن ابوبکر نے اُسی وقت پکار کر کہدیا کہ اس بدعت کو ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرف منسوب کرنا سراسر جھوٹ ہے قیصر و کسریٰ کے ہاں یہ دستور رائج ہو تو ہو مگر اسلام کا آئین حکومت محض جمہوری اور اس قانونِ توارث کے بالکل منافی ہے۔ اس کے علاوہ ہم لوگ عرب قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بادشاہوں کے آستانِ جلال پر ناصیہ فرسا ہونا اوروں کا کام ہوگا!" دورِ جاہلیت میں بھی عرب قبائل کا سیاسی نظام جمہوری اصول پر مبنی تھا، اس لئے ظہورِ اسلام کے بعد اُن کا تمدن و تہذیب اور اُن اسلامی قوموں کا طرزِ حکمرانی جو اُن سے اثر پذیر ہوئیں قُدرتاً جمہوریت کی روح سے لبریز تھا۔

صدیوں اور قرنوں سے عرب قوم اپنے تپتے ہوئے ریگ زار اور اونٹوں کے قافلوں پر نازاں اور قانع چلی آئی[1] تھی۔ قیصر اور کسریٰ کی فوجیں گرجتی اور برستی ہوئیں طوفانِ برق و باراں کی طرح، اسکی شمالی سرحدوں کے

[1] میں اس وقت قوم کی حیثیت اجتماعی سے بحث کر رہا ہوں ورنہ قدیم عربوں کے تجارتی تعلقات یقیناً افریقہ، ملیبار وغیرہ سے قائم تھے۔

پاس سے کئی مرتبہ گزر گئی تھیں لیکن اُس کے استغنا نے اس تمام ہنگامہ آرائی کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی"۔عربوں کی سیدھی سادی حریت، بہ مقابلہ یونانی اور رومی جمہوریتوں کے نفیس اور مصنوعی نظام کے ایک بالکل مختلف سانچہ میں ڈھلی تھی۔ کہ اس میں ہر فرد کو قوم کے شہری اور سیاسی حقوق بلا تقسیم و تفریق حاصل تھے عربی تمدن کے زیادہ سادہ اور ابتدائی مدارج میں قوم ہر طرح سے آزاد ہے کیونکہ اس کا ہر فرزند کسی آقا کے اشارہ پر رذیلانہ طور سے گردنِ نیاز جھکانے کو نگاہِ حقارت سے دیکھتا ہے"[1]۔

تقدیر نے بھی ہر موقع پر عرب کی خود مختاری کے عجیب و غریب سامان مہیا کر دیئے۔ سکندر کا قصد تھا کہ اپنی جہاں کشایانہ پیشقدمی کا رُخ اس خطہ کی طرف پھیرے لیکن ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے قضا نے اُسے بابل سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی۔ ابرہہ اسی نیت سے اپنے سدھائے ہوئے کوہ پیکر ہاتھیوں کو لے کر بڑھا تھا کہ پردۂ غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۔ دورِ جدید میں نپولین بونا پارٹ کو تسخیرِ عرب کی آرزو ہوئی تھی مگر اُس کی یہ آرزو بھی اُس کی دوسری آرزوؤں کی طرح واٹرلو کے فیصلہ کن میدان پر خاک و خون میں تڑپ کر رہ گئی۔ اِس میں شک نہیں کہ عرب کے بعض حصوں پر وقتاً فوقتاً اقوامِ غیر متصرف ہوجاتی رہی ہیں۔ یمن میں حبش اور ایران کو اقتدار حاصل رہا اور ظہورِ اسلام کے وقت شمالی سرحد کے علاقہ پر رومیوں کی برائے نام سیادت قائم تھی۔ لیکن ان مستثنیات کی حیثیت محض عارضی اور مقامی ہے ورنہ شہنشاہوں اور تاجداروں کی ہوس پرستانہ بے باکیوں کو عربی غرور نے ہمیشہ سرپائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہے۔



حریتِ اسلامی کے مسئلہ پر دو پہلوؤں سے بحث کرنی لازم ہے (۱) نظری یعنی شرعی اور (۲) عملی یعنی تاریخی۔ لیکن شرعی حیثیت سے اس مسئلہ کو موضوعِ بحث بنانا میرا منصب نہیں کہ یہ حضرت علمائے کرام کا حصہ ہے۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرونگا کہ عقیدۂ اسلام کا اصولِ اولیں یعنی کلمۂ توحید حریتِ انسانی کی سب سے جامع اور بہترین سند ہے۔ مسلمان جب کہتا ہے کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" تو گویا اس ازلی اور سرمدی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ خدائے جلّ و علا کے سوا کسی بڑی سے بڑی ہستی کی حضور میں سرِ نیاز خم کرنا اُس کو سزاوار نہیں۔ اس کے علاوہ بیسیوں ارشاداتِ ربانی و نبوی جن میں بار بار خدا اور صرف خدا سے ڈرنے کی تاکید کی گئی ہے، دراصل حریتِ انسانی کے مسئلہ پر بھی حاوی ہیں کیونکہ کسی انسان کے سامنے غلامانہ طریقے پر گردن جھکانا توحیدِ الٰہی

---

[1] گبن: "تاریخ زوال و ہبوطِ سلطنتِ روما"

کے اعتراف کا نقیض ہے اور ظاہر ہے کہ

نواقص میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے ناچاقی

حُرمتِ سُود اور فرضیتِ زکوٰۃ کے اسلامی مسائل قوم کی عمرانی زندگی کے مختلف طبقات و مدارج میں وہ انتہائی فرق پیدا ہو جانے کو مانع ہیں جس کا شکار آج تمام یوروپ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ اُس قسم کے ہیبت ناک انقلابات سے جو رُوس اور فرانس میں نمودار ہُوئے یکسر خالی ہے اور اسے بالشوزم اور نہلزم کی نوع کی تحریکات سے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا۔ لیکن کسی مسئلہ کے نظری پہلو کو ثابت کر دینے سے بالعموم عملی پہلو بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ جاتا۔ اس لئے میں ذیل کے صفحات میں زیادہ تر تاریخ کے واقعات سے استناد و استشہاد کرونگا تاکہ ہر وہ شخص جسے خدا نے عقلِ سلیم کے جوہر سے بہرہ ور کیا ہے ایک بدیہی اور صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو جنابِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے جانشین اور خلافتِ اسلامیہ کے اوّلیں رکن ہیں انہوں نے اپنے جلیل القدر منصب کا جائزہ لیا تو ان یادگارِ زمانہ الفاظ میں اس حقیقت کا کہ سید القوم خادمہم صحیح مفہوم روشن کر دیا تھا: "لوگو! میں اگرچہ تم میں سب سے بہتر نہیں، تاہم تمہارا سردار مقرر کیا گیا ہوں۔ اگر میں نیک کام کروں تو میری تائید کرو اور اگر مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو تو میری اصلاح کر دو۔ .... جب میں اللہ اور اس کے رسُولؐ کی اطاعت کروں تو تم بھی میری اطاعت کرو اور جب میں اس سے انحراف کروں تو تم پر بھی میری اطاعت فرض نہیں"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت کا آغاز اِن رُوح پرور الفاظ کے ارشاد سے کیا تھا جن کے متعلق دلندیزی مستشرق ایم۔ د۔ گوئجے بجا طور پر کہتا ہے کہ ان کا طلسم کبھی ٹوٹنے نہ پائیگا۔ "خدا کی قسم، تم میں سب سے زیادہ ناتواں میری نگاہ میں سب سے زیادہ توانا ہونگے تاوقتیکہ میں اُنکے حقوق اُن کو دلوا نہ لوں لیکن جو تم میں سب سے زیادہ توانا ہے، اُس کو سب سے زیادہ ناتواں سمجھوں گا۔ تاوقتیکہ وہ قانون کے آگے اپنا سر نہ جھکا دے"۔

متعصّبین فرنگ کہ اسلام کو تہذیب و ترقی کا دشمن قرار دینے کے خوگر ہیں ان الفاظ کو جو مساواتِ حقوقِ انسانی کے آئینہ بردار ہیں اور جن کا اعلان تیرہ سو برس کا زمانہ منقضی ہوتا ہے کہ اسلام نے کیا تھا اگر چشمِ انصاف سے دیکھیں تو ان کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔ یوروپ نے صدیوں بعد تک

بلکہ شاید آج تک ہوش نہیں سنبھالا۔ قرونِ وسطیٰ میں جو قابلِ نفرت آئینِ حکومت نظام اقطاع (فیوڈل سسٹم) کے نام سے یورپ کے ادنیٰ طبقہ پر مسلّط رہا اُس کی جابرانہ سخت گیریاں قوم کے زراعت پیشہ افراد کے لئے بلائے جان ہوگئی تھیں۔ زمیندار جن کی زمینوں پر وہ بحیثیت مزارعین کے کام کرتے تھے، اُن کی آزادی، آبرو، جان اور مال کو نہایت شرمناک طور پر تختۂ مشقِ جفا بنائے ہُوئے تھے۔ سرف (Serf) اور ولن (Villein) اگرچہ "خاصیّتِ تنفّس" کے اعتبار سے زندہ تھے لیکن اگر کبھی کبھی اطمینان کی سانس لینا بھی زندگی کے لوازم میں شریک ہے تو یقیناً اُن کا شمار مُردوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ۱۷۸۹ء میں جو خوں ریز انقلاب فرانس میں نمودار ہُوا۔ وہ بہت بڑی حد تک اسی قسم کی ستم رانیوں کا پیدا کیا ہُوا تھا۔ اسلام نے اس سے کئی سو سال پہلے حریتِ انسانی کے راز کو کس طرح سمجھا اُس کی تشریح اسلام کے ابتدائی دور کے بے شمار واقعات سے ہوتی ہے۔ خلافتِ فاروقی کے متعدد واقعات میں شاید سب سے زیادہ مشہور بنو غسان کے سردار جبلہ بن الایہم کا واقعہ ہے جسے مولانا شبلی مرحوم یوں بیان کرتے ہیں کہ "جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا اور مسلمان ہوگیا تھا۔ کعبہ کے طواف میں اُس کی چادر کا گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اُس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا۔ اُس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصّہ سے بے تاب ہوگیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سُن کر کہا کہ تم نے جو کچھ کیا اُس کی سزا پائی۔ اُس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کردیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔ غرض وہ چھُپ کر قسطنطنیہ چلا گیا مگر حضرت عمرؓ نے اس کی خاطر سے قانونِ انصاف کو بدلنا نہ چاہا"

اسلامی تاریخ کا سرمایہ اس قسم کے بیسیوں واقعات سے لبریز ہے اور وہ مؤرخ جسے خاص حدود کے اندر رہ کر اس بحرِ بیکراں کو عبور کرنا ہو یقیناً اپنے سفینہ کو ایک عجیب گردابِ مصیبت میں مبتلا پائیگا۔ مساوات کے اس اصول کا اطلاق محض دُنیوی معاملات ہی پر نہ ہوتا تھا بلکہ مذہبی اجتہاد کی راہ بھی ہر کہ و مہ اور امیر و غریب کے لئے یکساں طور پر کھلی تھی۔ آزادیٔ رائے کی ایک نہایت درخشاں مثال حضرت عمر فاروقؓ اور ایک بڑھیا کے مشہور واقعہ سے ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ خلفائے راشدین میں شاید سب سے زیادہ ذی جبروت خلیفہ تھے مگر ایک موقع پر جب ایک مجمع عام میں انہوں نے مقدارِ مہر کی تحدید و تعیین کے متعلق حکم صادر

فرمایا تو مجمع میں سے ایک بڑھیا نے بلا تامل انہیں ٹوک دیا اور کہا کہ عمرؓ! تمہیں یہ کہنے کا کیا حق حاصل ہے؟ قرآن میں اسکے متعلق قنطار کا لفظ آیا ہے جس کی مقدار محدود نہیں۔ پھر تم کیوں اس مطلب سے انحراف کر رہے ہو؟" حضرت عمرؓ نے جو "وامرھم شوریٰ بینھم" کے رمزشناس تھے اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر باآں ہمہ جلال و جبروت، فوراً معذرت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم خود اس قسم کے اختلافِ رائے کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کا قولِ مبارک ہے کہ "میری امت میں اختلاف رحمت و برکت کی علامت ہے"۔ اپنی ذات کے متعلق بھی آنحضرتؐ نے اس آزادیٔ رائے کی اجازت دے رکھی تھی جس کی مثالیں آپؐ کی حیاتِ مطہرہ کے معمولی مجمل تذکروں میں بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

اظہار و قبولِ حق کے معاملہ میں یہ جرأت و صداقت کچھ انہیں لوگوں سے مخصوص نہ تھی جو براہِ راست حضورِ سرورِ دوجہاں کے ارشادات سے سعادت اندوز ہو چکے تھے بلکہ اسلام کی تاریخ کے ہر دور میں (اگرچہ بہ اختلاف مدارج) جستجو کرنے والے کو اس قسم کی قابلِ تقلید مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ اور ایک بڑھیا کا واقعہ جس کی طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں، ایسے ہی ایک اور واقعہ کی یاد دلاتا ہے جو تقریباً چار سو سال بعد سلطان محمود غزنوی کو پیش آیا۔ ایک بڑھیا دربار میں آکر فریاد کرتی ہے کہ اُس کے بیٹے کو جو ایک قافلہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا، ڈاکوؤں نے قتل کر ڈالا۔ سلطان عذر کرتا ہے کہ سلطنت کے ایسے دور و دراز حصوں میں انتظام قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ مگر بڑھیا نہایت دلیری سے جواب دیتی ہے کہ "اے بادشاہ! اگر سلطنت کے اُس حصہ کا انتظام تو نہیں کر سکتا تو تُو نے اُس پر قبضہ کیوں کر رکھا ہے؟" سُلطان اس جواب سے بہت متاثر ہوتا ہے اور بڑھیا کی شکایت رفع کرنے کے لئے فوراً مناسب احکام صادر کرتا ہے۔

اس واقعہ کے نقل کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور سے اس قدر بعید فصل کے بعد بھی، ایک اسلامی حکومت میں جو بہ ظاہر ہر طرح سے شخصی اختیارات کی تابع ہے، نظامِ اسلام کا جمہوری اثر اس حد تک کارفرما ہے کہ عصرِ جدید کی بڑی بڑی آزاد سلطنتیں اُس سے سبق سیکھتی ہیں۔ ایک ایک اسلامی سلطنت کے متعلق اس قسم کی گرانقدر روایات کے خزانے محفوظ ہیں جو اس قابل ہیں کہ اگر بیان کی جائیں تو موجودہ دور کی کسی مہذب سے مہذب سلطنت کے لئے بھی موجبِ رشک ہوں۔ لیکن قلتِ گنجائش مجھے مجبور کرتی ہے کہ اس سلسلہ کو یہیں ختم کر دوں کیونکہ ابھی ابھی

اِس اہم تر مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے سیاسی حقوق کی کہاں تک پاسداری کی ۔

÷

اہلِ مغرب اکثر یہ الزام دیتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ اسلامی سلطنتوں میں مذہبی رواداری جو ہر مہذب سلطنت کا شعار ہونی چاہیئے بالعموم مفقود رہی ہے ۔ خوش قسمتی سے ملّتِ زہرائے اسلامیہ کو اقوامِ عالم کی محفل میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا سیاسی دور اسکے مذہبی دور کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہو گیا اور اسکا پیغمبرؐ جو نہ صرف بہت بڑا روحانی مصلح بلکہ ایک باخبر در حقیقت بیں سیاست دان اور مدبر بھی تھا، اپنی حیاتِ طیبّہ میں بہت سی ایسی مثالیں چھوڑ گیا ہے جو اسلام کے دورِ اول سے لے کر آجتک فرماں روایانِ اسلام کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دیتی رہی ہیں ۔ جو حقیقت اندوز کلمات اُسکے جاں نثار متبعّین نے وقتاً فوقتاً اُس کی زبانِ قدس ترجمان سے سُنے تھے، اُن کا اثر، اُن کی زندگی کا اس قدر نمایاں پہلو اور اُن کی فطرت کا اس قدر غالب عنصر ہو گیا تھا کہ اُن کے وہ قومی خصائص اور طبعی رجحانات جو اس تعلیم کے متناقض تھے، بالکل مُردہ اور بے جان ہو گئے تھے ۔ قانون اور اخلاق دونوں مترادف لفظ تھے لیکن شاید اس دعوے کی تائید سب سے مُسکت طریقے پر مشہور دشمنِ اسلام ولیم میور کے الفاظ کرینگے جو اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں لکھتا ہے :- "اُس ابتدائی زمانہ سے لیکر جب دنیا کو مسیحیت نے پہلے پہل خوابِ غفلت سے چونکا دیا تھا اور کفر و بُت پرستی سے ایک جاں گُسل کشمکش کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک، چشمِ انسان نے کبھی روحانی زندگی کے اس طریقے سے بیدار کئے جانے کا مشاہدہ نہ کیا تھا اور نہ ایسے ایمان کا منظر دیکھا تھا جو ہر قسم کی قربانی کے لئے مستعد ہو اور ضمیر کی خاطر مال و منال کی بربادی کو بطیبِ خاطر برداشت کرے" یہی حیرت انگیز جذبۂ ایثار تھا جس نے ہر رُکنِ حکومت کو ایسی بے غرضانہ تن دہی اور جاں فروشی سے عامۂ خلائق کی خدمت پر کمر بستہ کر دیا تھا، کہ اسلام کی جمہوریت کا نظام بہمہ وجوہ کامل اور مکمل تھا ۔ اس بیان کی صحت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک شب جب ایک نادار، اندھی بیوہ کی مدد کے لئے گھر سے نکلے تو منزلِ مقصود پر پہنچ کر انھوں نے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پہلے سے وہاں موجود پایا کہ وہ بھی اسی کارِ خیر کی نیّت سے وہاں تشریف لائے تھے ۔ مقامِ تعجب نہیں کہ جب منصبِ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد ہوا اور انھوں نے جمہوریۂ اسلام کا محکمۂ عدالت جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تفویض

کیا تو عرب کی مسلم اور غیر مسلم رعایا جمہوریہ کی معدلت کیشی سے اس درجہ مطمئن تھی کہ جناب عمرؓ کو کامل ایک برس کے عرصہ میں بمشکل دو مرتبہ اپنی شانِ فاروقی کو کام میں لانا پڑا!"

یہ برکات اُس وقت تک کسی حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتیں جبتک اُسکے تمام ارباب حل و عقد جمہوریت کی اصل رُوح کو نہ سمجھ گئے ہوں اور اس راز کا سمجھانا صرف اُسی عظیم الشان روحانی قوت کا کام تھا جو شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے وجودِ اطہر میں سرگرم عمل تھی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب قریشِ مکّہ نے طائف کے ایک سردار عروہ کو اپنا سفیر بنا کر مسلمانوں کے پاس بھیجا تو جو کچھ اس نے وہاں دیکھا، اُس کا اُس پر ایسا گہرا اثر ہُوا کہ واپس جانے پر اُس نے قریش سے یوں خطاب کیا:۔ "مَیں نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی جیسے ذی حشمت تاجدار دیکھے ہیں لیکن آجتک ایسی اطاعت اور احترام اور عقیدت کے مظاہرہ سے، جس کا ثبوت محمدؐ کے متعلق اُسکی رعایا دیتی ہے، کبھی روشناس نہیں ہُوا"

اس حیرت انگیز ارادت اور جاں نثاری کا راز اس ایک ارشاد پاک میں مضمر تھا کہ "انما المومنون اخوۃ" اسلام نے نسل اور نسب، خون اور رنگ کے سب امتیازات اُٹھا دئے تھے اور ہر طبقے، ہر خطے، ہر قوم کے لوگ اخلاقِ انسانی کے اس محترم معلّم کی راہ میں جسکی ملکوتی تعلیم نے انسان کے پیدا کئے ہُوئے تمام نسلی افتراقات محو کر دئے تھے اپنی جان تک نثار کرنیکو تیار تھے۔ عالم سیاسیات میں وطنی اور نسلی تفوق کا جذبہ، جو مختلف زمانوں میں بنی نوع انسان کی ہیئتِ اجتماعی کے لئے ایک خوفناک لعنت ثابت ہوتا رہا ہے، اُس کے بُت کو اسلام نے کس طرح توڑا، اس کی توضیح اسلام کے دورِ آغاز کے اس ایک واقعہ سے ہو سکتی ہے کہ جب لوائے توحید تمام عرب پر لہرانے لگا اور یمن جو پہلے ایرانی اقتدار کے ماتحت تھا اب فرزندانِ دینِ حنیف کے قبضہ میں آیا تو حضور سرورِ کائناتؐ نے بلالحاظ اسکے کہ عرب کے کسی حصہ پر کسی عجمی کی حکومت پرانے عربی غرور سے متصادم ہو گی، ایرانی صوبہ دار باذان کو جو مسلمان ہو گیا تھا، بہ دستور یمن کی حکومت پر قائم رکھا اور وطنی تعصب کے اُس قدیم جذبہ کا مطلق پاس نہ کیا جو مساواتِ حقوقِ انسانی اور اخوتِ اسلامی کے کسی کم گہرے راز دار کو عربوں پر حکومت کرنے کے لئے کسی عربی النسل حاکم کے انتخاب پر آمادہ کرتا۔ باذان کی وفات کے بعد بھی حضورؐ نے اسی اسلامی رواداری اور وسیع الخیالی کا ثبوت دیا اور باذان کے بیٹے شہر کو یمن کا عامل مقرر کیا جو اُس وقت تک اس عہدہ پر فائز رہا جبتک نبوّت کے اُس مدعیٔ کاذب نے جو تاریخ میں "الاسود" کے لقب سے مشہور ہے، اُس کو شہید نہ کر ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطنیت کے جذبہ کو رسول کریمؐ نے بیخ و بن سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ کیونکہ اوّل

توخدا کا اور انسانیت کا بین الاقوامی تصوّر اس کا متحمل نہیں ہوسکتا، دوم کسی خاص طبقۂ انسانیت سے اپنے
جذبۂ اعانت وہمدردی کو بلاتمیز ہر نیک و بد موقع پر وابستہ کردینا، اسلامی اصطلاح میں شرک کا مرادف ہوجاتا ہے
ایمان تو خدا کے نور کی تجلی ہے، جو انسان کے سینہ میں چمکی ہے۔ اور خاک وطن خواہ وہ کس قدر عزیز اور محبوب
ہو، آخر خاک ہے مسلمان کی نظروں میں خدا کے نور کے سامنے اس حقیر خاک کی کیا حقیقت ہے؟ اسلام کی یہ
بین الاقوامی خصوصیتِ ممیزہ حضور سرورِ کائنات ہی کی زندگی میں علیٰ وجہ الکمال نمایاں ہوگئی تھی اور اس کا
اظہار تاریخِ اسلام میں اس طرح رہ رہ کر ہوا ہے اور اس کی نظیریں کچھ اس کثرت سے ملتی ہیں کہ یورپ کی
مقدس سرزمین سے اسلام کو تعصب اور تنگدلی کا الزام دینے کے لئے بار بار جو صدائیں اُٹھتی رہی ہیں اور
اُٹھتی ہیں، اُنکی تردید بڑی حد تک محض انہیں واقعات سے ہوجاتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی طرح مسلمانوں نے
وطنی اختلاف کو حیلہ بنا کر کبھی کسی دوسری قوم کی حریت کا اخذ وسلب نہیں کیا۔ میں آگے چل کر تاریخی تمثیلات
سے دکھاؤں گا کہ فاتحانِ اسلام نے تمام دیگر ممالک کے حقوقِ آزادی کا احترام کس طرح کیا۔ کیونکہ مسلمان اس رمز
کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ "لِلّٰہِ المشرقُ والمغرِب" اور اُن کا عقیدہ ہے۔

ہر مُلک، مُلکِ ماست، کہ مُلکِ خدائے ماست

مُقدسینِ فرنگ کو شاید یاد نہ ہو، لیکن تاریخِ عالم اُس مہتم بالشان سند کے الفاظ کبھی فراموش نہ کریگی جو نسلِ
انسانی کے نجات دہندہ محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حضور سے کوہ سینا کے قریب کی ایک مسیحی خانقاہ
(سینٹ کیتھرن) کے راہبوں اور تمام عیسائی قوم کو عطا کی گئی تھی اور جو بجا طور پر مذہبی رواداری کی ایک
ایسی شریفانہ اور فقید المثال یادگار سمجھی جاسکتی ہے کہ تاریخ کے اوراق اس کا جواب لانے سے قاصر ہیں
اس سند کی رُو سے عیسائیوں کو ایسے حقوق حاصل ہو گئے جو دوسرے اقطاعِ ارض میں اُن کو خود اپنے
ہم مذہب حکمرانوں کے زیرِ نگیں بھی نصیب نہ تھے۔ رسُولِ کریمؐ نے نہ صرف ذاتی طور پر اس امر کا ذمّہ
لیا بلکہ اپنے متبعّینِ مخلصین کو بھی ہدایت فرمائی کہ اُن تمام عیسائیوں کو جو جمہوریۂ اسلام کی حدود میں سکونت
پذیر ہوں، اپنی پناہ میں لے لیں۔ اُن کے معابد اور اُن کے پیشوایانِ مذہب کے مکانات کی حفاظت
کریں۔ اُن کو ہر طرح کے ضرر اور نقصان سے بچائیں۔ اس امر کی تصریح کی گئی کہ اُن پر کوئی ناواجب محصول
عائد نہ کیا جائے گا۔ کوئی اُسقف اپنے علاقہ سے محروم کرکے نکال نہ دیا جائیگا۔ کوئی مسیحی تبدیلِ مذہب

پر مجبور نہ کیا جائیگا خانقاہوں سے کسی راہب کا اخراج عمل میں نہ آئیگا اور زائرین کی زیارت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کیجائیگی مسیحیوں کے گرجا مسلمانوں کے مکانات یا مساجد بنانیکے لئے تصرف میں نہ لائے جائینگے مسیحی عورتیں جو مسلمانوں کے نکاح میں ہیں اپنے مذہب کے بارہ میں آزاد ہونگی اور اُن پر اس معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہ کیا جائیگا اگر عیسائیوں کو اپنے گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت، یا کسی اور معاملہ میں جو اُنکے مذہبی کیش و آئین سے متعلق ہو مدد کی ضرورت پیش آئے تو مسلمانوں کو اُن کی امداد لازم ہوگی، نہ اس لئے کہ وہ عیسائیوں کے اس معاملہ پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے ہیں۔ بلکہ اس غرض سے کہ عیسائیوں کو تکلیف نہ ہو اور اُنکے کام میں اُن کا ہاتھ بٹایا جائے۔ اگر مسلمانوں اور بیرونِ ملک کے عیسائیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے، تو کسی عیسائی کے ساتھ جو اسلامی علاقہ میں اقامت گزیں ہوگا، اُسکے عقائد کی وجہ سے نفرت و حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائیگا۔ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی سے اس قسم کا سلوک کرتا ہوا پایا گیا تو وہ پیغمبر اسلامؐ کے نزدیک نافرمان اور سرکش قرار دیا جائیگا۔ اسکے ساتھ ہی اس امر کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ اگر کوئی مسلمان ان مراعات کے احترام کا پاس نہ کریگا تو وہ میثاقِ خداوندی کے نقض کا مرتکب، احکامِ ایزدی سے منحرف اور خدا کے دین کا استخفاف کرنے والا خیال کیا جائیگا۔

یہ سند بجائے خود ایسی نادر اور حیرت انگیز رواداری کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس پر کسی تنقید یا حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں لیکن اس کی عدیم النظیر نوعیت اور بھی واضح ہو جائیگی اگر اس امر کا اظہار کر دیا جائے کہ یہ کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے جو دو برابر کی طاقتوں کے درمیان ہو رہا ہو۔ مسلمانوں کو اس وقت مدینہ پر پورا اقتدار حاصل ہو چکا ہے اور عیسائیوں کی حیثیت اس چھوٹی سی جمہوریت میں محض ایک کمزور اور قلیل جماعت کی ہے۔ گویا زبردست زیردست کو، غالب مغلوب کو اس انداز سے امن اور سلامتی کا یقین دلا رہا ہے کہ اس پر غور کرنے سے آج بھی انسان کے اخلاقی احساس میں ایک عجیب رفعت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔

اس سند کے ساتھ بارگاہِ نبوّت کے اُس فرمان کو ملا کر دیکھا جائے جو اسی طریقے سے نجران کے عیسائیوں کے افادہ کے لئے صادر ہوا تھا اور جس کی توثیق پھر خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں ہوئی، تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا، جب حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں دمشق کے ایک مسیحی اُسقف کی زبان سے ہم ذیل کے کلمات سُنتے ہیں:۔

"یہ عرب جن کے ہاتھ میں خدا نے آج کل ہماری قسمت کی باگ دے رکھی ہے، مذہب عیسوی

کے خلاف جنگ نہیں کرتے بلکہ اُلٹا ہمارے دین کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے پیشوایان مذہب اور اولیائے ملّت کو بہ نگاہِ احترام دیکھتے ہیں اور ہمارے کلیساؤں اور خانقاہوں کو عطیات اور تحائف دیتے ہیں"۔



عہدِ نبوت میں بنو قینقاع اور بالخصوص بنو قریظہ کے مشہور واقعہ کو میور اور سپرنگر کے طرز خیال کے بعض مغربی مصنفین اسلام کے ظلم اور تعصب کا نقارہ بنا کرے اُڑے ہیں۔ ان الزامات کو اگر جائز تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ ان مسیحی حضرات نے جنابِ مسیحؑ کی تعلیم کو یکسر گُل دستۂ طاقِ نسیان بنا دیا اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو بھول کر اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا نکالنے لگے۔ بنو قریظہ نے سعد ابن معاذ کو جن کے ہاتھوں اُنکی قسمت کا فیصلہ ہوا خود ہی اپنا منصف مقرر کیا تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اس فیصلہ کے جواز کو خود اُن لوگوں نے جن پر براہ راست اس کا اثر پڑا تسلیم کر لیا تھا تو میور سپرنگر وغیرہم کو اس پر برافروختہ ہونیکی کیا ضرورت پیش آئی۔ میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ ایّامِ جنگ میں بھی اسلام نے اہلِ ملک کے امن و امان اور دیگر حقوق کے احترام میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی تقلید کسی غیر مسلم طاقت کو بیسویں صدی کے اس "تہذیب یافتہ" دور میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ بنو قریظہ کے اُس سنگین جرم کے لئے اگر کوئی نرم سزا تجویز کیجاتی اور پورے ضبط و قدرت کے ساتھ اس فتنہ کو دبا نہ دیا جاتا تو عجب نہ تھا کہ اسلام کی چھوٹی سی جمہوریت تباہ ہو جاتی اور خود مسلمانوں کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی۔ سٹینلی لین پُول نے کیسے حق شناسانہ الفاظ میں اس مسئلہ پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بنو قریظہ نے حکومت کے خلاف محاصرہ کے ایّام میں بغاوت اور غدّاری کے جُرم کا ارتکاب کیا تھا اور وہ لوگ جو پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح ولنگٹن کی پیشقدمی کا سراغ مفرور سپاہیوں اور غارتگروں کی درختوں سے لٹکتی ہوئی لاشوں سے ملتا تھا، انہیں ایک غدار قبیلہ کے ایسے مناسب اور سیدھے سادے خاتمہ پر متعجب نہ ہونا چاہیئے"۔

یہود نے آغازِ اسلام کے زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جس طرح پیہم عدوان وطغیان کا ثبوت دیا ہے، یہاں تک کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے کھانے میں زہر ملا کر جناب رسالت پناہؐ کی جان لینے کی کوشش سے بھی دریغ نہ کیا، ان واقعات کا جب اُس مرفہ الحالی اور فراغ بالی سے مقابلہ کیا جاتا ہے جو اس قوم کو متعدد اسلامی سلطنتوں میں حاصل رہی تو ایک عجیب دلاویز تناقض کی شان نظر آجاتی ہے۔ نہ

صرف عبّاسی خلافت کے عہد میں یہودیوں کو خاص حقوق حاصل تھے بلکہ اندلس میں بھی اُنکی تہذیب و ترقی کی یہانتک حوصلہ افزائی کیگئی تھی کہ حاذق ترین اطبّاء اور مشہور ترین حکماء اور ارباب فکر میں بہت سے یہودیوں کا بھی شمار تھا۔ جو سیاسی حقوق اسلامی سلطنتوں میں بسنے والے یہودی فضلا، تجار اور عوام کو حاصل تھے اُن کا عشرِ عشیر بھی اُن "یہودی کتّوں" کی قسمت میں نہ تھا جن کو تقدیر نے میور، سپر نگر، آسورن، ولہاؤزن اور مارگولیتھ کے اجداد کے قبضۂ قدرت میں دے رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یوروپ کی تاریخ قرونِ وسطیٰ کے اوراق کی سیاہی اُس ظالمانہ اور بیدردانہ سلوک سے جو یہودیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا، اور بھی زیادہ گھناؤنی اور نفرت انگیز ہوگئی ہے، فنِ حرب کے وہ شریفانہ اور کھلے کھلے اصول جو ہمیشہ سے بنی نوع انسان میں بطور مسلّمات کے تسلیم کئے جاتے رہے ہیں، اُن کا خون بیدریغ کیا جاتا تھا۔ عبّاسی خلافت کے عہد میں (۲۴۱ھ) یونانیوں نے ایشیائے کوچک پر غارتگرانہ پیشقدمی کی اور بدقسمت باشندگان ملک میں سے ہزار ہا کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لیتے گئے۔ واپس پہنچ کر یونانیوں نے جو سلوک ان اسیرانِ بلا سے کیا، وہ ایک دردناک داستان ہے۔ ملکہ تھیوڈورا کے حکم سے ان میں سے اکثر نہایت سفاکانہ بیرحمی سے قتل کر دئے گئے۔ خود میور بھی اپنی "تاریخ خلافت" کے ایک حاشیہ میں دبی زبان سے ان مظلوم مقتولین کی تعداد بارہ ہزار کے برابر بتاتا ہے۔ یہ بہیمانہ خون آشامی کا یہ مہیب واقعہ ہر مہذّب حکمران کیلئے بالعموم اور کسی عورت کیلئے بالخصوص موجب صد ہزار ننگ ہے۔ شارل مارتل کے مشہور پوتے شارل نے جسے مسیحی مورخین شارل اعظم (Charlemagne) کے نام سے یاد کرتے ہیں، ایک موقع پر پانچہزار سیکسنوں کو محض اس جرم میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا کہ انہوں نے مسیحیت کے قبول سے انکار کر دیا تھا۔ سیکسن جرمن نسل کے لوگ تھے جنہیں مسیحیت کی خاطر اپنے قدیم مذہب کو بدلنا منظور نہ تھا۔ شہزادہ امن کے اس "صلح شعار" نمائندہ نے بتیس سال تک اُنکے ملک میں ہنگامہ و فساد کا بازار گرم رکھا اور بیگناہ سیکسنوں کے خون سے ٹپکتی ہوئی تلوار کو اُسوقت تک نیام میں نہ کیا جبتک کہ ویزر (Weser) اور ایلبی (Elbe) کے درمیان کا تمام علاقہ ایک وحشتناک ویرانے میں تبدیل نہ ہو گیا۔ فرڈینںڈ اور اسابیلا کے ہاتھوں غرناطہ سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اندلس کے یہودیوں اور مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے اُنکے تصوّر سے اب بھی رُوح کانپتی ہے ہزاروں لاکھوں جلاوطن اور قتل کئے گئے یہانتک کہ چند ہی سال میں ہسپانیہ کی سرزمین یہودیوں اور مسلمانوں کے وجود سے بالکل خالی ہو گئی۔ یہ زہرہ گداز مظالم قرونِ وسطیٰ ہی کے ساتھ ختم نہیں ہو گئے

اِس زمانے میں کہ تہذیب و تمدّن کا دور کہلاتا ہے روس کے عیسائی شہنشاہ نے منچوریا میں پانچ ہزار چینی مرد عورتیں اور بچے تہ تیغ کر ڈالے تھے ابھی چار پانچ سال بھی نہیں گزرے کہ ایشیائے کوچک کے ترکی علاقہ میں یونانیوں نے دوبارہ تھیوڈورا کی یاد کو تازہ کر دیا تھا۔ پھر جب شارل اور تھیوڈورا، فرڈیننڈ اور اسابیلا کے صلیب پرست جانشین بہ غایتِ خیرہ چشمی و دیدہ دلیری ہمکو یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلام اپنی اشاعت کے لئے تلوار کی طاقت کا شرمندۂ احسان ہے تو ہماری چشم عبرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام   وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اب اسلام کا حُسنِ مسالمت و رواداری ملاحظہ ہو:-

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ مسلمانو! ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر برانگیختہ کرے کہ تم اُس قوم کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ تمکو حکم دیا جاتا ہے کہ ہر حالت میں انصاف کرو اسلئے کہ شیوۂ انصاف اتقا و پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

اہلِ اسلام نے اس آسمانی ارشاد کی عملی تفسیر کس طرح کی اسکا اندازہ اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قشونِ قاہرۂ خلافت کو بازنطینی طاقت کے خلاف روانہ کیا اور یزید بن ابو سفیان کو سرعسکر مقرر کیا تو یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے:- "یزید! دیکھو کہیں اپنے ہی لوگوں پر جبر اور سختی نہ کر بیٹھنا اور نہ انکو کسی قسم کی تکلیف پہنچانا۔ اپنے تمام معاملات میں اُن سے مشورہ طلب کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ جو کام تم کرو حق اور انصاف پر مبنی ہو کیونکہ وہ جو اسکے خلاف کرتے ہیں فلاح نہیں پاتے۔ جب دشمن سے تمہارا سامنا ہو تو مردوں کی طرح اپنا فرض ادا کرنا اور میدان میں پیٹھ نہ دکھانا۔ اگر تمہیں فتح ہو تو کہیں چھوٹے بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کا تباہ کرنا اور اناج کے کھیتوں میں آگ لگانا تمہیں منع ہے کسی ثمردار درخت کو نہ کاٹنا، نہ جانوروں کا نقصان کرنا سوائے اُنکے جنکو تم قوت لایموت کیلئے ذبح کرو۔ اگر تم کوئی عہد و پیمان یا معاہدہ کرو تو اُسکا ایفا تم پر فرض ہے۔ اور ایسا ہو گا کہ ذرا آگے بڑھنے پر تمہیں بعض مذہبی لوگ ملینگے جو خانقاہوں میں خلوت نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جنہیں خدا کی خدمت کا یہی طریقہ پسند ہے۔ اُن سے کسی طرح کا تعرض نہ کرنا۔ اُنکو قتل نہ کرنا اور اُنکی خانقاہوں کو بھی مسمار نہ کرنا"

یہ اسلام کا "مارشل لا" ہے، اسکے مقابلہ میں جب ہم تمام دنیا میں مغربی اقوام کی سلم آزار اور اسلام کش روش پر نظر ڈالتے ہیں اور بلقان، طرابلس، کریٹ اور اناطولیہ کے واقعات کو یاد کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ باوجود حقوق شناسی کے بلند بانگ ادعاؤں کے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مندرجہ بالا ارشاد کی نوعیت کا ایک خط حضرت عمر فاروقؓ نے بھی سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کو لکھا تھا۔ اس خط کے الفاظ آج تک بعینہٖ محفوظ ہیں اس میں فاروقِ اعظمؓ سعد بن ابی وقاص کو نہایت تاکید کے ساتھ نصیحت کرتے ہیں کہ جہاں جہاں عساکرِ اسلام کا قیام ہو وہاں کے مفتوح باشندگانِ ملک سے عدل و انصاف اور رحم و رفق کا سلوک کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو حکمران زمانۂ جنگ میں تو مفتوح رعایا کے ساتھ ایسا کرم گسترانہ سلوک کرنا جانتے ہوں وہ امن و امان قائم ہو جانے پر ملک کو کیسی کچھ برکات و حسنات کا مورد نہ بنا دینگے۔ جوشِ فدویت حق اور خدمتِ عامۂ خلائق کی اس سے بہتر مثال اور کہیں نہ ملیگی کہ فاروقِ اعظمؓ نے ابولولو کے خنجر بیداد سے وہ جانستاں زخم کھانیکے بعد جو انکے وجودِ گرامی کو دنیائے اسلام سے ہمیشہ کیلئے چھین لینے والا تھا، بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے جو نصیحت کی تھی اُس میں بھی اُنہوں نے اپنی عیسائی اور یہودی رعایا کو فراموش نہ کیا:۔ "وہ شخص جو جانشینی کیلئے منتخب کیا جائے اسکو میری یہ آخری استدعا پہنچا دینا کہ اس شہر کے لوگوں سے جس نے ہمکو اور دینِ حنیف کو پناہ دی، بہ ملاطفت پیش آئے ۔۔۔۔۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بارہ میں اُسے چاہیئے کہ رسولِ کریم نے جو قول انہیں دیا تھا اُسے ایمانداری کے ساتھ پورا کرے۔ الٰہی! میں اپنا دور ختم کر چکا اور اب اُسکے لئے جو میرے بعد آتا ہے، میں سلطنت کو مستحکم اور پُر امن چھوڑتا ہوں[۲]"۔

اسلام کا یہ عام دستور تھا کہ تسخیرِ ملک کے بعد اگر باشندگانِ ملک ایک خاص محصول ادا کرنے پر رضامند ہو جاتے تھے تو اسلامی حکمران اُنہیں اپنی حفاظت میں لے لیتے تھے۔ یہ لوگ جو اس طریقہ سے اسلام کی حفاظت میں آجاتے تھے "اہل الذمہ"، "یا ذمی" کہلاتے تھے۔ بخلاف مغربی حکومتوں کے جنکا تعصب انہیں نہ صرف اپنی غیر مسیحی بلکہ آزاد خیال مسیحی رعایا کو بھی تختۂ مشقِ جفا بنانیکے لئے محکمۂ احتساب عقائد (Inquisition) کے اندازکی ستم ایجادیوں پر آمادہ رکھتا تھا (اندلس کے یہودیوں اور مسلمانوں کے متعلق اس محکمہ کی ایک شاخِ ہسپانیہ ہی کا وحشیانہ طرزِ عمل مہذب دنیا کیلئے کچھ کم باعثِ ننگ و عار نہ ہونا چاہیئے) اُن اسلامی ممالک میں جہاں ذمیوں کی کوئی قابل لحاظ تعداد آباد ہوتی تھی ایک الگ محکمہ اُنکی مراعاتِ خصوصی کی نگہداشت کیلئے قائم کیا جاتا تھا اندلس میں اس غرض سے جو محکمہ قائم کیا گیا تھا اسکا صدر کاتب الذمام کہلاتا تھا۔ ایسا ہی ایک محکمہ خلافتِ عباسیہ نے بھی اپنی ذمی رعایا کے حقوق کی حفاظت کیلئے قائم کر رکھا تھا۔ ان محکموں کا اصول کار کیا تھا، اس کا پتا جنابِ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے اس ارشادِ مبارک سے چلتا ہے جو اس قابل ہے کہ تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں آبِ زر کے حروف سے لکھا جائے:۔ "ذمی کا خون مسلمان کے خون کے مانند ہے" اس ارشادِ مبارک سے موجودہ متمدن دور کی سب سے بڑی مسیحی حکومت کے ایک جلیل القدر رکن کے اُس قول کا مقابلہ کرو جس میں وہ اپنے کسی ہم وطن کے خون کے ایک قطرہ کی قیمت تمام سلطنتِ ایران کے خون کے برابر قرار دیتا ہے!

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا　　　(باقی)　　　ح۔ ا۔ خ

تمنّائیں

میں کیوں نومید اپنے دل کو اے نامہرباں کروں
پھلے پھولے چمن کو کس طرح وقفِ خزاں کروں

مری آنکھوں میں اُس حسنِ جہاں آرا کا جلوہ ہو
میں اپنے قلب کو ناآشنائے دو جہاں کروں

ادب سے سامنے اُس کے ہُوا نہ بند غنچے کا
کہا جوشِ جنوں سے گُل نے "کچھ گستاخیاں کروں"

اُسی کی جستجو میں روز و شب گرمِ تگ و دو ہوں
مہ و خورشید کو ہمدم فلک کو رازداں کروں

نہیں جنسِ محبت کا پتا بازارِ امکاں میں
نہ کیوں فرطِ جنوں سے اپنا دامن دھجیاں کروں

ہُوا کرتی ہے مجھ پر بارشِ غم اس لئے پیہم
کہ میں داغِ نہاں سے دل کو رشکِ گلستاں کروں

میں مر مر کر جیوں۔ جی جی کے مر جاؤں محبت میں
یونہیں اس زندگانی کو حیاتِ جاوداں کروں

(ح۔ ب)

نواہائے راز

صبحِ ازل سے آنکھ ہے نظارہ جُو مری
میں کاش جانتا کہ ہے کیا آرزو مری

کی میں نے ہر کسی سے بیاں اپنی داستاں
لیکن کوئی سمجھ نہ سکا گفتگو مری

اکسیرِ خاک کو ترے پرتو نے کر دیا
میں ورنہ جانتا ہوں جو تھی آبرو مری

ہوتی ہے روز پرتوِ خورشید سے فنا
شبنم کہاں سے جان گئی آرزو مری

ازبس کہ ہوں شہیدِ فریبِ وفائے گل
اب خاک اُڑا رہی ہے صبا سُو بہ سُو مری

اب عمر بھر رکھے گی مجھے انتظار میں
وہ زندگی کٹی جو ترے رُو بہ رُو مری

اب شکوہ ہائے درد کروں گا نہ میں کبھی
اب داستانِ ہجر سُنے گا نہ تُو مری

یا میں تھا اور صبح دمِ سا تیری آرزو
یا تُو ہے اور شام سحر جستجو مری

حامد علی خاں

نیرنگِ فطرت

اعجاز ایک عقلمند اور ظریف الطبع آدمی ہے۔ وہ ہر شخص کے ساتھ نہایت خُلق کے ساتھ پیش آتا ہے اسی لئے شاید ہر کس و ناکس کو اُسکی دوستی کا دعوٰے ہے۔ اُس نے کبھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عزیز سے عزیز دوست کے ساتھ بھی مذاق کرنے سے نہیں چُوکتا۔ وہ اکثر ہنستا اور لوگوں کو ہنستا تا نظر آیا کرتا ہے +

اُسکے دوست اُسکی دلچسپ اور ظریفانہ باتیں سُننے کے لئے اکثر اُس کے پاس جمع رہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی اُسکے احباب میں سے تین دوست اُسکے پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہیں +

یہ تینوں شخص اگرچہ اعجاز سے عمر میں بڑے ہیں۔ تاہم اُنہیں اُسکی دوستی پر بیحد ناز ہے۔ ان میں ایک تو نسیم ہے یہ شخص ایک متمول سوداگر ہے۔ اُسکی عمر ۳۵ سال کے قریب ہوگی۔ اُسکی شادی ہوئے پانچ یا چھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اور وہ دو بچوں کا باپ بھی ہے +

نسیم نہایت شریف اور نیکدل شخص ہے۔ عورتوں کو ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُس کے دل میں اپنی بیوی کی بڑی وقعت ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس میں یہ عادت بھی ہے کہ وہ ہر عورت کے سامنے اس قدر مرعوب ہو جاتا ہے کہ بعد میں اُسے خود ہی نادم ہونا پڑتا ہے۔ وہ اکثر ایسی باتیں کیا کرتا ہے جو دراصل اُسکی سرشت سے باہر ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر وہ دوستوں سے کسی ایسی عورت کی نسبت سُنتا ہے جو بے پردہ ہوگئی ہو۔ یا اُس نے حد سے زیادہ آزادی اختیار کر لی ہو۔ تو ایک مصنوعی غصہ سے اپنے چہرے کی عجیب حالت بنا لیتا ہے اور ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اسے اس بات سے دلی رنج پہنچا ہے۔ حالانکہ دل میں وہ اس بات کو کچھ زیادہ بُرا تصوّر نہیں کرتا۔ وہ پہلی بیوی کے موجود ہوتے ہُوئے دوسری شادی کر لینا بھی کچھ زیادہ جُرم نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر دوستوں کے سامنے کسی ایسے شخص کا ذکر آجائے تو گھنٹوں بیٹھا اُسکی مذمّت کیا کرتا ہے +

دوستوں سے اپنا کیرکٹر چھپانے میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہے۔ کیونکہ کسی نہایت عقلمند آدمی کے سوائے باقی سب اُسے پرلے درجے کا متقی اور پرہیزگار تصوّر کرتے ہیں +

دوسرا شخص سعید ہے۔ متوسط درجے کا آدمی۔ اُسکی عمر بھی غالباً نسیم کے برابر ہوگی۔ لیکن وہ ابھی تک ناکتخدا ہے۔ اُسکی وجہ وہ دوستوں سے یہ بیان کیا کرتا ہے کہ میں محبت کا زخم خوردہ ہوں اور اب تمام عمر شادی نہ کرونگا۔ لیکن اصل بات یوں تھی کہ جب اُسکی والدہ زندہ تھیں۔ ایک دفعہ اُسکی شادی کے لئے ایک لڑکی تجویز ہوئی۔ جس کی نسبت سعید اور اُسکی والدہ کو بتایا گیا کہ وہ نہایت حسین اور ایک شریف خاندان سے ہے چنانچہ انہوں نے نہ تو لڑکی کے متعلق کچھ تحقیقات کی اور نہ اُسکے خاندان کے متعلق۔ جب شادی بالکل قریب آگئی۔ اور یہاں تک کہ برات روانہ ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تو اچانک نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہو گیا۔ کہ لڑکی ایک نہایت کمینہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور بالکل بدصورت ہے۔ غرض کہ یہ بنا بنایا کام یوں ہی رہ گیا۔ اور تھوڑی مدت کے بعد سعید کی والدہ بھی راہئی ملکِ عدم ہوئیں +

اسکے بعد سعید نے بہت کچھ کوشش کی کہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ جس عورت سے میں شادی کروں۔ وہ کسی عالی خاندان سے ہو۔ اور بیحد خوبصورت ہو۔ لیکن مُصیبت یہ تھی کہ خوبصورت عورتیں اُسے پسند نہ کرتیں۔ کیونکہ وہ خود خوبصورت نہ تھا۔ اور نہ کسی حیرت انگیز قابلیت کا سرمایہ دار تھا۔ وہ بہت زیادہ دولتمند بھی نہ تھا کہ کوئی دولت پرست عورت ہی اُسے مل جاتی +

چنانچہ اب اُس نے اپنے تمام دوستوں کو جو اُسکے پچھلے واقعات سے بے خبر تھے۔ اور یہانتک کہ خود اپنے ضمیر کو بھی یہ سمجھا رکھا تھا۔ کہ "میں محبت کا زخم خوردہ ہوں اور اب تمام عمر شادی نہ کرونگا"

تیسرا شخص میرزا صفدر ہے۔ اُسکی عمر تقریباً چالیس سال ہوگی۔ باپ کی زندگی میں یہ شخص بھی خوشحالی سے بسر اوقات کر چکا ہے۔ لیکن باپ کے مرتے ہی جب بیوی بچوں کا بوجھ تنہا اُسی کی گردن پر پڑ گیا۔ اور کچھ عرصہ ملازمت بھی نہ مل سکی تو آہستہ آہستہ جو تھوڑی بہت جائداد باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ بک کر ٹھکانے لگ گئی۔ اور صرف وہ مکان باقی رہ گیا جس میں اب میرزا صاحب چھ بن ماں کے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیونکہ اسی دوران میں انکی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا +

دو لڑکیاں سب بچوں سے عمر میں بڑی ہیں۔ اور باقی چار لڑکے ابھی بالکل کم سن ہیں۔ ماں کے مرنے سے گھر کا تمام بوجھ اب لڑکیوں کے سر پر پڑ چکا ہے +

صفدر نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح دوسری شادی کرلے۔ لیکن اُسکی یہ آرزو کبھی بر نہ آئی چپکے چپکے کئی جگہ اپنا پیغام بھی بھجوایا۔ لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا۔ کہ "ہم کیوں اپنی لڑکی کو چھوٹتے ہی آدھی درجن بچّوں کی ماں بنادیں اور پھر لڑکی کو ایسے شخص کے پلّے باندھیں جس کی تنخواہ اتنی بھی نہیں کہ اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ ہی پال سکے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم لڑکی کو اندھے کنوئیں میں دھکیل دیں"۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر صفدر نے اپنے دوستوں سے یہ کہنا شروع کردیا کہ میں کبھی دوسری شادی نہ کرونگا۔ میں اپنی بیوی سے اُسکی موت کے وقت وعدہ کرچکا ہوں کہ باقی تمام عمر اسی طرح گذار دونگا۔ اب اگر میں نے دوسری شادی کا نام بھی لیا تو گنہگار ہونگا۔ میرا فرض اب یہی ہے کہ اپنے بچوں کو خوش رکھوں"

یہ تو بچّوں کا دل ہی جانتا ہوگا کہ اُنکے اکھڑ مزاج باپ نے اُنہیں خوش رکھا ہے یا ناخوش۔ لیکن صفدر نے تو یہی بات اپنا تکیہ کلام بنا رکھی ہے۔

وہ تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ اُن کا عزیز دوست اعجاز آج کسی گہری سوچ میں پڑا ہے اور خلافِ عادت کچھ خاموش سا ہے۔ حالانکہ پہلے جب وہ اُن سے ملتا تو اِس قدر پُر لطف اور ظرافت آمیز باتیں کیا کرتا کہ ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔

نسیم نے آگے بڑھ کر اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا اور کہا۔ اعجاز! آج کس معاملے پر غور کررہے ہو؟ اعجاز نے مُسکرا کر جواب دیا۔ نہیں میں کسی معاملے پر غور تو نہیں کررہا ہوں۔ بات صرف یہ ہے کہ آج سات بجے شام کی ٹرین سے دہلی جانے والا ہوں۔ والد کا ارادہ وہاں سے کچھ چیزیں منگانے کا ہے۔ تینوں دوست یکدم کھڑے ہوگئے اور ہنستے ہُوئے بولے کہ اچھا آپ ہمیں یہاں سے نکالنے کی فکر میں ہیں۔ لیجئے ہم جاتے ہیں۔

اعجاز نے کہا۔ نہیں نہیں بلاتکلّف بیٹھئے۔ میرے جانے میں ابھی پورے تین گھنٹے باقی ہیں لیکن سعید نے کہا کہ نہیں ہم پھر ملیں گے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کبتک واپس آؤ گے۔ اعجاز نے کہا "یہی ۔ ۔ ۔ ۔ چندروز تک انشاءاللہ جلد واپس آؤنگا"

اس کے بعد تینوں دوست ہاتھ ملاکر رخصت ہُوئے۔

اعجاز کمرے کی کھڑکی کھول کر دور تک اُنہیں جاتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ اُسکی آنکھوں

سے اوجھل ہو گئے تو معلوم نہیں کیوں اُسے ہنسی آگئی۔ وہ کُرسی پر بیٹھ گیا اور اس قدر ہنسا کہ ہنستے ہنستے اُسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے ؞

---- ۱ ----

نسیم کے کمرے کی چٹخنی اندر سے بند ہے۔ اور وہ مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ اُسکے چہرے سے عجیب بے چینی سی ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا اور قریب سے ایک صوفا کھینچ کر اُس پر لیٹ گیا ؞

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا۔ جس پر نسوانی ہاتھ کا لکھا ہُوا پتا درج تھا۔ یہ خط تھوڑی دیر ہوئی ڈاکیا دے کر گیا تھا۔ اور غالباً یہی خط اُسکی پریشانی کا باعث ہے اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون یہ ہے:۔

میرے دل و جان کے مالک! خدا تمہیں سلامت رکھے۔

جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے سخت بے قرار ہوں۔ مدت تک میں اپنا راز تم سے چھپائے رہی لیکن آج میرے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے میرے حالِ زار پر رحم کرو۔ اور مجھ سے ملو۔ اس بات سے تعجب نہ کرنا کہ میں نے تمہیں کہاں اور کب دیکھا ہے۔ جب صرف تمہارے خیال ہی سے میرے دل کی بستی آباد ہے تو میں تمہیں ہر جگہ دیکھ سکتی ہوں۔ ۹ فروری کو رات کے دس بجے جب چاند کی روشنی اچھی طرح پھیل جائیگی۔ میں قلعے کے پیچھے برگد کے پُرانے درخت کے نیچے کھڑی ہو کر تمہارے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہوں گی۔ لِلّٰہ مجھ بدنصیب کو مایوس نہ کرنا۔ اس سُنسان مقام تک پہنچنے کے لئے صرف تمہارا خیال میرا راہ بر ہوگا۔ اور ہاں اس بات کا خیال رہے۔ کہ جو راستہ سامنے سے آتا ہے اُدھر سے آنا دوسرے دونوں راستے میری مصلحت کے خلاف ہیں۔ باقی زبانی عرض کروں گی۔

تمہاری

ابن۔ این

خط ختم کر کے نسیم نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اور اپنے دل سے یوں باتیں کرنے لگا:۔

اُس خط سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں کوئی لگی لپٹی یا دھوکا نہیں۔ معلوم نہیں یہ بھولی بھالی

عورت کون ہے۔ اُسے کیا معلوم ہے کہ میں شادی کے جنجال میں پھنس چکا ہوں۔ خبر نہیں اس نے مجھے کہاں دیکھا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ یہ وہی عورت ہو جو اُس روز باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اُسکے چہرے پر نقاب تھا۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ وہ میری طرف گھور رہی ہے۔ میں بھی اُس روز کسی نامعلوم کشش سے اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ لیکن وہ تو شاید شادی شدہ تھی۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ایک نوجوان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اُس کا بھائی ہو۔ اگر وہ اُس کا بھائی تھا تو یقیناً وہ خوبصورت ہوگی۔ کیونکہ وہ شخص نہایت پاکیزہ صورت تھا۔ نہیں لیکن یہ سب قیاس ہی قیاس ہے۔ اس بات سے اُس کا کیا تعلق۔ مگر اب میں اُسے مل کیسے سکتا ہوں۔ میری بیوی گھر میں موجود ہے۔ اور میں اُسکی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ کیا میں یہ خط جا کر بیوی کو دکھادوں۔ اور اس خرخشے سے نجات پاؤں نہیں نہیں میں ہرگز ایسا نہیں کرونگا۔ میں کیوں ایک معصوم ہستی کو بدنام کروں۔ دوسرے ممکن ہے میری بیوی بدگمانی کرے"۔ حالانکہ آجتک میں نے کسی غیر عورت کی طرف نظر اُٹھا کر بھی تو نہیں دیکھا ...... اگر اُس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تو میں اُسے کیا جواب دونگا۔ بفرضِ محال اگر میں اُس سے شادی کر بھی لوں۔ تو اُسے رکھوں کہاں سخت مشکل درپیش ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دوسری کوٹھی اسکے لئے مخصوص کردوں۔ اور اُسے وہیں رکھوں۔ لیکن آہ کیا میں اپنی نیکدل وفادار بیوی پر یہ ظلم کرسکتا ہوں۔ ایسا کرنے سے اُس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور وہ مجھ سے بدگمان ہو جائیگی۔ میں اُسے کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ نہیں میں شادی نہیں کروں گا۔ لیکن وہ معصوم ہستی جس کے دل کی بستی فقط مجھی سے آباد ہے اُسے کیسے مایوس کروں۔ میں اُس سے ضرور ملوں گا۔ اُسے سمجھاؤں گا کہ میرا خیال چھوڑ دو۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ مجھے بھلادے۔ اُس کے خط سے کس قدر محبت اور انکسار ٹپکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میرا دل بھی اُس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ میں ضرور اُس سے ملونگا۔ یہ بات کب انسانیت میں داخل ہے کہ ایک عورت رات کے وقت سُنسان مقام میں میرے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہو۔ اور میں آرام سے بیوی بچوں میں بیٹھا خوشیاں مناؤں۔ ہرگز نہیں میں ایک عورت کو مایوس نہیں کروں گا۔ میں اس آگ میں بےخطر کود پڑوں گا۔ خواہ اس کا انجام میرے لئے کتنا ہی خوفناک ہو۔ لیکن ایک مشکل ہے کہ میری بیوی کبھی مجھے رات کے دس بجے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیگی۔ وہ تو خواہ مخواہ مجھ پر بدگمانی کیا کرتی ہے۔ اور اس حالت میں تو وہ حق بجانب بھی ہوگی۔ خیر میں آج ہی سے اُسکی خوشامد شروع کرتا ہوں۔ اُس کی خوبصورتی کی بیحد تعریف کرونگا۔ بس پھر اُسے .

مجھ پر کوئی شک نہ ہوگا۔ میں سرِ شام ہی یہ کہہ کر گھر سے نکل جاؤں گا کہ آج کسی دوست کے ہاں دعوت ہے وہ ضرور یقین کرلے گی۔ اور مجھے جانے کی اجازت دیدے گی۔"

اتنے میں باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ اور اُسکے خیالات کا سلسلہ یہیں منقطع ہوگیا

: ۲ :

سعید کا چہرہ انتہائی مسرت سے چمک رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آرام کرسی بچھا کر اُس پر دراز ہے۔ دفعتاً اُسکے منہ سے نکلا "او ہو کس نامعلوم طریقہ سے میری خواہش پوری ہوگئی وہ ضرور حسین ہوگی۔ بے حد حسین۔ نام ہی سے ظاہر ہے۔ این این ہاں نجم النساء ضرور اُس کا نام نجم النساء ہوگا۔" "ایک دفعہ پھر اُس محبت بھرے خط کو پڑھ لوں" یہ کہہ کر سعید نے میز پر سے ایک لفافہ اُٹھایا۔ جو بجنسہ اُسی شکل کا تھا۔ جیسا خط ابھی ابھی نسیم کے ہاتھ میں دیکھا گیا تھا۔ مضمون بھی بالکل وہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں دائیں جانب کے راستے سے آنے کی تاکید کی تھی +

خط پڑھ کر نسیم نے بے اختیار آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر خود بخود کہنے لگا۔ بھلا اس عاجزی سے کیا مطلب۔ میں تو آجتک اُسی کے انتظار میں تھا۔ میں اُسے اپنی رفیقِ زندگی بناؤں گا۔ جاتے ہی اُسکے پاؤں پر گر پڑوں گا۔ اور کہوں گا کہ میرے دل کی ملکہ میں آجتک صرف تمہارے ہی انتظار میں تھا میں اُسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ اُسکے لئے بیش بہا زیور بہم پہنچانے کی کوشش کرونگا۔ لیکن خدا کرے کہ وہ خوبصورت ہو۔ اگر وہ خوبصورت نہ ہوئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا ..... نہیں نہیں وہ ضرور خوبصورت ہوگی۔ کوئی بدصورت عورت کسی شخص سے یوں ملنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ بدصورت عورتوں کے دل میں محبت کے لطیف جذبات پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ دوستوں کی طرف سے ذرا خطرہ ہے کہ وہ مجھے بدعہد سمجھیں گے۔ کیونکہ میں سب میں یہی مشہور کرچکا ہوں کہ "عمر بھر شادی نہ کروں گا" لعنت ہو مجھ پر میں بھی کیسا ناعاقبت اندیش ہوں۔ خیر کچھ پروا نہیں میں ترکِ وطن بھی کرسکتا ہوں میرے کونسے عزیز دنیا میں موجود ہیں جن کی محبت اس بات میں مانع ہو۔ باقی رہے دوست سو یہ بھی میرے عمر بھر کے رفیق نہیں ہیں۔ سب سے پانچ پانچ چھ چھ سال کی آشنائی ہے۔ جب "وہ" مجھے مل جائیگی تو پھر مجھے کسی دوست کی پروا نہیں۔ میں اس کی پرستش کرونگا۔ اُس شمعِ حسن کیلئے پروانہ بن جاؤنگا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ ورنہ آج کیسی مشکل پیش آتی۔ اور بھلا میری

شادی کسی اور کے ساتھ ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ ایک سچی محبت کرنے والی ہستی دُنیا میں موجود تھی یقیناً میں اُسی کے انتظار میں تھا" ہاں اے ملکۂ حسُن میں تمہارے ہی انتظار میں تھا"
یا الٰہی کل کا دن جلد ختم کر مجھ میں اب زیادہ صبر کی تاب نہیں +

:: ۳ ::

صفدر صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے گھر کے معاملات پر غور کر رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ملازمت کے علاوہ بھی کوئی کام کرنا چاہیئے۔ ابھی تنخواہ ملنے میں کئی روز باقی ہوتے ہیں اُدھر لڑکیاں خرچ ختم ہو جانیکا تکلیف دہ پیغام سُنا دیتی ہیں۔ گھر کے خرچ کو بھی ذرا کم کرنا چاہیئے وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ چھوٹی لڑکی جمیلہ ایک نیلے رنگ کا لفافہ ہاتھ میں لئے آئی اور کہا۔ ابّا! تھوڑی دیر ہوئی ڈاکیا دے کر گیا ہے۔ یہ کہکر جمیلہ وہاں سے چلی گئی۔ صفدر نے جب لفافے پر سے ایڈرس پڑھا تو وہ کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوُا۔ اُس نے جلدی سے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون بالکل وہی تھا جو تھوڑی دیر ہوُئی نسیم اور سعید کے پاس دیکھا جا چکا ہے، لیکن یہاں بائیں طرف سے آنے کے لئے لکھا تھا +

خط پڑھ کر صفدر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اسکے بعد یہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے کے اندر پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ اور اپنے دل سے یوں باتیں کرنے لگا:۔

"یہ این۔ این"، کون ہے اُس نے مجھے کہاں دیکھا ہے۔ کہیں یہ کوئی دھوکا تو نہیں لیکن خط کے ایک ایک حرف سے سچائی راستی اور محبت ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ ضرور اُس صبر کا اجر ہے جو میں نے دوسری شادی نہ کرنے میں کیا۔ جو لوگ مجھے اپنے پائے استغنا سے ٹھکرا چکے ہیں اگر آج وہ یہ خط دیکھیں تو کس قدر شرمندہ ہوں میں ضرور اس سے ملنے کے لئے جاؤنگا اور دنیا کو دکھا دوں گا کہ سب لوگ نا قدر شناس ہی نہیں ہوتے۔ لیکن جبتک میں اُس سے مل نہ لوں یہ بات ہر شخص سے پوشیدہ رکھونگا۔ خواہ کوئی میرا کتنا ہی دوست کیوں نہ ہو۔ میں ایک ہی دفعہ لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دُوں گا +

اس بات کا ذرا خیال ہے کہ دوستوں سے کہہ چکا ہوں کہ اب کبھی دوسری شادی نہ کروں گا۔ لیکن مجھے ان فضول باتوں کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر اُن لوگوں کی ایسی حالت ہوتی تو یقیناً

وہ بھی یہی کہا کرتے۔ اگر انسان ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواکرنے لگے تو دنیا میں اُس کا گذارہ مشکل ہو جائے۔ اگر وہ دولت نہ بھی ہُوئی تو پھر میری خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں۔ معلوم نہیں وہ رہتی کہاں ہے۔ دفتر جاتے ہُوئے راستے میں جو سفید عمارت نظر آتی ہے کہیں وہ اُس جگہ کی رہنے والی تو نہیں؟ جبھی وہاں سے گذرتے ہُوئے میرے دل میں ایک دھڑکن سی پیدا ہوکر رہ جایا کرتی ہے۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہُوا کہ کوئی چق کے اندر سے مجھے دیکھ رہا ہے...... افسوس کہ میں لباس میں بہت ہی بے پروائی سے کام لیتا ہوں۔ اگر وہ وہاں رہتی ہے تو معلوم نہیں اُس نے مجھے کس کس حالت میں دیکھا ہو۔ لیکن یہ سب باتیں فضول ہیں وہ ہر طرح مجھے چاہتی ہے اور یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ وہیں رہتی ہو۔ یہ تو صرف ایک خیال ہے۔ میں نے کس قدر بیوقوفی کی جو داڑھی رکھی ہے۔ سب دوستوں کا خیال ہے کہ یہ کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ سفید بال جو نزلے کی وجہ سے قبل از وقت پیدا ہو گئے ہیں۔ یقیناً بُرے معلوم ہوتے ہونگے۔ یہ کہکر صفدر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ دیر تک آئینے میں اپنی صورت دیکھتے رہنے کے بعد پاس ہی سے خضاب کی شیشی اُٹھا کر چند سفید بالوں کو سیاہ کرنے لگا۔ اُس نے دل میں کہا کہ لوگ ان سفید بالوں کی وجہ سے قبل از وقت مجھے بوڑھا خیال کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ میں سچ کہتا ہوں کہ میرا دل ابھی بوڑھا نہیں ہُوا +

اتنے میں صفدر کی بڑی لڑکی فہمیدہ آگئی۔ وہ باپ کو اس مجنونانہ انداز سے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر ضرور واپس چلی جاتی۔ اگر صفدر کی نظر اُس پر نہ پڑ گئی ہوتی۔ صفدر نے آہستہ آہستہ آئینے کے سامنے سے سرکنا شروع کیا۔ گویا کوئی بہت ہی بڑا جُرم کر رہا تھا +

فہمیدہ نے جھجکتے ہُوئے کہا "آبا!"

لیکن صفدر نے سوائے ماتھے پر بل ڈالنے کے کچھ جواب نہ دیا۔

اُس نے دوسری دفعہ پھر کہا۔ "آبا"!!

صفدر۔ (ترشروئی سے) "کیا ہے"

فہمیدہ "اُس روز دھوبی سے جو کپڑے دُھلوائے تھے اُنکے بارہ......"

صفدر "(بات کاٹ کر تند لہجے میں) بس گھر میں داخل ہوتے ہی مجھ بدبخت پر تقاضوں کی

بوچھاڑ کردیا کرو۔ مجھے تو اس گھر نے جیتے جی جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ معلوم نہیں کب ان جھگڑوں سے چھٹکارا ہوگا"

فہمیدہ "ابا! دھوبی دیر سے باہر کھڑا ہے"

صفدر "اُس سے کہو چلا جائے"

فہمیدہ "پہلے بھی وہ کئی بار تقاضے کے لئے آچکا ہے"

صفدر "تو اُس سے کہو بارہ آنے کے لئے مجھ پر نالش کردے۔ مقدمہ چلائے اور مجھے جیل میں بھجوائے"

فہمیدہ یہ جملے سُن کر خاموش ہوگئی۔

صفدر "تم کیوں اس قدر فضول خرچیاں کیا کرتی ہو۔ تمام دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے گذر جاتا ہے اور کپڑے دھوبیوں سے دھلوائے جاتے ہیں۔ اگر باہر جاکر کمانا پڑے تو معلوم ہو۔ خبردار آج کے بعد تم نے دھوبی سے کپڑے دھلوائے۔ خود دھولیا کرو۔ انسان کو ہر ہُنر خود سیکھنا چاہیئے"

فہمیدہ "ابا! آپ نے خود ہی اُس روز کہا تھا کہ یہ کپڑے دھوبی کو دیدو گھر میں صاف نہیں ہونگے اسی لئے میں نے دھوبی سے دھلوائے ورنہ میں ضرور انہیں بھی خود ہی دھولیتی"

صفدر (کھسیانا ہوکر) "بالکل جھوٹ ہے بکواس مت"

فہمیدہ "ابا آج پیسے دیدیجئے اگر اسکے بعد کبھی مانگا تو سزا دیجئے"

صفدر "میں تو اس وقت کچھ نہیں دے سکتا غضنفر سے مانگ لو۔ وہ کل کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایک روپیہ جمع ہوگیا ہے"

فہمیدہ چلی گئی اور صفدر بڑبڑاتا ہُوا خضاب کی شیشی ہاتھ سے رکھ کر پلنگ پر آبیٹھا اور سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ان لڑکیوں کو چند ماہ کیلئے انکے ماموں اپنے پاس بُلوالیں۔ یہ کمبخت اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہر شخص چالیس کی بجائے میری عمر کا اندازہ پچاس ہی لگا سکتا ہے۔ لڑکے تعداد میں ذرا زیادہ ہیں لیکن خیر چھوٹے تو ہیں۔ یہ زیادہ اولاد بھی ایک عذاب ہوتی ہے۔ معلوم نہیں پرسوں دہاں پہنچنے کے لئے میرے پاس دُھلے ہُوئے کپڑے بھی موجود ہیں یا نہیں" یہ کہہ کر صفدر اُٹھا اور اپنا ٹرنک کھول کر اُس میں سے کپڑے دیکھنے لگا لیکن وہاں سب کپڑے ناکارہ تھے۔ اسکے بعد اُس نے الماری کھولی جس میں اُس کی مرحومہ بیوی کا تھوڑا سا زیور تھا۔ یہ زیور وہ مرتے وقت لڑکیوں کو دینے کے لئے کہہ گئی تھی۔ صفدر نے زیوروں کا ڈبہ سامنے رکھ لیا اور سب زیور اچھی طرح دیکھ بھال کر پھر اُسی طرح

رکھ دئے۔ اور ساتھ ہی یہ الفاظ کہے "لڑکیوں کے لئے ابھی کیا جلدی ہے"

اسکے بعد اُس نے اپنا بٹوا نکالا۔ اس میں کچھ روپے چند نوٹ اور کچھ پیسے تھے۔ انہیں گن کر پھر جیب میں رکھ لیا۔ اور میلے کپڑوں کا ایک جوڑا ہاتھ میں لیکر کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی آواز دی فہمیدہ،

فہمیدہ "جی۔۔۔۔۔"

صفدر "لو آج میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ یہ کپڑے نہایت عُمدہ طریقہ سے دھو کر استری کر دو"

فہمیدہ "بہت اچھا"

صفدر "شاباش! جمیلہ سے بھی مدد لے لینا۔ اور کیا دھوبی پیسے لے گیا؟"

فہمیدہ "جی ہاں غضنفر نے بڑا شور مچایا۔ دھوبی نے بھی سُن لیا ہوگا۔ پیسے دینے کا نام ہی نہیں لیتا تھا آخر میں نے اسے اپنی صندوقچی دیدی تب کہیں جاکر اس نے بارہ آنے کے پیسے دئے"

صفدر "شاباش تم بہت سلیقہ شعار ہو جاؤ گی۔ اسی طرح کفایت شعاری سیکھنی چاہیئے" پھر غضنفر کی طرف مخاطب ہوکر "کیوں غضنفر تم بہت کنجوس ہوتے جارہے ہو"

غضنفر۔ (بغلیں جھانک کر) "نہیں ابّا میں نے سمجھا باجی اپنے لئے مانگ رہی ہیں"

چھوٹا لڑکا اکبر "ابّا بھائی بالکل جھوٹ کہہ رہے ہیں باجی نے آتے ہی آپ کا نام لیا تھا"

صفدر "غضنفر! سخت افسوس ہے کہ تم میرے بیٹے ہو کر اس قدر کنجوس نکلے" خبردار پھر کبھی ایسا نہ کرنا آج تمہارا قصور معاف کیا جاتا ہے"

یہ کہکر صفدر اپنی ٹوپی کا پھندنا خریدنے کے لئے بازار کی طرف روانہ ہُوا۔

۔۔۔۔۔۔ ۴ ۔۔۔۔۔۔

۹ فروری ساڑھے نو بجے شب۔

تین شخص تین مختلف راستوں سے ایک ہی منزلِ مقصود کی جانب تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ چاند کی شفاف روشنی میں اُنکے چہرے صاف طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ سامنے کے راستے سے آنے والا نسیم ہے اُس نے سیاہ رنگ کا ایک گرم سوٹ پہن رکھا ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آس پاس کی تمام چیزوں کو یکسر فراموش کر چکا ہے۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے کبھی تو اپنی بیوی کا ہنستا ہُوا چہرہ آجاتا ہے۔ جب وہ شام کے وقت گھر سے نکلنے کو تھا تو کس طرح اُسکی تمام جھوٹی باتوں کا یقین

کرکے وہ دروازے تک اُسکے ساتھ آئی تھی۔ اور مُسکراتے ہُوئے کہا تھا کہ" دیکھنا کہیں باہر دیر نہ لگا دینا مجھے رات کے وقت اکیلے رہنے سے ڈر لگتا ہے" پھر اُسے اپنا مجرمانہ انداز میں اچھا کہہ کر رخصت ہونا یاد آتا۔ اور کبھی عالمِ تصوّر میں وہ اُس عورت کو دیکھتا جو اس سردی اور رات کے اندھیرے میں فقط اُسی کے لئے ایک سُنسان جگہ میں کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھی ؛

ــــــــ :: ۵ :: ــــــــ

دائیں جانب سے آنے والا سعید ہے۔ اُسکے چہرے سے دلی مسرت اور شادمانی کے آثار ہویدا ہیں لیکن کبھی کبھی کسی آنے والے خیال سے اُس کا چہرہ پژمردہ بھی ہو جاتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو آج اُس نے منہ دھونے پر صابن کی پوری ٹکیہ صرف کی ہو گی۔ اپنے کپڑوں میں سے بہترین سوٹ زیب تن کئے۔ سر پر رومی ٹوپی پہنے چھڑی ہلاتا ہُوا چلا آرہا ہے ؛

ــــــــ :: ۶ :: ــــــــ

بائیں طرف کے راستے سے میرزا صفدر چلا آتا ہے۔ چہرے سے یکسوئی اور اطمینان ٹپکتا ہے۔ اُس روز داڑھی میں جو چند سفید بال نظر آتے تھے۔ آج خضاب کی برکت سے اُنکا نام و نشان موجود نہیں۔ داڑھی اور مونچھیں نہایت فیشنیبل طور پر کٹوائی گئی ہیں۔ سیاہ رنگ کا فراک کوٹ۔ سفید پائجامہ پہنے ہے۔ واقعی فہمیدہ نے آج کپڑے دھونے میں کمال کر دیا ہے۔ غالباً میرزا صاحب نے امتحان میں اُسے کافی نمبر دئیے ہونگے۔ سُرخ رنگ کی ٹوپی جس میں نیا پھندنا بہار دکھا رہا ہے کچھ عجیب انداز سے سر پر رکھی ہے۔ آج بیچارے بوٹ کی فریاد بھی سُنی گئی ہے۔ کیونکہ غضنفر اور اکبر نے شرطیں باندھ باندھ کر اُس پر پالش لگا کر اُسے خوب چمکایا ہے کوٹ کے کاج میں ایک تازہ گلاب کا پھُول زیب دے رہا ہے۔ اور اس سے غالباً ایک پنتھ دو کاج مقصد ہے۔ یعنی سجاوٹ کی سجاوٹ اور اگر ضرورت پڑے تو کسی کی نظر بھی کیا جاسکتا ہے ؛

اگر صفدر کے سراپا پر اس وقت اُسکے کسی دوست کی نظر پڑجاتی تو وہ کس قدر متحیّر ہوتا۔ کیونکہ کئی سال سے اُس نے اس قدر سادگی اختیار کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ ؛

ــــــــ :: ۷ :: ــــــــ

دفعتاً تینوں کی نگاہیں دُور سے برگد کے بڑے درخت کی جانب اُٹھ گئیں اور کامیاب واپس لوٹیں ؛

پتّوں میں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر درخت کے نیچے کی زمین کو نورانی بنا رہی ہے اور ایک بلند قامت عورت نقاب پہنے درخت کے نیچے کھڑی نظر آتی ہے تینوں نے عجلت سے قدم بڑھایا۔ اور وہ ایک ہی دفعہ درخت کے نیچے پہنچ گئے۔

سب سے پہلے نسیم کی نظر صفدر اور سعید پر پڑی' دیکھتے ہی گویا زمین اُسکے پاؤں تلے سے نکل گئی اُسکا سر چکرانے لگا "ہو نہ ہو ان دونوں کو میرا راز معلوم ہوگیا۔ وہ یقیناً میرے تعاقب میں آئے ہیں' عجب نہیں کہ میری بیوی کو شبہ ہوگیا ہو۔ اور اس نے انکو میرے پیچھے بھجوا دیا ہو" اُسے اپنا دم گھٹتا ہُوا معلوم ہُوا۔

اُدھر سعید نے صفدر اور نسیم کو دیکھ کر غصہ سے دانت پیسنے شروع کئے۔

"یہ کیوں میرے پیچھے آ گئے۔ انہیں کس نے خبر دی۔ میں ایسا مذاق ہرگز پسند نہیں کرتا۔ خواہ مخواہ اسوقت یہاں آ دھمکے۔ میں انہیں ابھی مزا چکھاؤنگا"۔ بچارے صفدر کی حالت قابلِ رحم تھی' وہ سوچ رہا تھا کہ مجھ سے یہاں آنے میں بڑی غلطی ہُوئی۔ وہ خط ضرور سعید کی طرف ہوگا۔ جبھی وہ نسیم کے ہمراہ یہاں آیا ہے۔ اُس نے اس بات کو بالکل فراموش کر دیا کہ لفافے پر صاف اُس کا نام اور پتہ درج تھا۔ پھر اُس نے سوچا کہ شاید ان شریروں کو میرا راز معلوم ہوگیا ہے' اور وہ مجھے شرمندہ کرنیکے لئے یہاں آئے ہیں۔ اُس نے جلدی سے گلاب کا پھول کوٹ کے کاج میں سے نکال کر زمین پر پھینک دیا۔

نسیم نے جھجکتے ہُوئے کہا۔ میں ..... صرف ..... انکی مدد ..... کے لئے ....

صفدر نے سمجھا کہ یہ سعید کی مدد کے لئے آیا ہے۔ اور سعید نے بھی شاید یہی سمجھ کر درشتی سے کہا" مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں"۔

دفعتاً نقاب کے اندر سے آواز آئی" میرے پیارے دوستو! اس سردی میں رات کے وقت تشریف فرمائی کا شکریہ"' اس کے ساتھ ہی چہرے سے نقاب اُٹھا دیا گیا۔

تینوں کی حیرت اور پشیمانی کا اندازہ مشکل تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کا عزیز دوست اعجاز چہرے سے نقاب اُٹھائے اُنکے سامنے ہنس رہا ہے۔

(ز۔ ب)

پیام سحر

اے کلیمِ طورِ ہستی! اُٹھ چراغِ طور دیکھ! — روشنی عالم میں ہے جس نور کی وہ نور دیکھ!
امینِ ہستی میں تو کیوں اس طرح خوابیدہ ہے؟ — نور کی بستی میں تو کیوں اس طرح خوابیدہ ہے؟
جلوہ گاہِ نور ہے، سینہ ترا وہ سینہ ہے — یہ جہاں آئینہ خانہ اور تو آئینہ ہے
ذرۂ صحرا تو جلوے کے لئے بیتاب ہو — اور تو اے ننگِ بینائی! سراپا خواب ہو!
ظلمتِ شب کا گریباں چاک ہونیکو ہے دیکھ! — قصۂ تاریکِ ہجراں پاک ہونیکو ہے دیکھ!

ساقیٔ فطرت درِ میخانہ وا کرنیکو ہے
اپنے میخانہ میں پھر محشر بپا کرنیکو ہے

اُٹھ! کہ بیداری میں ہیں ہستی کی مستی کے مزے — اُٹھ! کہ اس مستی کے پردے میں ہیں ہستی کے مزے
اُٹھ! کہ قربِ کوئے جاناں جادہ پیمائی میں ہے — اُٹھ! کہ لطفِ زندگی ہنگامہ آرائی میں ہے
اُٹھ! کہ تو زندہ ہے جشنِ زندگی کی داد دے — جوہرِ قابل ہے تو تابندگی کی داد دے
اُٹھ! کہ تیرے جاگنے پر منحصر بہبود ہے — اُٹھ! کہ تیرا جاگنا ہی منزلِ مقصود ہے
نیند کے ماتوں میں نورِ زندگی ملتا نہیں — عقل کے اندھوں کو طورِ زندگی ملتا نہیں

خوابِ غفلت تا بکے؟ ہشیار ہو ہشیار ہو
نور کا تڑکا ہے۔ اُٹھ! بیدار ہو! بیدار ہو!

امینِ حزین

رفع دفع

(ڈراما)

جائے وقوع۔ کشمیری دروازہ لاہور کے باہر باغ میں چار دیواری کے اندر ایک تکیہ

وقت۔ چھ بجے شام ماہ جون ۱۸۹۵ء

رلدو، بوٹا اور چند قمار باز جمع ہیں۔

رُلدو۔ کیوں بے ابن الم علم، آج تو کچھ گھبرایا ہوا ہے؟

بوٹا۔ بیٹے کچھ نہ پوچھ۔ آج آخر کار ہم نے اپنی قسمت کا مینڈھا کوتوال کی تدبیر کے خچر سے لڑا ہی دیا ہے۔

رلدو۔ کیوں نہ ہو، افلاطون کے خاص الخاص صاحبزادے تمہیں تو ہو نا! مگر بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟

بوٹا۔ مجھے یقین تھا کہ کوتوال آج ضرور خود شام کے چھ بجے آئیگا اور بہت سی رقم مانگیگا مقررہ سے ڈبل۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ پچھلی جمعرات کو ہم نے دو چار موٹی اسامیوں کی دل کھول کے فصد لی ہے۔ سو میں آج صبح ڈپٹی کمشنر کے گھوڑے کے آگے جا ڈٹا اور اسے سب حال کہدیا اور منوا لیا کہ شام کے چھ بجے یہاں آکر شہر بھر کے سب سے بڑے بدمعاش یعنے کوتوال کو مال سمیت خود گرفتار کرلیں۔ اب دیکھنا تم آنکھ جھپکنے کی دیر میں گُل کھلا چاہتا ہے۔

رُلدو۔ بچہ جی کوتوال ایسا اُلّو نہیں کہ تمہارے نرغہ میں پھنس جائے۔ کیوں شامت آئی ہے۔

بوٹا۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ لو وہ کوتوال حرامی تو آ گیا۔

(کوتوال داخل ہوتا ہے)

کوتوال (اہم۔ اہم۔ پھر اپنے اردلی سے) بلاؤ گارد کو۔ لگاؤ ان سب پاجیوں کو ہتھکڑی شہر بھر کو لوٹ لیا ہے

اردلی (دو چار گالیاں دیکر) خبردار جو اپنی جگہ سے کوئی ہلا۔

بوٹا۔ سرکار ہم حضور کے غلام ہیں خفا نہ ہوں۔ ہماری مجال ہے کہ ہلیں۔ اور بھاگ کر جائینگے کہاں۔ (اردلی سے) بھیجئے بڑی گرمی ہے۔ سرکار کو پانی دانی پلوائیے۔ برف ہے۔ کھانڈ ہے!

(اردلی برف لیتا ہے اور برف کے بنڈل میں دس روپیہ اپنے حصہ کے پاکر کوتوال کی طرف مخاطب ہوکر کہتا ہے) عالیجاہ پانی بناؤں یا شربت؟

کوتوال۔ بڑی گرمی ہے تھوڑا سا شربت بنالو۔ (چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)۔

بوٹا کوتوال کے پاؤں دباتا ہے اور چپکے سے نوٹوں کا بنڈل کوتوال کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ اور دبی زبان سے کہتا ہے "دوسو"

کوتوال۔ (دبی زبان سے) نہیں ہرگز نہیں۔ دوسو اور ورنہ ابھی حوالات۔

بوٹا "سرکار رحم"

کوتوال "حرامزادہ۔ ہزار میں سے ہمارا حصہ دوسو۔ شرم نہیں آتی"

بوٹا "سرکار! ہزار کس بھڑوے نے دیکھا ہے۔ یونہی مشہور ہوگیا ہے ورنہ پیر صاحب کی قسم ہمیں چھ سو سے زیادہ نہیں ملا"

کوتوال "تم پیر صاحب کی قسم جھوٹی نہیں کھایا کرتے۔ اچھا تو ہمارا حصہ ایک سو اور ہُوا وہ لاؤ"

بوٹا "حضور پکا وعدہ کرتا ہوں پھر حاضر کردونگا"

کوتوال "نہیں ابھی لاؤ ورنہ چلو"

بوٹا سو کے نوٹ گن کر ادا دیتا ہے کہ اتنے میں ڈپٹی کمشنر گھوڑے پر سوار انکے سر پر جا پہنچتا ہے نوٹ ابھی کوتوال کے ہاتھ میں ہیں۔ کوتوال سرد قد کھڑا ہو کر نوٹوں والے ہاتھ ہی سے باقاعدہ فوجی سلام کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

"حضور تلاشی لے رہا ہوں۔ ابھی پہلی تلاشی ختم نہیں ہُوئی۔ دیکھئے اور اس کے پاس کیا نکلتا ہے بوٹا کو ڈپٹ کر" نکال باقی بھی" بوٹا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کوتوال زور سے ایک تھپڑ دیتا ہے۔ بوٹا کانپ جاتا ہے اور چپکے سے تہ بند کی ڈب سے نقد نکالنا شروع کرتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر گھوڑے سے اُترتا ہے۔ ایک سپاہی گھوڑا الگ لے جاتا ہے۔

کوتوال۔ (ڈپٹی کمشنر سے) "حضور بڑا بھاری بدمعاش ہے۔ اس نے شہر لوٹ لیا ہے میں چھ مہینے سے اسکی تاک میں تھا۔ کپتان صاحب کو میں نے خبر دی تھی وہ بھی آتے ہونگے۔ مجھے علم نہیں کہ انہوں نے حضور سے ذکر کیا یا نہیں"

ڈپٹی کمشنر "دل کیا کپتان صاحب آئینگے؟

کوتوال "ہاں حضور۔ میں تھانہ سے آدمی بھیج کر آیا ہوں۔ گارد ساتھ لایا ہوں (سیٹی بجاتا ہے آٹھ دس سپاہی آجاتے ہیں) +

ڈپٹی کمشنر:۔ "ہم سے کپتان صاحب نے نہیں بولا"

(کوتوال تاڑ جاتا ہے)۔

کوتوال:۔ "حضور یہ بوٹا بڑا بدمعاش ہے۔ اس نے سارے شہر میں مشہور کر رکھا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے ملازموں کو حصّہ دیتا ہوں مجھے کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا"

ڈپٹی کمشنر:۔ "ڈیم۔ گرفتار کرو ان سب بدمعاشوں کو"

بوٹا کا رنگ فق ہو جاتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کپتان پولیس داخل ہوتا ہے۔

ڈپٹی کمشنر:۔ (انگریزی میں) "تمہارا تھانہ دار بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے"

کپتان پولیس۔ (انگریزی میں) "بیشک۔ اس نے مجھے چھ ماہ سے کہہ رکھا تھا کہ موقع پا کر گرفتار کرونگا۔ آج دوپہر اس نے خبر کی کہ موقع ہے۔ مگر آپ کس طرح آ گئے؟

ڈپٹی کمشنر۔ (انگریزی میں) "امر واقع یہ ہے کہ بوٹا نے آج میرا گھوڑا رد کا اور کہا کہ کوتوال زبردستی ہم سے رشوت لیتا ہے اور چھ بجے آپ اس مقام پر آئیں"

کپتان پولیس۔ (انگریزی میں) ڈیم سوائین۔ مجھے اس تھانہ دار پر پورا اعتبار ہے۔ بہت کام کا آدمی ہے۔ رشوت لینے والا نہیں۔

ڈپٹی کمشنر:۔ "میرا آپ سے اتفاق ہے۔ اگر اس نے رشوت لی ہوتی تو مجھے دیکھ کر سخت گھبرا جاتا مگر اس نے فوراً کہدیا کہ تلاشی لے رہا ہوں۔ میں نے اسکے چہرے کو بہت غور سے پرکھا بالکل اضطراب نہ تھا"

کپتان:۔ "بالکل درست۔ فرسٹ ریٹ افسر ہے (کار دگی طرف متوجہ ہو کر) سب کو ہتھکڑی لگاؤ فوراً۔ تلاشی معتبرین کے سامنے کوتوالی میں ہوگی۔

سپاہی:۔ "بہت بہتر خداوند"

کوتوال (ڈپٹ کر) "بہت جلدی"

ایک سپاہی باوجود اس حکم کے قمار بازوں کی طرف نہیں بڑھتا۔ بلکہ ڈپٹی کمشنر کے عین سامنے آکر خاص بلند آواز سے کہتا ہے: "ہزار میں سے ہمارا حصّہ دو سو" تھانہ دار اسے دھکا دیتا ہے اور کہتا ہے "ادھر جاؤ"

وہ سپاہی تھانہ دار کی کچھ پروا نہیں کرتا اور ڈپٹی کمشنر کے عین سامنے جاکر پھر کہتا ہے۔

"ہزار میں سے ہمارا حصّہ دو سو"

ڈپٹی کمشنر (خفگی سے) واٹ دی ڈیول ....

کپتان پولیس (بہت زور سے) ایٹنشن!

سپاہی (انگریزی میں) "تام بیوقوف مت بنو!

(کپتان کا رنگ فق ہو جاتا ہے) سر! سر! (Sir, Sir) کا لفظ دو دفعہ کہہ کر اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ کوتوال کو تقریباً غش آنے لگتا ہے"

ڈپٹی کمشنر: "کیا آپ واربرٹن ہیں؟

سپاہی: "یس (ہاں)"

"ہزار میں سے ہمارا حصّہ دو سو۔ شرم نہیں آتی" کہکر پولیس کے جرنیل واربرٹن نے کوتوال کی جیب میں سے دو سو کے نوٹوں کا بنڈل نکالا۔

جرنیل واربرٹن: "اس ہوشیار تھانہ دار نے تم سب کو خوب چکمہ دیا ہوتا اگر میں اتفاق سے رستہ میں گارد میں نہ مل جاتا۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں بھیس بدلتا ہوں تو پٹھان بنتا ہوں۔ وہ بھی کبھی کبھی مگر اکثر میں پولیس کا سپاہی ہی بنتا ہوں۔

اب سب یہاں سے چلو اور اس معاملے کو رفع دفع کرو" ۔

(عبدالعزیز)

بڑوالا چودھری

کانگڑے کا ضلع پنجاب کے اُن حصوں میں سے ہے جہاں پرانی روایات۔ بھوت پریت کی داستانیں۔ چلتے پھرتے مُردوں کی کہانیاں اور اسی قسم کے دقیانوسی خیالات ایک غیرفانی زندگی لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ضلع کے طبعی حالات بھی بھوت پریت کو پناہ دینے میں مدد دیتے ہیں۔ گاؤں میں ایک گھر دوسرے گھر سے بعض اوقات ایک آدھ میل کے فاصلہ پر واقع ہوتا ہے۔ اس لئے جب کہیں کوئی مُردہ شمشان گھاٹ پر سے ہوتا ہوا اپنے رشتہ داروں یا دشمنوں کو آوازیں دینے لگتا ہے۔ تو پیشتر اسکے کہ کوئی پڑوسی اس کی آواز سن کر آسکے وہ وادی میں سے گزرتا ہوا۔ نالے کے کنارے پر پہنچ کر اُن سب کی بے فائدہ کوششوں پر بے تحاشا ہنس سکتا ہے۔ پگڈنڈیاں ہر قسم کے تعاقب کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ اس لئے جتنے بھوت پریت اس علاقہ کے بعض دیہات میں نمودار ہوتے ہیں۔ اُنکی تعداد باقی پنجاب بھر کے بھُوت پریتوں سے زیادہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں بعض اوقات ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ اگر تھیوصوفیکل سوسائٹی کے کچھ عالم اُن کی تحقیقات کریں تو اچھے خاصے دلچسپ ناول لکھے جاسکیں۔

اس وادی میں ایک گاؤں معراج پور نامی ہے۔ یہ ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ مشرق مغرب۔ شمال اور جنوب ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ مشرق کی جانب ایک پہاڑی نالہ ہے جو اٹھکیلیاں کرتا۔ ناچتا۔ گاتا قریب کی ایک ندی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ شمال کی جانب پہاڑی پر درختوں کا ایک گنجان جھنڈ ہے۔ یہ پودے بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ بادصرصر کے جھونکوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ انہیں جھاڑیاں کہنا گناہ ہوگا۔ یہ خاردار نہیں ہیں۔ اور آج تک کسی کے دامن میں انکا خار نہیں اٹکا۔ یہ اپنی ہی قسم کے درخت ہیں جنہیں پہاڑی زمین نے سرافرازی سے باز رکھا ہے۔ مدت مدید اور عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ یہاں ایک چودھری ہوشیار سنگھ نامی رہا کرتا تھا۔ یہ ایک خاندانی چودھری تھا۔ جب گاؤں آباد ہوا تھا اُس کے آباو اجداد گاؤں کے مورث اعلیٰ کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اُن کی شہرت کے گیت آجتک سردیوں کی راتوں میں اکھاڑوں میں گائے جاتے ہیں۔ ہوشیار سنگھ صلح کُل اور ہر دلعزیز آدمی تھا اور اپنی بیوی کا زرخرید غلام۔ شاید بیوی کی زباں درازیوں ہی نے اُسے اتنا حلیم الطبع بنا دیا تھا۔

گاؤں "بھیّا چارے" کے طریق پر آباد تھا۔ اس لئے ہوشیار سنگھ کے والد کی وفات پر ایک اچھا خاصا زمین کا ٹکڑا اسکے حصے میں آیا تھا۔ لیکن ہوشیار سنگھ ہر قسم کی منفعت بخش محنت سے گھبراتا تھا۔ اسکا قصور بھی کوئی نہ تھا۔ یہ زمین بقول اسکے پڑوسی رلیا سنگھ کے بڑی ہی ناقص تھی۔ مرلہ مرلہ کر کے اسکا بہت سا حصہ رلیا سنگھ کے پاس رہن ہو چکا تھا۔ اور جو ٹکڑا باقی تھا۔ وہ بھی کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ ہوشیار سنگھ کی بیوی اکثر اُسے طعنہ و تشنیع سے تنگ رکھتی تھی۔ لیکن گھر کی دہلیز سے پاؤں نکلتے ہی ہوشیار سنگھ کی ہوشیاری کی کوئی حد نہ رہتی۔ گاؤں کی ہر ایک بہو بیٹی اس سے اپنا کام کرا سکتی تھی۔ گاؤں کے بچوں کا وہ رہنما تھا۔ جہاں اسکی صورت دیکھ پاتے تھے، اسکے گرد ہو جاتے تھے، کوئی کندھے پر چڑھتا تھا تو کوئی گھنچال کھیلنے کے لئے اسے کھینچتا تھا۔ کچھ گلی ڈنڈے کے طلبگار ہوتے تھے، تو باقی فن پہلوانی میں اس سے مدد کے طالب تھے، غرضکہ جہانتک بچوں اور عورتوں کا تعلق تھا وہ بڑا ہی ہردلعزیز شخص تھا۔

ہوشیار سنگھ کی بیوی شادی کے وقت ہی سے زباں دراز تھی۔ تیز زبان استعمال سے کند نہیں ہوتی، بلکہ صیقل ہوتی جاتی ہے۔ اسوقت ہوشیار سنگھ اچھا خاصا فرمانبردار خاوند بنگیا تھا۔ گھر پر اسے ٹھیرنا دوبھر تھا اس لئے وہ نزدیک کے شوالہ میں جا بیٹھتا تھا۔ دھنا پنڈت بڑے کرم دھرمی تھے ٹیکا لگانے۔ چندن گھسانے اور مالا دکھانے میں کوئی اُن سے بازی نہیں لیجا سکتا تھا۔ ۱۱ بجے وہ پوجا سے فارغ ہوتے تھے آٹھ پہر کے بعد اَن کھاتے تھے۔ اس کے بعد ہی اُنکے یار دوست آجاتے تھے۔ شوالے کے فراخ احاطے میں بڑ کے درخت کے نیچے دھونی رمائے چرس کے دم لگانے شروع کر دیتے تھے۔ اڑوس پڑوس کے سب واقعات پر روزانہ بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ جمہوریت کا زور تھا۔ جو زیادہ شور مچاتا تھا وہی جیت جاتا تھا کبھی کبھار کوئی گھوڑ چڑھا مسافر گاؤں میں آجاتا تھا تو شوالے کے ساتھ کی دھرمسالہ میں ہی قیام کرتا تھا بس پھر دھنا پنڈت۔ بشن داس پاٹشالہ کا اُستاد۔ ہوشیار سنگھ اور سب یار غار اسکے گرد ہو کر لاہور دربار کی باتیں سُنا کرتے تھے۔ کبھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بٹالہ فتح کرنیکی خبر سن پاتے تھے۔ تو کبھی اس کے بیدی صاحب سنگھ کے دربار میں حاضر ہو کر قدموں پر سر رکھنے کی کتھا کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ کبھی راجہ سنسار چند کے ساتھ جھگڑوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ تو کبھی انگریزوں کے ساتھ عہد نامہ کی بات چیت۔ رات آرام کر کے مسافر تو اپنی راہ لیتے تھے، لیکن ہوشیار سنگھ اور اسکے ساتھیوں کے لئے پانچ سات ماہ کیلئے بحث مباحثہ کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ بڑا ہی دلچسپ نظارہ تھا جب کہ ایک مسافر نے بٹالے کے فتح ہونیکے

دس سال بعد اُنکو اسی موضوع پر بحث کرتے پایا۔ اس جماعت کا سردار دھنا پنڈت تھا۔ وہ بحث مباحثہ میں حصہ کم لیتا تھا لیکن اشاروں کنایوں سے اپنی رائے ظاہر کر دیتا تھا۔ ہر ایک بڑے آدمی کے پیرو ہوتے ہی ہیں، دھنا کے حواری بھی اسکے چرس کے شعلوں سے اسکی رائے کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے +

لیکن دن پھرتے دیر نہیں لگتی، برسات کا موسم تھا۔ مکّی کی فصل تھوڑی بہت ہوشیار سنگھ نے بو رکھی تھی اسکی بیوی سُبھدرا کئی دن سے نلائی کا تقاضا کر رہی تھی لیکن ہوشیار سنگھ سمجھتا تھا کہ یہ سب تردد بیکار ہے۔ بارش اس سال زیادہ ہونی تھی جسکی وجہ سے ساری فصل برباد ہو جانیوالی تھی ایسی حالت میں دور اندیش ہوشیار سنگھ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فصل پر محنت مشقت سب بیکار ہے۔ دھنا پنڈت کہہ چکا تھا کہ اس سال بارش بہت ہوگی کیا اسکا وچن بیکار جائیگا؟ یہ سوچ کر اور سبھدرا کے طعنوں کی بارش سے گھبرا کر وہ شوالہ میں آبیٹھا تھا، ابھی ابھی ایک سوار دھرمسالہ میں آکر اترا تھا۔ اور حسب معمول شوالہ کے بڑ کے نیچے آرام کے لئے آرہا تھا۔ امید تھی کہ اس سے جموں کے جھگڑے کے سارے حالات معلوم ہونگے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا قبضہ یہاں تین سال سے تھا لیکن معراج پور کے چودھریوں کو بھی تک تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ گورمکھ سنگھ بڑ کے نیچے چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ ہوشیار سنگھ نے حقہ تازہ کیا اور گورمکھ سنگھ اس جھگڑے کے مصدقہ حالات سنانے ہی والا تھا کہ باہر اونچی کرخت آوازیں دھنے کی گت، بنی شروع ہوئی اور ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ پڑ گئی ہوشیار سنگھ گھبرا گیا۔ آخر سبھدرا یہاں بھی آپہنچی۔ پانچ دس صلواتیں پنڈت کو سنائیں۔ دو چار بشنداس کے حصہ میں آئیں اور ہوشیار سنگھ کو بادلِ ناخواستہ اپنے اس تکیہ کو بھی چھوڑنا پڑا +

اس واقعہ کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ معمول سے زیادہ اُداس تھا۔ اُس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی بندوق کندھے پر رکھی، موتی کُتے کو سیٹی دی اور گاؤں سے باہر نکلا معراج پور سے بھون کی طرف ایک پگڈنڈی جاتی تھی یہ اُن درختوں کے جھنڈ کے نیچے سے ہو کر ایک چشمہ پر جا نکلتی تھی چشمہ پر اکثر جانور پانی پینے کے لئے آجاتے تھے۔ صبح سویرے اس بات کا امکان تھا کہ کوئی جانور ہاتھ لگ جائے۔ ہوشیار سنگھ تو دل بہلاوے کے لئے نکلا تھا۔ کچھ وقت تو سبھدرا کی آواز سنے بغیر گذر جائیگا۔ اسے یہ تسکین تھی۔ اسکے پاس کچھ بھنے ہوئے چاول تھے جن میں شکر ملی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ ستو بنا کر کھاؤنگا اور شام ہونے سے پہلے واپس آنیکا نام نہ لونگا۔ شوالہ راستہ میں تھا۔ دھنے نے آواز تو دی مگر ہوشیار سنگھ پر آج اس آواز کا جادو بھی نہ چلا گاؤں سے باہر جاتے ہی پروہت بدھی چند بھی ملا۔ لیکن آج ہوشیار سنگھ کا دل اس سے بھی نہ کھینچا گیا۔

وہ کرتا کراتا پہاڑ کے نزدیک جا پہنچا۔ پگڈنڈی اُسے درختوں کے جھنڈ کے پاس لیگئی اور آخر کار اُس نے چشمہ کے مصفا پانی سے ستو بنائے اور دوپہر گزار دی۔ تیسرے پہر وہ پھر وہاں سے چلا۔ ارادہ تھا کہ دو چار میل کے فاصلہ پر جو شہیدی باغ ہے، وہاں تک ہو آئے۔ یہ جگہ عوام میں بڑی "سخت" مشہور تھی، دوپہر اور آدھی رات ایک طرف یہاں سے تو شام کو بھی گذرنا حوصلے والے آدمی کا کام تھا لیکن چودھری میں یہ حوصلہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ باغ میں ضرور جاؤں گا کُل آدھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ باغ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے اُسکا خیر مقدم کیا کوئل کی کوکو نے اُسے خوش آمدید کہی، اور بادِ صرصر کے عطر بھرے جھونکوں نے اُسکے پاؤں چومے۔ آخر وہ باغ میں پہنچ گیا۔ میوہ جات کثرت سے تھے، درخت بھی دور دراز سے لائے گئے تھے انواع و اقسام کے پھلوں کی نمائش تھی، پھرتا پھراتا ہوشیار سنگھ شہیدی سمادھوں کے نزدیک پہنچا۔ یہ چند شہید سکھوں کی یاد میں بنی ہوئی تھی، پاس ہی ایک چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ اُس نے سر جُھکایا۔ اور واپس جانے ہی کو تھا کہ آواز آئی ہوشیار سنگھ۔ ہوشیار سنگھ۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ اسکے کانوں نے اسکے ساتھ فریب کیا ہے۔ لیکن جب ایک دفعہ پھر وہی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسکے دائیں جانب سے ایک عجیب الہیئت انسان ایک گٹھڑی سر پر رکھے اسے ٹھہرنے کے لئے اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ایک لمبا چغہ پہنے ہُوئے تھا۔ ٹخنوں تک دھوتی باندھے تھا، سر کے بال عجیب ہی وضع کے معلوم ہوتے تھے۔ کپڑے پرانی قسم کی سوسی کے بنے ہُوئے معلوم ہوتے تھے جو اس وقت سے کوئی سو سال پہلے رائج تھی۔ ہوشیار سنگھ کو ایسا معلوم ہُوا کہ اُس نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہُوا ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔ نو وارد نے اپنا سامان لا کر چبوترہ پر رکھدیا اور ہوشیار سنگھ کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ اسی وضع و قطع کے پانچ سات اور آدمی آ گئے اور آ کر چبوترہ پر بیٹھ گئے۔ گھنیال کھیلنے کے لئے چبوترے پر سامان موجود تھا۔ چار آدمی اس کھیل میں مشغول ہو گئے۔ اور باقی لوگ انکے کھیل کو دیکھنے لگے، اشاروں ہی اشاروں میں اُنکے لئے چلم تازہ کرنیکا کام ہوشیار سنگھ کے سپرد ہُوا۔ پہلے پہل تو ہوشیار سنگھ ذرا خائف ہُوا۔ لیکن آہستہ آہستہ اسکا خوف دُور ہُوا۔ اب وہ کبھی کبھی چلم کا ایک کش خود بھی لگا لیتا تھا۔ پہلی ہی بار اُسے کچھ غنودگی سی محسوس ہُوئی۔ پانچ چار دفعہ دم لگایا تو نیند نے اس پر غلبہ پانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کوئی آدھ گھنٹے میں وہ خراٹے لینے لگا +

جب اسکی آنکھ کھلی تو سُورج کی شعاعیں مشرقی گوشہ سے نکل کر آسمان کو ارغوانی رنگ میں رنگ رہی تھیں۔ ہوشیار سنگھ نے کروٹ بدلی۔ تو گھٹنوں میں اُسے کچھ درد معلوم ہُوا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُسے کچھ کمزوری محسوس ہُوئی۔ نزدیک پڑی ہُوئی بندوق کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کا قبضہ زنگ خوردہ

تھا۔ پگڑی میں کرم لگ رہے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے اپنے پچھلی رات کے ساتھیوں کو پانچ دس صلواتیں سنائیں پھر سبھدرا کا خیال آیا تو دل کانپ اُٹھا، ساری رات باہر رہنے کے لئے نہ معلوم زن پرست ضابطہ فوجداری کی کتنی دفعات اس پر عائد ہونگی، موتی کو اس نے چند آوازیں دیں لیکن وہ بھی اس وقت موجود نہ ہُوا۔ خیر دن چڑھتا دیکھ کر اُس نے اکیلے ہی چلنا شروع کیا۔ لیکن جونہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو اُسے چبوترہ نظر نہ آیا۔ سارے باغ میں چکر لگایا۔ تو شہیدی دھرم ستھان کے نزدیک تو کجا سارے باغ میں بھی کوئی چبوترہ نہ تھا۔ حیران تھا۔ کہ یہ کیا ہوگیا۔ شہیدی سمادھوں کی بھی عجیب خستہ حالت تھی، باغ بھی کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ خیر اس نے گھر کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا +

جونہی اس نے جوتی پاؤں میں ڈالنے کے لئے اُٹھائی تو پاؤں میں ڈالتے ہی اس کا پاؤں باہر نکل آیا وہ حیران تھا کہ یا پرماتما یہ کیا ماجرا ہے۔ راستہ بھی اُسے کل کے راستہ سے مختلف نظر آیا۔ جہاں ایک معمولی پگڈنڈی تھی وہاں اب ایک چھوٹا سا راستہ دکھائی دیا۔ جس پر اب گھوڑوں اور خچروں کے پاؤں کے نشانات بھی موجود تھے۔ ہوشیار سنگھ کو اپنے استقبال کا اتنا خیال تھا کہ ان تبدیلیوں پر اس نے ذرا بھی غور نہ کیا۔ وہ تیز رفتاری سے گھر پہنچنے کے پیچھے پڑا ہُوا تھا۔ جوں توں کرکے وہ اپنے گاؤں میں پہنچ گیا +

گاؤں کی شکل ہی عجیب تھی۔ وہ پرانے مکانات اپنے پھوس کے چھپروں سمیت غائب معلوم ہوتے تھے۔ دو چار آدمی جو اُسے راستے میں ملے، اُنھوں نے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ جو ملتا تھا۔ اپنی ڈاڑھی کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ سادہ تقلید نے اُسے بھی اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے کو مجبور کیا۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ یہ کوئی فٹ بھر بڑھی ہُوئی ہے، بڑا حیران ہُوا۔ جوں جوں اپنے گھر کی طرف جاتا تھا۔ اسکا دل بیٹھا جاتا تھا۔ بچے ملے تو وہ اس سے ہمکلام نہ ہُوئے، جوان ملے تو اُنھوں نے اُس سے بات چیت نہ کی اور پھر لطف یہ کہ بچے، بوڑھے مرد اور عورت وہ سب سے نا آشنا معلوم ہوتا تھا۔ حیران تھا کہ ہے رام! یہ کیا ماجرا ہے ڈرتے کانپتے، وہ اپنے مکان کے نزدیک آیا۔ اندر قدم رکھا تو ہر طرف وحشت ہی ٹپکتی نظر آئی معلوم ہوتا تھا کہ سالوں سے یہاں کوئی آباد نہیں ہے۔ پھر بھی اسے ڈر ہی تھا کہ کہیں کسی کونے سے سبھدرا نکل کر جواب طلبی نہ شروع کردے۔ خیر اپنے مکان سے تو وہ بے نیل مرام باہر نکل آیا۔ حیران تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ اب کہاں جاؤں۔ کس سے اپنے اُجڑے ہُوئے خاندان کی خبر پاؤں۔ شوالہ کی جانب روانہ ہُوا کہ پنڈت دھنا ہی سے کچھ کیفیت معلوم ہو۔ اس اثنا میں گاؤں کے بچے اسکے گرد جمع ہو گئے تھے۔ لڑکے اس پر تمسخر اُڑا رہے تھے، طوعاً و کرہاً اس گروہ کی سرداری کرتا ہُوا شوالہ پہنچا۔ وہاں

دھنے پنڈت کا نام ونشان بھی نہ پایا۔ لشن داس کو آواز دی تو وہ بھی نظر نہ آیا۔ بڑ کے درخت کے نیچے جو صورتیں تھیں وہ بالکل نئی تھیں۔ دھرمسالہ کی طرف گیا۔ تو وہاں ایک آدمی کو بڑے بڑے رجسٹر کھولے کچھ لکھتے دیکھا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس آدمی نے جو یہ آواز سُنی اور دس بیس بچّوں کو دھرمسالہ کے گرد آتے دیکھا تو فوراً اپنے ایک ماتحت کو بھیجا کہ دریافت کرے کیا ماجرا ہے۔ آخر وہ خود آموجود ہُوا اور بڑے رعب داب سے پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو۔ اور سرکار انگریزی کے کام میں کیوں دخل دینے آئے ہو"

جواب میں ہوشیار سنگھ اس کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ دو چار آدمی اور اکٹھے ہو گئے۔ اب تو ہوشیار سنگھ کو ایسا معلوم ہُوا کہ جیسے وہ گھیرا جا رہا ہے۔ کانپتے کانپتے اس نے پوچھا کہ دھنا پنڈت کہاں ہے۔ وہ سب اسکے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک آدمی نے کہا کہ کون دھنا شوالے والا۔ اُسے مرے تو آج پندرہ سال ہونے آئے ہیں۔ "اچھا تو بشنداس کہاں ہے" "وہ بھی تو بسنلا ماتا سے مر گیا ہے اُسے مرے بھی سترہ سال ہو گئے ہیں۔ چیتو۔ نتھا سنگھ۔ بھینڈو۔ یکے بعد دیگرے اس نے سب کی بابت دریافت کیا۔ سب مر چکے تھے۔ ہوشیار سنگھ گھبرا گیا۔ اتنے میں ایک گھوڑ سوار اس جگہ آکر اُترا۔ جسے دیکھتے ہی مجمع تتر بتر ہونا شروع ہو گیا۔ اُس نے آتے ہی دو ایک آدمیوں کو صلواتیں سنائیں اور جب اُسے معلوم ہُوا کہ یہ بوڑھا اس مجمع کا باعث تھا تو فوراً اس سے کہنے لگا کہ تمہیں سرکار انگریزی کے امن میں خلل انداز ہونیکے لئے جوابدہ ہونا پڑیگا۔ اب تو ہوشیار سنگھ کے اوسان اور بھی خطا ہُوئے۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ دوہائی راجہ سنسار چند کی۔ دوہائی مہاراجہ صاحب کی۔ میرا قصور کوئی نہیں ہے تھانیدار صاحب بھی گھبرائے۔ اور اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کا اقرار کرکے دھرمسالہ میں جا گھسے +

اس دوران میں کچھ اور آدمی آ گئے۔ اور ہوشیار سنگھ سے پوچھنے لگے تم ہو کون ؟ اُس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جواب دیا کہ میں بڑ والا چودھری ہوں۔ کیا یہاں بڑ والے چودھری کو کوئی نہیں جانتا ؟

واہ۔ بڑ والا چودھری تو اس کیکر کے نیچے کھڑا ہے"

ہوشیار سنگھ کا رہا سہا۔ دم بھی نکل گیا۔ دیکھا تو سامنے درخت کے نیچے ہُو بہُو اُسکا ایک جیتا جاگتا مجسمہ اسکے اپنے ہی پُرانے کپڑوں میں کھڑا ہے۔ ہوشیار سنگھ سے اب رہا نہ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

" تو کیا میں بڑ والا چودھری ہوں۔ یا نہیں ؟ وہ چودھری ہے یا میں۔ میں میں ہوں یا وہ" آخر اس نے اپنا نام لیکر پکارا +

کیا ہوشیار سنگھ چودھری کو یہاں کوئی نہیں جانتا" اس پر ایک بوڑھا مجمع کو چیرتا ہُوا آگے بڑھا

یہ پروہت بدھی چند تھا۔

"واہ۔ وا۔ تم تو ٹھیک ہی چودھری ہو۔ ہم تو سمجھے تھے تم کہیں باہر نکل گئے۔ ہو۔ یا ربتاؤ تو سہی اتنے سال کہاں رہے" یہ اور بھی معمّا بنا۔ ہوشیار سنگھ کو صرف ایک رات باہر بسر کرنیکا خیال تھا۔ یہاں کئی سالوں کی بابت سوال ہو رہا تھا۔ خیر اب آپ پہچانے گئے۔ کیکر کے درخت والا چودھری جوان کا لڑکا تھا وہ بھی آ گیا۔ مجمع میں سے اسکی شادی شدہ لڑکی بھی آنکلی۔ ہوشیار سنگھ نے جوں توں کرکے اپنا قصہ سنایا۔ پہلے تو کسی نے اس پر یقین نہ کیا۔ پھر بوڑھے حکیم اللہ بخش کو بلایا گیا۔ اور ساری کہانی اُسے سُنائی گئی۔ اس نے سُنتے ہی کہدیا۔ کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ شہیدی باغ ہے ہی ایسا۔ میرے دادا جان بھی ایسے ہی وہاں جاکر ٹھیک بیس سال کے بعد بیدار ہوئے تھے۔ اور اپنا سارا حال ہمارے خاندانی طبِ اکبر کے سرورق پر لکھ گئے ہیں۔ وہ کھلاڑی اس گاؤں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ٹھیک بیس سال کے بعد وہ شہیدی باغ میں آکر گھنچال یا شطرنج وغیرہ کھیلتے ہیں۔ اس وقت جو اُنکے قابو میں آ گیا اسکا خدا حافظ"

بوڑھے اللہ بخش کے طفیل چودھری ہوشیار سنگھ کو پھر گاؤں کے عقلمندوں میں جگہ مل گئی۔ ہوشیار سنگھ اب اپنے لڑکے کے ساتھ رہنے لگے جو اپنی بہن کے ہاں مزدوری کرتا تھا۔ دوپہر کے بعد آپ حسبِ معمول شوالہ آجایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی ملتا اس کو اپنی رام کہانی سُناتے۔ پہلے پہل تو یہ معلوم ہُوا کہ جتنی دفعہ انہوں نے کہانی سُنائی۔ اس میں کچھ کمی بیشی ہوتی رہی۔ لیکن آخر کار اُنکی کہانی نے اوپر والی مستقل شکل اختیار کر لی۔ کبھی کبھار کوئی آدمی آپ کے دماغ کے ٹھیک ہونے پر اعتراض کر دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُنہیں باقی سب باتوں میں صاحبِ عقل تسلیم کر لیا جائے اور اسی ایک بات میں اُن کا دماغ ناقص ہو۔ جب سمت ۱۹۰۸ کا بندوبست ہُوا۔ تو ہوشیار سنگھ نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ معراج پور اور ارد گرد کے کئی گاؤں کے رسم و رواج کو درست طور پر واجب العرض میں لکھوایا۔ ان گرانقدر خدمات کے عوض میں اُنہیں ایک سند عطا ہُوئی۔ اور چودھریوں کا درجہ اُنکے خاندان میں موروثی کر دیا گیا۔ صاحب مہتمم بندوبست نے خود اُن کو بلا کر اُن سے داستان سُنی۔ اور اسے بھی واجب العرض میں جگہ دی۔ اس کے بعد آپ مُدت تک جیتے رہے۔ کیونکہ اب سبھدرا کی موت نے انہیں آزاد منش بنا دیا تھا۔ وہ سارے گاؤں اور علاقے کی تفریحِ طبع کا باعث تھے۔ سمت ۱۹۲۸ کے بندوبست میں اُن کی موت واقع ہُوئی۔ اور سرکاری کاغذوں میں اس کا ذکر ہو ٭

(اوپر کی کہانی قصبہ معراج پور کے کاغذات واجب العرض سمت ۱۹۰۸ اور ضلع کے گزیٹیر کے پہلے سمت ۱۹۲۸ والے ایڈیشن سے لی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کاغذات کی سرکاری مثلوں میں کچھ ردو بدل ہوگیا ہو۔ اور اُن میں یہ کہانی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن ہمارے پاس ان کاغذات کی ایک مصدقہ نقل چودھری ہوشیار سنگھ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہُوئی اور دوسری پروہت بدھی چند کی لکھی ہُوئی موجود ہے۔ سرکاری کاغذات کی سرکاری مثلیں کوئی ٹھیک تو ہوتی ہی نہیں ابھی ہم نے کانگڑہ کے ضلع کا گزیٹیر دیکھا ہے۔ اس میں معراج پور نام کا کوئی گاؤں ہی درج نہیں اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ ہماری کہانی غلط ہے۔ یہ واقعات ہوئے ضرور ہیں۔ معراج پور نہ سہی بکھراج پور سہی۔ کانگڑہ کے ضلع میں نہ سہی۔ جموں کی ریاست میں سہی۔ اس بات کا ہمیں یقین واثق ہے۔ جن اصحاب کو کچھ شک ہو۔ وہ ہم سے بذریعہ خط وکتابت اپنے شکوک رفع کر سکتے ہیں۔ چونکہ کاغذات بھاری ہیں۔ اس لئے ہر ایک نامہ نگار کو ایک روپیہ کے ٹکٹ محصول ڈاک کے لئے ساتھ بھیجنے چاہئیں)

سریرام شرما
ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس

عورت

اے عورت! تیرے تبسّم لطیف میں فوارہ زندگی کا ترنم ہے۔ (ٹیگور)

عورت ہر دلعزیز، شیریں اور پاک ہے۔ (ملٹن)

میری کتابیں عورت کی نگاہیں ہیں (مُور)

عورت دُنیا کی بہترین مخلوق ہے۔ (کوپر)

(محمّد صادق ایُّوبی)

تیرے لئے!

تیرے لئے اے پیارے دوست! میں راہ تکتا ہوں، فضا کو دیکھتا ہوں، گردن نیچی کئے آنکھیں جھکائے رہتا ہوں کہ شاید تُو کسی دور دراز مُلک سے کہیں آسمانوں سے یا خود میرے دل ہی میں سے میری طرف سرگرمِ سفر ہو تجھے میری کلفتوں کی خبر ہو میری کوششوں کا کچھ پتہ ہو، میری بیقرار اُلفتوں کی کسک تیرے من میں بھی موجود ہو؟ شاید! اسی لئے اے جان سے عزیز تر اے حُسن کی آرایش اے محبت کی زیبایش! اسی لئے میں روز و شب تیری راہ تکتا ہوں وسیع پانیوں میں نیلے آسمان پر لق و دق صحراؤں میں مَیں تیری تلاش میں سرگرداں اور تیری جستجو میں آوارہ ہوں پیارے!

جب دُنیا کے جھگڑوں جھمیلوں سے میں اُکتا جاتا ہوں جب خود غرض ساتھیوں کی طمع و حرص سے جی گھبرا جاتا ہے جب مُصیبت کی گھڑیوں میں کوئی سچا ہمدرد اس فریب کار دُنیا میں نہیں پاتا تو اے دوست! تجھ بن کوئی نظر نہیں آتا تیرے سوا کسی کی یاد دل میں باقی نہیں رہتی تیری محبت آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے اور تیری صحبتِ پاکیزہ کی اُمید گرتے ہوئے آنسوؤں کو مُسکراہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے!

سچ یہ ہے کہ دوستوں کی قدر بے وفا دوستوں کی قدر میں اسی لئے کرتا ہوں کہ اُنکی بے وفائی سے تیری وفا کا پتہ چلتا ہے دُنیا کے بکھیڑوں کے جال میں اُلجھ کر بھی میں ناخوش نہیں ہوں کیونکہ یہ مجھے تیری آزادگی کا سبق دیتے ہیں زندگی کے نقص و عیب پر بھی میرا جی اُس سے بیزار نہیں اس لئے کہ یہی نقص و عیب ہیں جن سے مجھے تیری تکمیلِ حیات کا احساس ہوتا ہے اے دوست!

پیارے! گو یا تیری جُدائی میں بھی اک لُطف پنہاں ہے پھر تُو ہی بتا کہ تیرے وصال میں کتنی لذت اور تیری محبت میں کیسا کمالِ انبساط عیاں ہوگا ؟!؟!

د۔ ب

حسن اور زوال

دلکش باغ میں نورِ سحر ضیاپاشی کر رہا تھا یا معلوم ہوتا تھا کہ حوریں اور ملائک اشجار کی صورت میں صفیں باندھے کھڑے ہیں اور یہ اُن کے سایوں کا نور ہے جو زمین و آسمان پر چھا رہا ہے ۔

تارے سپیدۂ صبح سے شرماتے ہُوئے کسی باحیا کی طرح جھلملا جھلملا کر اپنی آنکھیں بند کر رہے تھے ۔ زمین سبز اطلس سے منڈھی ہُوئی تھی اور زمین کی اس خوبصورت پوشاک میں صانعِ قدرت نے کچھ ایسے موتی جڑ دئے تھے جو دیکھنے والوں کی توجہ کو جذب کر لیتے تھے ۔ ان موتیوں سے باغ کا گوشہ گوشہ لبریز تھا ۔ فرشِ اطلسیں پر خال خال بکھرے ہُوئے پیازی اور کاسنی پھُول نظر کو کیسے بھلے معلوم ہوتے تھے ۔ اِن سے لُطف اُٹھانا آنکھوں ہی کا حصّہ ہے ۔ ہر پھُول زبانِ حال سے اپنے حُسن کے ترانے گا رہا تھا ۔

سرخ سرخ روِشوں کے دونوں جانب خودرو سبزہ عجیب عالم میں لہلہا رہا تھا ۔

شامتی ندی دلکش باغ کے تین طرف لہراتی ہُوئی نِکل گئی تھی ۔ دراصل صبحِ بنارس کا لُطف اس وقت اِس باغ سے حاصل تھا ۔ حوضِ یاقوتی اور حوضِ زمرّدین میں سُرخ و سبز مچھلیاں تیر رہی تھیں ۔ شامتی ندی کے سفید پانی میں آفتاب کی طلعت ریز شعاعیں پہنچ رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سُورج کی عالمگیر کرنیں ندی میں نہا رہی ہیں ۔

مشامِ جان کو معطّر کر دینے والی طرب آگین ہوائیں ندی کی لہروں کو چھیڑتی ہُوئی باغ میں محوِ خرام تھیں ۔ نسیمِ صبح اپنے ہر روح پرور جھونکے کے ساتھ درختوں کو ہلاتی تھی اور ان سے زمین پر موتیوں کے جھُومر ٹپکنے لگتے تھے ۔

چمن کے خوشنما اور رنگ برنگ پھُولوں کی بھینی بھینی نشاط انگیز خوشبو دل و دماغ کو معطّر کئے دیتی تھی ۔

دور گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان ایک نہایت خوبصورت سفید رنگ کی نوشگفتہ کلی

مسکرا رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس کی پنکھڑیاں کھل رہی تھیں۔ یہ نہایت دلفریب غنچہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ ذرا سی دیر میں قہقہہ لگائیگا اور ایک شگفتہ پھول کی صورت اختیار کر لیگا۔

نسیم سحری جب اس کی طرف رُخ کرتی تو وہ بے خود ہو کر جُھک جاتا اور کبھی اس کے استقبال میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ اسے امید تھی کہ وہ بڑا ہوگا اور خوبصورت ہوگا۔ ہزاروں ہاتھ اسے توڑنے کے لئے بڑھیں گے۔ لیکن ہوا کسی ہاتھ کو اس تک نہ پہنچنے دیگی۔ اور وہ آس پاس کے تمام پھولوں کا سرتاج ہوگا۔ تمام خوشنما پھول اسے رشک آمیز نگاہوں سے دیکھیں گے۔

دفعتاً اس نونہال کی نازک اور سفید پنکھڑی پر شبنم کا ایک چمکدار اور بھاری آنسو ٹپک پڑا۔ غنچہ نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔ شبنم نے آہستہ سے کہا۔

"پیارے پھول تیرا حسن زوال پذیر ہے تجھے قیام نہیں۔ تو بہت جلد کمھلانے والا ہے۔ حسن کو بہت جلد زوال آجاتا ہے"

پھول پر اُداسی چھا گئی۔

شوخی پسند صبا پھُول کو بے دردی سے چھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ نازک پھول اس چوٹ کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی پنکھڑیاں بکھرنے لگیں۔ مغموم ہو کر ڈالی سے گر پڑا۔ اس کی بہار ختم ہوگئی ۔۔۔۔۔ نو شگفتہ کلی کے حسن پر زوال آگیا ۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ اس کی پنکھڑیاں بکھر کر پائمال ہوگئیں ۔۔۔۔۔ شبنم نے دو چار حسرت بھرے آنسو بہائے اور بلبل جانفزا نغموں کی بجائے ایک غمناک راگ الاپنے لگی!!!

خاک نشیں

تہذیب فاطمہ عباسی

---

*

خوش کرنے کا آسان نسخہ

کچھ لکھوں جس سے ہر شخص ہنس پڑے کم از کم مسکرائے کم از کم اُس کا جی ہی خوش ہو کم از کم اُس کے جسم میں ذرا سی غیر محسوس کپکپی تو پیدا ہو۔

کچھ کہوں جس سے غریب اپنی غربت کی سختیاں اور امیر اپنی جورو کی خفگیاں بھول جائے غمزدہ خوش اور خوش خوش تر ہو جائے۔ ایشیا والے ایشیا میں یورپ والے یورپ میں امریکہ والے امریکہ میں سطوت و مسرت کا راگ گانے لگیں اور گاتے رہیں۔

اس مسئلے پر بعض دفعہ میں گھنٹوں سوچتا سر ٹپکتا رہا ہوں کہ جب میری نیت نیک ہے جب مجھے کسی سے سروکار نہیں غرض نہیں مطلب نہیں تو کیوں میری ہر بات پر سب لوگ جو اک دوسرے کے مخالف ہیں خوش و خرم نہ ہو جائیں کیوں مجھے سب کے سب سب سے اچھا سب سے عقلمند اور سب کا ہمدرد و خیر خواہ نہ کہہ اُٹھیں اکثر میں متوقع رہتا ہوں کہ دُنیا اس طرح میری تعریف سے خود بخود گونج اُٹھے مگر کمبخت توقع کے معنے پورا ہونیکے نہیں اس کو میں کیا کروں؟

غرض میں اکثر پہروں سوچتا سر دُھنتا رہا کہ کوئی ایسی بات کہوں یا کروں جس سے ہر چھوٹے بڑے ہر دوست دشمن ہر عالم جاہل کو خوش و مطمئن کر دوں ـــــ آخر اہل ہند اور بالخصوص ہندی مسلمانوں کیلئے میں نے اسکا گُر ڈھونڈھ ہی نکالا اور سیدھے سادے لفظوں میں وہ فقط یہ ہے کہ ـــــ اگر کسی شخص کو خوش کرنا ہو تو اُسے خوش کرنے کی مشکل میں نہ پڑو بلکہ اُسکے مخالف کو ناخوش کر کے اُسے بآسانی خوش کر لو!

اب اس مجرب نسخے کو مختلف ملکی مریضوں پر آزما دیکھو ـــــ گورنمنٹ کو خوش کرنا ہو تو بلا تامل کانگریسیوں کا لیوں خلافتیوں کو بے نقط گالیاں دو۔ وطن پرستوں کو خوش کرنا ہو تو کھڑے ہو کر تقریر کر دو کہ انگریزی راج میں ایک ہندوستانی کی آمدنی دمڑی کا پانچواں حصہ اور اسکی بچت صفر کی دوسری طرف پچاس فیصدی ہے۔ ہندوؤں کو خوش کرنا ہو تو اورنگ زیب کے خلاف کچھ لکھ مارو مُسلمانوں کو خوش کرنا ہو تو سیواجی کو اوباش اور اچکا کہو پھر سکھوں کا لیڈر بننا ہو تو کسی مہنت کے تھپڑ رسید کرو ادھر نوجوانوں کا ہیرو بننا ہو تو بڈھوں کی نسبت کہدو کہ تمہاری عقل ماری گئی ہے اور بڈھوں سے عزت کرانی ہو تو نوجوانوں کو گستاخی بے ادبی اور ناتجربہ کاری کا ملزم ٹھہراؤ اور چونکہ ابھی کاتب چند سطریں اور مانگتا ہے) عورتوں کو ناقص العقل قرار دو کہ مرد واہ وا کہیں اور مردوں کو ظالم کہدو کہ عورتیں تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئیں۔ رُوحانی عقیدوں کی پھبتی اُڑاؤ کہ سائنس والے تمہیں عاقل سمجھیں اور سائنس کے نام پر لاحول پڑھو کہ مرد تو سب ڈاڑھی والے تمہارے حق میں انا للہ وانا الیہ راجعون پکار اُٹھیں!

"لاحول دلا"

محفلِ ادب

مشرق کی بیداری، مغرب کے اربابِ فکر میں یہ سوال آجکل بہت زور و شور سے زیر بحث ہے کہ کیا مشرقی ممالک کا موجودہ ہیجان اس کی حقیقی بیداری کے ہم معنی ہے؟ چنانچہ ولایاتِ متحدۂ امریکہ میں ایک سیاسی انسٹی ٹیوشن، ولیمسٹن انسٹیٹیوشن کے نام سے قائم ہے، جو حکومت کے مشکلاتِ پر انسان کے عادی ہو جانے کے ذرائع سوچنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، اس نے ابھی سب سے آخر میں ایک کتاب "مشرق کی بیداری" کے موضوع پر شائع کی ہے، جس میں چند ایسے ماہرین کے نتائج افکار ہیں جنہیں امورِ مشرقیہ میں کافی دستگاہ حاصل ہے، منجملہ ان کے انگلستان کے مشہور اہلِ قلم سر الٹن شرول کا بھی ایک مضمون ہے، جس میں انہوں نے مصر اور ہندوستان پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ مشرق کی موجودہ بیداری حقیقی بیداری ہے اور ساتھ ساتھ اہل مغرب کو متنبہ کیا ہے کہ "اب مغرب، مشرق کا گلا گھونٹنے سے عاجز آچکا ہے، اس لئے اربابِ سیاست خصوصاً امریکن اشخاص کو چاہیئے کہ وہ مشرق کی اس بیداری کو حقیقی اور معنوی بیداری سمجھنے کی کوشش کریں"

اس کتاب میں ایک فصل جاپان کے اہلِ قلم مسٹر ٹرسینی کے قلم سے بھی شائع ہوئی ہے۔ انکا خیال ہے کہ "مشرق ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا ہے لیکن ہاں یہ یقین ہے کہ عنقریب بیدار ہو کر رہیگا +

(معارف)

جلوہ آرائیِ نظر

جو ہرِ نگاہ کے ہیں تمام شعبدے
کوہسار، آبشار، جوئبار، لالہ زار کائناتِ حسن کے جلوہ ہائے سحر کار
ان میں دیکھتا ہوں حسن دیکھتا رہا ہوں حسن
میں نہ ہوں تو کچھ نہیں، میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا، میں ہوں حسن آفریں
ہیں تمام شعبدے جو ہرِ نگاہ کے

آفتاب، ماہتاب، اور نجوم بے حساب　　حسن کی کتاب کے پارہ ہائے برق تاب
ان میں دیکھتا ہوں حسن　　دیکھتا رہا ہوں حسن
میں ہوں حسن آفریں　　میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا، میں نہ ہوں تو کچھ نہیں

(چمنستان)　　(حامد علی خاں)

عورت

زمانۂ جہالت میں مرد عورت کو اپنے مقابلہ میں انتہا درجہ کی ذلت و تحقیر کی نظروں سے دیکھتے تھے، اور مختلف اقوام و ملل نے اپنے دورِ جاہلیت میں عورت کے ساتھ جو بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک روا رکھا ہے اس سے قرونِ مظلمہ کی تاریخ کے صفحات جابجا داغدار نظر آتے ہیں۔ علم اور تہذیب و تمدن کے ارتقا نے جہاں صنفِ غالب کے جذبات و احساسات کی تربیت کی ہے، وہاں اس کے دل کو صنفِ نازک کے احترام سے بھی مامور کر دیا ہے۔ ذیل میں ہم عورت کے متعلق دنیا کے چند بڑے بڑے علما و ادبا اور مصلحینِ بنی نوع انسان کی آرا کا اقتباس درج کرتے ہیں:-

عورت فطرت کا شاہکار ہے، ـــــــ کنفیوشس

عورت ہمیں وقار خلق و مروت اور اعتماد علی النفس کا سبق دیتی ہے ـــــــ والٹیر

شیکسپیئر کی تصانیف میں کوئی ہیرو نہیں۔ سب ہیروئنیں ہیں ـــــــ رسکن

اگر عورت نے جنت کو کھو دیا، تو بجز اس کے کوئی جنت پیدا بھی نہیں کر سکتا۔ ـــــــ وٹیر

جو کچھ مجھ میں ہے، مجھے میری ماں نے عطا کیا ہے........ ـــــــ جان کوئنسی ایڈمز

خوبصورت عورت ایک لعل ہے اور نیک عورت ایک خزانہ ـــــــ سنیڈی

ہر عظیم الشان کام کے آغاز کی محرک کوئی عورت ہوتی ہے...... ـــــــ ڈیمارٹن

گھر میں داخل ہونے پر ایک بیوی کا پرخلوص خیرمقدم زندگی کا بہترین ثمر ہے ـــــــ ولس

عورت ایک نئی مخلوق کا نام ہے، جو ظہورِ عیسائیت کے ساتھ پیدا ہوئی ـــــــ بیچر

عورت ایک نئی مخلوق کا نام ہے جو ظہورِ اسلام کے ساتھ پیدا ہوئی ـــــــ مسلم

عورت کے دل میں جب رحم کا جذبہ کارفرما ہو تو اس سے زیادہ پر اثر احساس چیز دنیا بھر میں ملنی محال ہے ـــــــ لوتھر

اس دُنیا میں وہ کونسا ادیب ہے، جو ہمیں حسن کے وہ نکتے سمجھا سکے، جو عورت کی آنکھ سمجھاتی ہے ـــــ شکسپیئر
عورت محبت کے لئے بنی ہے، اور اُسے محبت کی جستجو سے روکنا محال ہے ـــــ مارگریٹ فلاؤسولی

(ماخوذ)

رباعیاتِ صہبائیؔ

نذرِ بہار

۱

ہنگامہ بدوش ہیں ادا ہائے بہار
خمخانۂ مے ہے روئے زیبائے بہار
اس جانِ بہار کی ہے آنکھوں کو تلاش
اے وائے قرار وصبر وا ے وائے بہار

۲

تاریخیٔ اندوہ ہے باقی ساقی!
ہاں بادۂ دلگداز ساقی! ساقی!
یہ رنگ، یہ محفلیں رہیں یا نہ رہیں!
ہے عہدِ شباب اتفاقی ساقی!

۳

گو حسن میں ہیں نقوشِ مانی ساقی
ہیں بزمِ جہاں کے رنگ فانی ساقی!
ہنگامِ بہار ہو کہ تاراجِ خزاں
خوش باش کہ ہے دورِ جوانی ساقی!

۴

حورانِ بہشت کی تمنا، بے سود!
ہنگامِ شباب زہد و تقویٰ، بے سود!
لبریز نشاط ہے خمستانِ بہار!
یادِ غمِ دوش و فکرِ فردا بے سود!

۵

فردوسِ نظر پرست سامانِ بہار
اک پیکرِ رنگ و بُو ہے دامانِ بہار
سرشارِ جمال ہے جہاں کی ہر شئے
یعنی ہے قدح نوشِ خمستانِ بہار

۶

گلزار کا پھول پھول پیمانۂ حسن — اشجار کی شاخ شاخ مستانۂ حسن
دوشیزۂ صبح ہے صبوحی بردوش — ہنگامِ سحر چمن ہے میخانۂ حسن

آثر صہبائی

مختلف مذاہب کی دُعائیں

(۱) چینیوں کی دُعا

(۱)۔ تمام زندہ مخلوق کا بھلا ہو!

(۲)۔ مناسب وقت پر بارش ہو!

(۳)۔ بیماری۔ قحط اور چوری کہیں نہ ہو!

(۲) بودھوں کی دُعا

(۱)۔ تمام دُنیا بُدھ (گیان) کی راہ پر چلے!

(۲)۔ تمام دنیا دھرم (نیکی) کی جانب راغب ہو!

(۳) عیسائیوں کی دُعا

اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔ تیری سلطنت جیسی آسمان پر ہے۔ زمین پر آئے آج کی روٹی مجھے دے۔ جس طرح میں اپنے گنہگاروں کو معاف کرتا ہوں۔ تو بھی میرے گناہوں کو معاف کر۔

(ریاست)

(۴) مُسلمانوں کی دُعا

اے پروردگارِ عالم۔ مجھے سیدھا راستہ دکھا۔ گمراہی میں نہ پھنسا نعمتوں سے مالا مال کر اور میں تیرا شکر کروں۔

(۵) آریوں کی دُعا

تو مجھے عقل سلیم دے۔

(۶) ویدانتوں کی دُعا

میں برہم ہوں۔

(۷) صوفیوں کی دُعا

رُوحانی کمال جو میرا ورثہ ہے مجھے نصیب ہو۔

(رمتا رام)

تبصرے

پریم - حال ہی میں لاہور سے بچوں کے لئے ایک نیا ہفتہ وار رسالہ "پریم" کے نام سے جاری ہُوا ہے۔ رسالہ کے ایڈیٹر ملک کے مشہور ادیب بلیغ الملک جناب مولانا تاجور صاحب نجیب آبادی ہیں رسالہ معنوی حیثیت سے اُن تمام محاسن کا سرمایہ دار ہے جن کی توقع جناب مولانا کی خداداد قابلیت سے ہو سکتی تھی۔ پریم کے مضامینِ نظم و نثر نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور زبان اس قدر سادہ اور سلیس ہے کہ بچے بلا دقت سمجھ سکتے ہیں، پریم کا کاغذ کتابت اور عبارت سبھی قابلِ تعریف ہیں، سرورق خوشنما رنگین اور تصویر دار ہے ؏

رسالہ میں ہر ہفتہ دو رنگین تصویروں کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ہندو اور مسلمان بچوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے اور ہم اہل ملک سے کارپردازانِ "پریم" کی حوصلہ افزائی کی سفارش کرتے ہیں۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ قیمت فی پرچہ دو آنے (دفتر پریم لاہور سے طلب کیجئے)۔

پیشوا - یہ نیا ماہوار رسالہ حال ہی میں دہلی سے حافظ سید عزیز حسن صاحب بقائی کے زیرِ ادارت جاری ہُوا ہے۔ اس میں مذہبی تبلیغی اور اصلاحی مضامین درج ہوتے ہیں۔ حجم ۲۴ صفحے کاغذ معمولی۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ۔ مینجر "پیشوا" دہلی سے طلب کیجئے ؏

انقلاب - ماہوار رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر فتح چند نسیم ہیں۔ نظمیں افسانے اور مضامین اچھے ہوتے ہیں کاغذ اور طباعت وغیرہ بھی اچھی ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحے ہے۔ چندہ تین روپیہ سالانہ۔ منیجر انقلاب لاہور سے طلب کیجئے ؏

ہندوستانی لاہور - لاہور سے یہ ہفتہ وار اخبار حال ہی میں جاری ہُوا ہے اسکے ایڈیٹر مشہور سکھ لیڈر جناب سردار سردول سنگھ صاحب کویشر اور جائنٹ ایڈیٹر جناب مولوی صلاح الدین احمد صاحب بی اے (نیشنل) ہیں یہ اخبار بہترین ہفتہ وار اخبارات میں سے ہے۔ بیشتر مضامین مفید اور دلچسپ ہوتے ہیں، اخبار میں ہاف ٹون تصاویر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ دس روپیہ۔ ششماہی پانچ روپیہ چار آنے مقرر ہے۔ منیجر ہندوستانی لاہور سے طلب کیجئے ؏

فہرستِ مضامین

جلد ۹ | **بابت ماہ مئی ۱۹۲۶ء** | **نمبر ۵**

(نوٹ) پچھلے مہینے ہم نے رسالہ میں ناظرین کے نام جو مطبوعہ مراسلت بھیجی تھی اسکی طرف ناظرین نے زیادہ توجہ نہیں کی جن اصحاب نے جواب لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی اُن کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگر کسی صاحب کو کسی دوست کے دکھانے کے لئے ہمایوں کا نمونہ درکار ہو تو دفتر میں اطلاع آنے پر ہم نمونہ مفت بھیج سکتے ہیں۔ ناظرین ہمایوں کی توسیع اشاعت کی طرف ضرور توجہ کریں تاکہ ہم ہمایوں کو زیادہ مفید اور زیادہ دلچسپ بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

(منیجر)

جہاں نما

ہندوستان کے ساتھ اٹلی کی تجارت - اٹلی نے نئی نئی ایجادات میں نمایاں حصّہ لیا ہے - اور اب باوجود اس امر کے کہ اٹلی میں خام مسالہ کے کمیاب ہونے کی وجہ سے مصنوعات پیدا کرنے میں بہت دِقّت ہے، اس ملک کی تجارت حیرت انگیز طور پر ترقی کر رہی ہے، ہم ذیل کے اعداد و شمار رسالۂ ماڈرن ریویو میں سے نقل کرتے ہیں۔ امید ہے کہ صنعت و تجارت سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ اعداد دلچسپی کا باعث ہونگے :۔

۱۹۲۵ء کے ابتدائی آٹھ مہینوں میں جن اشیاء کی برآمد ہندوستان سے اٹلی میں ہوئی، اُنکی مجموعی قیمت کا اندازہ ۱،۱۸۷،۰۰۰،۰۰۰ لیرا کے برابر لگایا جاتا ہے، اسکے برعکس اٹلی سے جن اشیاء کی درآمد ہندوستان میں ہوئی ان کی مجموعی قیمت ۱۷۹،۰۰۰،۰۰۰ لیرا سے کچھ کم ہی تھی۔ مذکورہ بالا عرصہ کے دوران میں ہندوستان سے اٹلی میں جو اشیاء گئیں اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

روئی	۴۴،۸۰۰ ٹن	قیمت	۴۷۳،۰۰۰،۰۰۰ لیرا
روغن کے مختلف بیج	۱۲۸،۸۰۰ ٹن	قیمت	۱۴۵،۵۰۰،۰۰۰ لیرا
اناج		قیمت	۴۱،۰۰۰،۰۰۰ لیرا

جو سامان اٹلی سے ہندوستان میں آیا۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :۔

سوتی کپڑا	۱،۳۰۰ ٹن	قیمت	۴۱،۵۰۰،۰۰۰ لیرا
اونی کپڑا	۸۰۰ ٹن	قیمت	۲۳،۰۰۰،۰۰۰ لیرا
ربڑ کے ٹائر وغیرہ	۵۰۰ ٹن	قیمت	۱۷،۵۰۰،۰۰۰ لیرا
مصنوعی ریشم وغیرہ	۳۰۰ ٹن	قیمت	۱۷،۵۰۰،۰۰۰ لیرا

مندرجہ بالا اعداد و شمار دیکھنے کے بعد اوّل تو یہی بات قابلِ غور معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان نے اپنی جس قدر دولت کی برآمد کی، اس کے معاوضہ میں اسے بحیثیت مجموعی کس قدر کم قیمت کا سامان ملا۔ پھر اس حالت میں ہندوستان اگر روز بروز کنگال ہوتا چلا جائے تو تعجب کیا ہے۔ دوسری بات جس پر ہندوستانیوں کو غور کرنا چاہیئے، وہ یہ ہے،

کہ ہندوستان آخر کب تک دوسرے ملکوں کیلئے پیداوارِ خام کی منڈی بنا رہیگا۔ اور آخر کبتک ہندوستانی مصنوعات کے لئے دوسرے ملکوں کے محتاج بنے رہیں گے؟

بنگالیوں کا دماغی تنزل"۔ بنگال کو ہندوستان کے باقی صوبوں پر جو دماغی فوقیت حاصل تھی جسٹس گریوز نے اسکے تنزل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ایک بنگالی اہلِ قلم نے "ویلفیئر" میں اسکا حسبِ ذیل جواب دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ بنگال ایک عرصہ تک ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا دماغی رہنما بنا رہا لیکن اسکی وجہ غالباً یہ نہ تھی کہ بنگال میں کوئی خاص جوہر پنہاں تھا، بلکہ اس سے قبل خود دوسرے صوبوں نے بہت کم ترقی کی تھی۔ اب بھی بنگال میں کسی قسم کا دماغی تنزل واقع نہیں ہوا۔ البتہ دوسرے صوبے پہلے کی بہ نسبت بہت ترقی کر گئے ہیں جس کی وجہ سے بنگال کی وہ پہلی نمایاں حیثیت باقی نہیں رہی۔

یورپ کی مختلف زبانوں کی توسیع کی رفتار۔ ذیل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ یورپ کی مختلف زبانیں کس رفتار سے دنیا میں پھیل رہی ہیں:۔

انگریزی زبان جو انیسویں صدی کے آغاز میں ۰۰۰،۰۰۰،۲۲ آدمی بولتے تھے اب ۰۰۰،۰۰۰،۱۰۰ آدمی بولتے ہیں روسی زبان اسی صدی کی ابتدا میں ۰۰۰،۰۰۰،۳۰ آدمی بولتے تھے اب ۰۰۰،۰۰۰،۶۸ آدمی روسی زبان بولتے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں جرمن زبان بولنے والے صرف ۰۰۰،۰۰۰،۳۵ آدمی تھے لیکن اب ۰۰۰،۰۰۰،۷۰ آدمی یہی زبان بولتے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں ہسپانی زبان کے بولنے والے ۰۰۰،۰۰۰،۳۰ آدمی تھے اب ۰۰۰،۰۰۰،۴۴ آدمی ہسپانی زبان بولتے ہیں۔ اطالی زبان اب ۰۰۰،۰۰۰،۱۸ کی بجائے ۰۰۰،۰۰۰،۳۲ اور پرتگالی ۰۰۰،۰۰۰،۸ کی بجائے ۰۰۰،۰۰۰،۱۳ آدمی بولتے ہیں۔

انگریزی زبان میں ۳۱۲ فیصدی روسی میں ۱۲۰ فیصدی جرمن میں ۷۰ فیصدی اور ہسپانی زبان میں ۴۶ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ فرانسیسی زبان اب ۰۰۰،۰۰۰،۳۴ کی بجائے ۰۰۰،۰۰۰،۴۶ آدمی بولتے ہیں۔ یعنی اسکے بولنے والوں میں ۳۶ فیصدی کے حساب سے اضافہ ہوا ہے۔

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

کارلائل نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں ادبی تحقیق و تدقیق کی بعض جدید شاہراہوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک موقع پر روس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"روسیوں کی خاموش اور عظیم الشان قوم جو ایک برِ اعظم کے برِ اعظم کو اپنا مطیع و منقاد بنا رہی ہے لیکن جس نے ابتک کوئی علمی و ادبی کارنامہ نہیں دکھایا"

کارلائل کو یہ الفاظ قلمبند کئے پورے تیس سال بھی نہ گزرے تھے کہ یورپ بھر میں روسی ادبیات کا ڈنکا بجنے لگا۔ روس کے مصنفین کا ظہور اور ان کا فروغ بلاشبہ انیسویں صدی کا اہم ترین ادبی واقعہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یورپ کی "تحریکِ احیائے علوم" کے بعد دنیا نے ایسا نظارہ نہیں دیکھا تو بجا ہے۔ علم وادب کا یہ تحیر افزا ارتقا جتنا عظیم الشان تھا، اتنا ہی سریع بھی تھا۔ اور حقیقت میں روس کے ادبی فروغ کو مغربی یورپ کی "تحریکِ احیائے علوم" سے گہری مشابہت بھی ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ من حیث المجموع یونانی اور لاطینی ادبیات کے حیات افروز اثرات سے متاثر ہوا۔ لیکن چونکہ یورپ کی اقوام کے تمدنی و معاشرتی حالات اُن عظیم الشان قوموں سے، جو ان ادبیات کا سرچشمہ تھیں، مختلف تھے، جدید مصنفین کے خیالات اپنے جدید ماحول کی مناسبت سے مختلف سانچوں میں ڈھل گئے۔ قدیم ادبیات نے اُن پر شاعری اور فنونِ لطیفہ کی سحر کار قوتیں آشکار کر دیں، اور اُن کے دل میں ادبی کارناموں کے لئے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا، جو یورپ میں ادبیات کے ایک حیرت انگیز ظہور و ارتقا کا باعث بنا لیکن یورپ کا یہ جدید ادب اُن قدیم ادبیات کی نقل نہ تھا، بلکہ حالات کے اُس اختلاف کی وجہ سے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے قطعاً ایک نئی چیز تھا۔

بالکل ایک ایسی ہی کیفیت روسی ادب کے ظہور کا باعث ہوئی۔ روس کا ادب مغربی یورپ اور بالخصوص انگلستان اور فرانس کی ادبیات سے متاثر ہوا۔ لیکن چونکہ روس کے تمدنی معاشرتی اور سیاسی حالات دونوں متذکرۃ الصدر ملکوں سے بالکل مختلف تھے، روسی ادب کا بھی ان کے ادبیات سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ فرانس اور انگلستان کی تہذیب پُرپیچ اور مصنوعی تکلفات پر مبنی ہے۔ آبادی مختلف طبقوں پر مشتمل ہے، اور مختلف قسم کے پیچ در پیچ رسم و رواج انسان کی فطری آزادی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہاں کے مصنفین کی دماغی کیفیت بھی کچھ "رسمی" سی ہو گئی ہے، اور وہ صداقت اور خلوص جو ہر عظیم الشان کام کی طرح ادبیات کا بھی جوہرِ حقیقی ہے، ایک حد تک

ان ممالک کی تصنیفات سے مفقود ہے۔

اس کے برعکس روس کی مقابلۃً سیدھی سادی تہذیب کی وجہ سے اس مُلک کی ادبیات میں خلوص و صداقت کی جھلک اپنی انتہائی دلاویزی کے ساتھ موجود ہے، اور بالخصوص ٹالسٹائے کی تصانیف تو اس خاصیت کی بدرجۂ اتم حامل ہیں، جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ٹالسٹائے جتنا بڑا ادیب تھا، اتنا ہی بڑا علم بردار اخلاق بھی تھا۔ اگر انسانہ لکھنے میں وہ ہومر ڈانٹے اور شیکسپیر کا ہمسر تھا، تو اپنے ابنائے جنس کا مصلح اور معلمِ اخلاق ہونے کی حیثیت سے اس کا درجہ روسو اور لوتھر سے کسی طرح کم نہیں۔ ٹالسٹائے روس کے انہیں چند مصنفین میں سے ہے جو انیسویں صدی میں روسی ادبیات کے حیرت انگیز اور عالمگیر فروغ کا باعث ہوئے۔ لیکن یہاں یہ امر واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے ان تمام مصنفین کا جو بجائے خود نہایت عدیم النظیر تھے ہر لحاظ سے سرتاج تسلیم کیا جاتا ہے۔

ٹالسٹائے اپنی تمام تصنیفات میں اس حقیقت پر نہایت زور دیتا ہے کہ خالص اور بے لوث صداقت اخلاق کی اصل الاصول ہے۔ وہ اخفائے حقیقت کو انتہائی غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور اخفا کو ہر قسم کی بدیوں کا سب سے بڑا ممد و معاون سمجھتا تھا۔ اس نے خود وقتاً فوقتاً اپنی کمزوریوں کا نہایت صاف بیانی سے اعتراف کیا۔ اگر ہم اس کی زندگی پر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالیں، تو ہمیں اس میں مختلف اور متضاد کیفیتیں نظر آتی ہیں، لیکن اہلِ بینش ابتدا ہی سے اِس کی زندگی میں اس جہانتاب جوہر کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جس نے بالآخر اسکے سر پر شہرتِ جاودانی کا تاج رکھا۔

ٹالسٹائے کی تاریخِ پیدائش ۱۰ اگست ۱۸۲۸ء ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے میں پیدا ہُوا۔ اس کا باپ کاؤنٹ نکولس ٹالسٹائے اور اس کی ماں، پرنسس ماری والکانسکی تھی۔ یہ دونوں نہایت امیر گھرانوں کے رُکن تھے خاندانِ ٹالسٹائے کا نام تاریخ روس میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اس خاندان کے پہلے کاؤنٹ پیٹر ٹالسٹائے نے پیٹر اعظم کے بیٹے زار وِچ الکسز کے قتل کی سازش میں حصہ لیا۔ ملکہ کیتھرائن کے عہد میں اسکی بہت عزت و توقیر ہوئی اور اسے ملکہ کا اعتماد بھی حاصل رہا لیکن جب مقتول الکسز کا بیٹا پیٹر ثانی سریر آرائے سلطنت ہُوا۔ تو کاؤنٹ نکولس کا رسوخ و اعتبار کھو گیا، اور اس نے خلوت نشینی اختیار کرلی۔ اسی دوران میں اسکا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے خاندان ٹالسٹائے کاؤنٹ کے خطاب سے محروم رہا، آخر پیٹر اعظم کی بیٹی ملکہ الزبتھ نے تخت نشین ہونے پر یہ خطاب بحال کر دیا۔

لیو ٹالسٹائے کا باپ نکولس ٹالسٹائے ۱۸۱۳ء اور ۱۸۱۴ء کے معرکوں میں حصہ لیتا رہا۔ ایک دفعہ

وہ فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں گرفتار بھی ہوگیا۔ جہاں سے اسے ۱۸۱۵ء میں رہائی حاصل ہوئی۔ ٹالسٹائے نے اپنے ناول "وار اینڈ پیس" میں اپنے متعدد عزیزوں کی سیرتیں دکھائی ہیں۔ نکولس راشاف دراصل اس کا باپ ہے، اور پرنسس میرایا بالکانسکی اس کی ماں ہے۔ اپنی ماں کے انتقال کے وقت ٹالسٹائے کی عمر بمشکل ڈیڑھ سال کی تھی لیکن اس نے اپنی خالاؤں اور دوسرے عزیزوں سے اس کے جو حالات سُنے تھے اُن سے کام لیکر اس نے اپنی ماں کی ارفع و اعلیٰ سیرت کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بالکل صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن انتہا درجہ کی پسندیدہ اور بغایت مسحور کُن ضرور ہے ؎

جب لیو کی عمر ۹ برس کی ہوئی تو اس کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اُس کی پھوپھی اُس کی اور اُس کے تین بھائیوں اور ایک بہن کی سرپرست مقرر ہوئی، دراصل بچوں کی پرورش ایک اور خاتون ٹیٹیانا ایرگالسکی نے کی جس کو وہ پھوپھی اماں کہتے تھے، لیکن حقیقت میں اُن سے اس کا کوئی قریبی رشتہ نہ تھا۔

ٹیٹیانا ایرگالسکی کی داستانِ حیات بھی نہایت دلکش ہے۔ اسے لیو کے باپ نکولس ٹالسٹائے سے محبت تھی۔ نکولس نے بھی اس کی الفت کا جواب الفت سے دیا لیکن آخر اس نے اپنی تمام حسرتیں اور آرزوئیں اس بات پر قربان کردیں کہ نکولس ایک امیر الامرا گھرانے کی وارث پرنسس ماری والکانسکی سے شادی کرسکے۔ نکولس اور پرنسس ماری کی شادی کے بعد بھی وہ گھر کے ایک رکن کی حیثیت سے اُنکے پاس رہی اور اپنی بے لوث جاں نثاری کے باعث وہ پرنسس ماری کے دل میں بھی اپنی محبت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

بی بی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ پھر نکولس نے ٹیٹیانا سے شادی کرنی چاہی لیکن ٹیٹیانا نے اس خیال سے کہ مبادا محبت کا وہ لطیف تعلق جو اس کو اب اپنی بی بی اور بچوں سے ہے مٹ جائے۔ شادی سے دوبارہ انکار کردیا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس نے جس محبت اور جاں نثاری سے بچوں کی پرورش کی۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بچپن میں لیو ٹالسٹائے کی تمام خوشیوں کا دارومدار ٹیٹیانا کی ذات پر تھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ "میری اخلاقی سیرت کی تشکیل میں پھوپھی ٹیٹیانا نے نہایت اہم اور مفید حصہ لیا۔ اُس نے مجھے بچپن ہی میں محبت کی پاک اور بے لوث مسرتوں سے آشنا کیا ـــــــ الفاظ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اس کی ہستی ہی سراسر خالص محبت کا نور تھی جس نے میرے دل کو بھی یکسر اس نور سے معمور کردیا میں نے دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ محبت کرنے سے اسے کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور میں محبت کی مسرتوں کے راز کو سمجھ گیا یہ میرا پہلا سبق تھا، دوسرا سبق جو مجھے اس کی ذات سے حاصل ہُوا۔ وہ یہ تھا کہ

میں تنہا اور خاموش زندگی بسر کرنیکی پُرلطف اور اطمینان افزا کیفیتوں سے آشنا ہوگیا"۔

بچپن کے یہی وہ ابتدائی سبق ٹالسٹائے کے سوانح حیات کی کلید ہیں، اور اس کی تمام زندگی میں ان کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ ٹالسٹائے کے سب بھائی بجائے خود مختلف خوبیوں کے مالک تھے، اور اس کو اُن سب سے بہت محبت تھی، لیکن نکولس سے جو عمر میں اس سے چھ سال بڑا تھا، اُسے بہت زیادہ لگاؤ تھا، وہ اُسے ہمیشہ اپنے سے زیادہ قابل سمجھتا رہا۔ اس نے متعدد دفعہ اس کے متعلق مشہور روسی مصنف ٹرجینائف کی یہ رائے نہایت پُرزور تائید کے ساتھ پیش کی۔ کہ "نکولس میں صرف اُن کوتاہیوں ہی کی کمی ہے، جو کسی شخص کو مصنف بنانے کے لئے ضروری ہیں اس میں وہ خودپسندی مطلق موجود نہیں جو مشہور مصنف بننے کے لئے نہایت ناگزیر اور اہم ہے" ٹالسٹائے کو نکولس کی موت سے جو صدمہ ہُوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ بچپن میں نکولس اور ٹالسٹائے نے کھیل کے طور پر "اینٹ برورز" کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا، کہ بنی نوع انسان بلکہ تمام کائنات کو محبت کے ایک رشتہ میں منسلک کردیا جائے۔ انہوں نے سوسائٹی کی بنیاد قائم کرنیکی رسم ادا کرنیکے لئے زمین میں ایک لمبی سبز شاخ گاڑی تھی۔ جب ٹالسٹائے کا انتقال ہُوا، اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کی لاش اسی پہاڑی پر دفن کی جائے جہاں سالہا سال قبل اس نے اور نکولس نے ایک سبز شاخ گاڑی تھی۔

ٹالسٹائے کی ابتدائی زندگی ایک ایسے ماحول میں بسر ہوئی جہاں شعریت اور مذہب کا عنصر بہت غالب تھا۔ ٹیٹیانا یرگالسکی کو مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کے دروازے مسافروں گداگروں راہبوں اور ننوں وغیرہ کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اِن لوگوں کی سادہ زندگی کا ٹالسٹائے پر بچپن ہی میں بہت اثر ہُوا۔ چنانچہ زندگی بھر کے تجربوں کے بعد اس کی طبیعت کا رخ پھر اپنی ابتدائی زندگی کے عقاید کی طرف پھرنے لگا اور اس نے اُسی سادگی فروتنی اور محبت کو اپنا شعار بنایا۔ جس کا سبق اس نے ابتدا میں اپنے بچپن کے مہمانوں کی سادہ زندگی سے لیا تھا۔

لیو ٹالسٹائے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح تعلیم کے لئے کالج میں داخل کیا گیا۔ ابتدا میں اس نے السنۂ مشرقیہ کی تحصیل کا ارادہ کیا۔ اس کے بعد اس نے قانون کی تعلیم کی طرف توجہ کی لیکن ناکام رہا۔ دراصل تعلیم سے اسے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوسکی۔ بڑے بڑے مصنفین میں سے شاید ہی کسی نے ٹالسٹائے کے برابر تعلیم سے نفرت کی ہو۔ اُسی زمانے میں ٹالسٹائے بُری صحبت کا شکار ہُوا۔ اور وہ دوسرے نوجوان اور دولتمند طلبہ کے ساتھ قمار بازی اور مختلف قسم کی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہوگیا۔ اگر ہم اس کی زندگی کا مطالعہ کریں تو

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرتِ سلیم ایسے موقعوں پر ہمیشہ اسے اپنے نفس کے ساتھ ایک سخت روحانی کشمکش میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اور گناہ کے بعد ہر دفعہ اسے اپنے ضمیر سے سخت ندامت اور پشیمانی اُٹھانی پڑتی تھی چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے اس نفرت انگیز طریقِ زندگی کے خلاف بطور احتجاج یونیورسٹی سے کنارہ کشی کی۔ اور گھر واپس چلا آیا ٭

روس کے کسانوں اور کاشتکاروں کی حالت اُن دنوں ناگفتہ بہ تھی، سرمایہ دار زمیندار اُن پر من مانے ستم ڈھاتے تھے اور اُن کی زندگی کو موت سے بدتر بنا رکھتے تھے۔ ٹالسٹائے ان حالات سے بہت متاثر ہُوا چنانچہ اس نے کسانوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسے محسوس ہُوا کہ وہ معلمی کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ کاشتکار اسکے پسِ پشت اس پر ہنستے تھے اور اس کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ آخر وہ سینٹ پیٹرزبرگ چلا گیا، جہاں اس نے قانون کی سند حاصل کی۔ لیکن دارالسلطنت کی عیش و عشرت کی زندگی میں قدم قدم پر اسکے لئے مختلف قسم کی ترغیبات کا جال بچھا ہُوا تھا، جس سے بچنے کی ٹالسٹائے تاب نہ لا سکا۔ اس نے اپنی بلکہ تمام بنی نوع انسان کی اصلاح کے لئے مختلف قسم کی تجویزیں سوچیں، ایک دفعہ اپنی اصلاح کے خیال سے اس نے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑ کر اس قدر پیٹا کہ اسکے آنسو نکل آئے۔ لیکن وہ اپنی جوانی کے وحشی خون کو کسی طرح رام نہ کر سکا۔ چنانچہ اسی صداقت اور صاف گوئی سے کام لیکر جو روسی مصنفین اور بالخصوص ٹالسٹائے کا شعار ہے، وہ اپنی کتاب "مائی کانفیشنز" میں اپنے گناہوں کا اعتراف ان تلخ اور سخت الفاظ میں کرتا ہے:۔

"میری سچے دل سے یہ خواہش تھی کہ میں نیک بن جاؤں، لیکن میں نوجوان تھا میرے لئے ہر طرف مختلف قسم کی ترغیبیں اور تحریصیں موجود تھیں۔ اور میں نیکی کے راستہ کی تلاش میں بالکل یکہ و تنہا تھا جب میں نیکی کی طرف اپنی طبیعت کا رجحان ظاہر کرتا لوگ مجھ پر ہنستے اور مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھتے، لیکن جب میں برائی کی طرف راغب ہوتا، تو میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ان دنوں کی یاد اب میرے دل میں سخت نفرت اور خوف پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے انسانوں کو قتل کیا۔ وہ روپیہ جو مجھے کاشتکاروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے حاصل ہوتا تھا میں نے قمار بازی میں ضائع کیا میں نے آوارہ عورتوں کی صحبت میں اپنا وقت گزارا۔ جھوٹ، ظلم ہر قسم کی بدکاری، بادہ خواری، تشدد، قتل غرضکہ ہر طرح کی بد اعمالیاں مجھ سے سرزد ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے ہم مرتبہ لوگ مجھے

نسبتہً "زیادہ" اخلاقی آدمی" سمجھتے تھے"۔

یہاں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ٹالسٹائے غیظ و غضب میں انتہائی سختی کے ساتھ اپنی برائیاں بیان کر رہا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اسی زمانہ میں اسکے دل میں طبقہ امرا کی بیہودگیوں کے خلاف وہ نفرت پیدا ہوگئی جو بالآخر اُسکی زندگی کا مابہ الامتیاز بنی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کسانوں کی محنت کی کمائی سے یہ لوگ کس طرح بے دریغ گلچھرے اُڑاتے ہیں اور پھر ان سے کس قدر انسانیت سوز اور وحشیانہ سلوک روا رکھتے ہیں +

اسی دوران میں اس کا بھائی نکولس جو قفقاز میں فوجی افسر تھا۔ گھر واپس آیا اور ٹالسٹائے کو اخلاقی تنزل کی گہرائیوں میں گرا ہوا دیکھ کر اسے اپنے ساتھ قفقاز لے گیا۔ وہاں کی زندگی نے اسکی طبیعت میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس نے اپنی طبیعت کو پھر نیکی اور پاکیزگی کی طرف مائل کیا۔ انہیں دنوں میں اس نے اپنا سب سے پہلا ناول "چائلڈ ہڈ" شائع کیا۔ جسے روس کے بڑے بڑے مصنفین نے بہت جلد ایک گرانپایہ اور عدیم النظیر تصنیف تسلیم کر لیا +

قفقاز میں ٹالسٹائے نے بالکل راہبانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اپنے ایک عزیز کی تحریک پر وہ فوج میں داخل ہوگیا اور محاربہ کریمیا میں اس نے نہایت گرانقدر خدمات انجام دیں +

جنگ سے فارغ ہونیکے بعد جب وہ گھر کو لوٹا اسے ایک خوبصورت کاسک لڑکی سے محبت ہوگئی، اور اس نے اس سے شادی کی ٹھہرائی۔ لیکن ولیریا کے لئے ٹالسٹائے کی طبیعت ایک عجیب بجھارت تھی، جسے وہ کسی طرح نہ سمجھ سکتی تھی۔ کبھی وہ اس سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ محبت کرنے لگتا تھا اور کبھی محض اسی بات پر اسے سخت سُست کہتا تھا کہ اُسے عمدہ اور خوبصورت لباس پہننے سے کیوں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ٹالسٹائے اس کی طرف اس قسم کے عجیب و غریب خط لکھا کرتا تھا۔

"دوران سفر میں تمہارا چہیتا یعنی نادان آدمی (ٹالسٹائے) بالکل ازخود رفتہ ہوگیا اور سخت حماقت کی باتیں کرنے لگا۔ وہ ایسی عجیب و غریب اور بیہودہ تجویزیں سوچنے لگا کہ میں اس سے خائف ہوگیا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے واپس لے جائے اور تم سے دنیا جہان کی طفلانہ اور بے معنی باتیں کہے۔ اور پھر تم سے کبھی جدا نہ ہو، لیکن جب اس نے عقل سے کام لینا چاہا تو اس کا دوست اچھا آدمی (ٹالسٹائے) جس سے تمہیں محبت نہیں ہے اسے سمجھانے لگا اور نادان آدمی (ٹالسٹائے) کو راہ پر لے آیا"

پس کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ولیریا ٹالسٹائے کی عجیب و غریب باتوں سے گھبرا گئی اور اُن مختلف ہدایات سے جو وہ اس کو شادی کے بعد کے طرزِ عمل کے متعلق دیا کرتا تھا۔ تنگ آگئی اور اس سے علیحدہ ہوگئی۔ ٹالسٹائے نے اپنے اس درد و کرب کو بھولنے کے لئے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ انہیں دنوں میں اسکے بھائی نکولس کا انتقال ہوا جس سے اسے سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے بعد میں اسکے متعلق لکھا کہ ''مجھ پر آجتک کسی واقعہ کا اس قدر گہرا اثر نہیں ہوا''۔ اس کے بعد ہی اس نے پیرس میں ایک شخص کو سولی پر چڑھتے دیکھا اور وہ مدت العمر کے لئے سزائے موت کا سخت مخالف ہوگیا، وہ کہتا ہے، کہ ''اس سے قبل میں سزائے موت کو ضروریات میں سے سمجھتا تھا لیکن جب میں نے اس خوفناک سامان کا مشاہدہ کیا جو قتل کے لئے مہیا کیا گیا تھا اور میں نے ٹوکری میں مقتول کے سر کے گرنے کی زہرہ گداز آواز سنی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ فعل انسانیت کے سراسر خلاف ہے، اور قانون اور رسم و رواج خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، یہ فعل ہمیشہ ناجائز رہیگا۔ جنگ کے خوفناک نظارے بھی مجھ پر وہ دہشت طاری نہ کرسکے تھے جو ایک دست و پابستہ اور مجبور و ناچار انسان کو نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ بالارادہ قتل سے ... میرے دل میں پیدا ہوئی ہے''

اسی جذبۂ رحم سے متاثر ہو کر اس نے ایک دن ماسکو میں ایک پولیس کے سپاہی کو اس بات پر ملامت کی کہ وہ ایک گداگر کو گرفتاری کی دھمکی دے رہا تھا۔

اس نے سپاہی سے سوال کیا "بھائی کیا تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟"

سپاہی نے اپنے سر کو ایک اثباتی جنبش دی۔

ٹالسٹائے نے کہا "پھر کیا تم نے مسیح کا یہ قول پڑھا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ؟"

سپاہی نے جواب دیا "کیا آپ نے پولیس کے قواعد کا مطالعہ کیا ہے؟"

اس سوال کا واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ ٹالسٹائے خاموش وہاں سے چلا گیا۔

محبت کی پہلی ناکامی کے کئی سال بعد ٹالسٹائے کی شادی ایک جرمن لڑکی سے ہوئی جو اسکی طبیعت کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس نے ٹالسٹائے کے علمی مشاغل میں بھی اس کا ساتھ دیا، اور اس کی جاگیر کا ایسا اچھا انتظام کر دیا، کہ اس کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوگیا۔ شادی کے وقت ٹالسٹائے کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ اس کے بعد پندرہ برس اس نے نہایت مسرت اور اطمینان سے گزارے۔ اس نے

اپنی بعض بڑی بڑی تصانیف اسی زمانے میں شائع کیں جن میں "وار اینڈ پیس" اور "اینا کیرنینا" بھی شامل ہیں۔ لیکن جب اس کی عمر پچاس سال کے قریب ہوئی تو اس کے دل میں پھر اضطراب پیدا ہونے لگا۔ اس کو محسوس ہُوا کہ جبتک کوئی ایسا غیر معمولی کام نہ کیا جائے جو عام انسانی کاموں سے بالاتر ہو اس وقت تک یہ زندگی فضول ہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حقیقی زندگی دوسروں کے لئے زندہ رہنا ہے۔ وہ انجیل کی تعلیم کو ذریعہ نجات سمجھتا تھا۔ کسانوں کی سادہ زندگی میں اسے اس زندگی کا نمونہ نظر آیا جس کی تعلیم انجیل دیتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جائداد عوام کے حق میں ترک کر دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں اسے بہت دِقّت اُٹھانی پڑی۔ کاؤنٹس نے اس تجویز کی نہایت سخت مخالفت کی، اسے اپنے بچوں کا خیال کسی طرح اس بات پر آمادہ نہ کر سکتا تھا۔ کہ وہ اپنی جائداد سے اس طرح دست بردار ہو جائے۔

آخر ایک طویل کشمکش کے بعد ٹالسٹائے نے اپنی جائداد اپنے گھر کے لوگوں کے سپرد کی اور خود اس سے بالکل دست بردار ہو گیا۔ اس نے کسانوں کے سے کپڑے پہن لئے اور کھیتوں میں جاکر کام کرنے لگا۔ اب وہ سادہ زندگی کی مسرتوں کا بدرجہ غایت گرویدہ ہو گیا۔ کبھی وہ کسانوں کے ساتھ کام میں مشغول ہو جاتا اور کبھی ماہی گیروں کے ساتھ مل کر مچھلیاں پکڑنے میں وقت گزار دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کی مصروفیتیں ادبی کام میں قطعاً ہارج نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اس نے عوام کے فائدہ کی غرض سے اور سرمایہ داروں پر کاشتکاروں کے حقوق ظاہر کرنے کے لئے متعدد چھوٹی چھوٹی تصانیف شائع کیں جو بے انتہا مقبول ہوئیں اور ٹالسٹائے کا پیغام روس کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ اب وہ اپنا ہر کام خود کرتا تھا اور کسانوں کی طرح نہایت سادہ غذا کھاتا تھا۔ اسے کسانوں اور غریب کاشتکاروں سے انتہا درجہ کی محبت تھی۔ وہ بالکل انہیں کے رنگ میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ آخری عمر میں اس نے کسانوں کی حمایت کے لئے روس کی سرمایہ دار حکومت پر سخت نکتہ چینی شروع کر دی۔

اس نے رائج الوقت مسیحیت کی اصلاح بھی کرنی چاہی۔ جس کی وجہ سے مارچ سنہ ۱۹۰۱ء میں کلیسائے روس نے اسے مرتد قرار دیا۔ لیکن ارتداد کے اس الزام کا اثر اُلٹا ہُوا۔ روسی قوم کو یکایک اس بات کا احساس ہُوا، کہ یہ شخص ایک بہت بڑا معلم اخلاق اور مجتہدِ اعظم ہے۔ اس زمانہ میں ٹالسٹائے کو ایک عالمگیر عزت و احترام حاصل ہو گیا، اور زار کی حکومت نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا اس بات سے ٹالسٹائے کو سخت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک "شہیدِ قوم" کا تاج سر پر پہننا چاہتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں تمام دنیا اس خبر سے چونک پڑی کہ کمن سال ٹالسٹائے اپنے گھر کے لوگوں کی اطلاع کے بغیر غائب ہو گیا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے ذیل کے مضمون کا ایک خط وہ مکان پر چھوڑ تا گیا جو اس نے کئی سال قبل اپنی بی بی کے نام لکھا تھا:-

۸ رجون ۱۸۹۷ء

پیاری سونیا

میں مدت سے پریشان تھا کہ میری عملی زندگی اور میرے اعتقادات ایک دوسرے سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتے۔ میں نے خود سادہ زندگی اختیار کر لی، لیکن میں تمہیں اس پر مجبور نہ کر سکتا تھا، اور تم بھی معذور تھیں، کیونکہ تم میرے مقاصد کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ گزشتہ سولہ سال کے عرصہ میں میں نے تمہیں کئی طرح سے تکلیف دی۔ میں تم سے لڑتا اور جھگڑتا رہا لیکن کسی طرح تمہیں اپنے مقاصد کی اہمیت کا قائل نہ کر سکا۔ اب میں نے دو وجوہ سے اپنی مدتِ دراز کی خواہش کو پورا کرنیکا مصمم ارادہ کیا ہے یعنی میں کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی اب ایک بارِ گراں معلوم ہوتی ہے۔ اور میں عزلت نشینی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ اب بچے بھی جوان ہو گئے ہیں اور انہیں اب میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ اُن کی وجہ سے اب تمہاری زندگی بھی دلچسپ ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میری کمی کو زیادہ محسوس نہ کرو گی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اب میری عمر[1] ستر برس کی ہو گئی ہے اور میں اپنی باقی زندگی خدا کی یاد کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں۔

اگر میں تم سے یہ بات زبانی کہتا تو ممکن تھا کہ تم لوگ میری منت اور خوشامد کرتے، میرے سامنے مختلف دلائل پیش کرتے، اور مجھے ملامت کرتے۔ اور ممکن تھا کہ میں اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے اپنے ارادے میں ناکام رہتا حالانکہ اس ارادہ کو تکمیل تک پہنچانا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پس سونیا اگر تمہیں میرا یہ طرزِ عمل تکلیف دے تو براہ مہربانی مجھے معاف کرنا۔ تم مجھے اپنے دل سے بھلا دو۔ میں تم سے اس لئے علیحدہ نہیں ہو رہا ہوں کہ خدانخواستہ میں تم سے ناراض ہوں۔ نہیں بلکہ میں اپنی زندگی کے گزشتہ ۳۵ سال کے عرصہ کو سچی محبت اور شکریے کے ساتھ یاد کرتا ہوں تم نے وہ تمام حقوق ادا کر دئے جو میری طرف سے یا دوسرے لوگوں کی طرف سے تم پر عاید ہوتے تھے۔ تم نے اپنے بچوں سے انتہائی محبت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا

---

[1] گھر سے کنارہ کش ہونے کے وقت ٹالسٹائے کی عمر ۸۲ سال کی تھی یہ خط اس زمانہ سے غالباً ۱۴ سال قبل قلمبند کیا گیا تھا۔

اور جو محبت آمیز سلوک تم نے مجھ سے روا رکھا میں اس کو ہمیشہ دلی شکریہ کے ساتھ یاد رکھونگا۔ تم مجھے اب بالکل فراموش کردو، اور میری تلاش کی مطلق کوشش نہ کرو۔ الوداع پیاری سونیا!

تمہارا محبوب لیو ٹالسٹائے۔

بی بی کے نام یہ خط چھوڑ کر ٹالسٹائے نے خاموشی کے ساتھ جاڑے کے موسم کی ایک صبح کو ایک رفیق کی معیت میں اپنے گھر کو خیرباد کہی۔ مگر اس کے سالخوردہ اعضا سردی کے موسم میں سفر کی تکالیف برداشت نہ کرسکے، اور وہ راستہ ہی میں بیمار ہوگیا۔ اس کے گھر کے لوگوں کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو وہ فوراً اس کی مدد کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن جب ٹالسٹائے کو یہ اطلاع ملی کہ اس کی بی بی نے اسکے حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو وہ رونے لگا ــــــ اس لئے نہیں کہ وہ اب اس سے بے پروا ہوگیا تھا، بلکہ اس خوف سے کہ جس اہم فرض کی بجا آوری کا اس نے تہیہ کیا تھا مبادا اس کی تکمیل میں اس کی طبیعت کی کمزوری حائل ہوجائے۔ بہرحال اس کی موت اس کی خواہش کے مطابق واقع ہوئی۔ جب ۲۰ر نومبر ۱۹۱۰ء کو اس نے اس دنیا میں آخری سانس لیا، اس کی بی بی دروازہ کے باہر کھڑی رہی، اس کی تجہیز و تکفین کی تمام رسوم کاشتکاروں ہی نے ادا کیں جو اس کو اپنے باپ کی طرح شفیق سمجھتے تھے، اہلِ کلیسا نے جو اسے مرتد قرار دے چکے تھے، ان رسوم میں کوئی حصہ نہ لیا۔

روسی حکومت جو اس کی زندگی میں اس کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرسکی تھی اسکے بعد اسکے پیروؤں کے ساتھ آخر دم تک سخت تشدد کا برتاؤ کرتی رہی۔ ہزاروں لوگ اس کے جنازے میں شامل ہونے سے جبراً باز رکھے گئے۔

۱۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو بالشوزم کے ظہور کے ساتھ روس کی آزادی کی تاریخ میں جو عظیم الشان انقلاب آیا، وہ ٹالسٹائے کے چند پیشرووؤں اور بالخصوص اس کی اپنی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے۔

حامد علی خاں

حیاتیّات

اُمنگوں نے کیا ہے زندگی کو میری طولانی
نہ پہلو میں یہ دل ہوتا۔ تو قِصّہ مختصر ہوتا

ایسی حیاتِ شیریں سب کو نہیں میسّر
دُنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایک دم نِگل جا

زندگی اُس میں کہاں۔ جس میں ہو یہ صبر و سکوں
تو بھی دکھلا موج کے مانند اے ساحل تڑپ

زندگی کی ہے ترے دم سے جہاں میں ہل چل
کہتے ہیں تجھ کو جہاں کی رگِ جاں اے ہمّت

اے زندگی آخر نہیں تیری تگ و دَو کا
جس طرح کہ رہتی ہے سدا گرمِ سفر موج

مُردنی تیری اُمنگوں پہ ہے چھائی غافل!
زندگی کے تجھے اسرار بتاؤں کیونکر

زندگی چاہے تو پھر خضر کا احساں نہ اُٹھا
آبرو چاہے تو لے چشمۂ حیواں سے بگاڑ

دل میں انسان کے اگر ہو تو حقیقت کھُل جائے
یہی جھلکی سی جو پوشیدہ ہے پروانے میں
تاکہ باقی نہ رہے ہستی و مستی میں تمیز
بھر دو جذبات کی مے عمر کے پیمانے میں

جو زہد کی خلوت میں دل افسردہ ہیں بیٹھے
اے کاش جوانوں کی ترنگیں انہیں مِل جائیں

خوشی کو کیوں رنج و غم سے بدلو۔ بہار کو کیوں خزاں بناؤ
کلی کھِلی ہو اگر نہ دل کی نہ جاؤ پھولوں کی انجمن میں

(باقی)

وحیدالدین سلیم
از حیدر آباد دکن

حُریّت اور اسلام

(۲)

جس وقت اسلام "اللہ اکبر" اور "لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے لگاتا ہوا، وادیٔ فاراں سے نکل کر تمام دُنیا کے لئے پیغامِ حُریّت لایا، اُس وقت دُنیا اہلِ مذہب اور اہلِ سیاست دونوں کے شخصی اقتدار اور ہوس پرستانہ چیرہ دستیوں سے نالاں تھی۔ بقول پروفیسر اسکاٹ کے "محمد صلعم کی ولادت سے ایک صدی قبل بلکہ اس سے بھی پیشتر مسیحی دنیا پر نہایت ہی افسوسناک جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یسوع کے دل پذیر مذہب کے حلم اور زیبائی کی جگہ وحشیانہ تعصب نے لے لی تھی۔ آئینِ انصاف و قوانینِ اخلاق بازیچۂ استخفاف و استحقار بنے ہوئے تھے۔ خود پیشوایانِ دین کی یہ حالت تھی کہ اپنے مقتدیوں کیلئے اتقا اور اعتدال کی مثال قائم کرنے کے بجائے قتل و غارت اور عیش و مستی کے ظلمت اندوز ہنگامے ہر روز بڑھ چڑھ کر بپا کرتے تھے۔" آزادیٔ خیال کا وجود معدوم محض ہوگیا تھا اور کلیسائے یونان کے رائج الوقت مسلّمات سے سرِ مو انحراف کرنا یا علمی مذہبی اجتہاد کا کوئی نیا دروازہ کھٹکھٹانا کفر و الحاد کا مُرادف اور سزائے موت کو مستلزم تھا۔ نسطوری طرزِ خیال کے مسیحی راہب یونانی شہنشاہوں کے مسلسل جور و ستم اور تشدد سے تنگ آکر اور اپنا گھر بار چھوڑ کر، دشت نوردی کرتے ہوئے، ایران اور دوسرے ممالک میں آکر پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ مصر میں کہ اس خطہ پر بھی یونانی شہنشاہ قابض تھے، عوام کی مذہبی اور سیاسی آزادی بالکل سلب کرلی گئی تھی، ہپاشیا جیسی صاحبِ کمال اور راست کردار خاتون سے، عقاید کے جزئی اختلاف کی بنا پر مسیحی راہبوں کی ایک جماعت نے ازراہِ غایتِ بربریت سکندریہ کے بازاروں میں جو بُزدلانہ اور شرمناک سلوک کیا، وہ بہت بڑی حد تک اُس رکیک تعصب کا انکشاف کردیتا ہے جو تمام مسیحی دُنیا پر محیط اور مسلط تھا۔

ایران میں کسرے کے مامور کردہ محصّلوں اور بڑے بڑے مالکانِ اراضی نے جو "دہقان" کہلاتے تھے اپنے جبر و جور سے ایران کے بدبخت کاشتکار طبقہ کی زندگی تلخ کردی تھی۔ مذہبی پیشواؤں کا اخلاقی تنزل اس انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا کہ جن لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی اُن کا فرض تھی اُن کو اُنھوں نے اپنی ہوا و حرص اور جلبِ منفعت کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ یہ تھی ظہورِ اسلام سے پہلے دُنیا کی حالت۔ اسلام نے جس طریقے سے ان سب زنجیروں کو

لے ترجمہ ماخوذ از ستارۂ صبح (ہفتہ وار)

کاٹ ڈالا۔ وہ ایک ایسی داستان ہے کہ اُس پر سرسری سی نظر ڈال کر بھی ہر فرزند توحید فخر سے کہہ سکتا ہے کہ

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے

نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے



اسی داستان کا ایک مجمل خاکا پیش کرنا اِس وقت میرا مقصود ہے۔

عمرو بن العاصؓ نے جب مصر کی طرف فاتحانہ پیشقدمی کی تو عساکرِ اسلام قبطیوں کے لئے جنکی زندگی کو یونانی شہنشاہوں کے جبر و تشدد نے ناگفتہ بہ کر دیا تھا، ملک میں خدا کی رحمت اور برکت بن کر داخل ہوئے جس مسرت سے اُنہوں نے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا ہے، اُس پر مسلمان بجا طور سے آج بھی ناز کر سکتے ہیں۔ جزیہ کے طور پر ایک قلیل رقم مسلمانوں کی حکومت کو ادا کرنے کے بعد مسلمان حکام اُنکی جان، مال، آزادیٔ ضمیر اور حقوقِ شہریت کی حفاظت کے ذمہ دار ہو جاتے تھے۔ جزیہ کا نام سنتے ہی دانایانِ فرنگ اکثر چیں بہ جبیں ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ سیدھی سی بات اُنکی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ملک کے غیر مسلم باشندوں سے حفاظتِ ملک کے لئے فوجی خدمت نہ لی جاتی تھی تو حکومت کے قیام و تحفظ کیلئے اُن سے ایک معین رقم کا فراہم کیا جانا اور اپنے ملک کی حفاظت کا فرض جو بہ حصہ رسدی ان پر بھی عاید ہوتا تھا، اُسکے ادا کرنیکے لئے اُنکا ایک خاص رقم صرف کرنا بالکل قدرتی اور منصفانہ بات تھی۔ مصر پر جب جزیہ عاید کیا گیا ہے تو بقول گبن کے بوڑھے مرد راہب، عورتیں اور سولہ سال سے کم عمر کے تمام ذکور و اناث اس سے بری قرار دئے گئے کہ یہ لوگ اپنے ملک کی فوجی خدمت کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ جزیہ ادا کرنے کے صلہ میں انہیں جو مذہبی فیوض حاصل ہوئے اُنکی تشریح گبن اس طرح کرتا ہے:۔ "میلکائیٹ (یعنی "شاہ پسند") فرقہ کے مذہبی تشدد اور سیاسی چیرہ دستی کا قلع و قمع کر دیا گیا سینٹ سائرل کی پھٹکار کی صدائیں دمسیحیوں کے ہر منبر سے بجلی کی کڑک کی طرح بلند ہونے لگیں اور تمام مذہبی عمارات اور کلیسائی اوقاف قومیتِ مصر کی نمائندہ مذہبی جماعت جیکبائیٹس کے حوالے کر دئے گئے[1]" قبطی بطریق بن یمین ہرقل کے صوبہ دار سائرس کے جور و ستم سے اپنی جان بچانے کے لئے رو پوش ہو گیا تھا اور شمالی مصر کے کسی نامعلوم مقام میں جا کر چھپ گیا تھا۔ تیرہ سال تک وہ اسی طرح چھپا رہا۔ جب مسلمان آئے تو عمرو بن العاص نے خاص طور پر اُس کی تلاش کرائی اور کلیسائے مصر کا یہ رئیس جب مل گیا تو مسلمانوں نے دوبارہ اُسے اُس کے پرانے عہدہ پر فائز کر دیا۔

---

[1] تاریخ زوال و ہبوطِ سلطنتِ روما۔

یہ تو مذہبی آزادی کا عالم تھا۔ اس سے آگے چل کر گبن بتاتا ہے کہ مصر کے قوائے سیاسی و عمرانی کی تنظیم فاتح اسلام نے کس معدلت کیش اور انصاف پرورانداز پر کی۔ یونانی عہد حکومت میں "محصولِ انفرادی" کا جابرانہ دستور مروج تھا۔ کہ استحصال بالجبر اس کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ عمرو بن العاص نے اس رسم کو یک قلم موقوف کیا اور محاصلِ تجارت و زراعت پر مناسب حدود و قیود عاید کردیں لیکن اس کا اعتراف شاید ولیم میور جیسے تنگ نظر اور متعصب عیسائی مورخ کے الفاظ میں زیادہ دلکش معلوم ہو جس کے قلم سے تعریف و ثنا کے کچھ الفاظ نکل ہی گئے ہیں۔ مصر کے عہد اسلامی پر بہ حیثیتِ اجتماعی تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔ "مصر میں عربوں کی حکومت ملک کے لئے من حیث المجموع موجب برکت ثابت ہوئی۔ بیشک محصول زیادہ تھے لیکن ان کی مقدار غالباً بازنطینی عہد کے مقابلہ میں کم ہی تھی اور مصر محصول کی گرانباری کو برداشت کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اسکے علاوہ جب کبھی کسی عرب حاکم کو ظالم اور غارتگر کہا گیا ہے تو جیسا قبطیوں کی پرانی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے، اس کی وجہ اکثر یہ ہوتی تھی کہ حاکم وقت اعلیٰ طبقہ کی درازدستی کے مقابلہ میں ملک کے غریبوں کے حقوق کی حفاظت کرتا تھا۔ ...... عربوں کی رواداری اس حقیقت سے آشکار ہوجاتی ہے۔ کہ اس دور میں بھی عرب حاکم کے منشور یونانی (نیز عربی) میں لکھے جاتے تھے اور ان کا جواب قبطی زبان میں دیا جاتا تھا۔ بہت سے صوبہ دار اور اکثر ماتحت عہدہ دار مسیحی المذہب تھے۔ حکومت کے محرروں کو مراسلات میں اسلامی ضوابط و اصطلاحات کے استعمال کی پابندی نہ تھی۔ صلیب کے نشان کے استعمال کی آزادی تھی...... مذہبی تشدد کا کوئی وجود نہ تھا۔ بیرونی دشمنوں کی غارتگری کا خاتمہ ہوگیا۔ اور گندم کے ذخیرے اس نیت سے جمع کر رکھنے کا کہ قحط کے موقع پر گراں نرخ سے بیچی جائے، امکان بھی جاتا رہا[۱]"

سندھ کے اسلامی طرز حکومت کے متعلق بھی میور اسی قسم کا اعتراف کرتا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے اس نظام حکومت کو جو ہندو عہد میں مروج تھا، برقرار رکھا۔ چنانچہ میر محمد معصوم بھکری اپنی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں "اسلامی حکومت نے اپنے محکوموں کو صرف تین تکلیفیں دی تھیں۔ (الف) اسلام کی سیادت مانیں (ب) خراج دیں۔ (ج)۔ بلاد اسلام سے جو مسلمان بغرض سیاحتِ سندھ آئیں اُن کی تواضع کریں اور اُن کو راستہ بتائیں۔ فقہ اسلام کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان یا مطیع الاسلام ہوں اُن کی زمینیں انہیں کے قبضہ میں رہنے دی جائیں اور اُن سے مالگزاری بطریقِ عشر وصول کی جائے۔ سندھ میں جو فرقے اطاعت کرتے گئے، اُن کے ساتھ یہی برتاؤ ہوا۔ مثلاً ہندوؤں کی ایک قوم "کھیہ" تھی جس کے نام کی تصحیح سے ہم قاصر ہیں۔ یہ قوم سب سے پہلے اسلامی حکومت

---

[۱] میور "تاریخ خلافت"

کی مطیع ہوئی تھی۔ فقہائے اسلام آج تک اس کی زمین اور اس کے علاقے کو عشری لکھتے ہیں۔ ہندو عہد میں نظم و نسقِ مملکت برہمنوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں نے بھی اس انتظام کو برقرار رکھا۔ سندھ کے تمام اسلامی مقبوضات و مفتوحات میں بند و بستِ اراضی اور تشخیصِ اخراج کا کام برہمن کرتے تھے جنہیں ہندو رعایا اپنا پیشوا مانتی تھی۔ قیامِ سیادتِ اسلامی کی درمیانی کڑی یہی تھے۔[1]"

یہ کہنا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی، ایک دروغِ بے فروغ ہے اور اُسی فسانہ طراز دماغ کی جودتِ طبع کا کرشمہ ہے جس نے یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں شارعِ اسلام علیہ احسن التحیات کو ماہومٹ، باہومٹ اور باہُوم کے نام دئے تھے اور حضورؐ کو (نعوذ باللہ) ایک خون آشام دیوتا قرار دے رکھا تھا جس کی پیاس بجھانے کے لئے انسانی قربانیوں کے خون کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی مبلّغین اسلامی عساکر سے پہلے اطراف و اکنافِ ہند میں پہنچ چکے تھے اور اس ملک میں اسلام کی اشاعت عُلمائے کرام کی مساعئ جمیلہ کی مرہونِ احسان ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ محمدؐ غوری قنوج پر حملہ آور ہوتا، اس شہر میں ایک اسلامی مبلّغ بابا حاجی شریفؒ تشریف لا چکے تھے۔ جن کی روحانی قوت سے قنوج میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ قنوج میں بابا صاحب کی آخری خوابگاہ کا مقام آج بھی "حاجی شریف" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قسم کی اور بھی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن انہیں بخوفِ طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔ ایک نومسلم انگریز مسٹر خالد بننگ نے اپنے مضمون "اسلام اور تلوار" میں نہایت خوبی سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان پر برطانی قبضہ کے وقت، مسلمانوں کی تعداد، ہندوستان کی آبادی میں صرف دس فیصدی تھی۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ تعداد بفضلہ تعالیٰ پچیس فیصدی سے متجاوز ہوچکی ہے۔

جب مسلمانوں نے ایران کی طرف پیشقدمی کی تو مفتوحین کے ساتھ کیسا قابلِ تعریف برتاؤ کیا، اس کا نقشہ اُن شرائط کے مطالعہ سے جو فتح حیرہ کے بعد اہلِ شہر کو پیش کی گئیں، آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ خالد ابن ولید نے کہ عساکرِ اسلام کے قائد یہی تھے، اہلِ شہر کی جان، مال اور آزادی کی ضمانت دی اور اعلان کیا کہ مسیحیوں کو ناقوس بجانے اور مذہبی تہواروں کے موقع پر صلیبوں کے نکالنے سے منع نہ کیا جائیگا۔ خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے بہ معیّتِ مجلسِ شوریٰ ان شرائط پر صاد کیا۔ خالد بن ولید نے حیرہ کا نظم و نسق سردارانِ شہر ہی کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ وادئ فرات کے کاشتکاروں کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے خاص ہدایت

---

[1] ماخوذ از ستارہ صبح ص ۵۲ "معارف" جنوری ۱۹۲۳ء۔

فرمائی تھی کہ انہیں اُن کی زمین سے بے دخل نہ کیا جائے اور اُن کے حقوقِ ملکیت کا پورا لحاظ کیا جائے۔ جزیہ عاید کیا گیا مگر حسبِ دستورِ اسلام صرف اُن پر جو فوجی خدمت کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ حیرہ کے اِن واقعات سے اُس طرزِ عمل کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس پیشقدمی کے دَوران میں مُسلمانوں کا شعار مخصوص تھا کیونکہ حیرہ پہلا اہم مقام ہے۔ جس پر عرب کے باہر، مسلمانوں کا قبضہ ہُوا۔

ایران کے عام لوگ مذہبی پیشواؤں (موبدوں) کی ہوس رانیوں اور دہقانوں کی چیرہ دستیوں سے جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے مُسلمانوں کی آمد کو اپنے لیے ایک یزدانی رحمت خیال کیا اور یہ واقعہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اسلام کو ایرانی مقاومت سے سامنا کرنا پڑا۔ وہاں محض امرا اور پیشوایانِ مذہب کی غرض مندانہ کوششیں بر روئے کار آئیں ورنہ جمہورِ ایران نے جن میں غربا اور محنت پیشہ طبقہ کا شمار تھا، ہر جگہ مُسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔ فتح الفتوحِ قادسیہ کے بعد جب ایران کامل طور پر اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ گیا تو ایران میں بسنے والے یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی جن پر ایرانی عہد میں بہت تشدّد کیا جاتا تھا اطمینان کا سانس لیا۔ یہ خیال کرنا کہ پارسی مذہب کے خلاف اسلامی حکمرانوں نے کوئی جابرانہ یا متعصبانہ طریق کار اختیار کیا، ایک بہت بڑا تاریخی مغالطہ ہے۔ جس میں بعض ناواقف مسلمان بھی مبتلا ہو گئے ہیں۔ لیکن خود میور کے بیان سے اِس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ اپنی کتاب "تاریخ خلافت" میں لکھتا ہے:۔ "زرتشت کا مذہب اسلامی فتح کے بہت زمانہ بعد تک، فی الحقیقت تقریباً آج کے دن تک، ایران میں رائج رہا۔ ایک صدی سے کچھ اوپر کا عرصہ گزرا کہ اس کے بہت سے معتقدین موجود تھے لیکن سُنا جاتا ہے کہ آجکل پورے ملک بھر میں کوئی بیس آتشکدے ہیں۔" گزشتہ سو سال میں آتش پرست جماعت کی تعداد کا ایران میں کم ہو جانا اس عرصہ میں ایران کی خاموش تبلیغی کوششوں کی کامیابی پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس دَور میں حکومتِ ایران اپنی غیر مسلم رعایا پر کسی قسم کا مذہبی جبر و تشدّد روا رکھتی تو یہ خبریں برق کی پرواز سے تمام متمدن دُنیا کو پہنچ گئی ہوتیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ گزشتہ صدی کے ایرانی فرمانروا حصولِ عیش و مسرت کے سوا، سیاسی یا مذہبی کسی معاملہ میں سرگرم نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ عباسیہ کے عہد میں آتشکدوں کی ایک کثیر تعداد ایران میں موجود تھی اور پیروانِ زرتشت سے جو معدلت گسترانہ سلوک کیا جاتا تھا اُس کا معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید نے امورِ مملکت کے انصرام و انضباط کے لئے جو مجلس شورٰی قائم کی تھی، اُس میں زرتشتیوں کو بھی حقوقِ نمائندگی حاصل تھے۔

تسخیرِ شام کے بعد بھی مسلمانوں نے سیاستِ ملک میں وسعتِ خیال اور نصفت پژوہی کی یہی شان دکھائی۔ ۱۴ھ میں شام کا دار الحکومت دمشق جب مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو خالد بن ولید نے نہ صرف باشندوں کے جان و مال، گرجاؤں اور شہر پناہ کی صیانت کا ذمہ لیا بلکہ اپنے آپ کو مکانوں کی حفاظت اور مکینوں کے مالکانہ حقوق کا ضامن بھی ٹھیرایا۔ اہلِ ملک کے لئے یہ پُرامن زندگی ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ۱۵ھ میں جب رومیوں کی ایک جرّار فوج (جس کو یرموک کے تاریخی معرکہ میں شکست ہوئی) پھر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بڑھی تو نہ صرف یہودیوں نے بلکہ عیسائیوں نے بھی اپنے شہروں کے دروازے اُنکے لئے بند کر دینے کا تہیّہ کر لیا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ رومیوں کے ظلم و تشدّد اور مسلمانوں کے عدل و انصاف میں زمین و آسمان کا جو فرق تھا اُس کا محسوس کرنا اہلِ شام کے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔ چنانچہ میور بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "شام کے عیسائی اپنے عرب حملہ آوروں کے ماتحت اُس سے کہیں زیادہ شہری اور سیاسی آزادی سے متمتّع ہو رہے تھے، جو انہیں ہرقل کی حکومت کے ماتحت حاصل تھی اور اسی لئے اُنہیں اپنی پہلی حالت پھر اختیار کرنے کی مطلق کوئی خواہش نہ تھی" فاروقِ اعظمؓ نے عیسائیوں کی درخواست پر بہ نفسِ نفیس بیت المقدس میں آکر جس پُرامن طریقے سے شہر کا قبضہ لیا ہے، اُس کی یاد لوحِ روزگار پر ہمیشہ نقش رہیگی تاریخ اسلام کا یہ سب سے زیادہ پُرجلال شہنشاہ جس کی عظمت نے قیصر و کسریٰ کے نام کو شرما دیا تھا، اس شانِ فقر کے ساتھ یروشلم میں داخل ہُوا کہ سواری کے طور پر صرف ایک اونٹ ساتھ تھا اور لباس کی یہ کیفیت تھی کہ بدن پر اونٹ کے بالوں کا ایک پھٹا پرانا لبادہ تھا۔ شہر کے مسیحی بطریق کی معیّت میں، مختلف مقدّس مقامات کی زیارت کرتے کرتے کلیسائے آزفہ (Resurrection) میں نماز کا وقت ہو گیا۔ بطریق نے اپنے عالی مرتبت مگر درویش صفت مہمان سے وہیں نماز پڑھ لینے کی درخواست کی۔ لیکن خلیفۃ المسلمین نے نہ صرف وہاں بلکہ کلیسائے قسطنطین میں بھی جہاں نماز کے لئے کپڑا بچھا دیا گیا تھا۔ ادائے صلوٰۃ سے اس بنا پر انکار کیا کہ مبادا بعد میں مسلمان اُنکے اس فعل کو وجہِ جواز قرار دیکر، کلیسا کو مسجد بنا لینے کی کوشش کریں۔ چنانچہ خود مسیحی مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فریضۂ صلوٰۃ گرجا کے باہر کے زینہ پر ادا کیا۔ مذہبی رواداری اور جذبۂ حرمتِ عدل کے لطیف ترین احساس کی اس زندۂ جاوید مثال پر اسلام بلکہ انسانیت ابد الآباد تک ناز کرے تو بجا ہے۔ گبن تاریخ عالم کی اس عظیم الشان شخصیت کے بارہ میں بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ آپ کے اور انکے پیشرو کے عہد میں مشرق کے فاتح خدا اور خلق کے ایماندار اور با وفا خدمتگار تھے۔[1]

[1] تاریخ زوال و ہبوطِ سلطنت روما، جلد پنجم ص ۴۲۶

رحمتِ ایزدی نے جب مسلمانوں کی صورت میں اُندلس کا رُخ کیا، اُس وقت یہ ملک نہایت تشدد آمیز غلامی اور محکومی کا شکار ہو رہا تھا۔ بالخصوص یہودیوں کے ساتھ تو یورپ بھر میں کتوں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ ہسپانیہ میں وہ اُن اعمال کے ارتکاب پر مجبور کئے جاتے تھے، جو اُن کی شریعت کے احکامِ بیّنہ کے منافی تھے اُن میں سے جو ان شرمناک قوانین کی تعمیل سے سرتابی کی جرأت کرتا تھا، وہ سنگسار کیا جاتا تھا یا جلاد یا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ محصول یہودیوں ہی کو ادا کرنے پڑتے تھے مگر حکومت کا سلوک اُن سے یہ تھا کہ عدالت میں اُن کی شہادت بھی تسلیم نہ کی جاتی تھی۔ دولتِ اسلامیۂ اندلس کے مؤرخ پروفیسر سکاٹ نے نہایت خوبی سے ایک فقرہ میں اس قوم کی تاریخی مصیبتوں کا خاکا پیش کر دیا ہے "مصریوں نے انہیں جلاوطن کیا۔ ایرانیوں نے غلام بنایا۔ یونانیوں نے تحقیر کی اور رومیوں نے نہایت تشدد آمیز برتاؤ کیا" اندلس کی اسلامی سلطنت نے یہودیوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں جو زبردست تغیر رونما کر دیا، وہ ایک ایسی دل کشا داستان ہے کہ اگر قلتِ گنجائش کا خیال مانع نہ ہوتا تو میں کسی قدر تفصیل سے اس کے متعلق عرض کرتا۔ مختصراً صرف اتنا کہوں گا کہ مسلمانوں کے عہد میں یہودیوں کو سلطنت کی شہریت کے پورے پورے حقوق عطا کئے گئے اور مسجدوں کے رفیع الشان میناروں کے ساتھ ساتھ اُن کے معابد بھی سر اُٹھائے کھڑے نظر آتے تھے۔ اس عہد میں اُن کی تعلیمی ترقی کا یہ عالم تھا کہ شاعری، طب، فنِ سیاست اور فلسفہ میں بہت سے یہودی فضلا نے نام پیدا کیا۔ حکومت نے کئی مرتبہ اُن کے ربیّوں کو سفارت کے معزز عہدہ پر فائز کر کے اپنے اعتماد کا ثبوت دیا۔ اور پروفیسر سکاٹ کا بیان ہے کہ دولتِ اندلس کے اُن ذی سطوت تاجداروں کے ساتھ جنکی حضور میں منظورِ نظر مشیروں کو بھی بغیر طلب کئے جانے کے رسائی نہ ہوتی تھی، اُن کے خاص رازدارانہ مراسم تھے"۔

عیسائیوں سے بھی اسی قسم کا روادارانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ اُن کا اپنا محکمۂ عدالت قائم تھا اور اس کی صدارت مسیحی منصفوں کے سپرد تھی جو قدیم وزیگاتھ آئین کے مطابق مقدمات فیصل کرتے تھے۔ اُن کی عزت و آبرو اور آزادی کے تحفظ کے لئے ایک خاص قاضی بادشاہ کی طرف سے مامور ہوتا تھا جو اُن کے حقوق کی نگہداشت کرتا تھا۔ عیسائی پیشوایانِ مذہب امن و امان میں اپنے فرائضِ دینی سرانجام دیتے تھے اور اُن سے تعرّض کرنے والوں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اُن کے مذہبی جلوس

بازاروں میں وزیگاتھ عہد کی قدیم شان وشوکت کے ساتھ بے روک ٹوک نکلتے تھے اور اس معاملہ میں مُسلمان کبھی مزاحم نہ ہوتے تھے۔ لیکن اس دور کو اپنی فقید النظیر وسیع الخیالی اور مسالمت پروری کی شاید سب سے زیادہ محکم اور سب سے زیادہ معتبر مگر بایں ہمہ نہایت دردناک سند اُس وقت ملی جب ۱۶۰۲ء میں ویلنشیا کے اُسقفِ اعظم نے فلپ سوم شاہِ ہسپانیہ سے مُسلمانوں کے اخراج کی سفارش کرتے ہوئے فردِ قرارداد جرم کی سب سے بڑی دفعہ یہ پیش کی کہ:-

"اندلسی مُسلمان مذہبی امور میں آزادی کو جائز رکھتے ہیں اور یہ ایک ایسی خرابی ہے جو تمام مسلمانوں میں عام اس سے کہ وہ تُرک ہوں یا کوئی اور قوم ہوں، پائی جاتی ہے۔ کوئی ایسی اسلامی حکومت نہیں جہاں رعایا کو یہ قابلِ ملامت حق حاصل نہ ہو۔"

لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم۔ نعوذ باللہ من شرورانفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ۔

(باقی) ح۔ ا۔ خ۔

خیالستان

بحرِ دنیا میں رہ لیکن کنول کے پھُول کی طرح
گلوں میں رہ لیکن شبنم کی طرح

تکمیلِ مقاصد سب سے اعلیٰ عبادت ہے۔

عہدِ حاضر میں "منزل" اُس عمارت کو کہتے ہیں
جو فنِ معماری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہو ـــــ
جن کا یہ خیال ہے انکو معلوم ہونا چاہیئے کہ

ہر انسانی کاشانہ "ایک منزل" ہے۔
لیکن سب سے بڑی منزل قبر ہے۔

ایک رات میرا بستر دوسرے کمرے میں ہوا، اور مجھے شب بھر بے قراری رہی ـــــ اب میں ڈر رہا ہوں کہ قبر میں پہلی رات کیسے کٹے گی۔

(صادق ایوبی)

فلسفۂ مغرب

دورِ ثانی

افلاطون

علم وفضل کا یہ بحرِ ذخار ۴۲۷ سنہ ق م میں پیدا ہوا۔ ایک بڑے شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والدین نے موسیقی، مصوری، شاعری، منطق، فلسفہ، اور ریاضی کی تعلیم دلوائی، ۴۰۷ سنہ ق م میں سقراط کی شاگردی اختیار کی اور ۳۹۹ سنہ ق م تک اُستاد کے ساتھ رہا، اس کے بعد اُس نے مصر اور ایشیائے کوچک کی سیاحت کی ۳۸۸ سنہ ق م میں اٹلی بھی گیا۔ تمام عمر درس وتدریس میں بسر کی، ۳۴۷ سنہ ق م میں اسّی سال کی عمر پاکر وفات پائی۔

اُسکے خصایص علاوہ زبردست منطقی اور فلسفی ہونیکے، افلاطون اعلیٰ درجہ کا شاعر اور صوفی (Mystic) بھی تھا۔ صوفیانہ جذبات، شاعرانہ نازک خیالی، فلسفیانہ، بلند پروازی، اور منطقیانہ قوۃ استدلال چاروں باتیں اس کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان باتوں کے علاوہ، شریف النفس، جامعِ اخلاقِ فاضلہ، عالی حوصلہ، اور دُنیا کی تمام بُری اور ذلیل باتوں سے متنفر تھا۔ اس کی تمام تصنیفات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے مکالمات (Dialogues) مفصلہ ذیل یعنی سمپوزیم (Symposium) اپالوجی (Apology) ریپبلک (Republic) ٹائمیئس (Timaeus) لاز (Laws) اور فیڈرس (Phaedrus) زیادہ مشہور ہیں۔

افلاطون پہلا شخص ہے جس نے بدلیل لمّی (a priori) اثباتِ واجب الوجود کیا، اور الٰہیات کی بنیاد ڈالی، اسی لئے اُسے افلاطونِ الٰہی کہتے ہیں۔ اسکے فلسفہ نے "مادیت" اور "دہریت" کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اُس نے بڑے زور وشور کے ساتھ توحیدِ ذاتِ باری کی تعلیم دی اور اسکے اثبات میں فلسفیانہ دلائل پیش کئے۔ اس کا فلسفہ اپنے اندر ایک عجیب جامعیت رکھتا ہے۔ فلسفہ کا ہر پہلو، اس کے اندر نمایاں ہے، اس کا فلسفہ اس لحاظ سے عقلی کہا جاسکتا ہے (Rationalistic) کہ وہ علم کائنات کو ممکن مانتا ہے اور

اس علم کی بناء عقل یا تصورات معقولی ہیں نہ کہ حواس ظاہری (Sense perceptions) اور اس لحاظ سے خارجی (Realistic) کہا جاسکتا ہے کہ وہ دُنیا کے وجود کا خارج از ذہن قایل ہے۔ اور اِس لحاظ سے مثالی (Idealistic) ہے کہ وہ ایک عالمِ مثال تسلیم کرتا ہے، اور اس لحاظ سے حادثاتی (Phenomenonalistic) ہے کہ عالمِ حواس، عالمِ خارجی کے مظاہر پر مبنی ہے، اور اس لحاظ سے وحدۃ الوجودی ہے (Pan-Theistic) کہ تمام مرئی اور غیر مرئی اشیاء ایک عقلِ کُل (World Soul) سے متحد ہیں۔ اور اس لحاظ سے الٰہی ہے (Theistic) کہ دنیا کا خالق ایک خدائے واجب ہے۔ اور اس لحاظ سے اثنینی (dualistic) ہے کہ وہ روح اور مادہ دونوں کی بناء پر فلسفیانہ حقائق کا انکشاف کرتا ہے، اور اس لحاظ سے اخلاقی (Ethical) ہے کہ وہ عالم کی علّتِ غائی خیرِ محض (The Good) مانتا ہے۔

اس کے فلسفہ نے صرف فلاسفہ ہی پر اپنا رعب اور اثر نہیں ڈالا، بلکہ یہودیت اور عیسائیت دونوں مذاہب اسکے خیالات سے متاثر ہُوئے، اور ان کا مسیحی فلسفہ اور الٰہیات دونوں پر خاص اثر ہُوا، چنانچہ جسٹن، اوریجن، اگسٹاین اور بہت سے مُشایخ کلیسیا، کی تصنیفات میں افلاطون کے فلسفہ کا اثر پایا جاتا ہے اور اُس کی مثالیّت (Idealism) کا اثر تو تمام یورپین فلاسفی پر شروع سے لیکر آجتک نمایاں ہے۔ یہ وہ بات ہے جو دنیا میں افلاطون کے سوائے کسی کو نصیب نہیں ہُوئی۔

بارکلے اور ہیگل کا فلسفہ، دراصل افلاطون کے لگائے ہُوئے درخت کا ایک ثمر نورس ہے۔

افلاطون کے نظریہ کے مطابق ہر چیز کا ایک تصورِ خیالی ازل سے الٰہی دماغ میں موجود تھا اور اسی کے مطابق دنیا اور تمام ذی شعور مخلوق پیدا ہُوئی افلاطون کا خیال تھا کہ ہر چیز کی ایک ازلی و ابدی غیر مادی صورت ہے اور یہ غیر مادی چیز ہی (Idea) تصور یا خیال کہلاتی ہے۔

نوٹ:۔ ارادہ ہے کہ افلاطون کی زندگی اور اُسکے فلسفہ پر بالاستیعاب علیحدہ مضمون لکھوں، اس لئے اسجگہ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمال سے کام لیا جائے، اور سرسری نظر پر اکتفا کیا جائے۔ ٹایمئس اور ریپبلک ایسی کتابیں نہیں جن پر بحث کرنے کے لئے دو تین صفحات کافی ہوسکیں ۱۲۔

ریڈ لکھتا ہے "آیڈیا (Idea) افلاطون کی اصطلاح فلسفہ میں ان سانچوں سے مراد ہے جنکے موافق خدا نے دنیا کی تمام اشیا کو بنایا ہے" کلیات (Universal Ideas) ہی کو ارسطو کا فلسفہ Categories or General Terms یا انواع عام سے تعبیر کرتا ہے۔ اور موجودہ فلسفہ میں ان (Ideas) کو Laws of Thought کہتے ہیں طبیعات میں انکا نام انواع خاص (Species) ہے ۱۲۔

اسکے فلسفہ پر اجمالی نظر | افلاطون ہرقلیطوس سے اس امر میں متفق ہے کہ "العالم متغیر" (perpetual change) اور حواس کے ذریعہ صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ عالم محسوسات (world of sense) میں کوئی چیز (immutable) ثابت اور قائم نہیں۔ وہ سقراط سے اس امر میں متفق ہے کہ اگرچہ ہم کائنات کے (انتہائی اور آخری) اصول سے خبردار نہیں ہو سکتے لیکن ہم اپنے آپ کو جان سکتے ہیں افلاطون کا مشہور مقولہ ہے (γνωθι σεαυτον) (اپنے آپ کو جان) اور حسن باطنی (inner sense) کے ذریعہ خیراعلیٰ (Highest Good) یعنی خدا کو جان سکتے ہیں +

افلاطون کے تمام فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ عقل کا صحیح طور پر استعمال کرنا، انسان کو معلوم ہو جائے۔ اور ہمارا ذہن جن اغلاط یا غلط خیالات میں پھنسا ہُوا ہے۔ اُن سے باہر نکل آئے۔ اور استدلال و استنباط کی بنیاد صحیح اصولوں پر قائم ہو جائے، کالرج کہتا ہے "یہی کام انگلستان میں بیکن نے کیا اور اس نے افلاطون اور بیکن دونوں کے اصولوں میں بہت مشارکت اور مشابہت دکھائی ہے +

کلیات | ہم انسان کو دیکھتے ہیں وہ خارج میں موجود ہے لیکن 'انسانیت' خارج میں موجود نہیں۔ بلکہ صرف ہمارے ذہن میں ہے اور یہ انسانیت زید، بکر، خالد وغیرہ میں مشترک ہے، پس یہی انسانیت، اصلی اور حقیقی چیز ہے۔ اور اسی کا تصور ذاتِ باری میں ازل سے موجود تھا، اور اسکے موافق، خارج میں انسان، پیدا کیا گیا۔

آیڈیا (Idea) یا کُلی سے مراد وہ مفہوم ہے جس کا نفس تصور، شرکت سے مانع نہ ہو۔ جو ان امور کو شامل ہو، جو افراد میں مشترک ہیں۔ دُنیا میں جزئیات (افراد) موجود ہیں، کلیات کا وجود خارج میں نہیں پایا جاتا۔ میں افراد دیکھتا ہوں مگر وہ حقیقت جو مختلف افراد میں مشترک ہے، دکھائی نہیں دیتی، یہ حقیقت ذات باری میں ازل سے موجود تھی اور یہی خلاصۂ انسان ہے۔ دنیا کی تمام اشیاء آنی و فانی ہیں مگر کلیات باقی اور دائم الوجود ہیں ان میں تبدّل و تغیر راہ نہیں پا سکتا +

ہندو فلسفہ میں کلیات کی تعداد سولہ ہے، لیکن افلاطون لکھتا ہے، ہر اسم نکرہ کلی ہے، انسان، گھوڑا، کتا، میز، کرسی وغیرہ۔ یہ کُلیات، جو اصل اشیاء ہیں، اگرچہ بے شمار ہیں۔ لیکن غیر مرتب اور بے ترتیب نہیں ہیں، بلکہ ان کی دنیا منتظم اور مرتب ہے اور اُسے ہم عالم معقول (Rational world) کہتے ہیں، یا عالم مُثل کہہ لو۔

"افلاطون کا نظریہ یہ ہے کہ اس عالمِ محسوس میں ہر شئے فرداً فرداً جزئی اور مشخص ہو کر آتی ہے۔ کلی کا وجود خارج میں نہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ انسان ہنستا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، کتا بھونکتا ہے، تو

یہ حکم کسی خاص انسان، یا گھوڑے یا کتے پر نہیں لگایا گیا، بلکہ انسان، گھوڑے اور کتے کی نوع پر لگایا گیا ہے لیکن کلی انسان کا وجود تو اس عالم میں موجود نہیں۔ لہذا کہیں نہ کہیں ہونا چاہیئے۔ عام جواب یہ ہے کہ ذہن میں، لیکن ذہن میں یہ ساری دنیا نہیں سما سکتی۔ اس لئے ایک عالم ہے، جس میں کلیات اور انواع بستے ہیں، اس عالم محسوس میں جتنی چیزیں ہیں وہ کسی نہ کسی نوع کے تحت میں ہیں۔ یہ انواع عالم مثل میں ہیں۔ اور انکے عکس اور سائے جن کا نام افراد اور جزئیات ہے، وہ اس عالم محسوس میں ہیں، حقیقی وجود انہیں (Ideas) یا کلیات کا ہے یہ کلیات گویا قدرت کے سانچے ہیں اور اس عالم محسوس کی چیزیں، یعنی جزئیات انہیں سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نمودار ہوتی ہیں۔ ان افراد اور جزئیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی اپنی انواع (Ideas) کے آثار اور اظلال (copies) ہیں (ماخوذ از سیرۃ نبوی جلد ۳ صفحہ ۱۹ مرتبہ سید سلیمان)۔

کلیات کا علم بذریعہ استقراء (Induction) یا تجربہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ہم دنیا میں انسان تو روزمرہ دیکھتے ہیں مگر انسانیت تو کسی جگہ نہیں دکھائی دیتی Conceptual Knowledge یا علم کلیات ہی صحیح اور سچا علم ہے، محسوسات کا علم یا علم جزئیات کسی کام کا نہیں، کیونکہ اُسے اُستواری اور پائداری حاصل نہیں ہے۔

یہ کلیات، عالم مثال میں ایک معقول ترتیب کے ساتھ موجود ہیں اور اعلیٰ ترین کل (Good) خیر یا نیکی ہے کلی خیر یا نیکی سے اوپر اور کوئی کلی نہیں ہے۔ اور یہ کلی، عقل اول ہے (Logos) (جسکا ذکر آگے ہوگا) جو اس عالم کی علت ہے، عقل کل واحد ہے اور عالم، کثیر ہے، لہذا وحدت میں کثرت موجود ہے۔

افلاطون کے فلسفہ میں شروع سے لیکر اسکے زمانے تک کا سارا فلسفہ مضمر ہے، چنانچہ اسکے فلسفہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہ اہل سفسطہ سے اس امر میں متفق ہے کہ (appearances) مظاہر کا علم ناممکن الحصول ہے

سقراط سے اس بات میں متفق ہے کہ صرف علم کلیات ہی (Genuine) حقیقی علم ہے۔

ہرقلیطوس سے امر میں متفق ہے کہ دنیا ہر لحظہ متغیر ہے۔ یعنی دنیائے محسوس۔

پارمینا یڈیز سے امر میں متفق ہے کہ عالم غیر متغیر ہے۔ یعنی عالم مثال۔

دیمقراطیس سے امر میں متفق ہے کہ وجود متکثرہ ہے۔ یعنی کلیات بہت ہیں۔

پارمینا یڈیز سے امر میں متفق ہے کہ وجود ایک ہے۔ یعنی واجب الوجود۔

انکیزاگورس سے امر میں متفق ہے کہ نفس ناطقہ، (mind) مادہ سے علیحدہ ہے۔

علم الآفاق | cosmology | افلاطون نے اپنی تصنیف (Timoens) میں بدءِ الخلق (origin of world) سے بحث کی ہے لیکن اُسے یہ امر مسلم ہے کہ اسکے اقوال سب قیاسات پر مبنی ہیں +

خدا واحدِ حقیقی ہے، اور افضل ترین، بزرگ ترین اور کامل ترین وجود ہے (Tim, ch. 79) ازلی اور ابدی ہے زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہے۔ روح (psyche) یا نفس ناطقہ، قدیم بالزمان ہے مگر قدیم بالذات نہیں واجب بالغیر ہے +

چونکہ خدا علۃ تامہ ہے، معلول کا ہونا لازمی ہے، علۃ تامہ سے معلول کا سرزد نہ ہونا محال ہے، لہٰذا جب سے خدا ہے تب سے عقلِ اول ہے عقل ہیں جاننے یا ادراک کی قوت اسلئے ہے کہ وہ خدا سے ملتی جلتی ہے۔ (homogenous) اور ازل ہیں خدا سے سرزد ہوئی (Generated) دیکھو (Tim 16) تمام مخلوقات میں عقل/روح Rational Soul خدا سے زیادہ مشابہ ہے (Laws Bk. ch. I) ایک طرف عقل/روح خدا سے متصل ہے (Linked) کیونکہ وہ اس سے صادر ہوئی (emanated) دوسری طرف عالم محسوسات یعنی ہماری دُنیا سے بھی متحد ہے۔ یعنی خدا اور دُنیا کے درمیان واسطہ ہے، اور دنیا اسی واسطے سے پیدا ہوئی۔ کیونکہ واحدِ حقیقی سے صدور ایک سے زیادہ فعل کا نہیں ہو سکتا الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد ؎

ارواح ہیں علوی اور سفلی دونوں آثار موجود ہیں۔ آدمی زادہ طرفہ معجون نسبت۔ از فرشتہ سرشتہ وز حیوان، اور دونوں آثار اُسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں روح جسم میں مقید ہے مگر، اوپر کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے، عالم بالا کی طرف رجوع کرنا، اسکی فطرت اولیہ اور طبیعت کا تقاضا ہے، کیونکہ اس کا اصلی گھر یا وطن دنیا نہیں ہے cf. Wordsworth خدا کی معرفت روح کا مقصد ہے اور اسکی اصلی خواہش ہے اسکی طبیعت کا تقاضا ہے،

روح اور مادہ، خدا کے ساتھ ازلی ہے، ان دونوں سے خدا نے دُنیا بنائی، خدا اس معنی میں خالق creator نہیں کہ نیستی سے ہستی کرتا ہے، بلکہ وہ ایک معمار (architect) کی مانند ہے جو اینٹ اور گارے سے عمارت کھڑی کر دیتا ہے +

الٰہیات | افلاطون پہلا شخص ہے جس نے لمی دلیل سے اثباتِ واجب الوجود کیا۔ (Timoens) میں اور Laws میں اُس نے دہریت اور مادیت وغیرہ کا خوب ابطال کیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بخوف طوالت ان مقامات کو اس مختصر مضمون میں درج نہیں کر سکتے، لیکن (Laws) میں سے چند سطور پیش کرتے ہیں :-

"قانون اور اخلاق کی حفاظت صرف خدا پرستی سے ہو سکتی ہے، جو شخص خدا پر ایمان اور اعتقاد رکھتا ہے

وہ بدی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص بدکار ہے وہ اپنے افعال سے ثابت کرتا ہے کہ اُسے خدا پر ایمان نہیں۔ ہمارے زمانہ میں انتشر میں چند ایسی کتابیں پائی جاتی ہیں جو لوگوں کو بے دینی اور الحاد کی طرف لیجاتی ہیں ان کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں، اخلاق بیکار اور فضول باتیں ہیں۔ مادہ ہی اصل کائنات ہے دنیا خود بخود بن گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں عدم تفکر اور جہالت کا نتیجہ ہیں۔ اگر کائنات پر غور کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود بخود نہیں بن گئی۔ کائنات ایک نظام کے ماتحت چل رہی ہے، اور نظام بغیر منتظم کے نہیں پایا جا سکتا۔ بے شعور مادہ اسکی علۃ نہیں ہو سکتا۔ نظام عالم میں اگر کوئی بات ہمیں ناقص معلوم ہوتی ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم خود ناقص العقل ہیں، بہت سی باتیں جن کو ہم بُرا سمجھتے ہیں وہ دراصل اچھی ہیں ہماری غلط رائے یا ناواقفیت کی وجہ سے بُری معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شے جو کُل کے لحاظ سے اچھی ہو، جب کل سے علیحدہ ہو کر دیکھی جائے تو بُری معلوم ہو، لیکن ہم لوگ کُل کا علم نہیں رکھتے، کُل کائنات، سارا نظام عالم ہمارے سامنے موجود نہیں، ہم تو صرف ایک چھوٹا سا حصہ اور جزی علم رکھتے ہیں۔ پھر اس قصور کے ہوتے ہوئے اگر ہم اعتراضات کریں تو کیسی ہٹ دھرمی اور بے انصافی کی بات ہے۔

خدا جو رحیم و کریم ہے، اُس نے یہ دنیا بہترین دنیا بنائی ہے کیونکہ اگر وہ بہترین نہیں تو خدا کی ذات پر حرف آتا ہے، اور اس کی قابلیت اور قدرت پر عیب لگتا ہے۔ ہم محدود العقل ہیں، خدا کی ذات کو نہیں جان سکتے لیکن اس قدر بہ یقین کہہ سکتے ہیں کہ خدا ایک ہے۔ خدا کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا بیان بذریعہ سلب ہو سکتا ہے (God can only be described in negations) اُسے جاننا کما حقہ طاقتِ بشری سے بالاتر ہے۔

رُوح کے غیر فانی ہونے پر افلاطون نے مفصل بحث کی ہے۔ اس کا مذہب ہے کہ رُوح غیر فانی ہے کیونکہ (۱) وہ جسم نہیں ہے (۲) فاعل اور متحرک بالذات ہے (۳) کیونکہ مُدرکِ کلیات ہے۔ (مادہ ساکن ہے جب تک دوسرا اُسے حرکت نہ دے، متحرک نہ ہوگا لیکن رُوح خود متحرک ہے)۔

لیکن جو کچھ علم ہم خدا کے بارہ میں رکھتے ہیں وہ اپنی ذات میں اور کائنات میں غور و خوض سے حاصل ہوتا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ "تمام محدود اشیاء (finite existences) اور علل، قوانین فطرت کلیات، اصولوں سے برتر اور اُن کے اوپر (Beyond)، ایک قابل ہستی ہے (intelligence or mind) جو علۃ العلل ہے، تمام کلیات کی عالم ہے، تمام اصولوں کی اصل ہے کائنات پر حکمران ہے، منتظم ہے۔

واجب الوجود ہے، حی و قیوم ہے، کائنات میں جو انتظام، نظم و نسق، توازن و توافق، اتحاد اور ہم آہنگی، برائی اور بھلائی ہے ان سب کی علۃ اولیہ (First cause) ہے اور ہم اُسے خیر برترین Supreme Good یا اللہ (ὁ θεός) یا (ὁ ἐπὶ πᾶσι θεός God over all) کہتے ہیں اور یہ خدائے بزرگ و برتر (Incorporeal) غیر متجسد و مجسم، غیر متغیر (unchangeable) لامتناہی، غیر محدود کامل مطلق، خیر محض (essentially Good) واجب بالذات unoriginated اور قدیم اور دایم الوجود ہے وہ صانع عالم ہے۔ علۃ العلل ہے، احکم الحاکمین ہے، مدبر الارض و السما ہے اصل اصول کائنات ہے، عدل کا سرچشمہ ہے، تمام خوبی اور بھلائی کی علۃ ہے، ہر شئے کی ابتدا اور انتہا ہے ہو الاول ہو الاخر، ہو بکل شی علیم۔

کیا اس بیان کو بغور پڑھنے کے بعد ناظرین کو اس امر کا احساس نہ ہوگا کہ افلاطونِ الٰہی نے اپنے ہموطنوں کے سامنے خدا کا کس قدر اعلیٰ اور ارفع تصور پیش کیا ہے، اور اس ایک بات کے لئے وہ لایقِ ہزار تحسین و آفریں ہے۔

محمد یوسف خاں سلیم

حُسن

حسین چیز ہمیشہ کے لئے موجبِ شادمانی ہے۔ (کیٹس)

A thing of beauty is a joy for ever

حُسن اور صحت خوشی کا سرچشمہ ہیں۔ (بیکنسفیلڈ)

حُسن فصاحت کو مات کر دیتا ہے۔ (شیکسپیئر)

حُسن حُسن ہی پر مائل ہوتا ہے۔ (لے ہنٹ)

(صادق ایوبی)

کوہِ ہمالیہ پر صبح کا منظر

تاریک دہشتوں نے پُرہول وحشتوں نے
خاموش حسرتوں نے غمناک ظلمتوں نے
کوہِ ہمالیہ کو
مسکن بنا رکھا تھا

لو پھر ہُوا سویرا چلنے کو ہے اندھیرا
نازک خرامیوں سے وہ صبح آرہی ہے
خوش ابتسامیوں سے اک حشر ڈھا رہی ہے
اور عارضِ اُفق پر
سرخی لگا رہی ہے

گلگونہ ریزیاں ہیں اس خوشنما ضیا میں
رنگینیاں نہاں ہیں اس کی ادا ادا میں
یہ ہلکی ہلکی سُرخی
یہ پیاری پیاری سُرخی
بیدارئ سحر کا پیغام لا رہی ہے
دامن ہمالیہ کا
گلشن بنا رہی ہے

وہ برف پوش خطّے وہ بارِ ہوش خطّے
جن کی اُداسیوں پر
ظلمت کی سلطنت تھی
گلگونۂ شفق کی بیتاب لغزشوں سے
کرنوں کے مُو قلم کی ہلکی سی جنبشوں سے
کیا تمتما اُٹھے ہیں
کیا جگمگا اُٹھے ہیں

وہ حُسن کا ستارا وہ چاند آسماں کا
خونیں کفن کو پہنے
اب جا رہا ہے نیچے
اس کے کمال میں بھی پنہاں جمالِ حیرت
اس کے زوال میں بھی پنہاں کمالِ حیرت

سُورج ابھر رہا ہے فطرت سنور رہی ہے
اور عارضِ سحر پر سُرخی بکھر رہی ہے
وہ ننھی ننھی کرنیں
وہ پیاری پیاری کرنیں
برفانی چوٹیوں کے مینار چومتی ہیں
مستی بھری ادا سے اُٹھ اُٹھ کے جھومتی ہیں
گُدگُدی اُفق کو
چپکے سے کہہ رہی ہیں

سُن اے نگارِ فطرت اے نو بہارِ فطرت
رنگیں تری نمو سے لیل و نہارِ فطرت
اس بزمِ دلنشیں میں
ہم تیری جانشیں ہیں

سرعت سے مہرِ انور اُٹھتا ہے اوپر اوپر
کیسی یہ تیزیاں ہیں کیا جلوہ ریزیاں ہیں
پست و بلندِ قدرت پہنے لباسِ زینت
چشمِ نظارہ بیں کو
مسحور کر رہے ہیں
مسحور کر رہے ہیں مخمور کر رہے ہیں
چیلوں کی چوٹیوں پر
سوتے ہوئے پرندے بیدار ہو گئے ہیں
بیدار ہو گئے ہیں سرشار ہو گئے ہیں
اک کیفِ بیخودی میں
پہنائے آسماں پر پرواز کر رہے ہیں
رنگینئ سحر پر کیا ناز کر رہے ہیں
میٹھے سروں میں مل کر
گاتے ہیں کچھ ترانے
ان نغمہ پردروں کو کیا دل دیا خدا نے؟

تصدق حسین خالد
ایم۔ اے

غزل

ستم شعارِ محبت سے اجتناب نہ کر
کسی کی عمر خدا کے لئے خراب نہ کر

عجب نہیں گل و بلبل کا خون ہو جائے
چمن میں عارضِ زیبا کو بے نقاب نہ کر

نوازشیں تری معلوم ہو گئیں ساری
بس اے امید! مرے دل کو تو خراب نہ کر

اگر پسند تجھے وقت کی ہے پابندی
تو جاگنے کے زمانہ کو صرفِ خواب نہ کر

یہ آنکھیں پھر تجھے بیداد گر نہ دیکھینگی
بس اب تو نزع کا ہنگام ہے حجاب نہ کر

کریم تیرا کرم کب ہے مقتضی اس کا
میرے گناہوں کا لینے بھی دے حساب نہ کر

اگر کسی کے تصور کا لطف اُٹھانا ہے
تو اپنی آنکھ کو مصروفِ کیفِ خواب نہ کر

حاجی محمد صادق۔ صادق ایوبی
ڈیرہ غازیخاں

آتشِ انتقام

عبدالرحمٰن اسٹریٹ سے شام کے ۵ بجے گذرنے والی مخلوق کی اکثر و بیشتر نظریں اُن سیاہ بالوں کے پیچ و خم کی، اُن بادامی وضع کی آنکھوں کی چمک کی، اور اُس چھریرے جسم کے موزوں اتار چڑھاؤ کی یقیناً کچھ لمحوں کے لئے شکار ہو جاتیں اگر اُس کی میلی ساڑھی، اور پُرانی جوتیاں " الناس باللباس " ماننے والی دُنیا کے سامنے اُسے اس درجہ پست و نا قابلِ توجہ نہ بنا دیتیں! وہ سڑک کی پٹڑی پر، پیادہ پا، کچھ انتشار و فکر میں محو، خستہ و ماندہ قدم اُٹھاتی، خصوصیت کے ساتھ متموّل نما افراد سے بہ عاجزی مخاطب ہوتی، جھڑکی اور گھُرکی کبھی کبھی اور تکبر آمیز استغنا کا اظہار عموماً برداشت کرتی، دستِ سوال دراز کرتی، چلی جاتی تھی!

ممکن ہے کہ نشۂ تموّل میں چور ہونے والے اشخاص کی نخوت اُس کے تخیلات میں گداگری سے چوری کو نسبتاً زیادہ معزز و نتیجہ خیز ذریعۂ کسب معاش ثابت کرتی ہو۔ اور اس کش مکشِ افلاس میں وہ اِن دونوں طریقوں کا نمایاں فرق محسوس کرتی ہو۔ تاہم وہ جابجا ٹھٹکتی اور مختلف الفاظ میں گڑگڑاتی، ہر خوش پوشاک کا دُور سے استقبال کرتی اور خاموش رہنے والوں کا چند قدم تعاقب کرتی، مصروفِ گداگری تھی!

بھیک چوری سے بہتر ہو یا بدتر، مگر اس میں کلام نہیں کہ دستِ سوال کا پھیلانا، بقولِ زمانہ شناس۔ آبرو سے گزرنے کا پُل بنانا ہے۔ وہ فارغ البال چشم وابرو والے راہگیروں کا جائزہ لے رہی تھی کہ عبدالرحمٰن اسٹریٹ کے موڑ پر ایک شخص نے چند تانبے کے سکّے اُسے دئے تو سہی مگر کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ "خیرات تو دئے دیتا ہوں لیکن آئندہ میرا پیچھا کرنے کی ہمت نہ کرنا، ورنہ یاد رکھو مجھ سے بُرا کوئی نہیں"۔ اُس پامال ہستی نے اِس نظری ہتکِ عزت کا مطلق خیال نہ کیا۔ اور کرتی کس طرح جب کہ چند پیسوں سے پیدا ہونے والی مسرت نے تمام بقیہ جذبات کو یک لخت مٹا دیا تھا!

وہ اِسی طرح کسی سے اپنے مسافر ہونے کی کیفیت، اور کسی سے عرصۂ دراز کے بعد شفاخانہ سے نکلنے کی حالت، بیان کرتی بھنڈی بازار تک پہنچ چکی تھی کہ ایک دوکان سے برامد ہوتے ہوئے اس نے ایک آسودہ پیر فرتوت کو جالیا۔ بڈھے کو موم بنانے کے لئے اُس نے اپنے شوہر اور بچہ کی اچانک موت کا اظہار کیا اور تجہیز و تکفین کی ضرورت کو گداگری کا پردہ بنایا۔ بڈھے کا ہاتھ جیب میں گیا اور کنگ جارج

کی ہئیات چاندی پر نمایاں کرنے والے سکّہ کو لئے ہوئے نکلا!

عین اُسی وقت تھوڑے سے فاصلہ پر، ایک نوجوان، بظاہر متموّل و آسودہ، چہل قدمی کرنے اور بمبئی کی سیر سے بہرہ اندوز ہونے میں ہمہ تن محو تھا۔ اِس پامال ہستی نے اُس نوجوان کو حاصل شدہ روپیہ کے نذرِ جیب کرچکنے کے بعد دیکھا، مگر وہ نوجوان غالباً اس گداگری کرنے والی کو بہت پہلے سے بھانپ چکا تھا! ایک متموّل نما نوجوان سے روپیہ کے مصرف میں ناعاقبت اندیشی کی امید اکثر ہوتی ہے اور بجا ہوتی ہے گداگر کی نظر ایسی رقم کے جائزہ کو کب نظر انداز کرسکتی تھی؟ اُس نے قریب تر ہو کر نوجوان سے لجاجت آمیز سوال کیا اور اپنے ستم رسیدہ ہونیکی وجہ یہ ظاہر کی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ریل میں ہمسفر تھی کہ اُس کا شوہر یکایک ہیضہ میں مبتلا ہُوا اور دونوں کو بمبئی میں مجبوری اُترنا پڑا۔ باوجود انتہائی کوشش کے اُسکا انتقال ہو گیا۔ اور اس بیچاری نے ایک مہینہ میں تمام مال و متاع کوڑیوں کے مول بیچ بیچ کر کھالیا۔ اب وہ بے یار و مددگار ہے اور محض اپنے وطن کراچی واپس جانے کے لئے کرایہ اور زادِ راہ کی خواستگار ہے نوجوان اس سوال کو سنتا بھی جاتا تھا اور آہستہ آہستہ قدم بھی اُٹھاتا جاتا تھا۔ اُس کا ہاتھ ایک مرتبہ کوٹ کی جیب میں گیا کہ گداگر کی امیدیں زندہ ہو چلیں، مگر باہر آنے پر ہاتھ میں محض رومال تھا۔ جو ناک کی حاجت روائی کے لئے نکالا گیا تھا۔ گداگر کی نظر باوجودِ ناکامی برابر جیب پر تھی، اُس کو اُمید ہوگی کہ شاید یہ ہاتھ پھر جیب کی گہرائی میں غوطہ لگائے اور اس مرتبہ دُرِ مقصود لے کر باہر آئے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! نوجوان نے کسی قدر غرور آمیز درشتی کے ساتھ کہا "معاف کرو! آگے جاؤ"

وہ ایک حسرتِ جانگداز کے ساتھ ٹھٹکی چاروں طرف نظر دوڑانے لگی اور پھر آہستہ آہستہ، نوجوان سے کسی قدر فاصلہ پر، سایۂ ابرِ دواں کی طرح، اُسکے پیچھے پیچھے چلتی رہی ❊

بھنڈی بازار کی سڑک پر ایک تیز رو موٹر نے ایک غریب سن رسیدہ راہگیر کو آلیا، موٹر ہارن نے حضرت عزرائیل کی آمد کا اعلان کیا، شکارِ اجل نے آگے دوڑنا چاہا مگر ٹرام سدِ راہ تھی، اُلٹی طرف بھاگنا چاہا مگر ایک مشکی جوڑی کی ٹاپ حائل تھی، گھبرا کر اُلٹے قدم ہٹنا چاہا کہ سیدھی طرف سے موٹر نے دھکا دیا، ایک ضربِ سخت کے ساتھ سن رسیدہ جسم زمین پر گرا، چشم زدن میں موٹر اُس پر سوار تھی، دیکھتے ہی دیکھتے ایک بولتی چالتی ہستی مُردہ لاش سے مُبدّل ہو گئی!

تُو چل، میں چل، راہگیر چل، تماشائی چل۔ بچانے کے لئے کوئی نہ دوڑا مگر کُچل جانے کا انجام

دیکھنے کے لئے سب دوڑے۔ اور تو اور، مار پیچھے سنوار پر عمل کرنے والا پولیس کا سپاہی بھی دوڑا، ایک غیر معمولی ازدحام نے سڑک کی آمد و رفت کچھ عرصہ کے لئے مسدود کر دی۔ اس بھیڑ میں وہی متموّل نما نوجوان بھی تھا اور ممکن ہے کہ اُس کے پس پشت وہ گداگر عورت بھی ہو +

ہیجان کے بعد سکوں اور مجمع کے بعد سناٹا۔ پولیس کے ہاتھ نے پکڑ دھکڑ شروع کی کہ سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ نوجوان بھی اس عرصہ میں بھیڑ کو چیرتا، دھکّے کھاتا، سڑک کے دوسری جانب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کسی قدر اطمینان کے بعد اُس نے اپنے لباس کو، اوپر چڑھ جانیوالی آستین یا گرد آلود ہو جانے والے پتلون کی موری کو، جھاڑنا اور جھٹکنا شروع کیا، اُسے اپنی جیب کچھ ہلکی معلوم ہوئی کہ فوراً ہاتھ اندر تھا، چمڑے کا جیبی بٹوا غائب، اور مع پانسو روپے کے نوٹوں کے غائب، چہرہ کا رنگ ہوا، سٹّی گم، ایک دفعہ پیروں تلے سے زمین نکل ہی تو گئی!

نظروں نے چاروں طرف بلا سوچے سمجھے دوڑ لگائی، سینکڑوں بندگانِ خدا، یا عاشقانِ شیطان اپنے اپنے خبطِ حیات میں منہمک کسی نہ کسی مقصد کی خاطر متحرک تھے، نوجوان کی نظریں کسی کو مشتبہ نہ کر سکیں، سڑک کے دوسرے رُخ پر، وہی گداگر عورت ایک سمت کو دوڑ رہی تھی ...... کیا؟ ...... یہ عورت؟ ...... بیشک! ...... حافظہ و عقل نے آن کی آن میں اس عورت کے خلاف فردِ قرارداد جرم لگا دی اور نوجوان بھی اُس کے پیچھے بلا تاخیرِ مزید فوراً جھپٹا!

بھاگنے والے اور تعاقب کرنے والے کا درمیانی فاصلہ اس قدر کافی تھا کہ صرف دو ایک منٹ کی دوڑ میں، پیش رَو نے ایک کرایہ کی پالکی گاڑی لے لی اور تعاقب کرنے والے نے دُور سے اُس کو سوار ہوتے اور گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ لیا، نوجوان بھی کوششِ تعاقب میں ایک اور پالکی گاڑی کی طرف لپکا، کوچبان کو نہایت مختصر الفاظ میں سامنے جانے والی گاڑی کا پیچھا کرنے کی عجلت آمیز ہدایت کرتے ہوئے گاڑی میں داخل ہوا اور ایک بدحواسی کے عالم میں کھڑکی سے باہر منہ نکالے "چلو! تیز چلو! سامنے والی گاڑی کو اوجھل نہ ہونے دو!" کا حکم بار بار دینے لگا۔

پیدل دوڑ کے بعد گاڑیوں کی دوڑ شروع ہو گئی اور نوجوان کسی قدر سکون و وحشت کے ساتھ مستغرقِ فکر ہو چلا۔ اگر یہ عورت چور نہ ہوئی؟ ...... اگر یہ کوشش رائگاں گئی؟ .... لیکن

اُس کی گداگری کی حالت ـــــ پھر آخر وہ بھاگی کیوں؟ ـــــ اُس نے گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ جانا کیوں چاہا؟ ـــــ مگر کیا ممکن نہیں کہ وہ کسی ضروری کام کی خاطر عجلت کر رہی ہو؟ ـــــ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دراصل آسودہ حال ہو اور محض دریوزہ گری کا آسان پیشہ اختیار کرنے کے لئے اُس نے یہ رنگ اختیار کیا ہو؟ ـــــ

دن چھپ رہا تھا مگر کوشش جاری تھی، خیالاتِ فاسد کا ہجوم تھا مگر ڈھارس بندھی ہُوئی تھی، پانسو روپے کی رقم کا صدمہ، آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام نوٹوں کا غائب ہو جانا، خدا دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا ہے۔ اُسی عقل کا فتویٰ لے رہا تھا کہ ہو نہ ہو، وہ گداگری کرنے والی عورت، گرہ کٹ، اُٹھائی گیرا اور چور بھی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کوشش سے ایک نئے تجربہ، نئے انجام، اور انوکھی بمبئی کی سیر کا، پورا یقین تھا! نوجوان کی گاڑی رُکی اور اس نے باہر منہ نکال کر جھانکا، سامنے والی گاڑی ایک بڑی دوکان کے آگے کھڑی تھی! بالآخر اُس نے دوکان کے اندر داخل ہوتے ہُوئے اُسی گداگر کو تاڑ لیا وہ گاڑی سے اترا، اور سامنے والی گاڑی کو خالی واپس جاتے ہوئے دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ چڑیا کہیں پھُر سے اُڑ تو نہیں گئی! ٹہلتا ہُوا آگے بڑھا تو دیکھتا کیا ہے کہ مخصوص دوکان "مسز باٹلی والا" کی مشہور فرم ہے جہاں صنفِ نازک کے ملبوساتِ نظر فریب کے حُسن میں چار چاند لگانے والی ہر قیمتی شئے دستیاب ہو سکتی ہے ـــــ کیا وہ بھی اس دوکان میں گھُس جائے؟ ـــــ

آتشِ انتقام کا اصرار تھا کہ ہاں! ضرور! ـــــ مگر احتیاط پسندی کا تقاضا تھا کہ "نہیں! ہرگز نہیں! ـــــ نوجوان نے دوکان کے سامنے خاموشی کے عالم میں ٹہلنے پر اکتفا کیا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا اور دن کی رہی سہی روشنی پر رات کی سیاہی غالب آتی جاتی تھی، فورٹ بمبئی کی کشادہ سڑک پر بجلی کی روشنی دفعتاً جابجا جگمگانے لگی تھی اور راہ گیر افراد کے علاوہ طرح طرح کے پہیّوں پر چلنے والی مخلوق، متلاطم سمندر کی مانند، مسلسل طور پر متحرک تھی، نوجوان کے جولانگاہِ تخیّل میں بھی توہمات کا طوفان موجزن تھا۔ اس کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا چلی تھیں۔ "السعی منّی والاتمام من اللہ" کا خیال تو کہاں، البتہ مرتا کیا نہ کرتا، کے لحاظ سے پیدا ہونے والا جنون، اور اُس جنون کے زیرِ سایہ قائم ہونے والی اُمید کا زعم، نوجوان بہرحال گھنٹہ بھر سے زیادہ گذر جانے پر بھی اپنی کامیابی کا منتظر تھا۔

بالآخر دکان سے باہر کوئی نکلا، بجلی کی روشنی نے ایک حسین صورت کو نمایاں کیا جو نیلی ریشمیں ساڑی، قیمتی آسمانی بوڈی، سیاہ ریشمیں موزے اور نازک لیڈیز پمپ سے، سر سے پیر تک آراستہ تھی، نوجوان

کچھ جھجکا ـــــ حسن کی پتلی کسی قدر تیز گام، سڑک کی طرف چلی ـــــ متجسس نظروں نے پھر جائزہ لیا ـــــ بیشک وہی ـــــ نوجوان کا حافظہ کہتا ہوگا:

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من اندازِ قدت را می شناسم

وہ آگے بڑھا۔ قریب تر ہوا۔ پھر کچھ جھجکا۔ اور عین اس وقت جب کہ یہ حسن کی پتلی نوجوان کی خالی گاڑی کے پاس سے گذر رہی تھی اُس نے لپک کر اُن نرم و نازک کلائی تھام ہی تو لی! ریشمیں بائی نے دفعتاً چونک کر نوجوان کو گھورا ـــــ آنکھیں کہنا چاہتی تھیں کہ "تو کون ؟" مگر نوجوان کو پہچان کر اسی قدر ظاہر کر سکیں کہ "ہائے!" ـــــ دھڑکنے والے دل سے متاثر ہونے والے چشم و ابرو نے ہتھیار ڈال دینے کا اعلان کر دیا ـــــ نوجوان پھر بھی مرد تھا اور مرد کے معنے ہیں قوی، درشت، سخت گیر۔ اور وہ آخر کار عورت تھی۔ یعنی کمزور، مسکین اور مطیع ـــــ نوجوان نے محض اپنی سخت گرفت کی بدولت اُس کو اپنی گاڑی میں چڑھا لیا اور وہ بچاری کچھ ایسی مرعوب ہوئی کہ زبان ہلائے بغیر سوار ہو گئی!

پہلو بہ پہلو بیٹھتے ہوئے، ایک طعن آمیز رنگ میں نوجوان نے بلا تامل کہا " یہ تمام کر و فر غالباً اُن ہی نوٹوں کی بدولت ہے ؟"

"جی ہاں!"

"غالباً اس سے پیشتر بھی ایسی ہی چابکدستی کی بار ہا مشق کی گئی ہوگی ؟"

"نہیں! یہ عمر بھر کا پہلا اتفاق ہے۔"

" اور امید ہے کہ آخری ثابت ہوگا " پھر طنزیہ لہجہ میں نوجوان نے کہا۔

اُس کو تعجب تھا کہ اس گرِاکر چور نے، گرفتاری سے گریز کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی ؟ اپنی صدائے احتجاج سے راہگیروں کو اپنی امداد کے لئے کیوں نہیں بلایا ؟ اپنی نسائیت کو ہمدردی کے حصول میں" پردہ پوشِ جرم بنانے اور بظاہر ناجائز نما ہتکِ عزت کا ہتیار استعمال کرنے میں تامل کیوں کیا ؟ سب سے زیادہ یہ کہ اِس آسانی کے ساتھ اقبالِ جرم کیوں کر لیا: وہ نوجوان کو اس قدر بدحواس نہ معلوم ہوتی تھی۔ جس قدر مستغرقِ فکر! غالباً وہ کوئی خوبصورت ترکیب نوجوان کو دوبارہ چکمہ دینے کی سوچ رہی ہوگی!

" آخر اس دیدہ دلیری کی جرأت کیوں ہوئی ؟" نوجوان نے پھر جرح شروع کر دی۔

" ایک ناقابلِ بیان مصیبت کی مجبوری سے "

"یعنی وہی مفروضہ شوہر کے انتقال کی من گھڑت داستان؟"

"جی نہیں! ایک سچی مصیبت . . . ."

"خیر! اس سچی اور جھوٹی کو بالائے طاق رکھو" بات کاٹتے ہوئے نوجوان نے کسی قدر سخت لہجہ میں کہا "اب انجام کے لئے تیار ہو جاؤ"

"انجام کے لئے میں ہر طرح تیار ہوں، بشرطیکہ . . . . ."

"شرط کیسی! تم کو یہ بھی علم ہے کہ میں تمکو کہاں لے جا رہا ہوں؟"

"مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے"

"میں تم کو سب سے قریب والے تھانہ، فورٹ پولیس اسٹیشن لے جا رہا ہوں"

"نہیں! ابھی نہیں!" نہایت لجاجت کے ساتھ گداگر نے کہا "میری آخری تمنا پوری ہو لینے دیجئے"

"وہ کیا ہے؟"

"صرف تین گھنٹے کی مہلت!"

"تاکہ تم پھر کوئی چکمہ دینے میں کامیاب ہو جاؤ اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں؟"

"یقین کیجئے میں ایسا نہیں کر سکتی۔ تین گھنٹے کے بعد آپ جہاں چاہیں لے جائیں مجھے مطلق عذر نہیں ہوگا" وہ نہایت عاجزی کے ساتھ التجا کر رہی تھی "میں بیکس ہوں اور قطعی طور پر آپ کے بس میں ہوں۔ صرف تین گھنٹے خدا کے واسطے دیدیجئے" یہ کہتے کہتے اُس نے اپنا سر اس قدر جھکایا کہ نوجوان کے گھٹنے سے مس ہونے لگا۔ وہ اس لئے جھک رہی تھی کہ قدموں پر سر رکھ دے۔ نوجوان نے بالآخر اُسے روکا، اس کا سر پکڑ کر اوپر اُٹھایا۔ اور اس کوشش انسانیت میں تیز خوشبودار تیل نے گداگر کے بالوں سے اپنا پیغام شامہ نواز نوجوان دماغ کو دیدیا۔ نوجوان کو پہلی مرتبہ محسوس ہُوا کہ گاڑی کی تنہائی میں وہ ایک حسین ہستی کے پہلو بہ پہلو تھا!

مجبور و ناچار عورت برابر التجا کر رہی تھی "میں صرف تین گھنٹے چاہتی ہوں۔ یہ میری آخری آرزو ہے۔ خدا کے واسطے تین گھنٹے کی مہلت دیدیجئے" وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ رہی تھی!

"اچھا! منظور! مگر اس شرط پر کہ تین گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی تم مجھ سے اوجھل نہ ہوگی"

"بے شک نہیں ہو نگی"

اِس معاہدۂ مبہم کے بعد نوجوان کے دماغ کو تین گھنٹے پورے لطف کے ساتھ گذارنے کا خیال پیدا ہونا تقاضائے فطرت نہیں تو تقاضائے سن تھا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر کوچبان کو ہدایت کی "اپالو بندر۔ گرین ہوٹل۔ چلو!"

جب گاڑی اپالو بندر پر رُکی اور نوجوان اس عارضی ساتھی کے ساتھ اُترا تو بجلی کی روشنی میں اس مرتبہ خصوصیت کے ساتھ اُس کی نظریں اس مجسّم راز پر پڑیں۔ کم از کم اس حسین شکل کی معیت، ظاہری لباس اور مہذب چال ڈھال کے اعتبار سے، اس کو قابل انگشت نمائی نہ معلوم ہُوئی، تاہم سرقہ کے واقعہ سے انتقام کا جذبہ دل دماغ پر قطعی طور سے حاوی ہو چکا تھا، وہ اپنے قیدی کو حسن کی سحر کاری سے متاثر ہو کر نہیں لایا تھا بلکہ محض دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کس طرح اس کی گرفت سے نکلنے کی تدبیر تلاش کرتی ہے۔ وہ اس چابکدست حسین کے ایک ایک لفظ کو محض لغو سمجھتا تھا۔ تاہم اضافۂ معلومات کی خاطر وہ اس کی رسّی دراز کر کے کسی نئے تجربہ کا متمنی تھا۔ گویا وہ اس محدود مہلت میں حسن کی پُتلی کے ساتھ اِسی طرح کھیلنا چاہتا تھا جس طرح ایک شریر بچہ کسی ایسے خوشنا کھلونے سے جس کو وہ بالآخر توڑ ڈالتا ہے۔

ہوٹل میں پہنچ کر ایک گوشۂ عافیت میں اُس نے بھی اپنی حسین شریک دقت کے سامنے، ایک میز پر قبضہ کیا اور ڈنر کی فرمائش کر دی، ہوٹل کی ہر میز پر دو یا دو سے زیادہ اشخاص مصروف ادوقات کشی تھے۔ ہر حلقۂ مختصر ایک یا دو نسائی شمعوں سے اپنے ارد گرد کے پروانوں کو محوِ شعلہ بنانے میں سرگرم تھا اور "کسے را باکسے کارے نباشد" کا افسوں مختصر و محدود صحبتوں کو مُسنگِ مداخلت سے بکلّی مامون کئے تھا! نوجوان کو چاروں طرف غلط انداز نظریں ڈالنے سے یہ معلوم ہو کر اطمینان۔ بلکہ افتخار۔ ہو چلا تھا کہ اُس کی حسن کی پُتلی اکثر شباب کے کھلونوں سے چشم و ابرو میں نسبتاً زیادہ نظرگیر اور توجہ فریب تھی! اُس نے اپنی پتلی کو ایک میز کی طرف غور سے دیکھتے ہُوئے مزاحاً پوچھا "کیا کسی کو پہچانا؟"

"جی ہاں! اُس میز پر مسٹر و مسز پارکر کھانا کھا رہے ہیں۔ غالباً تیسری مس پارکر ہے۔ جو اَب جوان ہو گئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ میں نے اُن کو ۵ سال کے بعد دیکھا ہے"

"تو پھر اُن سے جا کر ملتیں کیوں نہیں؟" نوجوان نے طنزیہ رنگ میں کہا۔

"مجھے اب شاید نہ پہچانیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ میرے شوہر کے پاس آتے تھے اور رات دن میری خوشامد کرتے تھے" ایک عجیب حسرت اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔

"اچھا۔ تو کیا واقعی تمہارا کوئی شوہر بھی تھا؟" نوجوان نے پھر طنزیہ طور پر پوچھا۔

"میری موجودہ حالت کیسی ہی ہو۔ مگر پیشتر ایسی نہ تھی" اُس نے گردن جھکائے جواب دیا۔

"پیشتر کی حالت سننے کا مجھے بھی اشتیاق ہے"

"مجھے بتانے میں کوئی تکلف نہیں۔ بشرطیکہ آپ یقین کریں"

"یقین کرنے نہ کرنے سے بحث نہیں۔ کم از کم لطفِ صحبت کی خاطر سُنائیے"

"میرے شوہر کا نام فرامرزجی ٹھٹا دُ ہے۔ وہ میکنس تھیٹریکل کمپنی کے مالک اور بمبئی کے لکھ پتی ہیں"

"ہیں؟ یعنی وہ ابھی زندہ ہیں؟" نوجوان دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

"جی ہاں! زندہ ہیں، بائیکلا نمبر ۱۸۷ ان کا عالیشان مکان ہے"

"اچھا! آپ ایک لکھ پتی کی بیوی ہیں!" نوجوان نے طنزاً کہا۔

"جی ہاں واقعہ تو یہی ہے خواہ میری موجودہ حالت میں آپ اسے باور نہ کریں۔ لیکن وہ زمانہ جب کہ میری معمولی سے معمولی بات بھی عزت و اعتبار کی نظروں سے ــــــ" وہ ایک حسرت کے ساتھ گردن جُھکا کر خاموش ہوگئی اور نوجوان نے دل ہی دل میں اُسکے "ایکٹنگ" کی تعریف کرتے ہوئے پھر چھیڑا۔" مگر آپ کے والدین بھی یقیناً لکھ پتی ہونگے ورنہ ایسی اونچی جگہ شادی کیونکر ہوتی؟"

"نہیں! میرے والدین نہایت مفلس اور حاجتمند تھے اور اسی وجہ سے روپیہ کی چمک نے اُن کو میرے بہ آسانی نذرِ تنول کر دینے پر آمادہ کر دیا۔ میں شاید ۱۳ یا ۱۴ سال کی تھی کہ فرامرز نے مجھے حاصل کر لیا اور ۲۰ سال کی ہونگی کہ اُن سے علیحدہ ہوگئی ــــــ"

"علیحدہ ہوگئی! یا۔ انہوں نے علیحدہ کر دیا؟ غالباً لکھ پتی کو تم نے خود تو کہاں چھوڑنا چاہا ہو؟"

"میں نے خود ہی کنارہ کیا۔ فرامرز نے نہیں۔ (اُس کی آنکھیں اُٹھنے سے پہلو تہی کر رہی تھیں) میں ہی قصوروار ہوں"

نوجوان دل ہی دل میں اس لغو گوئی اور اختراع کا لطف اٹھا رہا تھا اور اپنے نظر فریب مخاطب کی لسانی کا کمال دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس کے سامنے فرامرز جی کھٹاؤ کا نام بھی زبان پر نہ آئیگا اور وہ اُس وقت ضرور اس اُڑتی چڑیا کو پر قینچ کر دینے کے بعد لکھ پتی کی حمایت حاصل کرنیکے لئے اُسے اکسائیگا۔ سچ یہ ہے کہ عورت اگر لسان بننا چاہے تو مبالغہ و تعلّی سے منزلوں آگے سفید جھوٹ تک فراٹے بھرتی چلی جاتی ہے اور مرد خاموشی کے عالم میں اُس کا مُنہ تکتا رہتا ہے!

ریشمیں بائی نے کچھ چونک کر اپنی قیمتی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور گھبرا کر کہا "آٹھ بج چکے!! وقت آگیا۔"

"کیسا وقت؟۔ ابھی تو دو گھنٹے باقی ہیں"

"دو گھنٹے مہلت کے باقی ہیں۔ مگر جس آخری تمنا کی خاطر یہ مہلت حاصل کی ہے اُس کا وقت آگیا ــــ اب میں نہیں رُک سکتی۔ اُٹھئے!"

"کیوں؟ کہاں کا ارادہ ہے؟" نوجوان کسی نئے چکمہ کا منتظر تھا۔

"جہاں کا ارادہ ہے آپ خود دیکھ لینگے" ــــ وہ کھڑی ہوگئی۔

"ذرا صبر کرو۔ میں بل ادا کر دوں"

نوجوان میز سے کچھ فاصلہ تک ایک خانساماں سے باتیں کرتا چلا گیا۔ بل ادا کرنا اُس کا مقصد ہو یا نہ ہو، مگر فرامرز جی نامی ہستی کی تحقیقات ضرور مطلوب تھی۔ اُس کو حیرت تھی کہ فرامرز جی کھٹاؤ جی کا لکھ پتی ہونا بیگنس کمپنی کا مالک ہونا، اور بائیکلا ۱۸۱ کی عالی شان کوٹھی میں سکونت۔ سب کی حرف بحرف تصدیق ہوئی۔ البتہ اس حسن کے کھلونے کو کوئی نہ شناخت کرتا تھا۔

ہوٹیل سے باہر آتے ہی نوجوان اپنی نظر بند پُتلی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوا اور حُسن کی پُتلی کے اشارہ پر گاڑی بائیکلا ۱۸۱ کے طرف چل نکلی!



نوجوان کے تخیلات میں ایک غیر معمولی ہیجان کا باعث اوّل تو فرامرز جی کھٹاؤ جی کے نام و مرتبہ کی تصدیق تھی اور دوم اُس سراپا راز ہستی کی دیدہ دلیری ــــ یہ عورت کیا واقعی ایسے سربرآوردہ شخص کی بیوی۔ یا کم از کم معشوقہ ہے؟ ــــ پھر اُس کی خستہ حالت چہ معنی دارد؟ ــــ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنا تعلق بتانے میں اسی قدر راست گو ہو جس قدر اکثر لکھنؤ کی بداطوار ہستیاں واجد علیشاہ کا نام بدنام کرنے میں؟ ــــ

پھر وہ اِس دیدہ دلیری کے ساتھ فرامرزجی کے مکان پر کیوں جاتی ہے؟ ـــــ نوجوان کے وسوسوں میں اضافہ ہوا اور مجبوراً اُسے گفتگو کو مزید معلومات کی کنجی بنانا پڑا +

"آخر تم نے اپنے لکھ پتی شوہر سے کنارہ کیوں کیا؟" اس نے کریدنا چاہا -

"شومئی قسمت اور ناتجربہ کاری"

"اس اجمال کی تفصیل؟"

"فرامرز کی نخوتِ تموّل - حاسدوں کی رخنہ اندازی اور مجھ بدنصیب کی خامی!" وہ سر جھکائے نہایت حسرت دیاس سے کہہ رہی تھی "فرامرز کے تھیٹر میں زہرہ نامی ایک نوجوان لڑکی ہے جس کا ایکٹ اور گانا تمام دنیا کے لئے قابلِ ستایش اور میرے لئے باعثِ نفرت ہوا"

"کیا فرامرزجی اُس پر لٹّو ہو چلے تھے؟"

"مجھے یہ ہی باور کرایا گیا - اور ــــ اور اس یقین کے بعد ــــ آتشِ رقابت ــــ سوکنا پا ــــ کچھ نہ پوچھیئے ــــ میں نے تمام عزت وعیش پر لات ماردی" اُس کی آواز بھی متاثر معلوم ہوتی تھی +

"غالباً تم کسی کے بہکانے پر گھر چھوڑ بھاگیں؟"

"میں پہلے ہی تسلیم کرچکی ہوں کہ قصور میرا ہے"

"پھر اب اُس گھر میں جانے کی ہمت کیسی؟"

"ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل کی خواہش ــــ جنونِ محبت ــــ جذبۂ دیوانگی!"

"پھر مبہم جواب - آخر اس معمے کا حل - اس پہیلی کا مدعا؟"

"آپ کو اس کے معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟"

"وہی جو اِس قدر معلوم ہو چکنے سے - جب تم خود اس قدر ظاہر کرچکیں تو بقیہ کی تلاش مجھے پیدا ہوئی"

"آپ نہیں مانتے؟"

"اور نہ غالباً مان سکتا ہوں" ـــ نوجوان کو یقین تھا کہ اب زیادہ جرح کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس سوال کا جواب تمام غلط بیانی کا بھانڈا پھوڑ دیگا -

"اچھا تو سنئے! میں تموّل کو نہیں ڈھونڈتی - اپنی محبت کی آگ بجھانا چاہتی ہوں - میں گئی مگر

میرے جگر کا ٹکڑا یہاں رہ گیا۔ میرا پیارا بچہ نوروز آج پانچ برس ہوئے کہ مجھے دیکھنے کو نہ مل سکا۔ میں پونا۔ کراچی۔ حیدر آباد۔ اور کہاں کہاں ماری ماری پھری مگر نوروز کی صورت میری آنکھوں کے پردہ میں۔ میرے دل کے اندر۔ ہر جگہ میرے ساتھ تھی ــ " وہ یہ کہتے کہتے ایک لمبا سانس لینے کسی قدر ٹھہری "۔ اس پانچ سال کی مدت میں پچاس مرتبہ میں نے فرامرز کو لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی شکل دیکھ لینے دے۔ طرح طرح سے التجا کی۔ خوشامد کی۔ عاجزی کی۔ مگر اُس ظالم نے کبھی میری تحریر کا جواب نہ دیا۔ میں اسی آرزو میں بمبئی آئی اور عرصہ سے بھیک مانگ کر پیٹ پال رہی ہوں ــ صرف کل اُس نے میرے آخری خط کا جواب دیا اور اجازت دی کہ میں آج ۸۔ اور ۹ بجے کے درمیان رات کو۔ نوروز کو دیکھ سکتی ہوں! بس یہی میری آخری تمنا ہے"۔

"اور اس آخری تمنا کے لئے غالباً تم نے بھیک کی بجائے چوری کا پیشہ اختیار کیا؟" نوجوان نے پھر طنزاً کہا۔

"ہاں اسی دیوانگی میں ــــ کیونکہ ــــ میں فرامرز کی نخوتِ تمول کو پاش پاش کرنے ــــ اور ہاں ــــ اپنے لختِ جگر کی نظر میں ذلیل نہ معلوم ہونے کی خاطر ــــ مجبور تھی کہ اچھی پوشاک بہم پہنچاؤں ــ چند لمحوں کے لئے ــ چاہے آخری نتیجہ ــــ"

گاڑی بائیکلا کی ایک کوٹھی کی چار دیواری میں داخل ہوئی اور سلسلۂ گفتگو منقطع ہوگیا! اب ایک آنِ واحد میں نوجوان کے وسوسوں میں ایک بجلی سی چمک گئی کہ کہیں یہ عیارہ کسی جال میں پھنسانے کے لئے بولنے والی پلاؤ بٹیر۔ یا بہ الفاظِ دیگر، پھندیت، کا کام تو نہ کرتی ہو۔ اُسے قدرے وحشت ہوئی۔ مگر گاڑی برآمدہ کے سامنے رُک چکی تھی ــ حسن کی پتلی نہایت شان کے ساتھ اُتری اور اب نوجوان اُس کے پیچھے سایۂ دیوار بننے پر مجبور تھا۔ اندر اطلاع کی گئی اور ملازم نے باہر آکر حسن کی پتلی کو ادب کے ساتھ سلام کرتے ہوئے اندر جانیکا مژدہ سنایا!

بجلی کی روشنی سے معمور ڈرائنگ روم اور اس کا نہایت بیش قیمت سامان نوجوان کے مبہوت دل و دماغ کو اور زیادہ محوِ حیرت کرنے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھا۔ حسین بائی اور اسکے ساتھ نوجوان۔ دونوں ابھی کرسیوں کے پاس کھڑے ہی تھے کہ ایک پہلو کے دروازہ سے فرامرز جی، سیاہ سوٹ زیب تن کئے، ننگے سر کمرہ میں داخل ہوئے اور قریب پہنچتے ہی نوجوان کی اجنبی شکل کو کچھ اس نظر سے دیکھنے لگے گویا

اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "کون؟ ــــ تم؟ ــــ تم ہی ہو؟ ــــ اور تمہاری یہ جرأت؟" ان آنکھوں میں گھس جانے والی گہری نظروں سے نوجوان کو کسی قدر اختلاج قلب پیدا ہو چلا! حسین بائی نے درمیان میں حائل ہوتے ہوئے فرامرز سے فوراً خطاب کیا "میں تمہاری اجازت پر حاضر ہوئی ہوں"

"ہاں مجھے علم ہے" فرامرز کی زبان نے کہا مگر برابر نوجوان کو گھورے جانے والی آنکھیں کہتی تھیں "لیکن یہ کون؟ اس مداخلتِ بے جا کے کیا معنی؟"

"تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں ایفائے وعدہ کا تقاضا کروں" ریشمیں بائی نے پھر کہا "اور اپنے پیارے بچّہ کی شکل دیکھ لوں"

"کیا واقعی تم کو اُس کی شکل دیکھنے کی تمنّا ہے؟" فرامرز نے ایک طعن آمیز اور کسی قدر کرُیہہ آواز میں پوچھا۔

"تعجب ہے کہ پانچ برس کی متواتر التجا کے بعد بھی تم کو اس کا یقین نہیں"

"خیر! میرا یقین زیر بحث نہیں" فرامرز کے چشم و ابرو سے انتہائی سنگدلی اور غصّہ ظاہر ہو رہا تھا۔

"پھر تم پیارے نوروز کو بُلاتے کیوں نہیں؟ وہ کہاں ہے؟" حسین بائی بُری طرح مضطرب معلوم ہوتی تھی۔

"میں اُس کو نہیں بُلاؤں گا۔ تم خود اُس سے جا کر مل لو"

"کہاں جاؤں؟ وہ کدھر ہے؟" گھبرا کر حسین بائی نے پوچھا۔

"پہلو والے کمرے میں" فرامرز نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا!

"وہاں ہے!" حسن کی پُتلی بے چینی کے ساتھ جھپٹی "نوروز! پیارے نوروز!" پکارتی ہوئی وہ کمرہ کے دروازہ پر تھی اور نوجوان و فرامرز اُس کے پیچھے پیچھے! کواڑ کھولتے ہوئے اُس نے عین اضطراب میں فرامرز سے پوچھا "کیا اُس کو میرے آنے کا علم نہیں ہے؟ کیا تم نے اس کو اطلاع تک نہیں کی؟"

"مطلق نہیں! اب تم خود اُسکو بتا دینا۔ سب کچھ بتا دینا!" فرامرز نے اُسی سنگدلی کے ساتھ جواب دیا!

دروازہ کھُل چکا تھا اور حسن کی پتلی بے تابانہ اندر داخل ہو چکی تھی۔ ایک آنِ واحد میں حسن کی پتلی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی ــــ اب نوجوان بھی اندر تھا۔ ایک مسہری پر، جس کے سرہانے کئی مومی بتیّاں روشن تھیں، ایک معصوم بچّہ بیحس و حرکت دراز تھا۔ معصوم چہرے کے چشم و ابرو اور تمام جسم کا

انتہائی ڈھیلاپن بتارہا تھا کہ وہ جسم بےجان ہے ــ حُسن کی پتلی ایک چیخ کے ساتھ مسہری پر گرچکی تھی اور اُس کا سر معصوم جسم بےجان کے سینہ پر تھا ــ فرامرزا نتہائے اطمینان ومسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اے عورت! اب تو اپنے بچّہ کو دیکھ سکتی ہے! کیا یہ ممکن تھا کہ میں اپنے بچّہ کو اُس کی زندگی میں ایسی ذلیل ماں کا علم ہونے دیتا۔ کل اُس کی رُوح پرواز کرگئی اور کل ہی میں نے تجھ کو اجازت دیدی! آج مجھے مسرت ہے کہ میری آتش انتقام بُجھ گئی!" وہ اِس نظارہ سے محظوظ ہورہا تھا!!

مُصیبت زدہ عورت کا جسم تھرتھرایا۔ کانپا۔ ڈھیلا پڑا اور وہ بیہوش ہوکر مسہری سے نیچے گری! نوجوان اس تمام تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ بیہوش جسم کا زمین پر گرنا تھا کہ وہ بلا تامّل مزید جھپٹا بغلوں میں ہاتھ دئے ہلکے پھلکے جسم کو اُٹھایا اور اپنی آغوش میں زمین سے بلند کئے۔ کمرے ہی سے نہیں۔ کوٹھی سے باہر نکلا!

گاڑی بہت کچھ راستہ طے کرچکی تھی۔ جسم نازنیں نوجوان کی آغوش میں تھا۔ رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دماغ سے بیہوشی کو زائل کرتی جاتی تھی۔ اور ہ۔ اور نوجوان کا دل و دماغ ان غیرمعمولی واقعات سے بُری طرح متاثر ہورہا تھا! رفتہ رفتہ آفت زدہ نازنین ہوش میں آئی۔ نوجوان کہہ رہا تھا "ہشیار ہو! اب تم فرامرز کے قبضہ میں نہیں ہو ــ آنکھیں کھولو ــ دیکھو تم کہاں جارہی ہو؟"

"کہاں؟ ــ مجھے نہیں معلوم ــ ہاں! ــ تم؟ ــ تم مجھے لے جارہے ہو ــ کہاں؟ ــ ہاں یاد آیا ــ میری مہلت ختم ــ اب مجھے کچھ عذر نہیں!"

"تم کو اب تو کچھ عذر نہیں؟"

"قطعی نہیں! میں قید کے لئے نہیں، سزائے موت کے لئے تیار ہوں!"

"مگر میں قید کو ترجیح دیتا ہوں"

"مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں"

"تو پھر۔ آج سے ــ" نوجوان نے حُسن کی پتلی کو ہوش میں آجانے کے بعد پہلی مرتبہ آغوش میں لیا ــ میری قیدی ہو" ــ آغوش تنگ ہوتی چلی۔ . . . . ایک نئے احساس نے۔ متضاد اثر نے ــ حسین بائی کو چونکایا ــ وہ کچھ سُکڑنے لگی ــ اُس کی زبان سے نکلا "میں آپکا

مطلب نہیں سمجھی ؟"

"میرا مطلب ؟۔ بالکل صاف ہے ــــ میں تم کو قانونی شکنجہ میں کس کر سنگدل و جابر طبقۂ ذکور کی فہرستِ مظالم میں ایک نیا اضافہ کرنا نہیں چاہتا"

"یعنی ؟"

"یعنی !ــ" آغوشِ تنگ نے دو دھڑکنے والے دلوں کو متصل تر کر دیا ــــ کیفیاتِ قلبی نے زبان و بیان کی وساطت ترک کر دی ــــ نوجوان کے ایک بوسۂ گرم نے تمام پیغامِ قلبی ایک قلب سے دوسرے قلب تک من وعن پہنچا دیا ــــ اور ؟ ــــ اور خدا جانے کس طرح دونوں کو "من تو شدم تو من شدی" کا پورا یقین ہو گیا !

کیا بندِ محبت، قیدِ فرنگ سے زیادہ سخت انتقام نہیں ؟ــ آہ مرد !۔ خود غرض و قوی مرد !!

سلطان حیدر (جوش)

حُسن

حُسن کا بہترین حصہ وہ ہے جو تصویر ظاہر نہ کر سکے ۔ (بیکن)

حُسن زوال پذیر ہے لیکن نیکی ہمیشہ رہتی ہے ۔ (گوئٹے)

حسین چیز مفید بھی ہوتی ہے ۔ (رولتھ)

حُسن زود انجام ظلم ہے ۔ (سقراط)

اگر کوئی پھل کچا استعمال کیا جا سکتا ہے ، تو وہ حُسن ہے ۔ (انفدوسن کر)

صادق ایوبی

کنارِ چمن

(نظمِ بے قافیہ)

آہ وہ عہدِ سعید — آہ وہ دورِ فراغ
آہ وہ آرامِ زیست — آہ وہ لُطفِ حیات
آہ وہ صبح و مسا — آہ وہ لیل و نہار
آہ وہ شمس و قمر — آہ وہ ارض و سما
آہ وہ کیفیتیں — آہ وہ آزادیاں
ہر طرف آبادیاں — روح افزا وادیاں
شام و سحر شادیاں

ہاں وہ کنارِ چمن — حُسنِ بہارِ چمن
سبزے کی دلکش فضا — ہمسرِ باغِ بہشت
تا بہ حدودِ نظر — منظرِ باغِ بہشت
نکہتِ نسرین و گل — دوشِ ہوا پر سوار
برگ و بر و شاخ سے — فیضِ نسیم آشکار
روئے زمیں زرنگار — چرخِ بریں مشکبار
جلوۂ لیل و نہار

اور وہ پانی کا شور — اس کی روانی کا زور
گاہ اُچھلتا ہُوا — گاہ مچلتا ہُوا
گاہ پھسلتا ہُوا — سن سے نِکلتا ہُوا
دِل کو مسلتا ہُوا

لو وہ بجی بانسری — کیف برسنے لگا
ہوگئی آفاق میں — پریم کی گنگا رواں
دوڑ گئی ہر طرف — بن میں مسرت کی لہر
سبزۂ خوابیدہ بھی — کروٹیں لینے لگا
گوشِ مجسم بنا — عالمِ امکاں تمام
وادیٔ شاداب پر — ہوگیا طاری سکوت
عقل کا سب زور گم — عشق کے طوفان میں
طائروں کا شور گُم — بانسری کی تان میں
وجد کناں ہیں شجر — ہر خوشی کا راج ہے
چار طرف الغرض — خامشی کا راج ہے
آبِ رواں ہے خموش — بادِ وزاں ہے خموش
کوہِ گراں ہے خموش — چرخِ دواں ہے خموش
پیلِ دماں ہے خموش — شیرِ ژیاں ہے خموش
پیر و جواں ہے خموش — خورد و کلاں ہے خموش
یہ بھی یہاں ہے خموش — وہ بھی وہاں ہے خموش
سارا جہاں ہے خموش — کون و مکاں ہے خموش
گوپیاں مسحور ہیں — کام سے معذور ہیں
شاد ہیں مسرور ہیں — چُور ہیں مخمور ہیں
پاس ہیں یا دُور ہیں

پھر وہ سُنا بانسری — ہند میں لے شیام آ

دردِ زماں ہے ترا — شامِ سحر نام آ
پیس رہی ہے ہمیں — گردشِ ایام آ
ہندی محزوں کو دے — زیست کا پیغام آ
مایۂ آرام آ — دافعِ آلام آ
آ پھر اب اے شیام آ

نامعلوم

پہاڑی کوّا

بلند خشک سی ٹہنی پہ آہ کیوں بولا — فضا میں دفترِ فریاد تو نے کیوں کھولا
صدا ہے تیری کہ اک لہر ہے شکایت کی — یہ تیرا راگ ہے یا داستاں مُصیبت کی
بلا کا لہجۂ فریاد اس نوا میں ہے — کہ درد بول رہا ہر طرف ہوا میں ہے
ترا لباس ہے تصویرِ شکوہ ہائے حیات — بیانِ درد کو سمجھا ہے مدعائے حیات
یہ کیا حدیث سُنائی ستم کیا تُو نے — شکایتِ غمِ دل کا سبق دیا تُو نے
وہ مے ہے درد کہ نشہ ہے زندگی جس کا — جو پی گیا وہ ہراسِ اجل سے پاک ہُوا

تو اپنے دیس سے لایا ہے درد کی سوغات — یہ جنس عام ہے جس جا بھی ہے نشانِ حیات
بلندیوں کی کوئی داستاں سُنا مجھ کو — سراغ اونچے پہاڑوں کا کچھ بتا مجھ کو

شام موہن لال جگر بی۔اے
نائب تحصیلدار

شاعر

شاعر صرف خواب دیکھنے والا شخص نہیں، اس کا دل دنیا کے جذبات کا آئینہ ہے۔ اس کے نغمے دُنیا کے قہقہوں کی گونج ہیں۔ اور اس کے نوحے انسانیت کے آنسو ہیں *

(سروجنی نیڈو)

اشتراکیت عہدِ قدیم میں

ماہرینِ اقتصادیاتِ سرمایہ کو ابتدائے آفرینش سے اِنسان کی زندگی کا لازمہ بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ قرونِ ماضیہ کے رسم ورواج کے متعلق صحیح معلومات سے بہرہ ور نہیں۔ ورنہ آج کل بھی ایسی وحشی اقوام موجود ہیں۔ جو زمین کی ذاتی ملکیت تو کجا، قومی ملکیت کے نام سے بھی واقف نہیں۔ یہ ایک کھُلا ہوُا راز ہے۔ کہ اشتراکیت کی دنیا سرمایہ داری کی دُنیا سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ تمام محققین متفق الرائے۔ اور متحد الخیال ہیں۔ کہ بنی نوعِ اِنسان کے اوّلیں نشو و ارتقا کے زمانہ سے اشتراک ہی انسان کا اقتصادی اور معاشرتی دستور العمل رہا ہے۔ اور آجکل بھی افریقہ آسٹریلیا اور بعض دیگر ممالک کے قدیم باشندے اشتراکیت کے اسی عہدِ کہن کی یادگار ہیں۔ قدیم زمانہ کے لوگ قبیلوں میں رہتے تھے۔ کوئی شخص اپنے وجود کو قبیلہ سے الگ نہ سمجھتا تھا۔ قبیلہ ایک جسم تھا۔ اور افراد اس کے اعضا تھے۔ اِن لوگوں کی بسرِ اوقات شکار پر تھی۔ جس کے لئے وہ نہایت سادہ ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ ہر شخص کو حق حاصل تھا۔ کہ ان ہتھیاروں کو کام میں لائے۔ ذاتی یا شخصی ملکیت جو ایک شخص کو دوسرے شخص پر اقتصادی تفوق دلانے کا باعث ہو سکے بالکل مفقود تھی۔ خوراک اور دیگر ضروریاتِ زندگی میں ہر شخص برابر کا حصّہ دار تھا۔ اس کی تقسیم کے لئے سرمایہ محنت یا قابلیت وغیرہ کی بجائے بقائے حیات انسانی کا حق معیار تھا۔ جس طرح ماں باپ اپنے بچّوں کی خوراک کے کفیل ہیں۔ اسی طرح قبیلہ ہر فرد کی روزی کا ذمہ دار تھا۔ قبیلہ کے تمام مرد مل کر شکار کرتے تھے۔ اور اس وقت تک واپس نہ آتے تھے جب تک کہ ہر شخص کو اس کا حصہ نہ مل جاتا تھا۔

بہرحال اس زمانہ کو ہم ارتقائے انسانی کا مطمح نظر نہیں بنا سکتے۔ اس زمانے میں ایک قبیلہ کی تمام عورتیں دوسرے قبیلہ کی بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔ مردم خواری اس زمانہ میں بالکل معمولی بات تھی۔ گوشت درکار تھا۔ اسلئے ایک انسان دوسرے کو بلاتکلف مار کر کھا لیتا تھا۔ ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلہ کے لوگوں کو مار کر کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔

نوعِ اِنسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ مردم خواری کی رسم مٹتی گئی۔ اور اس کی جگہ جانوروں اور مچھلیوں وغیرہ کے شکار نے لے لی۔ لیکن اس زمانہ میں بھی ضروریاتِ زندگی کی تقسیم انہیں اصول پر مبنی رہی۔ جن کا ذکر اوپر

ہو چکا ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد لوگوں نے اپنی ضروریات کے لئے جانوروں کو پالنا شروع کیا۔ اس زمانہ کی زندگی خانہ بدوشی کی زندگی تھی۔ جہاں جانوروں کے لئے گھاس اَور چارہ اور پانی وغیرہ ملتا تھا۔ وہاں یہ لوگ اقامت اختیار کر لیتے تھے قبیلہ ہر شخص کی ضروریات کا ذمہ دار تھا۔ اس زمانہ سے پہلے انسان کے لئے جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنا نہایت مشکل تھا۔ نہ صرف مردوں کو بلکہ عورتوں کو بھی نہایت سخت کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب لوگ زمین کے استعمال سے واقف ہو گئے۔ بہت سی مشکلات آسان ہو گئیں۔ مگر اس زمانے میں بھی زمین ذاتی ملکیت نہ ہوئی۔ ہر شخص زمین کے استعمال کا مجاز تھا۔ اگر قبیلہ کا ایک شخص مصیبت میں ہوتا تو باقی سب کا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کی حالت اچھی ہوتی تھی۔ تو باقی سب بھی خوشحال ہوتے تھے کسی شخص کو دوسرے پر اقتصادی فوقیت حاصل نہ تھی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اشتراکیت کے نظام کے ماتحت نئی ایجادات نہیں ہو سکتیں۔ اور اس لحاظ سے اشتراکیت تہذیب و ترقی کے لئے سنگِ راہ ہے۔ ایجادات لوگ اسی لئے کرتے ہیں کہ مالی فائدہ اٹھائیں۔ جب اسی کے وہ حقدار نہ رہینگے۔ تو پھر ایجاد کا شوق بھی مفقود ہو جائیگا +

ممکن ہے۔ کہ آجکل کے تہذیب یافتہ انسان ایسے ہی خود غرض ہوں۔ لیکن اشتراکیتِ قدیم کی تاریخ صاف بتا رہی ہے۔ کہ اس زمانہ میں بھی ایجادیں ہوئیں۔ جن کے موجدوں کو نہ خواہش مال و زر تھی نہ ہوس نام و نمود۔ اُن کی ایجاد سے ہر شخص فیضیاب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انکی ایجاد تمام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہوتی تھی۔ وہ کسی سرمایہ دار کی زراندوزانہ حکمتِ عملی کے لئے دامِ حرص و آز کا کام نہ دیتی تھی۔ اس زمانے میں نئی چیزیں ایجاد کرنا نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ اُن لوگوں کے سامنے موجودہ زمانے کیطرح اپنے پیشرووں کی مثالیں موجود نہ تھیں جنکے نقشِ قدم پر وہ چل سکتے۔ ناموری کا شوق بھی انکی ہمت بڑھانے کے لئے موجود نہ تھا۔ چپہ چپہ پر اُن کے لئے ہزاروں شکوک و شبہات تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان برہنہ خانہ بدوش لوگوں نے کب کپڑے کا استعمال سیکھا اور اسکے لئے انہوں نے کیا کیا مصائب برداشت کئے۔ کب انہوں نے مٹی سے مکان بنائے۔ کب انہوں نے آگ جلانا سیکھا۔ ہم ان سب طریقوں کے موجدوں کے نام تک سے واقف نہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہی وہ پہلے قدم تھے جو انسان نے ایجاد و اختراع کی طرف بڑھائے اور موجودہ تہذیب بھی اپنی حیرت انگیز ایجادات کے لئے انہیں وحشیوں کی ممنون احسان ہے +

اس سے بھی زیادہ تحیر افزا وہ ترقی ہے۔ جو اِن لوگوں نے زراعت میں کی تعجب ہے۔ کہ یہ غیر مہذب لوگ جو بچوں کی طرح ہر چیز کو فقط منہ میں ڈال لینا جانتے تھے۔ کس طرح پہلے پہلے یہ بات سمجھے۔ کہ دانہ کو زمین

میں بو دیں اور پھر مہینوں انتظار کیا کریں۔ کہ فصل پکے اور کاٹ کر کھائیں۔ بہرحال ہم انہیں کتنا ہی غیر مہذب اور ناتربیت یافتہ کیوں نہ سمجھیں اس امر کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس زمانہ میں موجودہ تہذیب و تمدن کے دور کی طرح کوئی شخص ضروریاتِ زندگی کیلئے کسی دوسرے شخص کا شکوہ گزار نہ تھا۔ ہر شخص کو ہر چیز سے برابر کا فائدہ اُٹھانیکا حق حاصل تھا۔ اِس زمانہ میں ہزاروں ایجادیں ہوئیں لیکن چونکہ وہ دماغِ انسانی کی متفقہ کوشش سے بنی نوعِ انسان کے متحدہ مصرف میں آنیکے لئے بنی تھیں۔ اسلئے آج ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ فلاں چیز کس نے ایجاد کی اور کب ایجاد کی۔ جنگ اور شکار کیلئے تیر اور تفنگ کی ایجاد، مچھلیاں پکڑنیکے لئے جال، بنسی اور بھالے کی ایجاد، تن ڈھکنے کیلئے رُوئی سے کپڑا بُننے کی ایجاد اور مٹی سے برتن بنانا وحشی جانوروں کو سدھانا یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ انکے بغیر انسان موجودہ ترقی کی طرف قدم نہ اُٹھا سکتا تھا آجکل یہ سب چیزیں ہمیں نہایت سادہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے، تو یہ ایجادیں موجودہ زمانہ کی بہ نسبت زیادہ وقت لیکر زیادہ محنت و کاوش کے بعد ہوئیں کیونکہ انسان کو اس زمانہ میں قدرت پر کوئی دسترس حاصل نہ تھی، نہ وہ گزشتہ معلومات سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا +

اسی طرح دریاؤں پر قدرت حاصل کرنیکے لئے ان لوگوں نے کشتی چپو اور بادبان وغیرہ دریافت کئے۔ لیکن یہ سب چیزیں قبیلہ کے مشترکہ استعمال کیلئے تھیں، تعجب ہے کہ آجکل کے تہذیب یافتہ لوگ یہ سمجھیں کہ سوائے خود غرضانہ فائدہ کے خیال کے اور کوئی چیز ایجاد پر انسان کو آمادہ نہیں کر سکتی۔ اور نام و نمود ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر انسان مرتا ہے حالانکہ موجودہ علوم و فنون کی طرف پہلے قدم ان لوگوں نے اُٹھائے۔ جنکی نسبت آج ہمیں کوئی علم نہیں، کہ وہ کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے اِن لوگوں کو ذاتی فائدہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ افراد تو کہیں رہے قبیلے بھی جہانتک کہ زمین کا تعلق ہے ذاتی ملکیت کے نام سے واقف نہ تھے۔ زمین پر مشترکہ کاشت ہوتی تھی +

اس زمانے سے لیکر جب لوگ پھول پھل کی تلاش میں جنگلوں میں آوارہ پھرتے تھے۔ اس زمانے تک، جب لوگ زمین اور آلات وغیرہ کے استعمال سے واقف ہوگئے۔ اور تہذیب و تمدن کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ مشترکہ کام۔ مشترکہ جائداد، آلات کا مشترکہ استعمال اور پیداوار کی مشترکہ تقسیم یہ سب باتیں عام تھیں۔ غرض کہ اشتراکیت ہی کا دور دورہ تھا۔ سرمایہ داری کا نظام صرف دو تین ہزار سال سے معرضِ عمل میں آیا ہے۔ اور اس کے عیوب و نقائص کی ایک دُنیا شاکی ہے +

حامد علی خاں

سوختہ ساماں

نسیم کی شادی کے بعد اُس سے ملنے کا آج پہلا موقعہ تھا۔ دسمبر کے آخری عشرہ میں بصد اصرار، خط پر خط لکھ کر میں اُسے اپنے یہاں بُلانے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ وہ دہلی چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اور آخر بڑی مشکلوں سے آیا بھی تو اس وعدہ پر کہ وہ تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکیگا۔ میں نے اسی مختصر صحبت کو غنیمت جانا۔ دوستوں سے چھُٹ کر میں پیوستہ تنہائی اور مسلسل عزلت سے تنگ آگیا تھا۔ اب میری یہ حالت تھی کہ میں ہر ممکن الحصول نشاط آفریں ساعت کی تلاش میں رہتا تھا جو چند لمحوں کی عشرت کے عوض میں خواہ مجھ سے مہینوں کا آرام چھین لے۔ میں اپنی جذباتی کمزوری اور حافظ کی تکلیف دہ تیزی سے بھی اچھی طرح واقف تھا میں جانتا تھا کہ برسوں کی مفارقت کے بعد کسی دیرینہ حبیب سے چند گھنٹوں کی ہنگامہ خیز ملاقات اُس وقت کے لئے تو یقیناً مجھے وقفِ مسرت کردیگی مگر بعد میں میرا حال بھی اُس بدبخت شرابی کا سا ہوگا جو تمام رات نشے میں گذار دینے پر علی الصبح اپنی وہی کیفیتِ خمار برقرار رکھنے اور گذشتہ تلخکامیوں کو بھول جانیکے لئے پھر شراب مانگتا ہے لیکن نہ ملنے پر ایک جاں گُسل حالتِ مذبوحی میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ نسیم سے مجھے بے حد محبت تھی۔ اگرچہ فارغ التحصیل ہونے سے قبل ہی چند مجبوریوں کے باعث مجھے کالج کو خیرباد کہنی پڑی تھی۔ مگر میرے اُس بے وقت انقطاعِ تعلیم نے ہمارے آئندہ دوستانہ مراسم پر کوئی ناگوار اثر نہ ڈالا تھا۔

نسیم نے حال ہی میں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ کی آخری سند حاصل کرکے دہلی میں وکالت شروع کی تھی۔ قدرت نے اُسے حُسنِ ظاہری و باطنی عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ اپنے حلقۂ احباب میں ایک خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ نسیم کی زندگی کا جدید ترین دور اُن دلفریبیوں سے حقیقی طور پر آشنا ہوچکا تھا جنہیں اُسکی حق شناس نگاہیں ابتک صرف تخیل ہی کے زور سے محسوس کرنے کی عادی تھیں۔ وہ ازل سے ایک حساس دل اور شاعرانہ دماغ لیکر آیا تھا۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچا اُسکی زندگی میں ایک لطیف تبدیلی پیدا ہوچلی تھی۔ اب اُسکی باتوں میں۔ تحریر میں۔ روزانہ مشاغل میں حتیٰ کہ اُسکے خدوخال میں شعریت کا عنصر غالب نظر آنے لگا تھا۔ لیکن یہ امر کہ مراحلِ زندگی طے کرنے میں کسی حسین، نوجوان، اور بامذاق عورت کی شرکت ہمارے دماغوں کو کس درجہ خیالات کو کتنا

وسیع، اور جذبات کی چھپی ہوئی خوشگوار راہوں کو کیونکر واضح کر دیتی ہے، اُس پر اپنی حیاتِ ازدواجی ہی کے ذریعہ سے روشن ہوا۔ اس لئے اگر وہ اب اپنی فرحت سے (جسکے متعلق وہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں بڑے مزے لے لیکر اور خاص کیف کے عالم میں ذکر کیا کرتا تھا) ملکر اور ایک طبعی خمار میں مدہوش ہو کر ہم سب کو بھول جاتا تو چنداں قابلِ ملامت نہ تھا۔ میں نے بھی ظلم کیا کہ اُسے زبردستی سے دہلی سے بلالیا۔ لیکن کیا کرتا مجھے بھی اس بات کا جنون تھا کہ دیکھوں کنوارے اور بیاہے نسیم میں کتنا فرق ہے +

شام کا وقت تھا، اور سخت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کمرے کے دروازے بند کر کے پردے چھوڑ دئے گئے تھے۔ ہم سب آتشدان کے قریب کرسیوں پر بیٹھے آگ تاپ رہے تھے نسیم کے ساتھ اُسکا نیا دوست شیروان جی بھی آیا تھا۔ شیروان جی سے میرا تعارف دہلی میں نسیم کی شادی کے موقع پر ہوا تھا۔ اُس وقت مجھے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ "مسٹر شیروان دہلی کے کاروباری حلقوں میں بڑا نام رکھتے ہیں"۔ یہ ایک پارسی نوجوان تھا جس کی عمر تیس سال سے کسی صورت میں متجاوز نہ تھی۔ مگر بعض موقعوں پر شاید اُسکے اندرونی اضطرار کا اثر پڑتا، یا کیا، کہ اُسکا چہرہ پُرشکن ہو جاتا اور آنکھیں اندر کی طرف گھس جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں وہ اپنی اصلی عمر کی بہ نسبت بہت بوڑھا نظر آتا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ میرا مخاطب زیادہ تر نسیم ہی تھا اور موضوعِ کلام اُسکی نئی زندگی اور اُسکا بھی جزوِ غالب اُسکی بیوی۔ میں محض شرارت کے طور پر اُسے دق کرنیکے لئے کہہ رہا تھا کہ "دیکھو نسیم تمہاری حیاتِ جدید کتنی ہی پُرلطف کیوں نہ ہو۔ اُسکی رنگینیاں ہزار جاذبِ دل و دماغ کیوں نہ ہوں لیکن اُسکا دائرہ بہت محدود ہے۔ تم لٹو کی طرح کبتک ایک ہی نقطہ پر گھومتے رہو گے؟۔ یاد رکھو ایک قسم کے ذائقہ سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ جبتک اپنی مصروفیتوں میں جدت پیدا نہ کرو گے تمہارا انداق یکساں ہمواری اور مرگ آور خاموشی سے اُکتا کر یا تو ان مصنوعی قیود کو توڑ دیگا اور یا اُس بوجھ کے اندر دب کر اپنے جوہرِ اصلی ہی کو فنا کر لیگا۔ دوستوں کی صحبت زندگی کو تر و تازہ رکھنے کا ایک مجرّب نسخہ ہے۔ ہمکو کبتک فراموش کئے رہو گے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں پرسوں، ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہو گا"۔

وہ میری اس چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر بولا "بس اب رہنے بھی دو۔ تمہیں تو یہی باتیں سوجھتی ہیں، اور سب کچھ بھول بھال گئے۔ ہمارے دوست شیروان جی کی طرف دیکھو۔ انہوں نے کبھی بھولے سے بھی اس مسئلہ پر لب کشائی نہیں کی حالانکہ میری انکی ملاقات ایک مدت سے ہے۔ جب بھی ملتے ہیں

ہنسی مخول سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر یہ گفتگو تم ہی تک محدود ہے"

میں نے شیرواں جی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش، فرش پر نظریں جمائے، انگیٹھی کے بجھے ہوئے کوئلوں کو اپنے بوٹ کی نوک سے آہستہ آہستہ ٹھکرا رہا تھا۔ لمپ چونکہ اسکی پشت پر تھا۔ اس لئے اسکی ناکافی روشنی میں مجھے اُسکا چہرہ دھندلا سا نظر آتا تھا۔ میں نے بلند آواز میں کہا "شیرواں جی آپ نے سُنا نسیم کیا کہہ رہا ہے" اُس نے آہستہ سے گردن اُٹھائی۔ میں نے دیکھا اُسکی آنکھوں میں آنسو تو نہ تھے مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رو دیا چاہتا ہے۔ اُسکے چہرہ کے تمام نقوش پر ایک ناقابلِ بیان حسرت ادا اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اُسکی یہ بے موقع اندوہناک حالت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ نسیم بھی یہ سب کچھ تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اِس سے پیشتر اپنے دوست کی ایسی کیفیت دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شیرواں نے ایک کمزور سا بناوٹی تبسّم، جس نے اُسکے مُرجھائے ہوئے چہرہ کی پژمردگی کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا، لبوں پر لاتے ہوئے جواب دیا "ہاں میں نے آپ دونو کی باتوں کو اچھی طرح سُنا نسیم صاحب صحیح کہتے ہیں۔ میں نے کبھی اُن سے اس موضوع پر بحث نہیں کی۔ اگرچہ اس نوع کی گفتگو کے لئے میرے پاس کافی سے زیادہ مواد ہے" اتنا کہکر وہ کھویا سا گیا۔ گویا آخری فقرہ میں وہ بہت کچھ کہہ گیا تھا جسے پوشیدہ رکھنا ہی وہ مناسب خیال کرتا تھا۔ اب اُس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے اور بات کو ہنسی میں ٹالنے کی غرض سے اک پُرزور قہقہہ لگایا۔ لیکن آواز کا بودا پن صاف کہے دیتا تھا کہ اس وقت خوش طبعی اُس سے کوسوں دور تھی۔ اس دوران میں گفتگو کا اصلی عنوان میرے ذہن سے بالکل اُتر گیا۔ بے اختیار میری توجہ شیرواں کی طرف مبذول ہونے لگی۔ چند منٹ تک تو سکوت رہا۔ لیکن یہ خاموشی ہمارے خلجانِ دماغی کو اور بڑھا رہی تھی۔ شیرواں جی کی نگاہیں پھر زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کی پتلی پتلی اُنگلیاں ایک دوسرے میں ڈال ڈال کر زور سے دبا رہا تھا۔ اُسکے چہرہ کا رنگ اب سُرخی مائل ہو رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا دل و دماغ کسی تیز جذبہ کا شکار ہو رہا ہے۔ نسیم نے میری طرف دیکھا گویا اشارہ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ میں نے اپنی کُرسی کو اُسکے قریب کر کے کہا "شیرواں جی آپکی طبیعت تو اچھی ہے؟ یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو کیا ہو گیا؟ اگر کوئی خاص تکلیف ہو تو ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں"

"نہیں" اُس نے اپنی آنکھوں کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے جواب دیا "کوئی تکلیف نہیں۔ محض

ایک خیال آ رہا تھا"۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ معاملہ بہانہ سازی کی حد سے گذر چکا تھا، اور ساتھ ہی اُسکے بشرے سے ندامت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ گو یا وہ افسوس کر رہا تھا کہ اُس نے سخت غلطی کی کہ مغلوب الجذبات ہو کر ہم پر حقیقت منکشف کر دی۔ شیروان کی مزاج میں یہ فوری تغیر ہوتا دیکھ کر ہم بیحد متعجب ہو رہے تھے۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ بھی نظر نہ آتی تھی۔ کہ وہ یوں یکایک مضمحل و پریشان ہو جاتا اگرچہ وہ اپنی اس اُلجھن پر پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کر رہا تھا مگر اُسکی ہر حرکت یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہو نہ ہو کوئی بھولا ہوا غم یاد آ کر اُسکے دل کے کسی زخمی حصّہ کو ٹھیس لگا گیا تھا۔ مجھ سے چونکہ اُس کی شناسائی بہت قلیل عرصہ سے تھی اور میں اُسکی عادات سے زیادہ واقفیت بھی نہ رکھتا تھا اس لئے اُس کی ہر بات مجھے اک راز سا معلوم ہو رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پھر پوچھا "اگر آپ اسے دخل در معقولات تصور نہ فرمائیں تو میں اتنا ضرور عرض کر دونگا کہ آپکی اس بے محل افسردگی نے ہمیں بھی افسردہ خاطر کر دیا ہے۔ مجھے تو یاد نہیں کہ اس وقت ہمارے درمیان کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آپ کے مزاج کی برہمی کا باعث ہو۔ لیکن اگر سہواً کسی کلمہ سے آپکے جذبات کو صدمہ پہنچا ہے تو آپ بلا تکلف اپنی بے چینی کا اظہار کر دیجئے۔ ہر دُکھ کا مداوا ممکن ہو سکتا ہے"۔

نسیم بھی بولا "ہاں ہاں، شیروان جی، ناصر بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ آپ کیوں نہیں اپنی تکلیف بیان کر دیتے؟ ہم سے کس بات کا پرہیز ہے؟ خدا شاہد ہے آپکی پریشانی نے میرے دل میں ہزاروں وسوسے پیدا کر دیئے ہیں"!

کچھ دیر خاموشی رہی۔ شیروان کی آنکھیں ایک غیر معمولی روشنی سے چمکنے لگیں۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیکر بولنا شروع کیا "پیارے نسیم! میں صرف تمہاری وجہ سے خاموش تھا۔ میں نے آجتک تم سے اپنی رام کہانی نہیں کہی۔ میں ڈرتا تھا کہ میری داستان جو سراسر اک داستانِ حزن و ملال اور میرا قصّہ جو یکسر اک قصّہ غم و اندوہ ہے، کہیں تم پر بھی ویسا اثر نہ ڈالدے۔ اور میں "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کا مصداق نہ ہو جاؤں خدا کرے تمہیں اپنی نئی زندگی مبارک ہو۔ اُس کی پُر شباب بہاریں تم اچھی طرح منا سکو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ بہار ویسی ہی پرفریب اور عارضی ہے جیسا کہ بستر مرگ پر اس مریض کا سنبھالا جو مرنے سے چند لمحے پیشتر تندرست و توانا نظر آنے لگتا ہے۔ اور حواس باختہ، نادان تیماردار یہ حالت دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کہ اب وہ اچھا ہو گیا، انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ چشم زدن میں موت کا آخری وار اُس بیمار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے اُنکی فریب خوردہ مسرتوں کو فنا کر دیگا۔ میں اس خواب سے بیدار ہو چکا ہوں جس کے تم آج مزے لے

رہے ہو۔ اور حق بجانب ہونگا اگر یہ کہوں کہ اُس کی تمام خوشیاں مصنوعی اور آرزوئیں ہلاکت خیز نکلیں ہیں نے بھی اپنے گرد پریوں کو رقص کرتے دیکھا ہے۔ مجھے بھی زمین و آسمان ایک نظرفریب حسین رنگ میں ملبوس نظر آئے ہیں۔ میں نے بھی حُسن کی کرشمہ سازیاں اور عشق کی جانسپاریاں جی بھر کے دیکھی ہیں لیکن آہ کیونکر کہوں کہ

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھُل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

ناصر صاحب" اب وہ میری طرف مخاطب ہوا تھا "میری سرگذشت بہت طویل ہے جسکا اعادہ سوائے رنج و کلفت کے اور کچھ نہ دیگا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپکی جمعیتِ خاطر کو بھی خراب کردں، اس لئے بہتر ہوگا کہ یہ قصہ یہیں ختم کردیا جائے"۔

میں نے جواب دیا "حقیقت یہ ہے کہ آپکی اس تمہید نے میرے اشتیاق کو اور تیز کردیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس قصہ کو ادھورا چھوڑدں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ غم کا اظہار غم کے اصلی بار کو کس قدر ہلکا کردیتا ہے اور ممکن ہے کہ یہ خیال ہی آپکے لئے باعثِ تسلی ہو کہ آپ نے اپنا دُکھڑا ایک ایسے ہمدرد کے گوشگذار کیا ہے جو ہر طرح آپکی مدد و دلجوئی کرکے آپکا شریک رنج و غم ہونے پر آمادہ ہے"۔

"میں آپکی ہمدردی کا ممنون اور شرافتِ نفس کا مداح ہوں۔ لیکن یہ کہ آپ میرے رنج و غم میں شریک ہوں آپ کے بس کی بات نہیں۔ ماضی کو میں ہمیشہ کے لئے دفن کرچکا ہوں لیکن کمبخت حافظہ ایسا ہے کہ کبھی نہ کبھی اُس دَورِ گذشتہ کی ورق گردانی کرہی لیتا ہے۔ آپکی آج کی گفتگو نے پھر اُسی بھولے ہوئے سلسلہ کی منتشر کڑیوں کو برقی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں اکٹھا کردیا"۔

کچھ دیر توقف کرنیکے بعد اُس نے اپنی جیب سے سگرٹ کیس نکال کر ایک سگرٹ روشن کیا۔ دو تین لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کچھ دیر دھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اور پھر یوں گویا ہوا۔ "میرا وطنِ مالوف کراچی ہے جہاں میں نے اپنا بچپن اور شباب کا ابتدائی حصہ، وہ حصہ، جو بدنام کرنے آیا تھا بدنام کرگیا، بسر کیا۔ میرے والد خدا انہیں مغفرت کرے، ریشم کے سوداگر تھے اور اُن کا کاروبار بہت وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے۔ میری تعلیم و تربیت میں بھی انہوں نے بہت غور و خوض سے کام لیا تھا۔ چونکہ میں چھوٹی ہی عمر میں والدہ کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا اس لئے میری کل محبت کا مرکز میرے والد ہی تھے۔ باوجودیکہ ہماری قوم کو ایران سے نکلے

صدیاں گذر گئی ہیں لیکن میرے والد ہمیشہ ایران ہی کو اپنا اصلی وطن سمجھا کئے۔ انہیں ایرانی تہذیب و تمدن سے بہت لگاؤ تھا اور عام پارسیوں کو مغربی طرز پر بود و باش اختیار کرتے دیکھ کر وہ بہت تاسف کیا کرتے تھے۔ فارسی زبان کے تو وہ عالم تھے اور یہ اُنہی کا فیضِ صحبت تھا کہ مجھے بھی لڑکپن سے فارسی اور اردو ادبیات کا شوق پیدا ہُوا۔ میں نے بیس سال کی عمر میں بمبئی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی اور ابھی میرا قوی ارادہ تھا کہ تعلیم جاری رکھوں گا کہ اچانک موت کے ناگہانی حملہ نے مجھ سے میرا شفیق ترین سرپرست قیامت تک کے لئے چھین لیا۔ میرے والد ہیضہ کے وبائی مرض میں چند گھنٹے مبتلا رہ کر چل بسے۔ اس حادثۂ جانکاہ نے میرے پرخچے اُڑا دئے۔ میرا مستقبل بالکل تاریک اور بھیانک ہو گیا تھا۔ میرے خیالات پر مایوسی ہی مایوسی چھائی ہُوئی تھی۔ والد کی موت نے مجھے اس کارگاہِ عالم میں بالکل یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔ اب میں حیران تھا۔ کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ مجبوراً مجھے تعلیم کے محبوب مشغلہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ مجھے تجارتی معاملات سے بہت کم اُنس تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے کبھی بھی والد کی زندگی میں اپنے کاروبار کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ لیکن اب میرے سوا اس کام کو سنبھالنے والا اور تھا بھی کوئی نہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اپنی طبیعت پر جبر کیا اور صبر و شکر کے ساتھ نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا وقت اور کام غم کی سب سے بڑی دوا ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی نئی مصروفیتوں سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میرا دل جو رنج والم اور بادِ مخالف کے تھپیڑوں کے باعث ہمیشہ ایک طوفانی کیفیت میں گرفتار رہتا تھا۔ اب مبدل بہ سکون ہوتا نظر آتا تھا۔ عرصہ گذر گیا اور میں اپنے ماحول سے بالکل مانوس ہو چکا تھا۔ میری زندگی ایک ہی رنگ میں گذر رہی تھی کہ یکایک اُس کی ہموار سطح پر ایک طوفان نمودار ہُوا جس نے میرے سفینہ حیات کے بادبان کو توڑ پھوڑ کر رکھدیا اور میں ایک مرتبہ پھر آوارۂ سیلِ زمانہ ہو گیا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، یا یوں کہئیے جب سے میں زندگی کے اُس پُرخروش حصّہ میں جسے شباب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں داخل ہُوا تھا۔ مجھ میں کوئی خاص قابلِ ذکر تبدیلی پیدا نہیں ہُوئی تھی۔ سُنا کرتا تھا کہ انسانی زندگی کا یہ وقفہ عجیب و غریب سحر آفرینیوں سے لبریز ہے مگر مجھ پر تو ابتک اُنکا کوئی اثر نہ ہُوا تھا۔ دوکان کے کاروبار سے جو وقت بچتا میں کتابوں کی نذر کر دیتا تھا کیونکہ ابھی تک شوقِ مطالعہ بدستور مجھ میں موجود تھا اور تضیعِ اوقات کو میں ہمیشہ کی طرح اب بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اِس دوران میں کراچی میں ایک تھیئٹریکل کمپنی آئی۔ یوں تو آئے دن اُس جگہ کھیل تماشوں کا ہجوم رہتا تھا مگر اُس تھیئٹر کی آمد نے تو

وہاں کی فضا میں ایک تہلکہ برپا کردیا۔ چند ہی تماشے دکھا کر کمپنی والوں نے کراچی کی کل خلقت کو اپنا گردیدہ کرلیا۔ میں بھی سنتا تھا کہ وہاں سامعہ و باصرہ نواز لذات کے سامان بافراط جمع ہیں مگر ابھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہُوا تھا کہ ایک شام میرے دوست کھینچ کر مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ میں نے انکار کیا تو کہنے لگے آؤ آج تمہیں ایک پری دکھائیں جسکی ایک جھلک تمہیں دنیا و مافیہا سب کچھ بھلا دے گی۔ مَیں اُن کی باتوں کو مبالغہ سمجھتا تھا مگر دل میں شوق گدگدایا کہ دیکھوں وہ پری کون ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم تھیٹر پہنچے اور تماشا شروع ہُوا۔ میرے تمام دوست ایک ایکٹرس کی تعریف میں رطب اللسان تھے میں بھی حیران تھا کہ وہ کونسی ایسی جنت کی حور ہے جس کا اتنا چرچا ہو رہا ہے کہ یکایک لوگوں پر خاموشی چھا گئی۔ تمام شور و غوغا ختم ہو گیا۔ سب کی نگاہیں بے تابانہ اسٹیج پر پڑنے لگیں اور دفعتاً یوں معلوم ہُوا کہ نور کی ایک خیرہ کن شعاع سامنے سے گزر گئی ہے۔ ایک انسانی ہستی جو سر سے پاؤں تک سراسر نور ہی نور تھی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ میرے دوست نے چپکے سے میرے کان میں کہا "یہی مس کامنی ہیں"۔ یہ ایک نوجوان لڑکی تھی جسکی عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی۔ اُسکا حُسن انسانی تعریف سے بالاتر تھا۔ لُغت کے کُل الفاظ استعمال کر دینے کے بعد بھی اُسکے حُسن کی تعریف مکمل نہ ہو سکتی تھی میں آپ سے سچ کہتا ہوں میں نے کامنی کا سا سریع التاثیر حسن اور کہیں نہیں دیکھا۔ چند منٹ میں اُس نے مجھ ایسے بے حس و منجمد انسان کی کایا پلٹ دی۔ اُس کی نگاہوں میں ایک جادو تھا۔ اُسکی آنکھوں سے ایک ایسے تیز جذبہ کا اظہار ہو رہا تھا کہ میں اُنکے سامنے پسا جاتا تھا۔ میری رُوح، دل، دماغ سب ایک نامعلوم کُہر میں تحلیل ہو رہے تھے اور نظریں بے اختیار اس منوّر چہرہ پر جمی ہُوئی تھیں جس کی جلوہ پاشیوں نے ہزاروں انسانوں کو دم بخود و مبہوت کر رکھا تھا۔ رات کے دو بجے کھیل ختم ہُوا اور ہم واپس گھروں کو لوٹے۔ اُس رات میں مطلق نہ سو سکا۔ میں اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کرتا رہا۔ زندگی کا کوئی نیا پہلو مجھ پر روشن ہو رہا تھا۔ میرے دل کی بعض چھپی ہُوئی حسّیات جنہیں میں آج سے پیشتر بالکل نہ جانتا تھا، مجھ پر ظاہر ہو رہی تھیں۔ میں اپنی روح میں ایک عجیب سی کمی محسوس کر رہا تھا۔ نسوانی حسن کا شعبدہ اس سے قبل دیکھنے کا مجھے کبھی اتفاق نہ ہُوا تھا۔ مجھے عورتوں کی صحبت بالکل میسر نہ آئی تھی۔ بچپن میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ میری کوئی بہن بھی نہ تھی، کنبہ کی دوسری بڑی بوڑھی عورتوں کے ساتھ ملنے جلنے سے بھی میں ہمیشہ گریز ہی کرتا

رہا۔ اس لئے آج تک اس صنف سے مجھے کوئی رغبت پیدا نہ ہو سکی تھی اور اُسکی بجائے اگر نفرت نہیں تو ایک قسم کی اجنبیت ضرور تھی، افسانوں میں البتہ اکثر عورت کی محبت کی داستانیں پڑھی تھیں۔ مگر اُن کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ کمزور ناتوان ہستی اپنی ایک جنبشِ چشم سے مردوں کے دلوں کو برباد و خستہ حال کر کے انہیں موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی وار عنقریب مجھ پر پڑنے والا ہے، کامنی نے میرے راستہ میں حائل ہو کر میری شاہراہِ حیات کو بدل دیا۔ معاً میرے خیالات کا رُخ پلٹ گیا۔ اب میں تیغِ ابرو کا گھائل اور تیرِ نگاہ کا زخمی تھا۔ میں ایک ہفتہ بلاناغہ تھیٹر جاتا رہا۔ جتنا عرصہ وہاں رہتا بلکہ یوں کہئیے جتنا عرصہ کامنی اسٹیج پر رہتی مجھ پر ایک کیفیتِ خمار طاری رہتی تھی۔ میری تشنگی کسی طرح سیراب ہی نہ ہوتی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ ہر دم اُسے دیکھا کروں۔ جب یہ آتشِ شوق میرے بجھائے نہ بجھ سکی، بلکہ کوششِ ضبط نے اُسے اور بھڑکا دیا، تو ایک روز تمام شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر میں اُس سے ملنے کے ارادہ سے نکل کھڑا ہُوا۔ اُسکی جائے سکونت پر پہنچ کر میں نے اپنا کارڈ اندر بھجوا دیا۔ میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ دماغ طرح طرح کے خیالات سے متمار ہا تھا، کہ اتنے میں ملازم نے آکر مژدۂ جانفزا اُسنایا "تشریف لائیے گا، بائی جی انتظار کر رہی ہیں"۔ میں نہیں جانتا میرے قدم کس طرح اُٹھے اور کیونکر اُس حجلۂ رنگ و بو میں جو مختلف خوشبوؤں اور عطریات سے مہک رہا تھا داخل ہو گئے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ کامنی میرے سامنے کھڑی تھی۔ ایک نہایت دلفریب تبسّم اسکے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔ اُسکی بڑی بڑی غزالی آنکھیں میری آنکھوں میں دھنسی جاتی تھیں اور میں بے جان بُت کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"آپ کا مزاج بخیر؟" کہتے ہُوئے اُس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہاتھ کے لمس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یہ میں نہیں کہہ سکتا ۔۔ مجھے اُس نے اپنے قریب ہی صوفے پر بٹھالیا۔ دُنیا کی ایک حسین ترین عورت جس سے ملنے کے ارمان نے ایک ہفتہ سے میری رات کی نیند اور دن کا آرام تباہ کر رکھا تھا مجھ سے چند بالشت کے فاصلہ پر یوں بیٹھی تھی کہ اُسکے شفاف دُودھ سے، برہنہ بازو اُسکی آغوش میں آرام کر رہے تھے۔ اُس کی لانبی سپید مرمریں گردن اور گردن کے نیچے وہ دور تک جانے والا بلّوریں نشیب، جس کی ایک جھلک دل کی ہزاروں خوابیدہ خواہشات کو جنجھوڑ کر بیدار کر دیتی ہے، ساڑی کے پلّو سے آزاد، یہ سب میری نظروں کو دعوتِ ہلاکت

دے رہے تھے۔ اُسکی سُرگیں آنکھیں جن پر لانبی لانبی گھنی پلکیں جُھکی ہُوئیں انہیں اور مست و بیخود بنا رہی تھیں میرے دل کی گہرائیوں میں کھبی جا رہی تھیں اُسکے لیونڈر میں بسے ہُوئے بالوں سے خوشبو کی ہلکی ہلکی لپٹیں نکل نکل کر میرے مشامِ جان کو معطر کر رہی تھیں۔ اور میں اُسکے حُسنِ جہاں سوز کی گرمی میں یوں پگھل رہا تھا جیسے سُورج کی شعاع سے قطرۂ شبنم۔ وہ اپنے حسن و شباب کی تمام غیر معمولی رعنائیوں کے ساتھ ایک دیوی معلوم ہوتی تھی اور میں خاموش پجاری جو اُسکے حضور اپنا عجز و نیاز سے لبریز دل نذر کرنے آیا تھا۔ وقت کی رفتار کا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔ آہ وہ پاس بیٹھی ہُوئی کتنی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ مُسکرا رہی تھی۔

"میں نے آپکو تماشے میں بھی اکثر دیکھا ہے" ایک حد درجہ رسیلی، ترنّم آگیں، لوچدار آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے اپنے منتشر حواس مجتمع کئے۔ طاقتِ گویائی جو سلب ہوگئی تھی پھر عود کر آئی اور میں بصد دقت بولا "بارے آپ نے پہچان تو لیا"۔

اسکے بعد ایک گھنٹہ میں وہاں ٹھیرا۔ میں نے دل کے تمام زخم اُسکے سامنے کھول کر رکھدیئے اور یہ بھی کہدیا کہ اُن پر پھاہا صرف اُسی کے ہاتھ سے لگ سکتا ہے۔ میں ابھی نو گرفتار تھا۔ مجھے آدابِ عشق سے بھی آگاہی نہ تھی۔ وہ میری بیساختہ باتیں سُن سن کر مُسکرا رہی تھی۔ چلتے وقت اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ وفورِ جذبات سے میری زبان گنگ ہوگئی۔ الفاظ میرے لبوں پر آ آ کر مر گئے۔ میں شکریہ کا ایک حرف نہ کہہ سکا۔ جھک کر میں نے اُسکے ہاتھ کا بوسہ لے لیا۔ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ گرفت اَور مضبوط ہوگئی۔ میں نے بوسوں کا تار باندھ دیا۔ وہ اب بھی مُسکرا رہی تھی۔ شاید مُسکراتی ہوگی۔ اپنی کامیابی پر اور مردوں کی اس فطری کمزوری پر کہ وہ کیونکر عورت کے ہاتھوں میں موم ہوجاتے ہیں۔

اب یہ دستور ہوگیا تھا کہ رات کو تماشے میں کامنی کے دیدار سے اپنے مضطرب دل کو تسکین پہنچاتا اور دن کو ہر روز گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے اُس سے ملاقات نصیب ہوجاتی تھی۔ میری حالت بالکل غیر تھی۔ اب میں وہ شیروان ہی نہ تھا جو کتابوں کے مطالعہ سے محظوظ ہوجاتا۔ مجھے ہر چیز میں کمی معلوم ہونے لگی۔ میرے دل میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ میں نے ممنوع پھل چکھ لیا تھا۔ جس کی لذت مجھے دُنیا کی تمام دوسری لذتوں سے بیگانہ کر رہی تھی۔ پندرہ روز اسی طرح گذر گئے۔ کامنی کے

سوا کل جہان میری نظروں سے غائب تھا۔ اُسکے بغیر وقت گذارنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اگر وہ ابتدا میں میرے ساتھ روکھاپن برتتی تو شاید یہانتک نوبت نہ پہنچنے پاتی۔ مگر وہ ظالم تو ہر نئی ملاقات میں پہلے سے بھی زیادہ گرمجوشی کا اظہار کرتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ آگ دونوں طرف بھڑک رہی ہے۔ یہ خیال کہ کامنی مجھ سے محبت کرتی ہے مجھے خود اپنی نظروں میں زیادہ معزز بنا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اُسے کہا کہ "اگر کمپنی کراچی سے چلی گئی تو میں تمہیں کمپنی کے ساتھ نہیں جانے دونگا" اُس سے جدا ہونے کا تصوّر میرے دل پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ جواب میں اُس کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جنہوں نے دم بھر میں مجھے عرش پر پہنچا دیا۔ اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "پیارے میں تم سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ اب کمپنی سے ہمیں کیا تعلق! کیا یہ کم خوش قسمتی ہے کہ میری برسوں کی آرزو بر آئی ہے؟ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرکے میں جس خوشی کی مالک بنوں گی وہ مجھے کہیں نہیں مل سکتی"

پیمانۂ مسرت لبریز ہو کر اب کناروں سے چھلکنے کو تیار تھا۔ کامنی کے ہاں میری آمد و رفت لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کمپنی کے مالک سیٹھ رستم جی نے بھی سب کچھ سُن لیا۔ رستم جی میرے والد مرحوم کے بہت دوست تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اُنکے ایک عزیز دوست کا لڑکا یوں بے راہ ہو کر اپنی خاندانی روایات کو دھبہ لگا رہا ہے تو انہوں نے ایک روز مجھے اپنے پاس بلایا۔ بہت شفقت سے حال دریافت کرتے رہے۔ اور پھر گفتگو کا پہلو بدل کر مجھے سمجھانا شروع کیا۔ انہوں نے سبھی کچھ کہا۔ اپنے ذاتی تجربات بیان کئے۔ تھیٹر کی عورتوں کو آوارہ منش اور زیورِ عصمت سے عاری بتایا۔ یہ بھی کہا کہ ایسی عورتوں کی محبت پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ یہ زبانی چوچلے کرنا خوب جانتی ہیں۔ مردوں کے دلوں کو ہاتھ میں لیکر انہیں خراب و خستہ حال کر دیتی ہیں۔ یہ خوبصورت بلائیں ہیں جو دُور سے دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اُنکے قریب جائیں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اور آخر اپنی لمبی تادیبی تقریر کو اِن الفاظ پر ختم کیا "مجھے یقین ہے تم اپنا نیکُ بد خوب سمجھتے ہو۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اگر تم ایسی مہلک غلطیاں کرو تو تعلیمیافتہ سوسائٹی کے لئے باعثِ عار ہو جاؤ گے۔ خدا رکھے تم ایک روشن دماغ اور ہونہار نوجوان ہو۔ تم سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ تم اپنے لائق کی کوئی لڑکی تلاش کرو۔ ایک سیلانی مزاج عورت سے راہ و رسم پیدا کرکے اپنی نیک شہرت کو یوں رسوا نہ کرو۔ میں پوری پوری امید رکھتا ہوں کہ تم تمام

پہلوؤں پر غور کر کے اپنی کارروائیوں سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو جاؤ گے۔"

آہ تائب ہو جانا اب میری حدود امکان سے باہر کی بات تھی۔ میرے لئے وہی امر قابلِ تحسین تھا جو مجھے میری کامنی سے نزدیک تر کرنے میں ممد ہوتا اور وہ بات جو مجھے کامنی سے دور لے جاتی میرے لئے زہر تھی۔ اُن دنوں کراچی میں موسمی بخار کا زور ہو رہا تھا۔ میں بھی اُس کا شکار ہُوا اور تکلیف لمبی ہو گئی۔ اگرچہ حدّتِ عشق تپ کی گرمی سے بہت زیادہ تھی مگر بیماری کے باعث میں کامنی سے ملنے سے معذور تھا۔ میں نے خط کے ذریعہ سے اس پر اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ ایک ہفتہ کے بعد اُسکا جواب آیا۔ جس میں میری علالت پر بہت افسوس و تاسف کا اظہار کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ "سیٹھ صاحب (یعنی کمپنی کے مالک) کچھ دنوں سے میری حرکات و سکنات کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میرے رہنے کا کمرہ بھی تبدیل کر دیا گیا ہے۔ آپ سے ملنے سے انہوں نے مجھے خصوصیت سے منع کیا ہے۔ میں سب سختیاں جھیلنے پر آمادہ ہوں۔ مگر یہ کہ آپ سے نہ ملوں میری برداشت سے باہر ہے۔ جب سے آپ کے دشمنوں کی ناسازیٔ مزاج کی خبر سُنی ہے دل پر برچھیاں چل رہی ہیں۔ پیش نہیں چلتی ورنہ خود حاضر ہو کر خدمت کرتی۔ کمپنی سے چھٹکارا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں اپنا معاہدہ جسکے اختتام میں ابھی بہت سال باقی ہیں فسخ کر دوں مگر تنسیخ معاہدہ کی صورت میں مجھے کمپنی کو بیس ہزار روپیہ ادا کرنا ہوگا اور روپیہ میرے پاس کہاں؟ سخت کرب و بے چینی کی حالت ہے۔ خدا ہی ہے جو مدد کرے۔ اگر روپیہ ادا کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکے تو میں ہمیشہ کے لئے آپکی ہوں"۔

یہ عبارت پڑھ کر میں کچھ مدت سوچتا رہا۔ پھر میں نے اپنی چیک بُک منگائی۔ بیس ہزار کا چیک کاٹ کر کامنی کے نام بھیجدیا۔ اور ساتھ ایک خط بھی لکھا کہ تمہیں حاصل کرنے میں اگر مجھے قارون کا خزانہ بھی خرچ کرنا پڑے تو دریغ نہ کروں گا۔ تمہارے سامنے دولت کی کیا حقیقت ہے۔ خدا کے لئے کمپنی سے فیصلہ کر کے جلد آؤ کہ میرا کلبۂ تاریک تمہاری ضیائے حُسن سے منوّر ہو"۔ اس واقعہ کو کئی روز ہو گئے۔ میں کامنی کے انتظار میں گھڑیاں گِنتا تھا۔ مگر وہاں سے کوئی جواب نہ موصول ہونے پر میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر سترہ روز کی صبر شکن علالت کے بعد جب میں بستر سے اُٹھا تو سیدھا کامنی کے یہاں پہنچا۔ دل میں ولولوں اور امنگوں کا ایک طوفان جاری تھا۔ مگر وہاں میں نے کیا دیکھا . . . . آتشِ عشق کی بجھی ہُوئی راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ تھا!!!!!! جس

مکان میں کمپنی کے لوگ فروکش تھے وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ کامنی کا کمرہ جو کبھی میرے لئے عیش وعشرت کا سمندر تھا جس میں غرق ہوکر میں دین و دنیا کو بھول جاتا تھا اب تمام سامانِ تعیش سے خالی اُجڑے ہوئے ویرانہ کی مانند سنسان معلوم ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل کو ایک دھکا لگا۔ سخت حیران تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ پھر خیال آیا کہ شاید انہوں نے رہنے کا مکان بدل لیا ہو۔ پورا پتہ حاصل کرنے کے لئے میں تماشا گاہ پہنچا۔ اور وہاں سے معلوم ہوا کہ آج چار روز ہوئے کمپنی کراچی سے چلی گئی ہے . . . . میری امیدیں ہمیشہ کے لئے مرگئیں۔ دل کی کلی کِھلنے سے پیشتر ہی مرجھا کر پتی پتی ہوکر جھڑ گئی۔ پردہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور مجھ پر خوفناک حقیقت کا انکشاف ہونے لگا۔ سیٹھ رستم جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "ایسی عورتوں کی محبت پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ یہ زبانی چونچلے کرنا خوب جانتی ہیں۔ مردوں کے دلوں کو ہاتھ میں لیکر انہیں خراب خستہ حال کر دیتی ہیں"۔

کامنی نے مجھ سے بیوفائی کی۔ میرا دل جو اُس کے طفیل محبت کے پاک و بلند جذبہ سے سرشار ہوا تھا آخر اُسی کے ہاتھوں چکنا چور ہوگیا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور آہ کس قدر تلخ! اُسکی محبت بھری باتیں۔ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اور گرم گرم شیریں بوسے یاد آتے تو میں کپکپا کر رہ جاتا تھا۔ وہ کتنی پاکیزہ مزاج اور کیسی بھولی معلوم ہوتی تھی۔ اللہ اللہ عورت کے ظاہر و باطن میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔

جس طرح اندھیری رات میں بجلی کی چمک دم بھر کے لئے کل فضا کو درخشاں کر دینے کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ اور دنیا پر پھر وہی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کامنی نے میرے تاریک دلوں کو روشن کیا اور پھر یکایک غائب ہوکر مجھے اُس سے زیادہ گہری تاریکی میں ٹاپک ٹوئیے مارتے چھوڑ گئی۔ اس واقعہ کے پورے دو سال بعد تک میری طبیعت بحال نہ ہو سکی۔ شروع شروع میں تو ہر وقت سوچنے اور بات بات پر آہیں بھرنے سے مجھے مالیخولیا سا ہوگیا تھا۔ میرے بستر کے تکئے جانتے ہیں کہ راتوں کو کیونکر وہ میرے آنسوؤں سے شرابور ہو جاتے تھے۔ آخر وقت گذرنے کے ساتھ اور دوستوں کے سمجھانے سے طبیعت ٹھکانے لگی۔ لیکن اب چوبیس گھنٹے کی تنہائی مجھے دوبھر ہوگئی تھی۔ دل جس مصاحبت کے مزے ایک دفعہ لوٹ چکا تھا پھر اُسی طرف راغب

ہو رہا تھا۔ آہ انسانی خواہشات بھی کس قدر مہلک واقع ہوئی ہیں۔ عورت کی کشش کتنی زبردست ہے۔
میرے تمام تفکرات اور عوارض کا باعث یہی ایک ہستی ہوئی تھی۔ اور چاہیئے تو تھا کہ میں اُس سے اپنی مصیبتوں
کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتا مگر اُس کی بجائے میں بڑے فخر و انبساط سے یہ شعر الاپتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا :-

پھر بارگاہِ عشق میں پہنچا ہوں سر بکف
زخموں سے پاش پاش کلیجہ لئے ہوئے
سر کرنے پھر چلا ہوں مہم حُسن و عشق کی
ہر سانس میں شکست کی دُنیا لئے ہوئے

الغرض میں نے چند مہینوں کے اندر اندر شیریں سے شادی کر لی۔ گذشتہ کو میں بھول چکا تھا اور حال و
مستقبل کو خوشگوار بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ شیریں غضب کی حسین تھی۔ اُس نے تعلیم بھی اعلیٰ حاصل کی تھی
میری اُسکی آشنائی اوّل اوّل کلب میں ہوئی اور اُسکے بعد بتدریج مراسم بڑھتے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب میں
اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے دائمی طور پر وابستہ ہوگئے تھے میں نے چند ہی دنوں میں
محسوس کر لیا کہ شیریں اپنے پہلو میں دردمند و حساس دِل رکھتی ہے۔ اظہارِ محبت جب عورت کی طرف سے
ہو تو سراسر قاتل ہو جاتا ہے۔ شیریں اکثر مجھے ایسے آتشیں اور محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں خطاب
کرتی تھی کہ میں بیخود ہو ہو جاتا تھا۔ زندگی خوب گذر رہی تھی۔ میں عہدِ ماضی کی تمام ناکامیاں قریب قریب
فراموش کر چکا تھا کہ قدرت نے پھر گذری ہوئی باتوں کی تکرار شروع کی۔ مگر ایک اور پیرایہ میں۔ میرا
شام کا وقت عموماً کلب میں گذرتا تھا اور اکثر شیریں بھی ہمراہ ہوتی تھی۔ ایک روز میں ابھی ٹینس سے
فارغ نہ ہوا تھا کہ میں نے دیکھا شیریں بنچ پر بیٹھی کسی شخص سے باتوں میں مصروف ہے۔ دُور سے وہ
شخص اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ جب میں کھیل چکا تو شیریں نے بہت تپاک سے اُسے پیش کرتے ہوئے
کہا "آپ میرے پرانے اسکول فیلو مسٹر کیقاؤس جی ہیں۔ میں اور مسٹر کیقاؤس کسی زمانہ میں اکٹھے اسکول
میں پڑھتے تھے۔ حال ہی میں آپ ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے آئے ہیں" کیقاؤس نے
بہت گرمجوشی اور خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ یہ ایک خوبرو و خوش پوش نوجوان تھا۔ جس پر انگریزی
تمدن کا پورا پورا اثر معلوم ہوتا تھا۔ اسکے بعد وہ روزانہ کلب میں آنے لگا۔ اُسکی عادات پسندیدہ تو
تھیں مگر اُن میں ملمع کاری سی نظر آتی تھی۔ لباس اور ظاہرا تکلفات کے معاملہ میں میں نے دیکھا وہ

بہت محتاط رہتا تھا۔ ہر روز نیا سوٹ زیب تن کر کے آتا تھا اور چند ہی دنوں میں وہ کل ممبروں سے ایسا گھل مل گیا جیسے برسوں کا ساتھ کھیلا دوست ہو۔ عورتوں سے گفتگو کرتے یا کھیلتے وقت وہ نسائی حرمت کا بہت لحاظ رکھتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے اُسے کلب کی کسی زنانہ ممبر کے ساتھ اوقات تفریح میں کبھی کوئی بے تکلفی کی بات کرتے دیکھا ہو۔ لیکن اس بے اعتنائی پر بھی وہ کمبخت عورتوں کی نظروں کا مرکز بنا ہُوا تھا۔ یہ عورت ذات بھی خدا اسکے سحر سے بچائے، عجیب مزاج واقع ہُوئی ہے۔ جبتک آپ اُسکے گرد پروانہ وار جھومتے ہیں۔ اُسکی ہر ہر ادا پر اپنا تن من نثار کرنیکو تیار ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تئیں ان تمام تواضعات اور خاطرداریوں کی جائز حقدار سمجھ کر آپکی جاں نثاریوں کے عوض میں جھوٹے مُنہ سے شکریہ کا تبسم پیش کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ مرد کا وجود دنیا میں پیدا ہی اس لئے ہُوا ہے کہ عورت کی پرستش کرے۔ لیکن جہاں اُسکی اس بے رُخی و بدمزاجی کے جواب میں آپ کی جانب سے استغنا و بے پروائی کا اظہار ہُوا، وہ جھٹ تمام تمکنت وغرور چھوڑ آپ کے قدموں میں آجائیگی۔ کیقاؤس نے غالباً یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ رکھا تھا۔ مجھ پر اُسکی خاص نظرِ التفات تھی۔ کلب میں یا باہر جہاں کہیں ملتا بہت خلوص سے پیش آتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ مجھے اور شیریں کو اپنے یہاں چائے پر بھی مدعو کر چکا تھا۔ چند ہی روز میں باہم اُٹھنے بیٹھنے سے ہمارے تعلقات دوستانہ حد تک پہنچ گئے۔ اب وہ میرے مکان پر اکثر آنے لگا تھا۔ شیریں اسکی بہت آؤ بھگت کرتی تھی اور میں یہ دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا کہ وہ فرائض میزبانی سے خوب واقف ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی نہ معلوم تھا کہ اس ظاہرا سج دھج کے اندر کونسا خوفناک راز پوشیدہ ہے۔ ایک روز مجھے کسی ضروری کام کے لئے باہر جانا پڑا، اور شام تک واپس نہ آسکا۔ غروب آفتاب کے بہت دیر بعد جب میں گھر کو لوٹا تو دور سے مجھے پیانو کی آواز بلند ہوتی سنائی دی۔ لمپ کی روشنی کھڑکیوں کے شیشوں سے گذر گذر کر باہر میدان میں پڑ رہی تھی۔ میں سمجھا کہ شیریں تنہائی کی کوفت موسیقی کی مدد سے دور کر رہی ہے۔ میں بیدھڑک کمرے میں داخل ہوگیا ....

.... شیریں کرسی پر بیٹھی پیانو کے سروں کو اپنی اُنگلیوں سے آہستہ آہستہ چھیڑ رہی تھی۔ اور کیقاؤس اُسی کرسی کے بائیں پہلو پر ٹیک لگائے اپنے دونو بازوں کو اُسکی گردن میں حمائل کئے اُس پر جُھکا ہُوا تھا۔ میرے یکایک داخل ہونے سے وہ سٹ پٹا سے گئے۔

دونوں کے چہروں پر گھبراہٹ اور ندامت کے آثار ہویدا تھے۔ میں بالکل خاموش رہا، گویا میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ میں نے اسکے بعد بھی شیریں کو مطلقاً نہیں جتایا۔ ہرچند کہ میرا دل شک و شبہ سے ملوث ہو رہا تھا مگر میں نے زیادہ بدگمانی کا شکار رہنا پسند نہ کیا۔ شیریں کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا۔ کیقاؤس بھی کلب میں مجھ سے اُسی طرح ملتا تھا۔ البتہ میرے ہاں آنا جانا اُس نے بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی آتا بھی تو چند گھڑی کے لئے کھڑے کھڑے باتیں کر کے چلدیتا تھا۔ اس بات کو تین مہینے گذر گئے۔ ایکدن میں اپنے ایک دوست کو جو چند روز سے میرے یہاں مہمان ٹھیرا ہوا تھا۔ الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن تک گیا اور جب واپس آیا تو مکان کے برامدہ میں مجھے کمرے کے اندر سے کسی شخص کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ میں فوراً ٹھٹک گیا۔ بہت آہستگی سے جُھک کر دیکھا تو کیقاؤس نظر آیا۔ قریب ہی دوسری کرسی پر شیریں بیٹھی تھی۔ شیریں کی نگاہیں زمین پر جُھکی ہُوئی تھیں۔ اور کیقاؤس بہت مدّھم آواز میں گفتگو کر رہا تھا "شیریں خدا کے لئے ذرا اسکول کا زمانہ تو یاد کرو۔ غور کرو میری محبت کتنی پرانی ہے۔ میں اسکول میں بھی تمہارا شیدائی تھا۔ ذرا سوچو تم نے مجھ سے کیا عہد و پیمان کئے تھے۔ اپنے الفاظ کا پاس کرو میں نے اُس وعدہ پر اتنے سال بسر کر دئے۔ اور اب جو یورپ سے لوٹا تو تمہیں کسی اَور ہی کے پہلو کی زینت دیکھتا ہوں۔ مجھے زیادہ نہ تڑپاؤ۔ میں تمہاری شمع حسن کا پروانہ ہوں۔ تمہارے سامنے جل کر جان دیدوں گا اور میرے خون کی ذمہ دار تم ہو گی۔ میری پیاری شیریں" یہ کہتے کہتے اُس نے شیریں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری رگوں میں خون ہیبتناک تیزی سے دوڑنے لگا۔ قلب کی حرکت تیز ہو گئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ "محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہارے قلب میں بھی محبت کی حرارت موجود ہے۔ آخر تم وہی ہو نا جو آج سے چند سال قبل اسکول میں مجھ سے دو قالب و یک جان کا تعلق رکھتی تھیں۔ اب میں بدل تو نہیں گیا۔ یقین جانو کیقاؤس کے دل میں تمہارے عشق کا شعلہ اُسی طرح بھڑک رہا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دونو بازو پھیلادئے اور شیریں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب مجھے تاب صبر نہ رہی میں بے اختیار ہو کر کمرے میں گھس گیا اور کیقاؤس کو گردن سے پکڑ لیا۔ میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ جو کچھ منہ میں آیا کہے چلا گیا۔ "ذلیل۔ نابکار۔ کمینے۔ دوستی کے پردے میں بدترین دشمنی کرتے ہو۔ میں تمہارے کرتوت کا ابھی مزہ چکھلائے دیتا ہوں۔" میں نے بے تحاشا اپنی لکڑی اُسکے بدن پر برسانا شروع کی۔ گنہگار ہمیشہ بُزدل ہوتا ہے۔ کیقاؤس تابِ مقاومت نہ لا کر کمرے کے دروازے سے نکل کر بھاگ گیا۔ شیریں

کچھ فاصلہ پر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں اُسکی طرف بڑھا۔ پیشتر اسکے کہ میری زبان حرکت کرے وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں بےحس و حرکت کھڑا تھا۔ خون میرے دماغ میں زور زور سے چکر لگا رہا تھا۔ کمرے کی کل چیزیں مجھے گھومتی نظر آتی تھیں۔ اُسکی گریہ و زاری نے میرے دل کو پگھلا دیا۔ میں نے جُھک کر اُس کا سر اپنے ہاتھوں سے اُٹھایا۔ آنسو اُسکے رُخساروں پر بہت تیزی سے بہہ رہے تھے۔ میں تمام غصّہ بھُول گیا۔ میں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "شیریں شیریں" الفاظ خودبخود میری زبان سے ٹپکنے لگے۔ "للہ اپنی اور میری زندگی کو بدمزہ نہ بناؤ۔ میں ہمیشہ تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ تم مجھ سے کیوں برگشتہ ہوئی جاتی ہو۔ کیقاؤس ایک کمینہ شخص ہے۔ اب یقیناً وہ تمہارے نزدیک نہیں پھٹکے گا" اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے رُک رُک کر کہا "پیارے ..... میں قصوروار ہوں .... مجھے معاف کردو" میں نے اُس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیتے ہوئے کہا "تم مجھے ہمیشہ کی طرح اب بھی ویسی ہی عزیز ہو۔ اس حادثہ کو بھول جاؤ" آہ مرد کا اکھڑپن عورت کے آنسوؤں کے سامنے کس طرح زائل ہو جاتا ہے۔ عورت کے مزاج کے اُتار چڑھاؤ سے واقف ہونا آسان کام نہیں۔ بعض دفعہ وہ روتی ہے تو اُسکے آنسوؤں کے پردے میں ایک برق پاش مسکراہٹ پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اُس کی مسکراہٹ میں آتشِ انتقام شعلہ زن ہوتی ہے +

ایک ہفتہ گذر گیا۔ شیریں پہلے کی بہ نسبت میرے آرام و راحت کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ ایک شام میں سینما دیکھنے جا رہا تھا۔ میں نے شیریں سے چلنے کو کہا مگر وہ دردِ سر کی شکایت کے باعث نہ جاسکی۔ میں رات کے دس بجے پلٹا۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو شیریں کا پلنگ خالی تھا۔ میں نے آوازیں دیں۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تمام کمروں میں تلاش کی مگر شیریں کہیں نہ ملی۔ ملازم نے صرف اتنا بتایا کہ وہ میرے سینما جانے کے کچھ وقفہ بعد یہ کہہ کر کہ "میں ڈاکٹر کے یہاں جا رہی ہوں" باہر چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر جمشید ہمارا خاندانی معالج تھا۔ مگر اُس کا مکان تو چند قدم پر تھا۔ میں بھاگتا ہُوا اسکے پاس گیا اور معلوم ہُوا کہ شیریں وہاں بالکل نہیں آئی۔ اب ایک خدشۂ موہوم کا مبہم سا خیال میرے دماغ میں جمنے لگا۔

میں جھٹ ٹیکسی میں سوار ہو کر کیقباؤس کے بنگلہ پر پہنچا۔ میرا قیاس بالکل ٹھیک نکلا۔ کیقباؤس کا بنگلہ خالی پڑا تھا۔ فرنیچر، اسباب، سب کچھ غائب تھا۔ میں نے وہیں کے ایک شخص سے دریافت کیا "بیرسٹر صاحب کہاں ہیں؟" اُس کے جواب سے معلوم ہُوا کہ وہ اُسی شام کراچی سے کہیں چلا گیا تھا۔ شیریں یقیناً اُسکے ہمراہ گئی تھی۔" اب کراچی میں رہنا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے کل ساز و سامان فروخت کر دیا۔ کاروبار قطعی بند کر دیا اور عرصہ تک ایک اُدھیڑ بن میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا رہا۔ جب طبیعت اس بادیہ پیمائی سے تنگ آگئی تو آخر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدا میں تو اکثر پرانی باتیں یاد آ آ کر مجھے تڑپا یا کرتی تھیں۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ کڑھنا بے سود ہے۔ جس عورت نے میری محبت و شفقت کی پروا نہ کی۔ جس نے میرے آبگینۂ دل کو بڑی بے رحمی سے توڑ دیا۔ اور جس نے میرے معصوم جذباتِ الفت کو سخت بے دردی سے پامال کر کے دوسرے کے ساتھ بھاگ جانا گوارا کر لیا۔ اُس کا خیال کرنا اوّل درجہ کی حماقت ہے"۔۔۔۔ شیروان کی آواز تھرآنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا، غریب کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔

. . . .

دو روز اور قیام کر کے نسیم اور شیروان دہلی روانہ ہو گئے۔ نسیم پر ایک غیر معمولی خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ شیروان کی سرگذشت نے اُسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ خدا نہ کرے کہ اُسے اپنی فرحت کی طرف سے کبھی کوئی بدگمانی پیدا ہو۔

عاشق بٹالوی

بی اے

سوجا

سوجا! اطمینان سے اپنے بچھونے پر سوجا!

بیداری سے کتنی زیادہ شیریں ہوتی ہے نیند میٹھی نیند! جب کچھ نہ کرنے اور کچھ نہ کرنے میں محو رہنے سے زندگی روزمرہ کے جھگڑوں جھمیلوں سے بالا رہتی ہے اور بے کلی اُس سکون میں غرق ہوجاتی ہے جس میں زندگی بغیر مردہ ہونے کے اپنی بے چین حرکت کو کھو بیٹھتی ہے!

سوجا اور آج کی زندگی کو بھول جا! سوجا اور کل سویرے نور کے تڑکے پیشتر اسکے کہ چڑیاں سوئے ہوئے فتنے جگادیں خود جاگ اور اپنی پچھلی بیداریوں کو دل سے ملیامیٹ سمجھ کر اک ایسی نئی بیداری میں قدم رکھ جو موجودہ زیست کی کاوشوں کے لئے خوابِ شیریں کا پیغام لائے!

سوجا! آرام و اطمینان کے ساتھ، لطف و سکون کے ساتھ، ایسا کہ پھر کبھی اس خونخوار، روشن، گرد بھری دنیا میں تو اِن فتنہ ساز سورج اور چاند تاروں کو نہ دیکھے ـــــ وہ نیند ہو اک مسلسل خمار کی سی نیند جس میں جنبش کو دخل نہ ہو، جو اک پیارے سپنے سے معمور، کسی آسودہ فضا میں، تجھے اپنے ہلکے پروں پر اُٹھائے ہوئے نہیں معلوم کدھر کو لے چلے!

بیل

تو اپنا ساز اُٹھاتا ہے

تو اپنا ساز اُٹھاتا ہے اور کائنات رنگینوں سے آباد ہوجاتی ہے: پہاڑ کی گھاٹیاں پہاڑی جانوروں کے راگ سے گونج اُٹھتی ہیں۔ اور آبشار کی پُرشور روانی سوئے ہوئے سبزے کو جاگ اُٹھنے کا ترانہ سناتی ہے!

لہروں کے گرنے اُٹھنے سے سمندر کی خاموشی ٹوٹ جاتی ہے اور اس کی نیلی نیلی فضائیں موسیقی اپنے ننھے خوشنما دائروں میں ناچ کرنے لگتی ہے:

چٹیل میدانوں کی ویرانی میدانی چڑیوں کے شور و غل سے آباد ہوتی ہے اور خوبصورت ہرن زمین کے پھیلاؤ میں چوکڑیاں بھرتا ہوا نظروں سے غائب ہوجاتا ہے +

رنگیلے پکھیرو چمن چمن اُڑتے ہیں اور اپنے گیتوں سے باغ میں اک قیامت برپا کردیتے ہیں +

تو جب اپنا ساز چھیڑتا ہے تو ساری کائنات رنگینوں سے معمور ہوجاتی ہے!!

سل

محفلِ ادب

شعرِ اقبال

برون زین گنبدِ دربستہ پیدا کردہ ام راہے ‏ کہ از اندیشہ برتر پر زند آہِ سحرگاہے
تو اے شاہیں نشیمن درچمن کردی ازاں ترسم ‏ ہوائے او ببالِ تو دہد پروازِ کوتاہے
غبارے گشتۂ آسودہ نتواں زیستن اینجا ‏ بباد صبحدم در پیچ و منشیں بر سرِ راہے
زجوئے کہکشاں بگزر، زنیلِ آسماں بگزر ‏ زمنزل دل بمیرد، گرچہ باشد منزلِ ماہے
چساں آدابِ محفل رانگہ دارند و می سوزند ‏ مپرس از ما شہیدانِ نگاہِ برسرِ راہے
اگر زاں برق بے پروا درونِ او تہی گردد ‏ بچشمم کوہِ سینا می نیرزد با پرِ کاہے
پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و میگویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

از رسالہ سُہیل

عرب اور مغربی تجارت اس عنوان سے ہمارا یہ مقصود نہیں کہ عربوں کی ترقی کی غیر واقعی حمایت کریں یا ایسے واقعات عربوں کی طرف منسوب کریں جنکے وہ فی الحقیقت مستحق نہیں ہمارا مقصد عربی تمدن نے موجودہ تمدن کی جو کچھ خدمت انجام دی ہے اسکا مختصر تذکرہ تاریخی پیش کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ اندلس میں عربوں کی زرعی وصنعتی ترقی کا ہی نتیجہ تھا جس نے ممالک یورپ میں بیداری کی حرکت پیدا کر دی اور انکو ترقی کی طرف مائل کر دیا۔ جن لوگوں نے تاریخ کے اوراق اُلٹے ہیں انکو معلوم ہے کہ عربوں نے زراعت وصنعت کو کس قدر عروج پر پہنچا دیا تھا پارچوں اور معدنیات کی صنعت میں انہوں نے کیسی حیرت انگیز ذہانت وذکاوت کا دنیا کے سامنے ثبوت پیش کیا ہے علی الخصوص سونے چاندی مسی، برنجی، لوہا، ہڈی، چمڑے، شیشے، مٹی، رنگریزی، شکر سازی، اور رنگ بنانے کی صنعت میں اعلیٰ ترقی حاصل کی تھی اور عرب کی یہ تمام مصنوعات ازمنہ وسطیٰ میں ہر طور قابل فخر خیال کی جاتی تھیں یورپ جو آج تمدن وحضارۃ کی انتہائی بلندیوں پر خیمہ زن ہے۔

اس نے عربوں ہی سے ابتدأً یہ تمام صنعتیں حاصل کی تھیں اور مغربی تمدن کے آغاز میں عرب ہی مغربی اقوام کے استاد تھے حقیقت یہ ہے کہ اگر یورپ اسلامی تمدن کی غلامی نہ کرتا اور عربوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرتا تو مغربی تمدن کو معراج پر پہنچنے میں اس قدر جلد کامیابی نہ ہوتی +

وہ عرب ہی تھے جنھوں نے زراعت اور کاشت کے طریقوں پر علمی حیثیت سے غور کیا اور آبپاشی اور کھاد دینے کے اصول معلوم کئے انکی آبپاشی کے طریقے نہایت صحیح اور اصولی تھے وہ کھاد دینے اور کھاد کے منافع اور کیمیاوی اصول کے مطابق عمل کرنے سے باخبر تھے انہوں نے اپنی کوششوں سے بعض ایسے زراعتی تجربے حاصل کئے جو کاشت میں انکے واسطے غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوئے اسکے علاوہ اس زمانہ کی تجارتی قیادت عربوں ہی کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے علمی و جغرافی معلومات سے تجارت کو فروغ دینے میں بہت کچھ آسانیاں حاصل کر لی تھیں تجارتی قافلوں کے لئے راستے تلاش کئے ملکوں اور حکومتوں سے تجارتی تعلقات پیدا کئے مبادلت کے کاروبار میں آسانیاں پیدا کیں راستوں کی حفاظت و مرمت، پلوں کا بنانا کنوؤں کا کھودنا اور آنے جانے والوں کے قیام، آسایش اور امور عامہ کے متعلق تمام ذمہ داریاں عرب ہی انجام دیتے تھے۔ یہی وہ امور ہیں جن سے ازمنۂ وسطیٰ میں عربوں کی تجارتی سیادت اور عام اقتدار کے متعلق حجتِ قطعی پیش کی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے موجودہ تمدن و ترقی میں عربوں کا خاص حصّہ ہے +

(از رسالۂ نگار)

ہاروں رشید کا شطرنج۔ "ادسمہ" کے عجائب خانۂ پیرس میں ہاتھی دانت کی ایک خوبصورت اور شاندار بساط ہے جس میں شطرنج کے تمام مہرے موجود ہیں انکے متعلق کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے زمانہ خلافت میں شارلمان شاہِ فرانس کو تحفہ بھیجا تھا ان دونوں بادشاہوں میں اسی طرح تحائف کا سلسلہ جاری تھا، غالب گمان یہ ہے کہ ہارون اسپین کی دولت امویہ کے خوف سے شاہ فرانس کی دوستی کا خواہشمند تھا وہ خطرہ کے احتمال اور امویین کے مغرب سے مشرق کی جانب خروج کے خوف سے شاہِ فرانس پر اعتماد کرنیکا آرزومند تھا، جس وقت یہ "تحفہ" بھیجا گیا ہے اُس وقت کا یہ مشہور واقعہ ہے +

کچھ بعید نہیں کہ اس ہدیہ کے علاوہ اور بھی تحائف انہی اغراض و مصالح کی بنا پر بھیجے گئے ہونگے، لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ شاہ فرانس کی طرح شاہ قسطنطنیہ سے اُسکے تعلقات خوشگوار نہیں شطرنج کی بساط اور مہرے سب کے سب ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ہیں +

بعض لوگوں نے اس (تحفہ) نیز اس امر کو کہ وہ ہارون رشید کے حکم سے بغداد سے بھیجا گیا ہے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا ہے لیکن عُلمائے مفتشین نے اُسکے نقش و نگار اور طرز صنعت سے متعلق جو تفتیش اور بحث وتمحیص کی ہے اُس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ آٹھویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں ایک مُسلمان کے ہاتھ کے بنے ہُوئے ہیں جس کا نام شطرنج کے ایک مُہرے پر کندہ ہے "من عمل یوسف" اس کے علاوہ کچھ اور الفاظ ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا ہارون رشید کا انتقال ۸۰۹ء میں ہُوا ہے اور جس بات سے اُنکی ہندی ساخت کا اندازہ لگایا گیا ہے یہ ہے کہ شطرنج کے شہسوار اور دیگر اشخاص اُس وقت کے ہندی طرز پر بنے ہوئے ہیں مُسلمانوں نے ساتویں صدی سے ہندوستان کو فتح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہارون کے زمانہ خلافت میں مُسلمانوں کی کافی تعداد ہندوستان میں رہتی تھی۔ بہر حال مہروں کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا بنانیوالا ہندوستانی ہے یا عربی کہ اُس نے ہندی طرز پر یہ مُہرے بنائے ہیں لیکن پہلا خیال زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے +

انکے آٹھویں صدی میں مصنوع ہونے پر جو چیز دلالت کرتی ہے یہ ہے کہ شہسواروں کے گھوڑوں پر رکابیں بھی ہیں اور رکابوں کی ایجاد ساتویں صدی میں چین میں ہوئی ہے اسوقت تک دنیا کی تمام قومیں بغیر رکاب کے گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں اسی امر نے زینوفن یونانی کو شہسواری کی تنقیص پر آمادہ کیا۔ کیونکہ شہسوار گھوڑے پر سنبھل نہیں سکتا تھا، اور یہ بات غیر معقول نہیں ہے کہ ساتویں صدی میں چین میں یہ "ایجاد" ہوئی ہو اور آٹھویں صدی میں ہندوستان و فارس پہنچ گئی ہو، لیکن، یورپ اسوقت تک اس سے ناواقف تھا، جس وقت ہارون رشید کا یہ تحفہ شارلمان کے پاس پہنچا لوگوں نے شطرنج کے مہروں کو غور سے دیکھنا شروع کیا، انہوں نے دیکھا کہ شہسوار رکابوں پر قائم ہیں بس اُس وقت سے اُنہوں نے اپنے یہاں بھی کاٹھیوں میں رکابوں کو رواج دیدیا۔ جب ہی سے گھوڑے کی سواری عام ہوگئی، اور شہسواری شریفوں کی خصوصیت سمجھی جانے لگی انتہا یہ کہ فرانیسیی زبان میں عام طور پر شریف آدمی کو فارس[1] ہی کہا جانے لگا۔ یورپ میں قرن متوسط (تقریباً ساتویں آٹھویں نویں صدی عیسوی) شہسواری کا زمانہ ہے جس کا سبب بڑی حد تک ہارون رشید کا تحفہ ہے جس سے یورپ گھوڑے کی رکاب سے واقف ہُوا +

---

[1] فارس یعنی شہسوار

عورت کی تاریخ

اگر زمانہ صاحب زبان ہوتا اور تم اس سے عورت کی تاریخ پوچھتے تو یقیناً اسکے جواب سے تمہارا دل خون آلود ہو جاتا، نصف انسانیت کا یہ نرم حصہ وحشت کے ہاتھوں خانگی جانوروں کی حد تک پہنچ چکا تھا جہالت نے اسے مرد کی ملک محض کا مرتبہ دے رکھا تھا، عورت پر مرد کا تصرف و استعمال نہایتی خود مختارانہ تھا، وہ جب چاہتا اور جس طرح چاہتا، اس سے کنارہ کش ہو جاتا، بلکہ بعض ذاتی اغراض کی تکمیل میں اگر ضرورت ہوتی تو اسکا دامن ہستی بھی ہمیشہ کیلئے چاک کر دیتا، کچھ دنوں بعد اس نے غلامانہ درجے طے کئے، درقیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتی رہی تاآنکہ اقوام عالم کے نشیب و فراز نے اسے ایک کھلونا بنا دیا، جس سے اسکا مالک باوقات فرصت کھیلتا، اس زمانے میں وہ ایک پتلی تھی جو انواع و اقسام کے ریشمی کپڑوں اور گراں قیمت زیورات و جواہرات سے سجی اور لدی تھی لیکن بایں ہمہ اُسکے قلبِ خونیں کے اُن زخموں کا علم کسی کو نہ تھا جو ریشمی کپڑوں کے اندر چھپے تھے اور کسی نے انکے ضماد کی کوئی تجویز نہ سوچی +

عورت کی تاریخ ایک الم انگیز طویل داستان ہے اور سخت تعجب ہے کہ زمانہ قدیم سے اس غریب کا کوئی ہمدم نہیں یہ شروع ہی سے مخلصین اور معاونین کا سہارا نہیں رکھتی، عوام کی شریعت میں اسکی تحقیر بالکل منصوص تھی، وہ بجز اپنے مختصر دائرے کے عورت کیلئے سنگدل اور ٹھوس تھے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم جنہیں روشن دماغ اور ماہر زمانہ کہتے ہیں وہ بھی اس میدان میں صحیح المسلک نہیں اور غلط راستہ چل رہے ہیں، لاطینی شعرا عورت کے ظاہری جمال و حسن میں رطب اللسان ہیں انکے طویل قصائد عورت کے آثارِ نفس سے خالی ہیں، وہ متفقہ طور پر صنف نازک کی تعبیر "خوبصورت شیطان" یا "سرچشمہ مسرات" کرتے ہیں یونانی شعرا جیسے اسخیلوس اور یدیس وغیرہ عورت کیلئے، "مسرت عامہ" "فرحت گل" "بلائے عام" کے سے کلمات استعمال کرتے ہیں، اب رہا فلاسفہ کا طبقہ تو میں سب سے بڑے فلسفی افلاطون کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتی ہوں +

افلاطون آلہی، وہ افلاطون جسے غور و فکر کی تاریخ میں ایک پوری قوم ہونیکا مرتبہ حاصل ہے، وہ افلاطون جس نے عالم کائنات کی سعادت اور اصلاح کیلئے ملکی، سیاسی، ادبی، اخلاقی، علمی، غرض ہر موضوع پر اصلاحانہ قلم اُٹھایا ہے، وہ افلاطون جسکے افکار نہایت عمیق، جسکا نقطۂ نظر بہت بلند تھا، اس نے عورت کی اصلاح کیلئے کبھی غور نہیں کیا، نسوانی تہذیب اخلاق کا اسے کچھ اہتمام نہ تھا، اس نے عورت کی استعداد اور قابلیت معلوم کرنیکی کبھی کوشش نہیں کی کیا کہوں، کہ اس افلاطون نے اپنی عمر عبث گزاری، وہ ایک عورت ہی کا بچہ تھا جسے نہایت جرأت کے ساتھ ماں کہکر پکارتا تھا، افلاطون کا اعتقاد تھا کہ جو شخص اس عالم میں بزدل ہے دوسرے جنم میں اسکی روح کسی زنانہ پیرہن میں ظہور کریگی، یا کسی حیوانی جسم میں حلول کریگی۔۔۔۔ افلاطون کو یہ خبر نہ تھی کہ اسکا جدید فلسفہ، افلاطونی ایک عورت ہی کا رہون تعلیم اور شرمندہ تدریس ہوگا وہ نہیں جانتا تھا کہ مشہور ریاضی دان ثیونس کی لڑکی ہیپاشیا اسکندریہ کے مدرسہ میں اسکے فلسفہ کی معلمہ ہوگی اور اسکا بھرا ہوا شباب اور دلکش حسن جمال اسکے لئے علم و فن میں وحید العصر ہونے سے مانع نہ ہوگا، یہ شہید علم و اخلاص چوتھی صدی میں اسکندریہ کی سڑکوں پر رجماً قتل کیگئی اور دُنیا سے جدید فلسفہ افلاطونی کی اشاعت و تبلیغ کا شوق دل میں لئے رخصت ہوئی +

(از رسالہ شمع)

فہرستِ مضامین

جلد ۹	بابت ماہِ جون ۱۹۲۶ء	نمبر ۶

سرورق کے سوائے تمام رسالہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام نظام الدین پرنٹر چھپا

جہاں نُما

مشرق کی بیداری۔ سر ویلنٹائن چرول نے ایڈنبرا ریویو میں مشرق اور مغرب کے موجودہ باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز مضمون لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک عام انگریز شاید کبھی اس بات پر غور نہیں کرتا کہ وہ اپنی بعض نہایت معمولی ضروریات کے لئے سیاہ اور زرد فام قوموں کا رہینِ منت ہے۔ وہ یہ بات کبھی نہیں سوچتا کہ ایشیا، افریقہ اور جنوبی سمندروں کے جزائر میں لاکھوں زرد، اور سیاہ رنگ کے محنت کش مزدور روز و شب اپنا خون اور پسینہ ایک کر رہے ہیں تاکہ اسکے ناشتہ کے سامان کیلئے چائے، کافی کوکوا اور شکر، اسکے کپڑوں کیلئے اُون روئی اور ریشم، اسکی موٹر کاروں اور بائیسکلوں کے لئے ربڑ کے ٹائر، اور اسکی دوسری ضروریات کیلئے زمین کے سینہ کو پھاڑ کر نہ صرف سونا اور چاندی مہیا کریں بلکہ مختلف قسم کی دوسری دھاتیں بھی جو عہد حاضر کی ضروریات کیلئے ناگزیر ہے ہم پہنچائیں ایک عام انگریز نے ایک لمحہ کیلئے بھی کبھی اپنی توجہ اس سوال کی طرف مبذول نہیں کی کہ اگر دفعتہً سیاہ رنگ قومیں اسکے لئے کام کرنا چھوڑ دیں، تو انگلستان کی مادّی زندگی کی پُر پیچ اور نازک کل کا کیا حال ہو؟ اس قسم کا سوال ایک انگریز کے نزدیک بالکل بے معنی اور از سر تا پا لغو اور بیہودہ ہے، وہ اس بات کو بالکل خارج از امکان سمجھتا ہے کہ اس کی مغربی لاٹھی کے سامنے ایشیائی بھینس کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی سرتابی کا خیال دل میں لاسکتی ہے۔ لیکن کیا حقیقت یہی ہے؟ اور اگر ہے تو آخر کب تک یہ صورتِ حال قائم رہ سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی قومیں نسل، رنگ تہذیب، تمدن اور مذہب، معاشرت کے لحاظ سے ایک دوسری سے بالکل مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود ایک بات میں وہ سب ہم رنگ، ہم آہنگ ہیں، ان سب کے دلوں میں سفید قوموں کے تفوق، اقتدار کے خلاف ایک ایسی رَو دوڑ گئی ہے، کہ جب کوئی سفید آدمی اس سے کسی طرح آشنا ہوتا ہے تو لامحالہ اس پر ایک خوف کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔

مشرقی قوموں کے حالات پر اگر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام مشرقی ممالک میں آزادی کی ایک ایسی رَو چل رہی ہے کہ مشرقی قومیں مغربی اقتدار پرستوں کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے بحیثیتِ مجموعی بیتاب نظر آتی ہیں۔ ذیل میں مختلف مشرقی ممالک کی موجودہ حالت پر مختصراً تبصرہ کیا جاتا ہے:۔

جاپان اور چین:۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ جاپان میں آزادی کا خیال پیدا ہوا۔ اور جاپان نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ دنیا میں دوسروں کا مطیعِ فرماں ہو کر نہیں رہیگا۔ جاپان اپنے مقاصد میں جس قدر کامیاب ہوا ہے، وہ بالکل عیاں

ہے۔ آج جاپان کی بین الاقوامی حیثیت وہی ہے جو مغربی سلطنتوں کو حاصل ہے۔ جاپان کی اس ترقی کا اثر دوسرے مشرقی ممالک پر بھی پڑا، اور جب جاپان نے روس کو شکست دی، تمام مشرقی ممالک میں ایشیائی فخر و غرور کی ایک لہر دوڑ گئی، جس سے ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور یہاں بھی مغربی اقتدار سے آزادی حاصل کرنیکا خیال پیدا ہوا۔ چین ایک مدت تک اپنی قدیم تہذیب پر نازاں رہا۔ اس نے مغربی قوموں کو حقیر سمجھ کر انہیں اپنے ملک میں ہر طرح سے دخیل ہونیکی اجازت دیدی۔ لیکن جاپان نے ۹۵-۱۸۹۴ء کی جنگ میں چین کی اس مزعومہ طاقت کا بھرم کھولدیا اس زمانہ سے لیکر آجتک چین کبھی ۱۹۰۰ء کی انقلابی تحریک اور کبھی ۱۹۱۱ء کے انقلاب اور کبھی موجودہ عہد کی فوجی ہلچل اور انقلابی جدوجہد کے ذریعہ سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ کسی طرح اپنی قومیت کے نظام کو اس قدر مستحکم کرلے کہ مغربی اقوام کے اقتدار سے نجات حاصل ہوجائے، اس وقت چین مغربی تہذیب کو شکست دینے کیلئے روسی بالشویکوں کو بھی پیغام اتحاد دینے پر آمادہ ہے۔ مشرق کا خیال ہے کہ جنگ عظیم میں مغربی طاقتوں کا دیوالہ نکل چکا ہے، اور اُس کے دل پر اُن کا وہ پہلا سا رعب و اقتدار باقی نہیں رہا۔ یہ چین کی اس عظیم الشان اور بیباک جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ اب چین کی اقتصادی پابندیوں کو کم کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں +

ٹرکی۔ جنگ عظیم میں ٹرکی کو سخت شکست ہوئی، لیکن ترکوں نے بہت جلد اپنے ملک کو آزاد کرالیا۔ ٹرکی نے اب اُن تمام پابندیوں کا قلع و قمع کردیا ہے جو مغربی سلطنتوں نے اس پر عاید کر رکھی تھیں +

ایران۔ لارڈ کرزن نے ایران سے جو عہدنامہ لیا تھا اور جس کے مطابق ایران میں انگلستان کا اقتدار مسلم ہوا تھا۔ ایرانیوں نے اسکے پرخچے اُڑا دیئے ہیں اور ایران اب بالکل ایک آزاد سلطنت ہے +

افغانستان:۔ انگلستان تین سخت معرکوں کے بعد افغانستان پر جو چند پابندیاں عاید کرنے میں کامیاب ہوا تھا افغانستان اب اُن سے آزاد ہوچکا ہے۔

مصر۔ مصر ٹرکی کے اقتدار سے آزاد ہونیکے بعد انگریزی اقتدار کا جوا اپنے کندھوں سے اُتارنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اس وقت تک وہ بہت سے حقوق حاصل کرچکا ہے اور یہ عہد لینے میں کامیاب ہوا ہے کہ بہت جلد اسے ایک آزاد سلطنت کی حیثیت حاصل ہوجائیگی +

ریف۔ شمالی افریقہ میں فرانس اور ہسپانیہ ابھی تک ریف والوں سے برسرِ جنگ ہیں۔ اور امیر عبدالکریم نے اُن کا اس قدر سخت مقابلہ کیا ہے کہ ان دونوں کی متحدہ فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے ہیں +

شام۔ شام کے عظیم الشان ہنگامے میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہے، جسکے ماتحت دوسرے مشرقی ممالک مغرب سے

روگرداں ہو رہے ہیں۔ اب مشرقی دماغوں میں مغرب کے اقتدار کے خلاف ایک عظیم الشان ہیجان پیدا ہو گیا ہے، پچھلے دنوں ہندوستان میں سوراج کی تحریک نے بھی انگلستان کیلئے ایک نہایت اہم صورت اختیار کر لی تھی۔ دراصل یہ تمام ہنگامہ و فساد اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے برپا ہو رہا ہے۔ مغرب نے ایک عرصہ تک مشرق کو اس کی دولت اور اسکے قدرتی حقوق سے محروم کئے رکھا۔ مشرق پر ابتک غفلت کی نیند طاری رہی، اب وہ اس خوابِ غفلت سے چونک اُٹھا ہے اور مغرب کو بتا رہا ہے کہ وہ بھی مغرب ہی کی طرح زندہ رہنے کا حقدار ہے ٭

آزاد مسلمانوں کی نعداد:۔ رسالۂ ماڈرن ریویو لکھتا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۲۳ کروڑ ہے، جن میں سے ۱۹ کروڑ یورپی طاقتوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں گویا آزاد مسلمانوں کی تعداد صرف ۴ کروڑ ہے۔ "ماڈرن ریویو" نے اس حقیقت پر رائے زنی کرتے ہوئے بالکل بجا کہا ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں میں حقیقی مدبر موجود ہوں، تو انہیں اسلامی سلطنتوں کے زوال و ہبوط کے اسباب پر غور کرنا چاہیئے۔ دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانا یا ہندوؤں کی بعض شعبوں میں ترقی کی رفتار کو بنگاہِ حسد دیکھنا بالکل بیفائدہ ہے۔ ہندو خود غلام ہیں۔ بلکہ ہندو غلاموں کی تعداد مسلمان غلاموں سے زیادہ ہے۔ اغیار کے عطیات کو اپنے لئے استخوانِ تنازع بنا لینا اس قوم کے شایانِ شان نہیں جس کے فیض نے مشرق و مغرب کو سیراب کیا اور جس نے اقصائے عالم سے جہالت اور بربریت کو مٹا کر وحشیوں کو انسان بنایا ٭

یوجین سینڈو:۔ رومامیں دس سال کی عمر کا ایک دُبلا پتلا لڑکا اپنے باپ کے ساتھ اعاظم روما کے سنگ مرمر کے مجسموں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہ بُت جسمانی صحت اور طاقت کا ایسا مکمل نمونہ تھے کہ انکو دیکھ کر اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے اُنکے سڈول اور خوبصورت جسموں سے اپنے نحیف و منحنی بدن کا مقابلہ کیا اور پھر اپنے دل میں ایک خاموش عہد کیا کہ میں بھی انہیں کی طرح قوی ہیکل اور توانا بنونگا ٭

اس بات کو پچاس سال گزرے ہیں، حال ہی میں اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر۔ یوجین سینڈو کا انگلستان میں انتقال ہُوا ہے۔ سینڈو اپنی طاقت کے لئے شہرۂ آفاق تھا اور دُنیا بھر میں سب سے زیادہ قوی انسان سمجھا جاتا تھا۔

سینڈو اپنے مداحوں سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر شخص جو میرے وضع کردہ اصول پر عمل کرے، مجھی جیسا طاقتور اور توانا ہو سکتا ہے۔ اپنے اس قول کی تصدیق میں وہ خود اپنے آپ کو پیش کرتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے اُسی نے دُنیا کے سامنے ریاضتِ جسمانی کے لئے ایک باضابطہ طریقہ پیش کیا جو چند خاص اصول پر مبنی تھا طاقتور بننے کے آٹھ طریقے جو اس نے بتائے حسب ذیل ہیں:۔

رہتے ہیں۔ وہ اگر اہلِ بہاء کی تفسیق و تکذیب اور تکفیر کریں تو یہ انکی سنتِ قدیمہ اور جانی پہچانی ہوئی رسم و عادت ہے۔ علاوہ ازیں ایران میں تو مسلمانوں کی وہ جماعت رہتی ہے۔ جو صدرِ اسلام سے لیکر ابتک اور اول سے لیکر آخر تک بجز اپنے خیال کے لوگوں کے باقی سب کو "کافر" کے علاوہ کچھ اور بھی کہنے کی عادی ہے۔ رہی ایرانی سلطنت اور اسکا فیصلہ سو یہ بھی انوکھی بات نہیں۔ کیونکہ وہاں بھی تو حکومت کی باگ ڈور انہی اربابِ عمائم کے ہاتھ میں رہی ہے ؛

میں عنقریب بہائی رسالہ "سٹار آف دی ویسٹ امریکہ" سے حضرت باب اور حضرت بہاء اللہ کے حالات ترجمہ کرکے اور اس کے بعد اگر فرصت ہوئی تو بہائی معتقدات کے متعلق مضامین پیش کرونگا۔ تاکہ ناظرینِ ہمایوں کو معلوم ہو جائے کہ اہلِ بہاء کا کیا خیال ہے۔ اہلِ بہاء کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی کے ہفتہ وار بہائی اخبار "کوکب ہند" کا مطالعہ ضروری ہے گو اس تحریک کے متعلق اور بھی متعدد رسائل کئی زبانوں میں مختلف دیار و امصارِ عالم سے شائع ہوتے ہیں۔ فقط ؛

دیوارِ چین، ابو الہول، اہرامِ مصر

دیوارِ چین - یہ عظیم الشان اور شہرۂ آفاق دیوارِ چین کی شمالی و مغربی سرحد پر واقع ہے اور خلیج پیکلی سے شروع ہو کر کانسو کے صوبہ کے شمالی و مغربی گوشہ تک وادیوں اور پہاڑوں پر ڈیڑھ ہزار میل تک پھیلتی چلی گئی ہے ہر دو سو گز کے فاصلہ پر دیوار میں چالیس فٹ بلند گنبد بنے ہیں دیوار کی بلندی مختلف مقامات پر مختلف یعنی ۱۵ سے لیکر چالیس فٹ تک ہے۔ بنیاد کے قریب دیوار ۲۵ فٹ چوڑی ہے اور چوٹی پر اسکا عرض ۱۵ فٹ تک ہے لیکن مختلف مقامات پر دیوار کی عام حالت اسکی بلندی اور اسکا عرض مختلف ہے، پیکنگ کے قریب تو اس کی بلندی چالیس فٹ کے قریب ہے، اور یہ اتنی چوڑی ہے کہ اس پر ایک وقت میں دو گاڑیاں مخالف سمتوں سے گزر سکتی ہیں لیکن بعض زیادہ دور افتادہ مقامات میں دیوارِ چین محض مٹی کی ایک کچی دیوار رہ جاتی ہے جو بیس فٹ سے زیادہ بلند نہیں چوڑائی میں بھی بہت کم ہے اور اس میں جگہ جگہ دراڑیں ہیں جن کا عرض بعض حالتوں میں آدھ میل کے قریب ہے، یہ دیوار ۲۱۴ سنہ قبل مسیح میں شہنشاہ شیہانگٹی نے تاتاریوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے تعمیر کرانی شروع کی، اور دس سال میں اسکی تکمیل ہوئی یہ دیوار عجائباتِ دنیا میں شمار کی جاتی ہے ؛

ابو الہول اور اہرامِ مصر - ابو الہول مصرِ قدیم کا ایک بہت بڑا بت ہے جو چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے یہ ۱۷۰ فٹ لمبا اور ۷۰ فٹ اونچا ہے۔ اسکا جسم اور پنجے شیر کے مانند اور سینہ اور چہرہ عورت کی طرح ہے۔ ابو الہول مصر کے قدیم ترین آثار میں شمار کیا جاتا ہے ؛

اہرامِ مصر - اہرام قدیم مصری بادشاہوں کے تابوت پر بطورِ یادگار اینٹ یا پتھر سے تعمیر کئے جاتے تھے ایک ربع بنیاد پر چار مثلث وضع کی دیواریں اس طرح قائم کی جاتی تھیں کہ اوپر جا کر انکے سرے آپس میں مل کر ایک نوکیلی چوٹی کی صورت بنا دیں۔ اہرام کا زمانۂ تعمیر ۴۰۰۰ سنہ سے ۲۰۰۰ سنہ قبل مسیح ہے ان میں سے چالیس اہرام ابتک موجود ہیں جو ہرم ابو الہول کے بت کے پاس ہے یہ سب سے بڑا ہے اسکی بلندی ۴۵۰ فٹ ہے اور اس کی بنیاد کے مربع کے ضلعے ۷۰۰ فٹ لمبے ہیں اسکے وزن کا اندازہ (۴،۸۸۳،۰۰۰) ٹن کیا گیا ہے۔ اس سے قبل یہ معلوم نہ تھا کہ اہرام میں داخل ہونیکا راستہ بھی ہوتا ہے اب معلوم ہوا ہے کہ ہر ہرم میں داخل ہونے کے لئے ایک پیچیدہ اور بظاہر غیر معلوم راستہ بھی رکھا گیا ہے ؛

حامد

بارگاہِ کبریا

(صدائے عشق)

اے تو کہ جنبشیں تری ہر شاخسار میں
اے تو کہ شوخیاں تری ہر جوئبار میں
اے تو کہ راگنی تری ہر آبشار میں
اے تو کہ تیری گونج ہے ہر کوہسار میں
آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

اے باکمال دشت کی وسعت میں تو ہی ہے
اے ذوالجلال بحر کی عظمت میں تو ہی ہے
اے لازوال کوہ کی شوکت میں تو ہی ہے
گل میں عیاں ہے تو تو ہی پنہاں ہے خار میں
آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

انساں کے دل میں تو نے رکھی اپنی آرزو
آوارہ وہ ترے لئے رہتا ہے چارسو
حق ہے کہ زندگی ہے فقط حق کی جستجو
پھر کس طرح سکوں ہو سکون و قرار میں
آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

دنیا میں سینکڑوں کو دیا میں نے اپنا دل
وہ دل کہ اب ہے کثرتِ جذبات سے خجل
اے روحِ عشق میری محبت ہے مضمحل
سارے جہاں کا حسن ہے تیرے نکھار میں
آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

آنکھوں کو فرشِ راہ بناؤں ترے لئے
دل کو سبق عمل کا پڑھاؤں ترے لئے
ہے آرزو کہ جاں بھی گنواؤں ترے لئے
رکھا ہے خاک زندگیٔ مستعار میں
آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

ب

تاریخ مصوّری ہند

ہندوستان میں زمانۂ تاریخ سے پہلے کی قلمی تصاویر کے نمونے شاذونادر پائے جاتے ہیں لیکن "دوچار" جو نظر سے گذرے فی الحقیقت دلچسپ ہیں۔

کوہِ کیمور واقع وسط ہندوستان کے غاروں کی دیواروں پر شکار کے منظر بنے ہوئے ہیں۔ اِن سے گو قلم کی خامی ظاہر ہوتی ہے تاہم ہندوستان کی ابتدائی تصویرکشی کے اہم نمونے ہیں۔ دَورانِ تحقیقات میں کوہ وندھیا سے آخری حصۂ "عہدِ حجر" کی تصاویر برآمد ہوئی ہیں۔ یہیں سے پسا ہُوا گیرو۔ سِل۔ بٹّے اور دیگر اشیا ایسی دستیاب ہوئیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ "عہدِ حجر" میں یہ مقام بھی تصویرکشی کا ایک مرکز تھا۔

چندسال گذرے موضع سنگنپور واقع ریاست رائے گڑھ (ممالک متوسط) کے قریب دریا مانڈ کی مشرقی پہاڑیوں کے غاروں میں متعدد تصاویر دیکھنے میں آئیں۔ محققین ہمخیال ہیں کہ یہ تصاویر بلاشبہ عہدِ تاریخ نویسی سے قدیم تر اور اسلاف ہند کے مذاقِ تصویرکشی کی شاہد ہیں۔ اگرچہ خیال کی سادگی اور اصولِ پیکرنگاری سے خلاف ورزی ناواقفیتِ فنِ تصویرکشی ظاہر کرتی ہے تاہم اس سقم کے باوجود یہ تصویریں متقدمین کے کارناموں کا ایک دلچسپ نمونہ ہیں۔ ان میں انسان اور حیوانات کی شبیہیں گیرو سے کھینچی گئی ہیں۔ اور اُن کے متصل عروفِ شبیہ بھی بنے ہوئے ہیں۔ بعض چوپائے خصوصاً بارہ سنگا۔ ہاتھی اور خرگوش خوب بنائے ہیں۔ اُنکی حرکت و رفتار سے ولولہ، شوخئ قلم اور چابک دستی ہویدا ہے۔ ایک غار میں شکار کا منظر نہایت خوش اسلوبی سے دکھایا ہے۔ چند اشخاص ایک زبردست ارنے بھینسے کو قابو میں لانیکی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض زخمی ہوکر زمین پر گر پڑے ہیں اور بعض گر رہے ہیں۔ اسی دیوار پر ایک اور شکار کا منظر ہے جس میں بھینسا برچھیوں سے زخمی ہوکر دم توڑ رہا ہے۔ شکاری چاروں طرف کھڑے ہیں جن کے چہروں سے خوشی و انبساط نمایاں ہے۔

افسوس تصاویر کا زیادہ حصہ مٹ جانے سے موضوع سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر بھی جو کچھ باقی رہگیا غنیمت ہے۔ اس قدیم مصوّر نے ایک گیرو کے ٹکڑے سے چٹان کی ناہموار سطح پر ایسی بے تکلفی اور سبک دستی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ چہروں پر جذبات نمایاں کرنیکی خداداد قابلیت اور قدرت کا قوی ثبوت ملتا ہے

دورانِ تحقیقات میں غاروں کے آس پاس آلاتِ سنگ دستیاب ہوئے ہیں جن سے ان تصاویر کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے کہ "عہدِ حجر" کی یادگار ہیں +

منجملہ دیگر مقامات کے جہاں زمانہ قدیم کی تصاویر تحقیق ہوئیں ضلع مرزاپور واقع ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے متعدد غار ہیں۔ ان میں نہایت دلچسپ تصاویر کے خاکے گیرو سے کھینچے ہیں۔ شکار کا منظر موضوع خاص ہے۔ گینڈے اور سانبھر حقیقت میں ہوبہو بنائے ہیں۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ مذکور خاکے کوگل واقع ملک اسپین کے مشہور غاروں کی تصاویر سے بالکل مشابہ ہیں جو ارگ نیسین (Aurignacian) انسان کے کارنامے سمجھے جاتے ہیں (ارگ نیسین انسان کے عہد کو سترہ ہزار برس کا عرصہ ہوا) اس اعتبار سے رائے گڑھ اور مرزاپور کے غاروں کی باقاعدہ تحقیقات غالباً صرف پیکر نگاری کی ابتدا ہی کے سربستہ راز کو آشکار نہیں کریگی بلکہ شرقی ممالک میں انسان کے آباد ہونے کے زمانہ پر بہت کچھ روشنی ڈالیگی +

یہ امر مسلم ہے کہ ہندوستان میں شروع حصہ "عہدِ حجر" کے کارنامے عموماً اور پیکر نگاری کے نمونے خصوصاً شاذ و نادر پائے جاتے ہیں۔ جو تصاویر قدیم تہذیب ہندوستان کا نمونہ ہیں اور جن کا زمانہ معین کرنا ظاہراً غیر ممکن ہے اور وہ تصاویر جن کا زمانہ معین کیا جا سکتا ہے دونوں میں غالباً ہزارہا سال کا فصل ہے۔ سب سے پہلی تصاویر جن کا عہد معین کیا جا سکتا ہے، جوگی مارہ غار کی دیواروں پر بنی ہوئی ہیں۔ یہ غار کوہ رام گڑھ کے اس حصہ میں ہے جو ریاست سرگوجہ (ممالک متوسط) کے حدود میں واقع ہے۔ مذکورہ غار کی دیواروں پر پلستر کر کے تصاویر بنائی گئی ہیں۔ ان کا زمانہ ایک صدی قبل سنہ عیسوی یعنی زائد از دو ہزار سال خیال کیا جاتا ہے۔ پہلی نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ ناہموار سطح پر بے میل، بے جوڑ، لایعنی اور بے ڈول شکلیں کسی نوآموز کے ہاتھ سے بجائے قلم کے کوچی سے بنی ہوئی ہیں جن میں سرخ اور سیاہ رنگوں کا پوتا پھرا ہوا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ مابعد میں ان کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی جس سے قدیم قلم کا روپ تقریباً زائل ہوگیا۔ یہ تصاویر مختلف حصوں میں منقسم ہیں اور ہر ایک کا موضوع جداگانہ ہے مثلاً عمارات جانور اور انسان کی تصاویر۔ ہر موضوع کی تصویر کا حاشیہ مچھلی، مگر اور دیگر آبی جانوروں کی شکلوں سے مزین ہے اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس قصہ سے انکا تعلق ہے۔ تمام تصاویر بہت کچھ مٹ گئی ہیں اور ان کا کام اسی عہد کی دیگر تصاویر کے مشابہ ہے +

گمانِ غالب ہے کہ بودھ مذہب کی اشاعت سے قبل اکثر مکانات جو پہاڑوں میں چٹانوں کو کاٹ کر

بنائے گئے تھے تصاویر سے آراستہ تھے لیکن ہندوستان کی مضرت رساں آب و ہوا نے انکو نیست و نابود کر دیا عہدِ عتیق میں سکونتی مکانات عموماً چوب اور خام خشت سے تعمیر کئے جاتے تھے دیواروں پر چونے کا پلستر یا چکنی مٹی سے کہگل کر کے مختلف موضوعات کی تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ ایسی غیر مستحکم عمارات کا زمانہ حال تک قائم رہنا ناممکن تھا۔ بدیں وجہ اس عہد کی تصاویر بھی معدوم ہو گئیں۔

جوگی ماڑہ غار میں سنہ عیسوی سے پہلے کی تصاویر دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں تصویر کشی ابتدائی حالت میں تھی لیکن اس خیال کی مخالفت میں قدیم کتب کی قوی شہادت موجود ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صدہا سال قبل از سنہ عیسوی ہندوستان میں پیکر نگاری درجہ اعلیٰ پر پہنچ گئی تھی اور جذبات و خیالات کو شبیہہ پر نمایاں کرنے میں اہلِ ہند کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ یہ دونوں واقعات متضاد ہیں۔ اکثر مؤرخوں نے سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں دیکھا کہ شاعروں کے خیالات اور رزم و بزم کے بیانات میں جن سے بقول مؤرخوں کے پیکر نگاری ماخوذ و مستخرج ہے ترمیم کر دیں۔ اُنکی رائے ہے کہ ایسے ادق موضوع اور باریک و مشکل دستکاری پر جیسی کہ پیکر نگاری ہے بحث کرنے میں سوائے اُن چند کمیاب رسالوں کے جن میں پیکر نگاری کی ہدایات درج ہیں دیگر کتابی حالات و شاعرانہ مناقب وغیرہ چنداں مستند نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو پیکر نگاری کے وجود و رواج کی شہادت کا ضمیمہ قرار دے سکتے ہیں۔

مؤرخوں کی رائے جو کچھ ہو مگر ہمارے خیال میں یہ قرینِ قیاس ہے کہ بودھ مذہب کی اشاعت سے صدہا سال پہلے مصوری اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گئی تھی جس کی قدیم کتب شاہد ہیں لیکن مرورِ زمانہ اور حکامِ وقت کی ناقدرشناسی سے بعد کو زوال پذیر ہو گئی اور جوگی ماڑہ غار کی تصاویر زوال یافتہ مصوری کے نمونے ہیں۔

ہندوستان کی پیکر نگاری کی ابتدا ایک افسانہ سے کم نہیں۔ ایک برہمن اپنے لڑکے کے انتقال سے نہایت ملول تھا۔ اُس نے بہت کچھ منت و زاری کی لیکن تحت الثریٰ کے دیوتا یامہ نے متوفی لڑکے کو واپس نہ دیا۔ پھر دیوتا برہما نے رحم کھا کر ایک بادشاہ کو متوفی لڑکے کی شبیہہ کھینچنا سکھائی۔ تصویر تیار ہوئی۔ تو دیوتا نے اس میں جان ڈال دی۔ ہندی مورخوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی ابتدا کو کسی دیوتا یا راجہ سے منتعلق کرتے ہیں۔ پیکر نگاری سے برہما کا تعلق اس لئے موزوں و مناسب ہوا کہ وہ اپنی دوسری صفت وشواکرما کی وجہ سے دنیا کی تمام صنعت و حرفت کا دیوتا متصور ہوتا ہے۔ اسی قسم کے اور افسانے بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شبیہہ کشی کی طرف قدیم زمانہ سے زیادہ توجہ رہی ہے اور اکثر عہدِ عتیق میں بادشاہوں

نے پیکر نگاری کا شوق کیا ہے۔ اس موقع پر شہزادی ادشا کا قصہ برمحل ہوگا۔ شہزادی ادشا نے ایک جوانِ رعنا کو خواب میں اپنے ہمراہ ہوا خوری کرتے دیکھا۔ اُسکے دلفریب حُسن پر فریفتہ ہوگئی۔ آنکھ کھُلی تو بے چین اور حیرت زدہ تھی کہ وہ جوان کون تھا۔ اپنی سہیلی چتر ا لیکھا سے خواب کہا۔ چتر ا لیکھا میں شبیہ کشی کی قابلیت خداداد تھی۔ شاہزادی کی تشفی کے لئے اُس نے تمام دیوتاؤں۔ شاہانِ وقت اور سربرآوردہ لوگوں کی تصویریں کھینچیں۔ کرشنا کے پوتے انی رودہا کی تصویر دیکھتے ہی شاہزادی ادشا پہچان گئی کہ اسی کو خواب میں دیکھا تھا (پھر دونوں کی شادی ہوگئی)۔

سنسکرت اور پالی کتب سے ثابت ہے کہ قدیم مصوروں کو دیواروں پر تصاویر بنانے میں کامل دسترس تھی۔ ونایا پی ٹہک (یہ کتاب تیسری یا چوتھی صدی قبل مسیح زبان پالی میں لکھی گئی تھی) شاہد ہے کہ بادشاہ پاسی ناداکے مختلف نشاط خانوں اور بزم گاہوں میں چتنا گرا یعنی تصویر خانے بنے ہوئے تھے۔ جن کی دیواریں مختلف مناظر کی تصاویر اور نقش و نگار سے آراستہ تھیں۔ رامائن میں جس کی قدامت مسلم ہے، اکثر تصویرخانوں کا ذکر آیا ہے۔ یہ تصویر خانے حقیقتاً عہد بودہ کے مصوروں کے رہنما تھے جنہوں نے اجنٹا اور باغ وغیرہ کے غاروں کو ہندوستان میں۔ سیگریا کے مندر کو لنکا میں۔ تبت۔ نیپال و چین کے منادر کو نیز ختن میں دندان ادق کی عمارات کو لاثانی قلمی تصاویر سے مزین کیا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں الورا اور الفنٹا کے غار۔ سرنا تھ۔ امراوتی اور سانچی وغیرہ کی عمارات۔ ملکِ سیام میں انکور کے چہل ستون اور جزیرہ جاوا میں بوروبدر کے مندر کو بے نظیر اصنام سے آراستہ کیا تھا۔ قدیم سنسکرت اور پالی زبانوں میں ایسے رسالے اور بھی ہیں جن کا تعلق پیکر نگاری سے ہے مگر جن قدیم کتب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ شاہد ہیں کہ عہدِ عتیق سے اس فن کو وقعت و برتری حاصل تھی۔ شاہانِ وقت خود اس کے شائق تھے۔ اپنے محلات اور درباری کمرے تصاویر سے مزین کرکے فن کی حمایت و رعایا کی قدر کرتے تھے۔

تبت کے رہنے والے سترھویں صدی عیسوی کے ایک مورخ تارا ناتھ نے ہندوستان کے دیگر فنون پر عموماً اور پیکر نگاری پر خصوصاً جو معرکتہ الآرا بحث کی ہے اس سے ثابت ہے کہ گوانم بودہ کی وفات ۴۸۰ سنہ قبل مسیح سے بہت پہلے ہندوستان کی صنعت و حرفت ترقی کرکے درجہ اعلیٰ پر پہنچ چکی تھی۔ مورخ مذکور نے فنِ پیکر نگاری کے اظہارِ کمال میں مبالغہ کیا ہے حتیٰ کہ جو دلفریب تصاویر دیواروں پر بنائی گئی تھیں انکو وہ دیوتاؤں کے کارنامے تصور کرتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ اِس فن کو یاکشاون اور ریپنیا یا نا یعنی نیک بندوں

نے جاری رکھا۔ اُن کاریگروں کو الہامِ رّبانی ہوتا تھا اور بادشاہ اشوک نے ۲۵۰ قبل مسیح ان سے کام تیار کرائے۔ بعد کو حکیم ناگرجن جو ۲۰۰ء کے زیرِ اہتمام فرقۂ ناگا نے جو صفاتِ ملکوتی سے متصف تھا اس فن کو زندہ رکھا۔

قبل از عہدِ بودھ ہندوستان میں سونگ یعنی چھ عضوِ (اصول) پیکر نگاری جاری تھے چنانچہ مورخ وتسیا یاما نے جو ۳۰۰ء میں گذرا ہے کسی قدیم تر کتاب سے اصول سونگ یعنی اصول ستہ شبیہ کشی اپنی کتاب کاما سوترا میں نقل کئے ہیں۔ جن کا ترجمہ ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے :۔

(۱)۔ روپا بھیدا یعنی علم اشکال الحیوان۔ اس میں کائناتِ فطرت کا مطالعہ۔ علم معماری اور اجمالی مناظر شامل ہیں۔

(۲)۔ پرامانم یعنی تناسب لیکن اس سے تشریح الاجسام اور علم مناظر و مرایا کا بھی تعلق ہے۔

(۳)۔ بھاوا یعنی جذبات کا چہرہ پر نمایاں کرنا۔

(۴)۔ لاوانیا یوجانم یعنی لطافت وحسن۔

(۵)۔ سدری سیام یعنی تشبیہ۔

(۶)۔ وارنی کا بھنگا یعنی آلات ولوازمِ تصویرکشی کا صحیح استعمال اور اصول کی شدید پابندی۔

یہ چھ اصول خود شاہد ہیں کہ متقدمین نے کامل غور اور تحقیق کے بعد فنِ پیکر نگاری کو ان پر مبنی کیا۔ عہدِ بودھ کی تصاویر سے ثابت ہے کہ اس زمانہ کے مصوّر سختی سے ان پر کاربند رہے بلکہ حقیقت میں ہر عہد اور زمانہ کے ہندوستانی مصوّر ان بے بہا ہدایات پر برابر عمل کرتے رہے ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی خیالات کی تبدیلی کے ساتھ تصاویر کے موضوع میں بھی تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ بودھ مذہب کی اشاعت وتبلیغ کی بدولت فنونِ پیکر نگاری وبت سازی پر مذہبی رنگ چڑھا جس کے بے بہا نمونے آجتک ہندوستان۔ لنکا۔ جاوہ۔ نیپال۔ تبت۔ چین۔ ختن وغیرہ ملکوں میں موجود ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ بودھ سے بہت پہلے مذہبی تصاویر ہندوستان میں رائج تھیں اور انکے بنانے کی خاص ہدایات کتاب ستر الکسانا یعنی اصولِ مصّوری میں درج ہیں جو عہدِ بودھ سے قدیم تر ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ باب وہ ہے جس میں دیوتاؤں اور بادشاہوں کو غیر معمولی عریض و طویل القامت اور مختلف مدارج کے لوگوں کو اُنکی حیثیت کے مطابق لمبے چوڑے بنانیکی ہدایت کی گئی ہے۔ (کچھ ہندوستان ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ عہدِ عتیق میں دوسرے ممالک

کے مجسمہ ساز و صنم تراش بھی اس اصول پر کاربند رہے ہیں)۔

دیوتاؤں کے چہروں کے متعلق ہدایت ہے "صاف نقوش و باریک خطوط سے چوکھونٹا اور دلکش چہرہ بنایا جائے جس میں صفاتِ برگزیدہ نمایاں ہوں۔ مثلث۔ خمیدہ۔ بیضاوی اور گول چہرہ سے پرہیز کرنا چاہئیے۔" "جو شخص چہرہ کو ان ہدایات کے تحت میں بنائیگا اُس پر ہمیشہ رحمت نازل ہوتی رہیگی۔ دیوتا اور بادشاہ کے بال باریک گھونگروالے آسمانی رنگ کے ہوں۔ معمولی طبقہ کے شخص کا چہرہ جو صلح پسند ہو۔ لمبا۔ گول یا مثلث بنا سکتے ہیں"

صرف عورتوں کی تصاویر بنانے میں مصور کو آزادی دی گئی ہے مگر خاص ہدایات کے ساتھ مثلاً تصویر میں جوق کے جوق عورتوں کے دکھائے جائیں۔ انکے جسم سڈول۔ قد میدھے۔ چہرے شرمگین ہوں۔ گوشت و پوست سے شباب اور جوبن ٹپکتا ہو اور موزوں مواقع پر اشکالِ مختلفہ کے اجتماع سے تصویر کو دلکش و دلچسپ کر دیا جائے۔ علاوہ ہدایاتِ مندرجہ بالا کے اس رسالہ میں اور بھی علمی دقائق و نکات ہیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فنِ پیکر نگاری کو ہندوستان کی قدیم تہذیب میں بہت اہمیت حاصل تھی +

۳۲۰ء میں خاندانِ گپتا کے عہدِ سلطنت و عروج میں شلپا شاستر مرتب ہُوا۔ اس میں بھی ابتدائی اصولِ پیکر نگاری مندرجۂ سترالکسانہ کا کم و بیش تتبع کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں جو عیش و عشرت اور اختلاط و اجتماع کی شکلیں مروج تھیں ان کا ایک ضخیم مجموعہ حکیمانہ ترتیب سے شلپا شاستر میں مرتب کر دیا گیا ہے +

زمانہ حاضرہ میں بھی ان ہی قواعد کے تحت میں تصاویر بنائی جاتی ہیں۔

اِن کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحت تشبیہ۔ تناسبِ اعضاء اور چہرہ سے اظہارِ جذبات کی بہت تاکید ہے اور قدیم تصاویر میں ہدایات متذکرہ کی پوری پوری پابندی کیگئی ہے!

محمد حامد (دہلوی)
تاج محل
بھوپال

انوارِ قُدس

جسے تُو زندگی سمجھے ہُوئے ہے — وہ اِک تصویر ہے حرص و ہوا کی
تگ و دو بہرِ زر بہر خور و نوش — بلا کی ہے! بلا کی ہے! بلا کی!
تجھے کچھ اَور بننا چاہیئے تھا — مگر تُو ہے ابھی خاکی کا خاکی
تو جس تہذیب پر نازاں ہے ناداں! — وہی تمہید ہے تیری فنا کی
تمدّن حیلۂ تن پروری ہے — توقع برقِ خاطف سے بقا کی؟
توازن چاہیئے جذباتِ دِل میں — ہے خواہش گر حقیقی ارتقا کی
بہیمیّت بھی ہے ازبس ضروری — کہ اِس پر ہے مدارِ جزو خاکی
مگر تو سر بسر خاکی نہیں ہے — کبھی کی فکر تُو نے ما بقا کی؟
ترے سینے میں ہے آئینۂ قدس — ضرورت ہے جسے ازبس جِلا کی
محبت کی جِلا اس چیز کو دے — یہ جاذب ہے نگاہِ آشنا کی

محبت کی جِلا سے طور ہو جا
کِسی کے نور سے معمور ہو جا

امینِ حزیں

حُریّت اور اسلام

۳

اسلامی سلطنتوں کے طریقِ سیاست رانی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر لینے کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ نظامِ حکومتِ اسلام کی ہیئتِ عمومی کے متعلق ایک صحیح اندازہ قائم کر سکیں۔ اب ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے اسلام نے اقوامِ عالم کی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی زندگی کو جن لازوال فیوض سے سیراب کیا ہے، اس کا جواب دنیا کی کسی ایک قوم یا مذہب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی طرزِ حکومت کے جو ممتاز خصائص بیان کئے گئے ہیں، ان کا لحاظ کرتے ہوئے تاریخِ اسلام میں ایسے حکمران بھی ملتے ہیں جنکے اعمال اسلام کے شعائرِ خصوصی سے متصادم ہوتے رہے ہیں لیکن اُن کی یہ گم کردہ راہی طبعی میلانات و رجحانات کا نتیجہ تھی نہ کہ اسلام کی تعلیم کا اثر۔ جس طرح دنیا کے بعض ایسے مسلمانوں کے افعال سے جو بہ ظاہر تو اسلامی اعتقادات کے مدعی ہیں مگر در اصل اُن کا چلن کفر والوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے، اسلام کی اصل رُوح کا اندازہ قائم کر لینا خلافِ دانش ہے، اُسی طرح کسی گمراہ مسلمان حاکم کے طرزِ عمل کو تعلیماتِ اسلامی کا معیار قرار دے لینا شیوۂ انصاف کے قرین نہیں۔ مہرِ جہانتاب کی لمعانیوں کے نظارہ کے لئے اگر وہی اوقات انتخاب کر لئے جائیں جب اسکے تابناک چہرہ پر ابر کی تاریک نقاب پڑ گئی ہو، تو سوائے اسکے کہ نظارگی کے حسنِ انتخاب کی نوحہ خوانی کیجائے، اور کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے، ورنہ مذہبی رواداری مساواتِ حقوق، احترامِ آزادیٔ بنی نوعِ انسان اور جمہوریت کے وہ لوازم جو یورپ کی بڑی سے بڑی شائستہ حکومت میں بھی نہ ملیں گے، اعلیٰ ترین درجۂ ارتقا کو پہنچے ہوئے، اسلامی سلطنتوں میں کم و بیش ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ حُرمتِ عدل کا لحاظ یہاں تک کیا جاتا تھا کہ محکمۂ عدالت کے اختیارات حکومت کے دباؤ سے ماوراء تسلیم کئے گئے تھے۔ اس کا فیصلہ اٹل اور غیر متغیر خیال کیا جاتا تھا اور خلفائے راشدین کے بعد بھی مختلف زمانوں میں اسلام کے تاجداروں نے عدالت کے صادر کئے ہوئے فیصلہ کو بدلنا خلافِ اصول قرار دیا۔ بلکہ حکمرانوں کو بعض دفعہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے اُن کا جواز عدالت کے سامنے ثابت کرنا پڑتا تھا۔ بہ طورِ تمثیل کے، میں خلافتِ حیدری کا ایک واقعہ پیش کرونگا کہ خلافتِ راشدہ ہی مسلمانوں کے منور نسخۂ حکومت کا دیباچہ

ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ مُسلم اور غیر مُسلم کا امتیاز اسلامی عدالت کی حضور میں مفقود و محض ہو جاتا تھا۔

جنگ صفین میں حضور علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی ایک زرہ گم ہو گئی۔ جب آپ مراجعت فرمائے کوفہ ہوئے تو اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھ کر فرمانے لگے کہ یہ زرہ تمہیں کہاں سے ہاتھ لگی۔ یہ تو میرا مال ہے۔ یہودی کی شوخ چشمی ملاحظہ ہو، باوجودیکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس شخص کے مال پر اُس نے دستِ تصرف دراز کیا ہے وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ ایک عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ اس سے بہ جبر اپنا مال وصول کرلے کہ یہ جبر بھی حق پر مبنی ہے، لیکن صاف انکار کر گیا اور کہنے لگا کہ نہیں، یہ میرا مال ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر میرا قبضہ ہے اور قبضہ دلیلِ ملکیت ہے۔ حضرت علیؓ اس منطق کا جواب نہ پا کر کہنے لگے کہ اچھا چلو قاضی کے پاس چلیں۔ منصبِ قضاۃ پر ابو شریح مامور تھے۔ انکے اجلاس میں جب حضرت علیؓ بہ حیثیتِ مدعی اور یہودی بہ حیثیتِ مدعی علیہ حاضر ہُوا تو انہوں نے حضرت کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ امیر المومنین! کہیئے آپکو کیا کہنا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہودی کے پاس جو زرہ ہے میری ہے۔ میں نے نہ تو اسے اس شخص کے ہاتھ بیچا ہے اور نہ بہ طور ہدیہ اسے دی ہے۔ میرا مال مجھے دلوایا جائے۔ قاضی ابو شریح نے یہ بیان سُن کر اسے اسلام کے قانون شہادت کی رُو سے غیر شافی پایا اور ناقابلِ پذیرائی بتایا۔ یہودی سے جب جواب طلب کیا گیا تو اس نے کہا کہ زرہ میری ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس پر قابض ہوں۔ دونوں کے بیانات سُننے کے بعد قاضی ابو شریح نے حضرت علیؓ سے کہا کہ یا امیر المومنین آپکے پاس اپنے دعوے کی کوئی دلیل بھی ہے، اُنہوں نے کہا کہ ہاں میرا غلام قنبر اور میرا بیٹا حسنؓ میرے دعوے کی صداقت کے گواہ ہیں۔ قاضی ابو شریح نے کہا کہ از روئے قانون آپکے بیٹے کی شہادت آپکے حق میں ناقابلِ تسلیم ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپ حسنؓ کی شہادت کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہیں مگر میں نے تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سُنا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ کیا جنتیوں کی شہادت بھی رد کی جا سکتی ہے؟ قاضی ابو شریح نے کہا کہ آپ فردوس بریں کا ذکر فرشِ زمین کے ساتھ کیوں کرتے ہیں۔ اپنے دعوے کی کوئی دلیل ہو تو پیش کیجے۔ یہودی جو اس گفتگو کو سُن رہا تھا، اس قدر متاثر ہُوا کہ کلمہ پڑھ کر اُسی وقت مسلمان ہو گیا اور یہ کہہ کر زرہ حضرت علیؓ کو دیدی کہ حقیقت میں یہ حضور ہی کا مال ہے۔

مغرب والے فرزندانِ توحید کو تشدد، مذہبی تعصب، بہ زورِ شمشیر اپنے مذہب کی اشاعت اور خدا جانے

اور کس کس بات کا الزام دینے کے خوگر چلے آئے ہیں۔ خود مغرب کی پارسائی کا دامن کہانتک بے داغ ہے، اس کا ذکر سرسری طور پر میں کرچکا ہوں۔ اگرچہ الزامی جواب دینے سے ہماری بریت نہیں ہوسکتی لیکن پھر بھی تقابل کی ایک ایسی شان ضرور پیدا ہوجاتی ہے جس سے چشم بصیرت عبرت اندوز ہوسکے۔ یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ یورپ میں قرون وسطیٰ کی مسیحی سلطنتوں کو بہ حیثیت حکمرانوں کے، صرف ایک غیر مسیحی قوم سے سابقہ پڑا اور جو سلوک انہوں نے اس کے ساتھ روا رکھا، اس سے ایک طویل داستان مذلت تیار کی جاسکتی ہے۔ یہودیوں سے مسیحیوں کے سلوک کی تشریح میں بار باران اوراق میں کرچکا ہوں لیکن یورپ کی حکایت ستم کچھ اسقدر دراز ہے کہ یہاں بھی میں مختصراً اتنا عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ سترھویں صدی کے ختم تک یورپ کی عمدہ سے عمدہ سلطنت میں یہودی کا وجود اس قدر ناپاک اور نجس خیال کیا جاتا تھا کہ عیسائیوں کا تقدس یہودی کو اپنے ساتھ بٹھانے یا کھانا کھلانے کا روادار نہ ہوسکتا تھا۔ یہ تو شاید بہت پرانی باتیں خیال کی جائیں اور بہ فحوائے "کلام اللیل یمحوہ النہار" انہیں تقویم پارینہ کے دفتر میں شریک کرنے کے قابل سمجھا جائے، لیکن اس دور جدید کے زمانۂ آغاز میں، مذہب کے فرقہ وار اختلاف کی بنا پر انگلستان میں ڈسنٹر، نان کن فارمسٹ اور رومن کیتھلک جماعتوں کے متعلق جو تعزیری قانون وضع کئے گئے تھے اُن کے متعلق کیا ارشاد ہوگا؟ اسلام کی شانِ رواداری دیکھنی ہو تو اہلِ مغرب اپنے ہی ایک ہم قوم کے ان الفاظ پر غور کریں:-

"آٹھویں صدی میں دمشق کا ایک پادری جس کا نام یوحنا تھا، اِس جرم میں کہ اُس نے کلیسا میں مورتوں کی پرستش کے رواج کے خلاف آواز اُٹھائی تھی، بازنطینی قیصر کے قہر و غضب کا مورد ہوکر اِسلامی علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا اور مُسلمانوں نے نہ صرف اُس کو امان دی بلکہ اسکے لئے وظیفہ مقرر کردیا اسلامی سلطنت میں مذہبی آزادی کا یہ عالم تھا کہ یوحنا سلطنت کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود اسلام کی مخالفت میں کتابیں تصنیف کرتا تھا اور عربی میں مہارت رکھنے کے باعث ہر وقت قرآن کی تردید کرتا رہتا تھا، لیکن مُسلمان اُس سے مطلق تعرّض نہ کرتے تھے"[۱]

اہل الذمہ کے حقوق کا احترام یہاں تک کیا جاتا تھا کہ کوئی مُسلمان کسی ذمّی کی زمین قیمتاً بھی حاصل کرنیکا مجاز نہ تھا، تاکہ مُسلمانوں کے ہاتھوں ذمّیوں کے حقوق کے غصب ہوجانیکا خفیف سا امکان بھی نہ رہے چنانچہ اس معاملہ کے متعلق سندھ کے مُسلمان حکمرانوں کا طرزِ عمل میں گزشتہ صفحوں میں کسی مقام پر دکھاچکا ہوں

---

[۱] ایس۔ ایچ۔ لیڈر "خفایائے مصر"

مامون الرشید کے عہد میں کئی سو یہودی معابد اور آتشکدوں کے علاوہ کشورِ عباسیہ میں مسیحیوں کے گیارہ ہزار گرجا تھے۔ اس روشن خیال تاجدار نے سلطنت کے نمائندوں کی ایک مجلسِ شوریٰ قائم کی تھی جس میں حدودِ سلطنت کے اندر بسنے والی تمام قوموں یعنی مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں، صابیوں اور زرتشتیوں کو حقوقِ نیابت حاصل تھے۔ شاہانِ اسلام کے اور خاندانوں مثلاً سامانی، سلجوقی اور ایوبی سلاطین نے بھی اسی قسم کی مجالسِ شوریٰ قائم کر رکھی تھیں۔ دولتِ عباسیہ میں دیوان النظر فی المظالم" اور "دیوان الموالی والغلمان" جن کے ناموں ہی سے اُن کے فرائض کی نوعیت کا انکشاف ہو جاتا ہے، مجلسِ شوریٰ کے علاوہ تھے۔

ہندوستان کے اسلامی عہد کے سلسلہ میں اکبر یا دوسرے مغل شہنشاہوں یا دکن کی بہمنی سلطنت کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے۔ قلتِ گنجائش مجھے اجازت نہیں دیتی کہ دیگر مسلمان سلاطین کا بھی ذکر کروں میں شیر شاہ کے ذکر سے بھی اجتناب کرونگا جس نے ایک بنیئے کی فریاد پر ولی عہدِ سلطنت شہزادہ عادل خاں کے متعلق ایک ایسا فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ اہلِ دربار اُس کی انصاف پسندانہ جباری سے تھرا اُٹھے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے متعلق میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اعلیٰ سے اعلیٰ فوجی اور انتظامی خدمات پر ہندوؤں کو مامور کرنا، ہندوکشی کہلا سکتا ہے تو خدا کرے کہ ہندوؤں کے موجودہ عہد کے حکمران بھی "ہندوکشی" کی اسی رسم کو اختیار کریں۔ کسی شخص کو اُس کے تقدس اور راسخ العقیدہ ہونے کی بنا پر متعصب کہدینا کوتاہ نظری اور کم فہمی کی دلیل ہے۔ اور اورنگ زیب کی اسلامی رواداری کی یادگاریں تو آج بھی موجود ہیں۔ گیا میں بُدھ مت کا جو مقدس ترین معبد ہے اُس میں "عالمگیر کی سند جاگیر جو اُس نے اِس غیر اسلامی معبد کو عطا کی تھی اور جس کی بدولت اس مندر کے مصارفِ روزینہ کا سامان ہے" آجتک محفوظ ہے ؎

مشہور رُوسی فاضل ٹالسٹائے کا قول ہے کہ "اپنوں کی بُری حکومت، غیروں کی حکومت سے خواہ وہ غیر فرشتے ہی کیوں نہ ہوں اچھی ہوتی ہے"۔ لیکن مُسلمانوں نے کم از کم اپنی حکومت کے متعلق اُس خیال کو جو اِس عقیدہ کی بنیاد ہے، باطل ثابت کر دیا۔ اندلس میں اسلامی دَورِ حکومت کو بجا طور پر ہسپانیہ کا عہدِ زریں کہا گیا ہے۔ مُسلمانوں نے اہلِ ہسپانیہ کو جس معراجِ ترقی پر پہنچا دیا، وہ نہ تو اس سے پہلے کبھی اُن کو نصیب ہوئی تھی اور نہ اُسکے بعد ہی آجتک نصیب ہو سکی۔ مسیحی مؤرخین بھی اب اس امر پر متفق ہیں کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج ہی اس ملک کے سیاسیُ تمدنی زوال کی علت ہُوا اور بقول اسٹینلی لین پول کے، مسلمانوں کے چلے جانے پر ہسپانیہ اُس قعرِ مذلت میں جا گرا جس کی خاک میں وہ آجتک پڑا لوٹ رہا ہے۔ یہاں مغربی

اور اسلامی طرزِ عمل کے تقابل کا ایک عجیب پہلو نمایاں ہوتا ہے اہلِ مغرب اور اہلِ اسلام دونوں کو اپنی پیدائش کی سرزمین سے نکل کر مغرب کی سمت میں جانے کا موقع ملا۔ اسلام نے اندلس میں پہنچ کر اہلِ ملک کو تہذیب اور تمدن کے طارمِ اعلیٰ پر بٹھادیا اور علم کے اُس چراغ کو روشن کیا جو آج بھی یوروپ کے ظلمت کدہ کو فروزاں کئے ہُوئے ہے۔ اہلِ مغرب نے امریکا میں پہنچ کر اہلِ ملک پر جونار وامنظالم اور قساوت و شقاوت سے لبریز ستم توڑے ہیں، اُن کی یاد پر انسانیت آج بھی آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔ ملک کے اصلی باشندوں کا جانوروں اور حیوانوں کی طرح شکار کیا گیا۔ توپ اور بندوق کی طاقت سے مسلح ہوکر یہ لوگ وہاں بڑھے زمین کے جائز وارثوں کو زمین سے بے دخل کر دیا اور اُن کے وطن میں اپنا جھنڈا نصب کرکے ملک کو ایک نیا نام دیا۔ ریڈ انڈین قبائل تہذیبِ انسانی کے ان علمبرداروں کے ظلم وستم سے ایسے خوف زدہ ہوئے کہ جنگلوں اور بنوں میں جاکر چھُپ گئے، جہاں اکثر بے بسی کے عالم میں اپنی دُکھ بھری زندگی گزار کر اُس دُنیا کو روانہ ہوگئے جہاں "آسمانی باپ کے بیٹوں" کی کوئی مقدس جماعت اُن کو تہذیب کا بپتسمہ دینے کے لئے نہیں پہنچ سکتی۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جو نسل آج سے ڈھائی تین سو برس پہلے امریکہ جیسے وسیع براعظم کے طول و عرض میں پھیلی ہُوئی تھی، آج تقریباً بالکل نابود ہوگئی ہے۔ ایک نئی قوم اب امریکا کی مالک ہے۔ اور وہ بدنصیب جو کبھی اس سرزمین کی آزاد فضا میں بیخوف وخطر پھرا کرتے تھے، اُن کے مٹتے ہُوئے نشانوں کے سراغ اب کہیں کہیں ملتے ہیں +

اسلام نے بنی نوعِ انسان کی حریت و آزادی کی محافظت ہر زمانے میں اس طرح کی ہے کہ اُسکا اعتراف نہ کرنا یقیناً بہت بڑی ناسپاسی کے مرادف ہوگا۔ دنیا نے ہر موقع پر جس طرح فاتحانِ اسلام کا خیر مقدم کیا ہے وہی اسلام کی حریت نوازی کا سب سے زیادہ روشن اور دلکش ثبوت ہے۔ اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو آنے کی دعوت خود دی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کاؤنٹ جولین کی التجا عساکرِ اسلام کے اندلس پر حملہ آور ہونے کی ترغیبات میں شریک نہ ہوتی تو یقیناً مسلمانوں کو اس طرف پیشقدمی کرنے میں بہت کچھ تامل ہوتا۔ قسطنطنیہ کو جب ترکوں نے فتح کیا تو عیسائی عوام تو ایک طرف رہے، خود یونانی پادریوں۔ اور پیشوایانِ مذہب نے اہلِ اسلام کی آمد پر اظہارِ مسرت کیا۔ کیونکہ اس عہد میں انہیں ویلنشیا کے اُسقفِ اعظم کے الفاظ میں مذہبی آزادی کا "قابلِ ملامت" حق حاصل ہوگیا۔ چنانچہ مسٹر آرنلڈ اپنی کتاب "تبلیغ و اشاعتِ اسلام" میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایشیائے کوچک میں جب سلجوقی سلطان داخل ہوئے تو اہلِ مُلک بازنطینی

عہد کی سخت گیریوں کی وجہ سے سخت پریشانی اور مصیبت میں گرفتار تھے ۱۰۶۷ء میں ایسے بہت سے دلفروز مناظر دیکھنے میں آئے کہ لوگ انبوہ در انبوہ اپنے نجات دلانے والوں کے پرچم اقبال کے نیچے آکر جمع ہونے لگے۔ اور برضا و رغبت اسلام قبول کرنے لگے، بلکہ وہ لوگ بھی جو اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے بازنطینیوں کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں کی فوجوں میں آملے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے سابق حکمرانوں کے خلاف معرکۂ حرب و قتال میں شریک ہوئے ÷



یہ مضمون ناتمام رہیگا اگر اس اہم مسئلہ کا ذکر نہ کیا گیا کہ اسلام نے نوعِ انسان کی انفرادی آزادی اور اس ملعون رسم کے استیصال کے لئے جو غلامی کے نام سے مشہور ہے، کیا شاندار کارنامے کئے۔ مقدسینِ فرنگ اس معاملہ میں بھی ہمکو موردِ الزام بنانے میں پیچھے نہیں رہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے معاشرتی نظام میں غلاموں کے وجود کو تسلیم کرکے، ایک ننگِ انسانیت دستور کے قیام و دوام سے اپنے دامن کو آلودہ کیا ہے ہم اس ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ کا فتوے کچھ اور ہی ہے۔ یعنی

ملا یہ امتیاز اسلام ہی کو سارے دینوں میں
گدا اُس کے نظر آتے ہیں بیٹھے شہ نشینوں میں

اس مغربی اعتراض کا ایک معقول اور بالکل صحیح جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اسلام نے غلامی کی رسم کو اگر یک قلم موقوف نہ کیا اکہ اس قسم کا کوئی فوری طریق کار مسلمانوں کے ابتدائی دور میں اسلام کی ہنوز نوزائیدہ جمہوریت کے نظام کے لئے اقتصادی طور پر تباہ کن ثابت ہوتا، تو ایسے قانون ضرور وضع کر دیئے جن کے ہوتے ہوئے اسکا زیادہ دیر تک قائم رہنا محال تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام شرعی میں غلام اور حرّ کے درمیان عملاً صرف اتنا فرق ہے کہ بہ خلاف حرّ کے، غلام پر ایک ایسے نام کا اطلاق ہوتا ہے جو چار حروف غ، ل، ا، اور م سے مرکّب ہے اور بس۔ اسی حقیقت کا دکھانا مجھے یہاں منظور ہے ÷

غلامی کی رسم قدیم الایّام سے تقریباً تمام اقوام عالم میں رائج تھی۔ یہودی، یونانی، قدیم جرمن اور رومی سب غلام رکھتے تھے۔ آخرالذکر نے تو "شمشیر زنوں" (gladiators) کی شکل میں ایک انوکھے طریقہ پر غلاموں کی جان اپنے لئے بازیچۂ تفریح بنا رکھی تھی "شمشیر زن" طبقہ کی نہ صرف آزادی سلب کر لی جاتی تھی بلکہ جنگلی درندوں اور طرح طرح کی آفات سے اُن کا مقابلہ کرا کر اُن کی زندگی بھی معرضِ خطر میں مبتلا کر دی جاتی تھی اور

جمہور روما اس تماشے کی سیر سے لطف اندوز ہوتے تھے ع

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھیری !

مسیحیت بھی بدبخت غلاموں کی حالت میں کوئی اصلاح نہ پیدا کرسکی بلکہ مسیحی سلطنتوں نے غلاموں کے متعلق سخت سے سخت قانون اور سزائیں جاری کر رکھی تھیں مثلاً ایک سزا یہ تھی کہ آزاد عورت اگر غلام سے شادی کرے تو قتل کی جائے اور غلام زندہ جلا دیا جائے، چنانچہ ملمن اپنی کتاب "رومی مسیحیت" میں اعتراف کرتا ہے کہ اس کا نتیجہ کھلم کھلا بدکاری کی صورت میں مترتب ہوا جسے اہل کلیسا بہ نظرِ اغماض دیکھتے تھے بلکہ خود بھی اس کے ارتکاب سے گریز نہ کرتے تھے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ انگلستان اور دیگر یوروپین ممالک میں غلاموں کی خرید فروخت بروئے قانون جائز تھی اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے جنوبی اضلاع نے تو اس لعنت کو برقرار رکھنے کے لئے شمالی اضلاع کے خلاف جنگ کر کے خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ چنانچہ امریکا میں غلامی کا اِنسداد اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر سے پہلے نہ ہوسکا۔ ان سب ممالک میں غلاموں کے ساتھ شدید مظالم روا رکھے جاتے تھے اور بہائم سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا +

جسے یہ معلوم کرنا ہو کہ اسلام نے اپنے غلاموں سے کیسا سلوک کیا وہ اس مبارک آواز کو سُنے جو آج سے تیرہ سو برس قبل دُنیا کے سب سے بڑے انسان کے آخری حج کے موقعہ پر جبل العرفات کی بلندی سے گونجتی ہوئی تمام دنیا کے غلاموں کے لئے حُریتِ شخصی کا پیغام لائی تھی۔ "اپنے غلاموں کے بارہ میں بھی سُن لو۔ اس کا خیال رکھو کہ تم اُن کو بھی ویسی خوراک کھانے کو دو جیسی خود کھاتے ہو اور اُنہیں بھی اُسی کپڑے کا لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور اگر اُن سے کوئی ایسی خطا سرزد ہو جائے جس سے درگزر کرنیکو تمہارا جی نہ چاہے تو پھر اُنکو علیحدہ کردو کیونکہ وہ اللہ کے خدمتگزار ہیں اور اُن سے سختی اور درشتی کا برتاؤ کرنا اچھا نہیں" کوئی کج فہم سے کج فہم شخص بھی اس ارشادِ نبوی کو پڑھ کر یہ کہے بغیر نہ رہیگا کہ اسلام نے بزمِ تمدن میں غلام اور حُر کا فرقِ مراتب جس خوبی سے اُٹھا دیا ہے، یوروپ اُس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نام نہاد غلام اپنے آقا کے دوسرے عزیزوں کی طرح گھر میں کنبہ کے ارکان کی حیثیت سے رہتے تھے اور بسا اوقات اُنکی شادی اپنے آقا کے گھرانے ہی میں ہوتی تھی۔ یہ مبارک طریقہ نہ صرف جمہور اہلِ اسلام بلکہ اسلام کے شاہی خاندانوں میں بھی جاری تھا۔ اور تاریخ اسلام میں اُس کے امثال و نظائر بہ کثرت مل سکتے ہیں۔ یوروپ کے نظامِ اقطاع میں آزاد کاشتکاروں کی ادنےٰ حیثیت سے جب غلامانِ اسلام کے بلند مرتبہ کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو کس بلا کا تناقض اور کس حیرت انگیز

درجہ کا تخالف نظر آتا ہے! ساٹھ ستر سال بھی نہیں گزرے کہ امریکا میں غلاموں سے مناکحت کے تعلقات قائم کرنا ممنوع تھا اور افریقی عورتوں سے امریکنوں کے ناجائز تعلقات کے ثمر بھی، اُس نسبتِ ولدیت کی پناہ لے کر جو انہیں اپنے خدا ناترس مغربی باپوں سے حاصل تھی، اپنی آزادی کو قائم نہ رکھ سکتے تھے بلکہ دوسرے غلاموں کی طرح قیمتاً فروخت کر دئے جاتے تھے اور طرح طرح کے شقاوت آمیز مظالم کا شکار ہوتے تھے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں نہ صرف غلام اپنے آقاؤں کے ترکے کے وارث ہوتے تھے بلکہ شاہی خاندانوں میں غلام عورتوں کے بیٹے سلاطین کے جانشین اور تاج و تخت کے وارث قرار دئے جاتے تھے۔ اسلام کی تاریخ اس قسم کے بے شمار ذی حشمت "غلام زادوں" کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ باوجود ان عظیم الشان رعایتوں کے، اجازت دی گئی تھی کہ غلام اگر اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہونا چاہے تو جائز ہے۔ غلاموں کے متعلق اس شریفانہ سلوک کی سنّت خود جنابِ رسالت مآبؐ نے قائم کی تھی اور اصحابِ کرام نے اس کی پیروی کو اپنی زندگی کے دستور العمل میں شامل کر لیا تھا۔ حضور کے آزاد شدہ غلام حضرت زیدؓ کو اکثر عساکرِ اسلام کی قیادت تفویض کی جاتی تھی اور بڑے بڑے عرب سردار بے چون و چرا اُن کی اطاعت کرتے تھے۔ اُن کے بیٹے اُسامہؓ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُس مہم کا قائد مقرر کیا جو یونانیوں کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ خلیفۂ ثانی کے متعلق یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا واقعہ کہ ارضِ مقدّس کے سفر کے دوران میں دنیائے اسلام کا یہ جلیل القدر شہنشاہ اور اس کا غلام باری باری سے اونٹ پر سوار ہوتے تھے، اِس حقیقت کی زندہ شہادت رہیگا کہ اسلام نے مساوات کی وہ شان دکھائی کہ غلاموں کو شہنشاہوں کا رتبہ دیدیا۔

مولانا شبلی مرحوم نے اسلام سے پہلے اور ظہورِ اسلام کے بعد کی مساوات کا نہایت دلپذیر انداز میں موازنہ کیا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب غزوہ بدر میں لشکرِ کفر نے اِس بنا پر انصارِ پاک سے شمشیر زنی کرنا اپنے لئے مایۂ عار خیال کیا تھا کہ نہیں تیغِ قریشی کے سزاوار یہ سر، یا وہ زمانہ آیا کہ

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال ... کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں ... جاکے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھُل کر
مَیں غلام حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں ... یہ بھی سُن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہے ... ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر؟

جس طرف اُس حبشی زادہ کی اُٹھتی تھی نظر!
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور"

یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس کے غلام سلطنتوں کی مسند حکومت پر متمکن نظر آتے رہے ہیں اسلام کے بہت سے نامور فرزند ایسے ہیں جو غلاموں کی تاریک سرزمین سے نکلے، احرار کا عصائے سلطنت اُن کے سپرد کیا گیا اور اُن کے جلال و جبروت نے دنیا کی قاہر سے قاہر طاقتوں کی قسمت کا فیصلہ کیا - دکن کا حبشی وزیر ملک عنبر جسے دراصل خود مختار بادشاہ کہنا چاہیئے اور جس کے اقبال نے دہلی اور بیجاپور کی متحدہ فوجوں کو شکستِ فاش دی تھی، ارضِ حبش کا محض ایک وحشی غلام تھا - اُس نے اُسے ہندوستان کے اربابِ سیاست کی صفِ اول میں لا بٹھایا اور وہ تاریخ میں اپنی انتظامی قابلیت اور حسنِ سیاست ہمیشہ کے لئے زندہ چھوڑ گیا - یمن کا حبشی فرماں فرما حسین ابن سلامہ جس نے تیس سال تک نام کو تاجدارِ یمن کے وزیر مگر درحقیقت ایک مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے یمن میں بڑے ٹھاٹھ سے حکومت کی اور اپنے بعد اپنے حبشی غلاموں کو یمن پر حکومت کرنے کے لئے چھوڑتا گیا - سلسلۂ زیادیہ کے تاجدار ابو الجیّاش کے ایک حبشی غلام رُشد کا غلام تھا - گویا اسلام کے غلاماں غلام بھی حکمرانوں اور بادشاہوں کے مرتبہ تک جا پہنچے - مصر کے مملوک سلاطین اور ہندوستان کے بادشاہوں کا خاندانِ غلاماں اُس طریقِ حکمرانی کی دو مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک حریت نواز مذہب کے غلام بھی تاریخ پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں - قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش جیسے تاجداروں کے کارنامے اُس کی اِمٹ یادگاریں ہیں - اِسلام نے اس عظیم الشان حقیقت کا عملی انکشاف کیا کہ

گدائے مے کدہ بھی بادشاہ ہوتے ہیں

حمید احمد خاں
حیدر آباد - دکن

---

*

دجلۂ بغداد

شاعر

اے دجلۂ طوفانی! یکسر بکجا رانی
با جوشنِ داؤدی، با فوجِ سلیمانی؟
گہ سبحہ بگردانی، گہ سلسلہ جنبانی
افرشتۂ یزدانی؟ اہریمنِ زندانی؟
از بہر چہ می غرّی؟ از بہر چہ گریانی؟

اے دخترِ کہساران! تو پیکِ سماہستی
پاکیزہ رداہستی، پاکیزہ اداہستی
آئینہ نماہستی، آتش تہ پاہستی
ہم ہوش فزاہستی، ہم ہوش رُباہستی
گہ جلوۂ عُریانی، گہ جلوۂ پنہانی

در روز فرود آید، خورشید بدامانت
ہمخواب ہمی گردد، شب گنبدِ گردانت
قندیلِ مہ انور، بوسد رُخِ رخشانت
می لرزد و می گوید "جانم ہمہ قربانت
اے چہرۂ نورانی! اے فترۂ یزدانی!"

نوروز دگر سرزد، ہنگامِ بہار آمد
گردون بہ سحاب آمد، گیتی بہ نگار آمد
فصلِ مے و جام آمد، فصلِ گُل دیار آمد
بنگر کہ کنارِ تو، چون عاشقِ زار آمد
بس لالۂ نعمانی، بس یوسفِ کنعانی

بینم[1] کہ سرِ موجت، چون کوہ بگردون شد
ہنگامۂ تاتاری، از قعرِ تو بیرون شد؟
یا تازہ درونِ دل، یادِ رُخِ ہارون شد؟
برگوئے بمن چون شد؟ چون شد کہ دلت خون شد؟
خون است کہ می ریزی، خون است کہ افشانی

اے دجلۂ طوفانی! یکسر بکجا رانی
با جوشنِ داؤدی، با فوجِ سلیمانی؟
گہ سبحہ بگردانی، گہ سلسلہ جنبانی
افرشتۂ یزدانی؟ اہریمنِ زندانی؟
از بہر چہ می غرّی؟ از بہر چہ گریانی؟

---

[1] از ماہ مارچ تا جون "موسمِ سیلاب" است در ظرفِ ایں مدت دجلہ خیلے طوفانی می شود و آبش ہمچو خون سرخ می نماید۔

دجلہ

از من چہ ہمی پُرسی، از دردِ دلِ خُونین   با من چہ ہمی گوئی، از اُردی و فروردین
شد موجِ روانِ من، آرامگہ برزین   تو دورِ خودت بنگر، با دیدۂ عبرت بین
تا در ورقِ ایّام این راز ہمے خوانی

در انجمنِ دوران، بس دورِ زمان دیدم   بس فصلِ بہار آمد، بس فصلِ خزان دیدم
ہم نقرِ کہان دیدم، ہم قصرِ مہان دیدم   ہر ذرّۂ عالم را، چون ریگ روان دیدم
گہ زندہ شود گیتی، گہ باز شود فانی

بس عہدِ کہن گشتہ، در قعرِ دلم پنہان   شد سینۂ سوزانم، آبستنِ جاویدان
آری، بکنارِ من، آمد چو فلک پُویان   گہ ابر صفت گریان، گہ مہر صفت خندان
کلدانی و ایرانی، یُونانی و تُورانی

قومے ز عرب آمد، با گوهرِ غمخواری   خوابیدہ جہانے را، آورد بہ بیداری
بُرّید بہ شمشیرش، زنجیرِ ستمکاری   و از دستِ جہانداران، بربود جہانداری
تا باز بیاموزد، آئینِ جہانبانی

ساقئ حجاز آمد، با بادۂ اسلامی   ہر کس کہ چشید آن مے بگذاشت مے آشامی
از نشئۂ آن بادہ، بیرون شدہ از خامی   ہم ہندی و ہم مصری، ہم رُومی و ہم شامی
کشمیری و افغانی، چینی و خُراسانی

بغداد پدید آورد، آئینِ پیمبر را   بر خواند بہ ہر ملّت، مر اللہ اکبر را
بنشاند بہ یک محفل، دہقان و سکندر را   بنمود رہِ وحدت، مر مسلم و کافر را
با شمعِ مُسلمانی، با بانگِ حُدی خوانی

دَر دورِ مُسلمانی، بس بزمِ شہان دیدم   بس صاحبِ تیغ آمد، بس شعلہ زبان دیدم
بس کشتئ زرّین را، بر سینہ روان دیدم   این وادی و صحرا را، گلزارِ جنان دیدم
شد لالۂ صحرائی، شد سوسنِ بُستانی!!

آن بزمِ جہانگیران، باگردشِ گردون شد!   آن فرِّ کلہ داران، افسانۂ افسون شد!
از غصہ دلم خون شد، پرسی کہ چنین چون شد؟   بغداد دگرگون شد، آن باغ دگرگون شد!!
نے ماند جہانبانی، نے ماند مسلمانی!!

توحیدِ مسلمان را، بانقشِ صنم بینم   آئینِ خدائی را، مقہورِ ستم بینم
نے سطوتِ دین بینم، نے تیغ و علم بینم   یک گلۂ مردم را، درفکرِ درم بینم
شد فرّۂ اسلامی، شد جوہرِ انسانی!

از خطۂ مغرب شد، طوفانِ اروپائی   تاریک شد از ابرے، این گنبدِ مینائی
از برقِ جہان سوزش، خیرہ شدہ بینائی   آتش ہمہ می بارد، بر پستی و بالائی
مشرق شدہ از دودش یک منزلِ زندانی

این فتنۂ افرنگی، بادورِ زمان گردد   گہ شعلہ فشان گردد، گہ ریگِ روان گردد
در دشت نہان ماند، در شہر عیان گردد   با توپ و تفنگ آید، با تیغ و سنان گردد
از بہرِ جہان سوزی، از بہرِ ستم رانی

اہرمنِ استعمار، از راہِ نیاز آید   گہ جادۂ چین گیرد، گہ رو بہ حجاز آید
کنجشک صفت لیکن، باپنجۂ باز آید   بنگر بچہ رنگ و فن، این شعبدہ باز آید
با اسلحۂ دیوان، با لشکرِ شیطانی

این دیوِ سیہ باطن، اندامِ سحر دارد   در دست گہر دارد، در سینہ شرر دارد
یک دفترِ آزادی، ہموارہ ببر دارد!   در شرق فرود آید، پیوستہ نظر دارد
بر کشورِ جمشیدی، بر ملکِ سلیمانی

شرق است ہمان خاکے، کز نور فروزان شد   در حسن چو گلشن شد، در فیض چو باران شد
این وادیٔ ظلمت را، چون مہرِ درخشان شد   افسوس بہم برخورد، آوخ ہمہ ویران شد
آن گلشنِ یزدانی، آن محفلِ روحانی!

قلبِ مللِ مشرق، چون قلبِ کبوتر شد   این مرغکِ ترسیدہ، بے پنجہ و بے پر شد
عقلم بہ شگفت آمد، جانم ہمہ آذر شد   چون دولتِ دارائی، در دستِ سکندر شد

باخنجرکِ ہندی، باگرزۂ ساسانی؟!

نیرنگ ہمی سازد، دائم فلکِ گردان ہموارہ درآویزد، اہرمن ابا یزدان
ناموسِ حیات آمد، این کشمکشِ دوران باید کہ یکے گردد، درسایۂ یک پیمان
انغانی و ایرانی، تورانی و ژاپانی

ہرگز نتوان انداخت، این جوغ اروپا را وحدت نشود پیدا، تا ملّتِ بیضا را
اسلام کند منسوخ، آئینِ کلیسا را آنگاہ ہمی بینی، یک گلکدہ دنیا را
ابلیس چو بگریزد، از محفلِ سبحانی

در آئینۂ گردون، بس فتنہ نہان بینم بس ملّتِ عالم را، باتیغ و نشان بینم
شیطانِ فرنگستان، بے روح وروان بینم گلزارِ پیمبر را، چون باغِ جنان بینم
بشگفت بصحرا در، بس لالۂ نعمانی

گرمی بحیات اندر، از شعلۂ خون باشد ہنگامۂ این محفل، از جوشِ جنون باشد
دردِ دلِ بیمارے، از غصّہ فزون باشد ہر ذرّۂ گیتی را، مرگے ز سکون باشد
رفتم کہ ہمی جوشد، خون در دلِ طوفانی

محمد اکبر منیر

گڑہل کا پھول

نہاں رگ رگ میں کس کی اُف بہارِ صد گلستاں ہے چمن کس کی بدولت رشکِ گلزارِ رضواں ہے
نگاہیں محو ہیں دل مضطرب ہے عقل حیراں ہے جمالِ شاہدِ نیرنگ کی شمعِ فروزاں ہے
گلِ رنگیں جگر ہے یا چراغِ نورِ ایماں ہے

کہاں یہ رنگ بیزی عاشقوں کے داغِ پنہاں میں کہاں یہ خونفروشی سینۂ صد چاک و بریاں میں
کہاں یہ شانِ خندہ غنچہ ہائے خوباں میں غم و شادی بہم ہیں زینتِ صحنِ گلستاں میں
گلِ صحنِ چمن ہے یا کسی کا زخمِ خنداں ہے

جگر

فلسفۂ مغرب کی اجمالی تاریخ

دورِ ثانی

ارسطو

ارسطو ۳۸۴ء ق م میں بمقام اِسٹاگرا (Stagira) پیدا ہُوا، اس کا باپ نِکو میکس Nicomacus مقدونیہ کے بادشاہ ایمنٹس ثانی کے دربار میں طبیب کے عہدہ پر ملازم تھا، ۱۷ برس کی عمر میں، افلاطون کے درس میں شامل ہُوا اور اسکے مدرسہ (Academy) میں ۲۰ برس تک شاگرد اور استاد دونوں کی حیثیت سے رہا۔ افلاطون کی وفات کے بعد اُس نے پانچ سال تک مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور ۳۳۲ء ق م میں ایتھنز واپس آکر، علم معانی اور بلاغت (Rhetoric) پر درس دینا شروع کیا۔ چندروز بعد فلپ شاہِ مقدونیہ نے اُسے اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کے لئے بلالیا، اور سات سال کے بعد پھر ایتھنز واپس آیا۔ اور دوبارہ درس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے مدرسہ کا نام (Peripatetic Sh:) اس لئے ہے کہ وہ چہل قدمی کرتے ہوئے پڑھایا کرتا تھا، ٹہلتا جاتا تھا اور تقریر کرتا جاتا تھا۔ ۳۲۲ء ق م میں وفات پائی +

عادات وخصائص | یہ شخص شریف النفس، صداقت کا شیدا، منصف مزاج، عالی دماغ، نکتہ رس، ذہین اور طبّاع تھا، منطق کا موجد، بال کی کھال نکالنے والا، غضب کی موشگافیاں کرنے والا، بہت مطالعہ کرنے والا، زبردست مشاہدہ کرنے والا، علم وفضل کا مجسمہ، عقل وفہم کا پُتلا، اور ہمہ دان انسان گذرا ہے۔ اسکے بعد بلحاظِ علم وفضل یورپ میں اگر کوئی شخص اُس سے نسبت رکھتا ہے تو وہ (Leibnitz) ہے۔ ارسطو تمام علوم وفنون میں جو اس وقت دُنیا میں موجود تھے، مہارتِ تامہ رکھتا تھا، اس کی تصنیفات میں منطق فلسفہ۔ معانی وبیان فصاحت وبلاغت، نظم وعروض، طبیعات، علم الحیوان، علم النباتات، الہیات (Metaphysics) نفسیات، اخلاق، سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، تمام دنیا کے علوم شامل ہیں، اینڈرانیکس نے ۵۰ء ق م میں اس کی تصنیفات یکجا شائع کیں، کل ابواب کی

تعداد ایک ہزار ہے (اُس نے لفظ کتاب استعمال کیا ہے) مثلاً الہیات میں ۱۴ کتابیں ہیں ۔ واضح ہو کہ جسے ہم مابعد الطبیعات یا الہیات کہتے ہیں، ارسطو اُسے Prime Philosophy کہتا تھا۔ اور واقعی بات بھی یہی ہے، ارسطو، اپنے اُستاد سے اکثر حالات میں مختلف ہے۔ افلاطون شاعرانہ، آئیڈیل اور صوفیانہ خیال کا آدمی تھا۔ ارسطو، اسکے برخلاف، خشک اور روکھا ( ) قانونی اور باقاعدہ کام کرنے والا (Systematic) اور عملی آدمی تھا۔ افلاطون وجدانی (Intuitional) اور جزئیات سے کلیات ترتیب دینے والا آدمی تھا، ارسطو منطقی اور عام سے خاص کی طرف بحث کرنے والا تھا۔

افلاطون کے خلاف، ارسطو کا مذہب یہ ہے کہ صحیح علم جزئیات سے شروع ہوتا ہے، اور تجربہ و احساس سے حاصل ہوتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک فلسفہ علم کلیات (Sc of universals) یعنی (ἡ ἐπιστήμη τῶν καθόλου) کا نام ہے، فلسفہ وہ شئے ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ فلسفہ کی تقسیم، (classification) ارسطو نے اس طرح کی ہے (۱) حکمتِ نظری (۲) حکمتِ عملی (۳) حکمت موثرہ یا فاعلی (Theoretic, Practical, Efficient) حکمت نظری میں (۱) طبیعات، الہیات، اور ریاضی، حکمت عملی میں (۱) اخلاق (۲) سیاست مدن اور حکمت مؤثرہ میں (۱) منطق (۲) بلاغت (۳) عروض شامل ہیں (یہی تقسیم صاحب اخلاقِ ناصری نے بھی تسلیم کی ہے۔ دیکھو ص ۱۳)۔

کلیات | افلاطون کا خیال تھا کہ کلیات، جزئیات سے علحدہ کوئی مستقل وجود حقیقی (Real being) رکھتی ہیں۔ اور وہ عالم جہاں یہ موجوداتِ حقیقی (کلیات) پائے جاتے ہیں عالم مثال کہلاتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کلی، جزئی سے علحدہ کوئی وجود حقیقی نہیں رکھتی، اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک عالم مثال موجود ہے جہاں ہماری دنیا کی اشیاء کے سانچے (Patterns) موجود ہیں، یہ محض افلاطون کا خیال ہی خیال ہے، کلی محض ذہنی چیز ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں، کیونکہ اگر کلی، اپنی جزئیات کے لئے بمنزلۂ ذات ہے تو ذاتِ شئے، ذاتیاتِ شئے سے جدا کیونکر متصور اور متحقق ہو سکتی ہے؟ ارسطو نفس کلی کا انکار نہیں کرتا۔ جس بات کا وہ انکار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کلی، جزئی سے علحدہ، موجود نہیں ہیں۔
(Idea does not exist apart from things)

ہیولیٰ اور صورت | مادہ کی صورت سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یعنی ہیولیٰ بغیر صورت کے نہیں پایا جاتا اور صورت بغیر ہیولیٰ کے نہیں، ہر موجود میں مادہ اور صورت دونوں (لازم و ملزوم) بطریق لزوم پائے جاتے ہیں۔ تمام اشیاء کے لئے علل چہارگانہ ضروری ہیں (۱) علۃ مادی مثلاً لکڑی (۲) علۃ صوری مثلاً خاص شکل ترتیب جو فاعل کے ذہن میں مقدم ہے (۳) علۃ فاعلی مثلاً آلات اور نجار (۴) علۃ غائی مثلاً جس کی وجہ سے قوت فعل میں منتقل ہو یعنی بیٹھنے کا مقصد (یہ چار باتیں تخت میں ہونگی) آیڈیا (ειδος) صورت مقدم یعنی ضروری ہے، ہیولیٰ (ὕλη) مادہ موخر ہے۔ صورت اور مادہ دونوں (eternal) ازلی ہیں

اثبات باری تعالےٰ پر پہلی دلیل | ارسطو کا مذہب یہ ہے (ἡ ὕλη ἐστι ...) ہر چیز مادی ہے اور مادہ بغیر صورت نہیں لہذا ہر شئے مادہ اور صورت سے علیحدہ نہیں لیکن خدا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ چونکہ مادہ، قوت سے عبارت ہے اور خدا موجود بالقوۃ نہیں بلکہ وہ محض موجود بالفعل ہے، لہذا وہ مادی نہیں۔ بلکہ محض صورت ہے۔ ہیولیٰ سے اسکی ذات منزہ ہے۔ اور یہ ازلی موجود بالفعل ہستی (πρῶτον κινοῦν ἀκίνητον) محرک اول اور خود متحرک نہیں ہے، محرکِ اوّل کی ہستی، مسئلہ علت و معلول کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہر متحرک شے، اپنے علاوہ ایک محرک کو مستلزم ہے جو اُسے حرکت دیتا ہے، لیکن چونکہ تسلسل و دور محال ہیں، لہذا ایک ایسا محرک، آخرالامر ماننا پڑیگا جو تمام اشیاء کی حرکت کا باعث ہے اور خود محرک نہیں ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ یہ تمام سلسلۂ علت و معلول ایک ایسے نقطہ پر منتہی ہونا چاہیئے جو دوسروں کے لئے باعثِ حرکت ہو اور خود محرک نہ ہو یعنی (First cause) علۃ العلل یا علۃ اولیٰ کا ماننا ہماری عقل کا تقاضا ہے۔ یہ بات خلاف عقل ہے کہ حرکت یا علت و معلول کا سلسلہ غیر متناہی ہو، (against the fundamental laws of thought)

اب سوال یہ ہے کہ جو خود متحرک نہیں وہ دوسرے کو حرکت کیسے دے سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا اسی طرح مؤثر ہے جس طرح پسندیدہ (The Desirable) اور جمیل اشیاء (The beautiful) مؤثر اور محرک ہوتی ہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کی نظم یا ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر (شاعری اور مصوری) دونوں خود ساکن ہیں مگر سُننے والے اور دیکھنے والوں پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میرا مطمح نظر خود ساکن ہے، مگر میرے لئے باعثِ حرکت ہے، اسی طرح خدا مادہ کے لئے محرک ہے مگر خود متحرک نہیں ہے چونکہ خدا مجرد (Immaterial) ہے، اس لئے تاثرات، احساسات، خواہشات، ہوا و ہوس،

جذبات وغیرہ سے منزہ ہے، خدا خالص عقل و حکمت (pure Intelligence) ہے، حکیم علی الاطلاق ہے، قدیم، غیر مادی، تغیر و تبدل سے پاک ہے اور محرکِ اوّل ہے ٭

دوسری دلیل | جو چیز بالقوۃ (Potential) ہے وہ ممکن (Contingent) ہے اور ممکن کے لئے ہونا ضروری نہیں، پس چونکہ ممکن، موجود ہے، لہذا اُسے کسی دوسرے نے موجود کیا، مادہ محض بالقوۃ اور منفعل (Passive) ہے، پس ایک فاعل ضرور ہے، جو اُسے قوۃ سے فعل میں لائے اور بہت کرے اور وہ فاعل واجب الوجود ہونا چاہیئے، اگر وہ اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہے، تو واجب نہیں، بلکہ ممکن ہے، اسی طرح آخر میں ایک ایسا وجود ماننا پڑیگا جو موجود بالفعل اور واجب ہے، اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں، ورنہ تسلسل لازم آئیگا جو محال ہے ٭

تیسری دلیل | دنیا میں ہر شے ایک قاعدہ اور قرینہ کے مطابق پائی جاتی ہے، مقاصد اور ذرائع (Ends and means) ہر جگہ نمایاں ہیں، مقصد یا علۃ غائی، ایک فاعل بالارادہ اور ذی شعور ہستی کو مستلزم ہے۔ بے شعور مادہ اس کی علۃ نہیں ہو سکتا ۱۲

خدا، مجرد عن المادہ اور مؤثر اول ہے (Energy) وہ حی و قیوم ہے مبدأ حیات ہے، ازلی و ابدی ہے، تفصیل کے لئے دیکھو (مابعد الطبیعات باب ۱۱)

خدا واحدِ حقیقی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کثرت نہیں، کیونکہ کثرت، مادی امور سے علاقہ رکھتی ہے، اور خدا مادہ سے بری ہے، وہ ہمیشہ یکساں ہے۔ اس میں تغیر راہ نہیں پا سکتا، ورنہ وہ خود معلول ہو جائیگا، اور علۃ تامہ نہ رہیگا، خدا جذبات، انفعال اور قسمت، اجزاء وغیرہ سے پاک ہے۔ یہ باتیں مادہ کے خواص ہیں اور وہ مادہ سے بری اور پاک ہے ٭

" ارسطو کا تصوّر، افلاطون کے تصوّر کی طرح اعلیٰ اور ارفع ہے مگر ایک فرق ہے، افلاطون کا تصوّر مذہبی رنگ لئے ہوئے ہے۔ اور ارسطو کا تصوّر زیادہ تر عقلی پہلو لئے ہوئے ہے اور moral Virtues صفاتِ اخلاقی سے معرّا ہے ۱۲

منطق | منطق کی ابتدا سقراط سے ہوئی لیکن ارسطو نے اُسے باقاعدہ مدون کیا۔ اور اس لحاظ سے ہم اُسے موجد کہہ سکتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ منطق صحیح علم کے حصول کا ذریعۂ خاص ہے۔ اور جبتک آدمی کو منطق سے پوری واقفیت نہ ہو اُسے فلسفہ و الٰہیات میں دخل نہ دینا چاہیئے، یعنی منطق، فلسفہ کا مقدمہ

ہے منطق کا موضوع تصوّر و تصدیق ہے اور غرض اس سے یہ ہے کہ فکر انسانی غلطی سے محفوظ رہے، غور د فکر Thinking سے مراد، کلیات سے جزئیات کی طرف آنا ہے ۔

ہمارا علم، حاسۃ (Sense perception) سے شروع ہوتا ہے اور جزئیات سے کلیات مرتب کیجاتی ہیں۔ کلیات ہمارے تخیل کی معراج ہیں اور مبادی علم (First premise) ہیں۔ علم تجربہ پر مبنی ہے۔ استقراء، استخراج کا مقدمہ اور تمہید ہے۔ (Catagories) یا اعراض سے مراد وہ امور عامہ ہیں، جو کسی شے کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ انکی تعداد نو ہے۔ کم۔ کیف۔ علاقۃ۔ فعل۔ انفعال این۔ متیٰ۔ وقوع اور ملک ۔

نوٹ:۔ موجودہ زمانہ میں مِل اور مینل نے ارسطو کی منطق کی اعلیٰ خدمت ہے۔

طبیعات | ارسطو کی طبیعات، دیمقراطیسی مذہب کی تردید ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ مادہ مجہول و منفعل (passive) اور غیر مؤثر و معطل (Inert) ہے۔ خلاء کے لئے اجرام کا وجود ضروری ہے، جہاں مادہ کی سرحد ختم ہوتی ہے، خلاء بھی ختم ہوجاتی ہے، جو شئے کسی دوسرے جسم سے محدود نہیں، خلاء میں نہیں، چونکہ خلاء کا وجود، مادہ سے علیحدہ ناممکن ہے، لہذا خلاء محدود ہے۔ حرکت کے بغیر خلاء کا تصوّر محال ہے، اور خدا متحرک نہیں، لہذا خدا مقید بالمکان بھی نہیں یعنی غیر محدود اور لامتناہی ہے ۔

کائنات (Universe) ازلی ہے، نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اول کرہ خاک ہے، بعدہٗ کرۂ آب، پھر کرۂ باد، آخر میں کرۂ نار ہے۔ انکے بعد اجرام فلکی کا دور ہے۔ بعض ثابت اور بعض سیارے ہیں ۔

علم الحیوٰۃ | ارسطو علم الحیوٰۃ کا موجد اور بانی ہے وہ کہتا ہے کہ حیاۃ، نفس (Soul) کا نشان ہے، جو شے زندہ ہے اس میں روح ضرور موجود ہے۔ انسان، جسم اور روح سے مرکب ہے مگر روح مقدم اور جزو اعظم ہے ۔

نفسیات | نفس یا عقل (mind) کے لئے دو قوتیں خاص ہیں، قوۃ منفعلہ اور قوت مدرکہ یعنی (Active and Passive) عقل مدرک جزئیات و کلیات ہے۔ اور جزئیات کا وجود حقیقی ہے۔ کلیات کا وجود خارج میں نہیں۔ وہ ذہنی اعتبارات ہیں۔ جو جزئیات پر موقوف ہیں ۔

مبادیات کا علم دو طرح پر ہوتا ہے۔ بذریعہ وجدان حسی (Intuitions of Sense) اور بذریعہ وجدانِ عقلی (Intuition of pure intellect) انسان خلاصۂ کائنات اور عالم صغیر (Microcosm) ہے۔ جملہ حیوانات و موجوداتِ عالم سے بذریعۂ عقل (Nous - Reason) ممتاز ہے

انسان کی روح، اول مرتبہ میں نباتاتی روح سے مشابہ ہے کیونکہ اُسکے جسم کی زندگانی کا سبب ہے، دوم مرتبہ میں حیوانی روح سے مشابہ ہے کیونکہ اس میں قواءِ حسی، واہمہ، متخیلہ اور حافظہ پائی جاتی ہیں، خوشی اور رنج، نفرت اور رغبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ تیسری مرتبہ میں سب سے ممتاز ہے یعنی مدرک جزئیات وکلیات ہے، اور حیوانات اس قوت سے محروم ہیں یعنی ان میں غور وفکر کی قوۃ موجود نہیں۔ روح کی وہ صفاۃ جو اول اور دوسرے مراتب میں پائی جاتی ہیں، مشاہدہ تخیل، حافظہ وغیرہ یہ سب جسم سے متعلق ہیں اور جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہیں لیکن لطیفۂ عقل (Reason) یعنی نفسِ مُدرک یہ غیر فانی ہے کیونکہ مجرد عن المادہ ہے۔ یہ لطیفہ ایک الٰہی نور ہے جو خارج سے روح میں شامل ہو جاتا ہے روح حیوانی، حیوان کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے لیکن یہ ہمیشہ باقی رہتا ہے، کیونکہ اسکا تعلق ذاتِ باری سے ہے جو مجرد اور باقی ہے۔ یہی حقیقی انسان ہے یہی مکلف ہے ۱۲

اخلاق | انسان کا نصب العین، حقیقی انسانیت کے درجہ پر پہنچنا ہے اور انسان دیگر حیوانات سے بذریعہ عقل ممتاز ہے، لہذا اسکی زندگی کا مآل کار محض کھانا پینا اور سورہنا نہیں ہوسکتا اگر وہ حیوانوں کی سی زندگی پر قانع ہوگیا تو پھر انسانیت کے درجہ سے گر گیا۔ اسکی زندگی عقلی زندگی ہونی چاہیئے، یعنی ایسی زندگی جس میں اُسکے تمام قواء جسمانی وروحانی، عقل کے ماتحت کام کریں اور تمام قواء میں ایک اعتدال پایا جائے "خیر الامور اوسطہا" جسے انگریزی میں (Golden mean) کہتے ہیں انسانی زندگی کا اصول ہونا چاہیئے۔ مثلاً انسان کے لئے جیسی کہ بُزدلی عیب کی بات ہے اسی طرح تہور۔ ان دونوں کے درمیان شجاعت کا درجہ ہے جو بوجہ اعتدال پر ہونیکے، احسن اور مناسب ہے، اسی طرح بُخل اور اسراف دونوں مذموم ہیں۔ سخاوت اعلیٰ اور افضل ہے مقصدِ حیات کا حصول، شرافتِ نفس پر منحصر ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو اخلاقی پہلو سے اعلیٰ بنا دے بلکہ قوم اور ملک کا مفاد ہمیشہ اسکے پیشِ نظر رہے۔ چنانچہ ارسطو کے نزدیک نیک انسان وہ ہے جو قوم کے مفاد کی خاطر سب کچھ حتی کہ اپنی عزیز جان بھی قربان کردے۔ کیونکہ انسان بالطبع مدنی واقع ہوا ہے، اسکی زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی ہے۔ اگر اس کے افعال جماعت کے لئے مضر ہیں تو وہ نیکوکار نہیں کہلا سکتا، نہ صاحب اخلاق حسنہ ۱۲

مرتبہ سلیم بریلوی

آسمانی بچّہ

ایک دفعہ دو غریب لکڑ ہارے صنوبر کے ایک گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے، جاڑے کی رات، بلاکی سردی۔ زمین اور درختوں پر برف ہی برف نظر آتی تھی، پالا ٹہنیوں کو چھیل رہا تھا۔

جب وہ رودِ کوہی کے نزدیک پہنچے، تو پالا بحس وحرکت ہوا میں معلق ہو جاتا، تاکہ شاہِ یخ اُسے چُوم لے۔ سردی اتنی سخت تھی کہ چرند اور پرند دونو عاجز آ گئے تھے۔ ایک جھاڑی سے نکل کر دُم دبائے ہوئے بھیڑیئے نے غُرّا کر کہا "اُف! موسم کتنا بُرا ہے۔ لیکن حکومت کو اس سے کیا غرض؟"

سبز چڑیا نے چہچہا کر کہا "افسوس! افسوس!! بوڑھی زمین مر چکی ہے، وہ سفید کفن میں لپیٹ دی گئی ہے"

قمریوں نے جن کے سبز پنجے یخ بستہ ہو چکے تھے، ایک دوسری سے بُڑبُڑا کر کہا "زمین بیاہی جا رہی ہے اور یہ اس کا عروسی جوڑا ہے"

بھیڑیئے نے پھر غُرّا کر کہا۔ بے وقوف! یہ سب کچھ حکومت کی غلطی کا نتیجہ ہے، اگر تم باور نہ کرو گے، تو کچّا چبا جاؤں گا"

بھیڑیا عملی جانور تھا، اُسے کوئی اچھی دلیل دینے کی ضرورت نہ ہُوا کرتی تھی۔ ہُدہُد نے جو ایک پیدائشی فلسفی تھا، کہا "واقعہ ہمیشہ واقعہ ہوتا ہے، آج سردی ضرور سخت ہے"

حقیقتاً سردی تھی بھی سخت۔ چنار کے درخت کے اندر رہنے والی چھوٹی چھوٹی گلہریاں اپنی ناک کو گرم کرنے کے لئے رگڑ رہی تھیں۔

خرگوش اپنے گڑھوں میں خاموش تھے، انہوں نے نظر اُٹھا کر باہر دیکھنا بھی گناہ سمجھ لیا تھا، ایسے میں صرف قرنی اُلّو خوش باش نظر آتے تھے۔ ان کے پَر شبنم آلودہ ہو چکے تھے، مگر اُنہیں اس کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنے زرد دیدے بدل بدل کر برابر کیے جا رہے تھے۔ "اہا! آج کیا ہی اچھا اور خوشگوار موسم ہے"

لکڑ ہارے اپنا آہنی عصا زمین پر ٹیک ٹیک کر بڑھ رہے تھے۔ ایک دفعہ برف میں جو دھنس کر نکلے تو سفید بّراق ہو گئے۔ دوسری بار پاؤں کیا پھسلا کہ آپ بھی زمین پر آ رہے اور لکڑی کے گٹھے بھی تتر بتر ہو گئے، ایک ایک لکڑی کو چُن کر دوبارہ گٹھے میں باندھا۔ ان کے بدن میں ارتعاش پیدا ہو گیا، جب

انہوں نے یہ خیال کیا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ستمگر برف کی آغوش میں مرنے کا انجام کیا ہے؛ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو "سینٹ مارٹن" جو مسافروں کی حفاظت کرتا ہے، اسکی پناہ میں دیدیا +

خدا خدا کر کے وہ جنگل کے کنارے تک آ پہنچے۔ دُور وادی کے اندر انہیں بستی میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی، جہاں انکی بود و باش تھی +

وہ اپنی نجات پر خوش تھے، زمین ان کو ایک سیمیں پھول، اور چاند ایک زرّیں پھول نظر آنے لگا" وہ ہنسے لیکن بہت جلد مغموم سے ہو گئے۔ ان کو اپنی تہیدستی یاد آئی۔

ایک نے کہا "ہم خوشیاں کس طرح منائیں؟ جب دیکھتے ہیں کہ زندگی صرف امیروں کے لئے ہے، ہمارے لئے نہیں؛ ہم جنگل میں سردی سے ٹھٹھریں یا کوئی وحشی درندہ ہمیں پھاڑ ڈالے کسی کو اس سے کیا غرض؟"

دوسرے نے کہا "تمہارا خیال بالکل صحیح ہے! کسی کو کم دیا جاتا ہے۔ اور کسی کو زیادہ، دنیا ناانصافی کا گھر ہے۔ ہاں! اگر کسی چیز میں برابر کا حصہ دیا جاتا ہے، تو فقط غم و اندوہ میں . . . ."

ابھی وہ یہ رونا رو ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

آسمان سے ایک حسین ستارہ گرا، ہاں آسمان کے گوشہ پر جب وہ اور ستاروں میں سے گزر رہا تھا، بید مجنوں کے جھنڈ کے پرے، لکڑہاروں سے بہت تھوڑی دُور گرا۔

"کیوں یہ ڈھونڈنے والوں کے لئے سنہری پلندہ نہیں ہے؟" یہ کہکر وہ سونے کی تلاش میں دَوڑے، اور سر پر پاؤں رکھکر دوڑے۔ ایک نے دوسرے ساتھی کو پیچھے چھوڑ دیا، وہاں پہنچ کر جہاں وہ سنہری چیز سفید برف پر گری تھی، رُکا، اور جُھک کر اُس گرنے والی چیز کو ہاتھ سے ٹٹولا، وہ ایک زربفت کا لبادہ تھا، جس پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ اور تہ در تہ لپٹا تھا؛ اُس نے چلا کر اپنے ساتھی سے کہا "میں نے آسمان سے گرنے والا خزانہ پالیا ہے آسمانی بچّہ پا لیا ہے"!

دونوں لکڑہارے وہاں برف پر بیٹھ گئے، اور اس لبادہ کی تہیں کھولنی شروع کیں، تاکہ وہ یہ زرّیں ٹکڑے آپس میں بانٹ لیں +

افسوس کہ وہ نہ تو سونا تھا، اور نہ چاندی۔ اور نہ کسی اور قسم کا خزانہ، اس میں صرف ایک بچّہ سو رہا تھا،

ایک نے کہا۔ "یہ سب کچھ ہماری اُمیدوں کے لئے مرگِ مایوسی کا پیام ہے۔ ہماری قسمت اچھی نہیں ہے، ہم راندۂ روزگار ہیں۔ ہم اپنے بچوں تک کو نہیں پال سکتے، اس کا پیٹ کس طرح پالینگے ؟ بہتر ہوگا کہ اسے اسکے حال پر چھوڑ دیں۔"

دوسرے نے جواب دیا۔ "یہ بہت بُری بات ہے کہ ہم اسے برف میں تباہ ہونے دیں، میں بھی قلاش اور کنگال ہوں، بہت سے آدمیوں کا پیٹ پالنا پڑتا ہے، پھر بھی اسے میں گھر لے جاؤں گا، میری بی بی اس کی پرورش کریگی"

اس نے بچے کو سردی سے محفوظ کرنے کے لئے لبادہ میں لپیٹا، اور آرام سے اُٹھالیا، لیکن اس کا ساتھی اس کے اس احمق پن اور سادہ لوحی پر ششدر رہ گیا۔ آخر پہاڑی سے اُتر کر انھوں نے بستی کی راہ لی۔ جب وہ بستی میں پہنچے تو ساتھی نے کہا۔ "تم نے تو بچہ لیا ہے، مجھے یہ لبادہ دے دو کیونکہ تمہارا اور میرا برابر کا حصہ ہے"

جواب دیا گیا کہ لبادہ نہ تو میرا ہے، اور نہ تمہارا، بچہ ہی اس کا مالک ہے۔ پھر اس نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بی بی نے دروازہ کھولا اور خاوند کو صحیح وسلامت دیکھ کر اپنی باہیں اُس کے گلے میں حمائل کر کے اُسے چُوم لیا۔ پھر لکڑیوں کا گٹھا پیچھے سے لیکر برف جھاڑ دی، اور اسے اندر آنے کو کہا۔

"مجھے کچھ جنگل میں سے ملا ہے۔ اُسے تمہاری حفاظت میں دینے کے لئے لایا ہوں"

یہ لفظ دہلیز سے باہر کہے گئے۔

"کیا ہے ؟ مجھے دکھاؤ نا۔ گھر خالی ہے، ہمیں کئی چیزوں کی ضرورت ہے"

اس نے لبادہ کھول کر سویا ہوا بچہ بی بی کو دکھایا۔

اس نے بڑبڑا کر کہا۔ "اے نیک بخت! ہماری پہلے ہی بہت سی اولاد ہے۔ پھر ایسے میں ہمیں اس کی ضرورت نہیں، کون جانتا ہے کہ یہ ہمارے لئے کتنا منحوس ثابت ہو ؟"

"نہیں یہ تو آسمانی بچہ ہے" پھر اُسنے اسکے ملنے کی عجیب وغریب بپتا سُنائی۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوئی، اس نے چلا کر کہا۔ "ہم اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے پھر کس طرح کسی اور بچے کی پرورش کی جا سکتی ہے ؟ کون ہماری خبر لینے والا ہے ؟ اور کون ہمیں خوراک دینے والا ہے ؟"

لکڑہارے نے جواب دیا۔ "وہی جو چڑیوں کی خبر لیتا ہے، اور ان کو خوراک بہم پہنچاتا ہے"

عورت نے پھر کہا: "کیا چڑیاں بھوک سے موسمِ سرما میں جان نہیں دیتیں؟"

اس کا جواب مرد نے کچھ نہ دیا۔ اور نہ دہلیز سے آگے بڑھا۔

کھلے ہوئے دروازے سے سرد ہوا کے جھونکے آئے۔ بیوی سردی سے کانپنے لگی۔

"دروازہ تو بند کر دو، ہوا سخت سرد ہے، میں سردی سے کپکپا رہی ہوں"

جواب دیا گیا کہ جس گھر میں دل سخت ہو وہاں سرد ہوا ہمیشہ نہیں آیا کرتی۔ تھوڑی دیر کے بعد عورت نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

مرد نے اندر آ کر بچّے کو عورت کی گود میں دے دیا۔ عورت نے چوم کر اُسے اپنے ننھے بچّے کے قریب لٹا دیا۔ صبح لکڑہارے نے وہ زرّیں لبادہ اور وہ عنبریں زنجیر، جو بچّے کے گلے سے لپٹی ہوئی تھی، دونوں چیزیں ایک صندوق میں محفوظ کر دیں۔

رین کٹ گئی، دن بیت گئے، آسمانی بچّہ لکڑہارے کے بچّوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا، اب وہ ان کا ہمجولی تھا، سن کے ساتھ ہر سال اس کا جمال بڑھتا گیا، تمام اہل قریہ اسے دیکھ کر حیرت میں کھو جاتے تھے۔ کیونکہ وہ سب ملیح تھے، اور ان کے بال سیاہ تھے۔ لیکن وہ نازک تھا، اور ہاتھی دانت کی طرح سپید۔ بال گھونگریالے تھے، ہونٹ سرخ گلاب کی پتّیوں کی طرح تھے۔ آنکھیں دریائی بنفشہ کی مانند تھیں، اور بدن ایک نرگس کا پھول تھا۔

اُف! اس حُسن نے اسے کہیں کا نہ رکھا، وہ ستمگر، اور مغرور ہو گیا۔ بہت جلد لکڑہارے کے بچّوں اور اہل قریہ کے بچّوں سے اس وجہ سے تنفر کرنے لگا کہ وہ عالی نژاد نہیں ہیں۔ میں عالی نژاد ہوں، اور آسمانی بچّہ ہوں۔

اِسی خیال سے اُس نے اپنے آپ کو تمام بستی کا مالک جانا، اور اہلِ قریہ کو نوکر اور غلام سمجھ لیا، وہ غریب اور اندھوں پر بھی رحم نہ کھاتا تھا۔ اِن پر پتھر اور کنکریاں پھینکتا، اور انہیں مجبور کرتا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز اس بستی میں خیرات مانگنے نہ آیا کریں۔

اس حشر کے بعد کسی گداگر کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ دوسری بار خیرات مانگنے آ نکلے۔ بہرکیف وہ ایک دلدادۂ حُسن تھا۔ ہمیشہ کمزور اور بدصورت انسانوں پر ہنستا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے عشق تھا پادری کے صحن کے اندر جو کنواں تھا موسمِ گرما میں وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر گھنٹوں اسی عشرت اور مسرت

میں ڈوبا رہتا تھا ؛

کئی بار پادری نے کوشش کی وہ اسے خدا کی مخلوق سے محبت کرنا سکھائے، ہاں! اسی پادری نے اس کے سامنے کئی بار یہ وعظ کئے کہ "مکھی کو گزند نہ پہنچاؤ کہ وہ ہماری بہن ہے، یہ وحشی پرندے جنہیں آزادی کی دنیا ملی ہے خوش ہیں، ان کو اسیرِ قفس نہ کیا کرو۔ خدا ہی نے اِن اندھے کیڑوں اور چھچھوندروں کو پیدا کیا ہے۔ ہم کون ہیں؟ کہ اس کی مخلوق کو تکلیف پہنچائیں۔ جبکہ کھیت کا ہر جانور اُسی کی توصیف میں ازخود رفتہ ہے" لیکن یہ سب باتیں صدا بصحرا ثابت ہوتیں۔ اور وہ چیں بجبیں ہو کر اپنے ہمجولیوں کے ہمراہ وہی کچھ جا کر کرتا۔

وہ حسین تھا، سبک پا تھا، ماہر موسیقی تھا، اور رقص کرنا جانتا تھا، ان فضیلتوں کے باعث اسکے ہمجولی اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا، ان سے کراتا۔ ٹوکتا تو رہ جاتے، جہاں جانیکا حکم دیتا، وہ جاتے۔

جب اُس نے چھچھوندر کی آنکھیں نکالیں، تو وہ ہنسے، آہ! جب اُس نے ایک کوڑھی پر پتھر پھینکے، تو وہ تمام ہنسے اور جی بھر کر ہنسے، وہ بستی کا حکمراں تھا، آخر سب بچے اسی کی طرح قسی القلب ہو گئے

ایک روز ایک غریب گداگر عورت کا بستی سے گزر ہوا۔ اسکے بدن پر چیتھڑے تھے، سڑک کی کنکریوں سے پاؤں لہولہان تھے۔ وہ تکان کے باعث ایک شہ بلوط کے درخت کے نیچے دم لینے کو بیٹھ گئی ؛

جب اُس نے فقیرنی کو دیکھا، تو اپنے ہمجولیوں سے کہا "دیکھو اُس سبز پتیوں والے درخت کے نیچے فقیرنی بیٹھی ہے، آؤ اس مفلوک الحال اور بدصورت ہستی کو یہاں سے اُٹھادیں"

وہ اس کام کی تکمیل کے لئے اُس طرف بڑھا، اور پتھر پھینکنے شروع کئے۔ فقیرنی نے خوف آلود مگر ترحم انگیز نگاہیں اس پر جمادیں ؛

لکڑ ہارا جو لکڑیاں پھاڑ رہا تھا، یہ دیکھ کر اس کی جانب بڑھا، اس نے چلا کر کہا "یقیناً تو رحم سے کوسوں دُور ہے، اور محض ایک قسی القلب انسان ہے۔ اس غریب عورت نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ اس سے یہ سلوک روا رکھتا ہے"

یہ سنتے ہی وہ غصہ سے تمتما اُٹھا، اور پاؤں زمین پر مار کر کہا "تو کون ہے؟ کہ مجھ سے یہ سوال

کرسکے ۔میں تیرا بیٹا نہیں ہوں، پھر تجھے کیا اختیار ہے کہ مجھے کسی بات سے باز رکھ سکے!

لکڑ ہارے نے جواب دیا "بے شک! تو میرا بچّہ نہیں، لیکن تجھ پر رحم کھانے والا میں ہوں"

جب فقیرنی نے یہ سُنا تو وہ ایک چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ لکڑہارا اُسے گھر اُٹھوا لایا۔ اس کی بیوی نے اُس کی تیمارداری کی، فقیرنی نے جب ہوش سنبھالا، تو تیمار دار نے کچھ کھانے اور پینے کو دیا۔ لیکن اُس نے نہ کچھ کھایا، اور نہ پیا، صرف لکڑہارے سے اتنا استفسار کیا "کیا یہ بچّہ جنگل میں ملا تھا، کیا آج اس بات کو دس سال کا عرصہ نہیں گزرا؟"

لکڑہارے نے جواب دیا "ہاں میں نے اسے جنگل میں پایا تھا، آج دس سال کا عرصہ گزرتا ہے"

فقیرنی:- کیا اس کے گلے میں عنبریں زنجیر نہ تھی؟ کیا وہ ایک زرّیں لبادے میں جس پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے، نہ لپٹا ہُوا تھا؟"

"بے شک تم درست کہہ رہی ہو" لکڑہارے نے وہ عنبریں زنجیر اور وہ زرّیں لبادہ صندوق سے نکال کر اُسے دکھایا جسے فقیرنی دیکھ کر فرطِ محبت سے رو دی۔ اس نے کہا "یہ میرا بچہ ہے میں اسے جنگل میں بھول آئی تھی، میں اس کی تلاش میں کہاں کہاں ہو آئی ہوں، دُنیا کا گوشہ گوشہ تلاش کیا ہے، اسے جلد بُلائیے . . . ."

لکڑہارا اور اس کی بیوی آسمانی بچّہ کو بُلانے کے لئے گئے۔ اور اس سے کہا "گھر میں تیری ماں آئی ہے، وہ تیرے انتظار میں ہے"

وہ مسرّت و ابتہاج کے ساتھ دوڑا۔

جب اُس نے فقیرنی کو دیکھا تو نفرت سے پوچھا "میری ماں کہاں ہے؟"

فقیرنی نے جوشِ محبت سے ہکلاتی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں . . . . . . ہی . . . تو تیری ماں ہوں"

اس نے غصّہ سے کہا "تو یونہی بکتی ہے . . . . . . " میں تجھ ایسی بدصورت فقیرنی کا بیٹا نہیں ہوں، آج کے بعد پھر کبھی یہ چہرہ نہ دکھانا"

فقیرنی نے چلا کر کہا "حقیقتاً تو میرا لال ہے" پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اور اپنی باہیں پھیلا دیں، ایک دفعہ جذبات کے ہیجان پر قابو پاکر بڑبڑائی "ڈاکو ہاں! ظالم ڈاکو مجھ سے تجھے جدا کر گیا تھا میں نے وہ نشان آج پہچان لئے ہیں، اور تجھے . . . . . . بھی پہچان لیا ہے۔ وہ عنبریں زنجیر، اور زرّیں لبادہ

بھی مل گیا ہے۔

آ۔ اے میرے مایۂ ناز! آ۔ میرے ہمراہ چل، میں تجھے کہاں کہاں ڈھونڈھ آئی ہوں!!"

آسمانی بچہ ساکت وصامت رہا۔ لیکن اس کا بابِ محبت ماں کے لئے بند اور قطعاً بند ہو چکا تھا۔

فقیرنی کے رونے کی آواز کے سوا ہر طرح سکوت طاری تھا، آخر اُس نے سلسلۂ سکوت کو توڑ کر جواب دیا۔ "اگر حقیقتاً تو میری ماں ہے، جیسا کہ تو کہتی ہے، تو پھر میرے لئے تو ایک ملامت ہے اور موجب صد ملامت، میں تو یہ خیال کئے ہوئے تھا کہ میں آسمانی بچہ ہوں نہ کہ تجھ فقیرنی کا بچہ۔ بہتر ہو گا کہ تو پھر یہاں کبھی نہ آئے"۔

فقیرنی نے جواب دیا۔ "آخری بار اپنا منہ چوم لینے دے۔ میری تلاش کا اتنا صلہ تو دے!"

"نہیں! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ تو مجھے چومے، تو اس قدر بدصورت ہے کہ میں تجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا"۔

آخر وہ روتی چلاتی جنگل کی طرف چل دی۔

آسمانی بچہ خوش خوش اپنے ہمجولیوں کی طرف دوڑا، تاکہ ان سے جا کر کھیلے۔ وہ تمام یک زبان ہو کر چلائے "ہم ایسے بدصورت اور کریہہ المنظر انسان کے ساتھ کھیلنا گوارا نہیں کر سکتے جسکے رخساروں کے قریب دو بدصورت سانپ لہرا رہے ہوں"۔

انہوں نے اُسے باغ سے باہر کر دیا۔ اس نے چیں بجبیں ہو کر اپنے دل میں کہا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟ میں ابھی کنوئیں پر جاؤنگا، پانی حقیقت بے نقاب کر دیگا"۔

وہ گیا اور کنوئیں کے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا، حقیقتاً اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا، اور اس کے گالوں کے نیچے دو سانپ لہرا رہے تھے۔

وہ گھاس پر لیٹ کر رونے لگا، اور اپنے دل میں اس نے اعتراف کیا۔ کہ یہ سب کچھ گناہوں کا نتیجہ ہے کیونکہ میں نے اپنی ماں کو سخت مایوس کر دیا ہے۔ اب دنیا میں اس کی کہاں تلاش کروں؟ ۔۔۔۔۔ میں قطعی طور پر آرام نہ لونگا۔ حتیٰ کہ اسے تلاش نہ کر لوں"۔

لکڑہارے کی چھوٹی بچی آئی اُسنے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا ہوا اگر تیری خوبصورتی زائل ہو گئی ہے؟ آ ہم تجھ سے مذاق نہیں کرینگے!"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، میں اپنی ماں کو تلاش کر کے اُس سے معافی چاہونگا"

"وہ جنگل کی جانب ماں کو پکار پکار کر دوڑا، لیکن سوائے اسکی صدائے بازگشت کے کوئی جواب نہ ملا۔ غروبِ آفتاب کے وقت وہ پتوں کے بستر پر سویا۔ پرند اور جانور اس کی جانب لپکے، کیونکہ ان کو اُسکے توڑے ہوئے مظالم یاد تھے +

لیکن ان دو سانپوں نے اس کی خوب حفاظت کی۔ صبح اُٹھ کر اس نے کچھ بیر کھائے، پھر روتا دھوتا آگے بڑھا، اس نے ہر راہگیر سے اپنی ماں کا پتا دریافت کیا۔

چھچھوندر سے پوچھا" کیا مری ماں زمین کے اندر تو نہیں ہے ؟"

"کیا تو نے مجھے اندھا نہیں کیا تھا؟ پھر میں کیسے دیکھ سکتی ہوں"

پھر چڑیا سے استفسار کیا" کیا تو کسی پیڑ پر سے میری ماں کو دیکھ سکتی ہے ؟"

"تو نے تو میرے پَر نوچ ڈالے تھے۔ اب میں کیسے اُڑ سکتی ہوں ؟"

پھر وہ گلہری سے مخاطب ہوا، اُس نے ٹکا سا جواب دیا۔ یہ سُن کر آسمانی بچہ بہت رویا، اس نے سر جُھکا کر خدا سے توبہ کی، پھر آگے بڑھا۔ تیسرے روز جنگل ختم ہو گیا اور وہ میدان میں داخل ہوا۔

جب وہ ایک بستی میں سے گزرا، تو لڑکوں نے اس پر سنگ باری کی، اور اُس سے نہایت ہی بےمہری کا سلوک کیا، کوئی نہ تھا کہ اس پر رحم کھاتا، اُسے اپنی ماں کا بھی کچھ پتہ نہ ملا۔ سڑکوں پر دوڑ دوڑ کر ماں کو پکارتا، لیکن وہ کہاں؟ کسی دوسرے شخص نے بھی اسے تسلی کا ایک حرف تک نہ کہا۔ تین سال کا عرصہ اسی جستجو میں گزرا، دنیا میں اسکے لئے نہ تو محبت تھی اور نہ رحم، دنیا نے اس سے وہی سلوک کیا، — ہاں بالکل وہی جو وہ کسی دن اُس سے روا رکھ چکا تھا۔

ایک روز وہ ایک شہر کی فصیل کے دروازہ پر پہنچا، یہ شہر برلبِ دریا واقع تھا۔ وہ تکان سے چور چور تھا، شہر میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ محافظ نے اندر داخل ہونے سے روک دیا، اور کڑک کر کہا" شہر میں تمہارا کیا کام ہے ؟"

"مجھے اپنی ماں کی تلاش ہے، اس غرض سے اندر داخل ہونا چاہتا ہوں، ممکن ہے کہ اس شہر میں آئی ہو"

وہ یہ سن کر ہنس دئے، ایک سیاہ داڑھی والے محافظ نے سپر رکھکر کہا" سچ تو یہ ہے کہ ماں تجھ کو دیکھ کر خوش نہ ہوگی، تو دلدل کے سانپ سے بھی زیادہ کریہہ المنظر ہے، رہنے بھی دے اس تلاش کو، تیری

ماں یہاں کہاں؟"

ایک اور محافظ نے جس کے ہاتھ میں زرد علم تھا کہا "تیری ماں کون ہے، تجھے اسکی تلاش کیوں ہے؟"

"میری ماں میری طرح ایک فقیرنی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ وہ بُرا سلوک کیا ہے، جو مجھے نہ کرنا تھا، اندر جانے کی اجازت دو، تاکہ میں اسے ڈھونڈھ کر اس سے معافی مانگوں"

اِن تمام محافظین نے اس کے جسم کو نیزوں سے چھُوا۔ وہ رو کر واپس ہو رہا تھا، کہ ایک شخص جس کے زرہ بکتر پر ملمع کے پھُول تھے، اور جس کے خود پر پروں والے شیر کی شبیہ بنی تھی، آگے بڑھا، اس نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ جواب دیا گیا کہ یہ ایک فقیر ہے، اس لئے ہم نے اسے اپنے شہر میں داخل ہونیکی اجازت نہیں دی"

مستفسر نے ہنس کر جواب دیا "نہیں! ہم اس بُری چیز کو بھی بازار میں فروخت کرینگے، اسکی قیمت کے بدلے کم و بیش ایک شراب کا جام ضرور آئیگا"

اسی اثناء میں پاس سے ایک بوڑھا اور سخت کریہہ المنظر شخص گزرا، اس نے کہا "میں اسے خریدتا ہوں"

اُسے کچھ دے کر اور آسمانی بچہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر وہ شہر میں داخل ہُوا، وہ دونوں کئی گلی کوچوں میں سے گزرے، آخر ایک دروازے پر پہنچے جس کی دیوار پر انار کے درخت کا سایہ تھا۔

بوڑھے نے دروازے کو سنگِ یشب کی انگوٹھی سے چھُوا، جس کے چھوتے ہی دروازہ کھُل گیا، پھر وہ ایک باغ میں داخل ہوئے، جس میں سیاہ پوست کے پودے تھے۔ بوڑھے نے اپنی پگڑی سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور آسمانی بچہ کی آنکھیں اُس سے باندھ دیں۔

جب آسمانی بچہ کی آنکھوں سے کپڑے کا ٹکڑا کھولا گیا، تو اس نے اپنے آپ کو ایک کلبۂ احزاں میں محبوس پایا۔ جس میں ایک دیا جل رہا تھا۔

بوڑھا اسکے قریب آکر بیٹھا، اور اس کو ایک روٹی کا ٹکڑا دے کر بولا، کہ اسے کھاؤ۔ پھر کچھ سیاہ سا پانی ایک پیالہ میں اسے دیا کہ اسے پیو۔

جب وہ کھا پی چکا، تو بوڑھے نے پھر ایک آہنیں زنجیر سے دروازہ بند کر دیا۔

بوڑھا ایک ساحر تھا، جس نے ساحری ایک ایسے شخص سے حاصل تھی، جو نیل کی خانقاہ میں معتکف تھا۔ صبح وہ چیں بجبیں ہو کر آیا، اور آسمانی بچہ سے کہا۔ شہر کے اور نزد کے جنگل میں سونے کے تین

ٹکڑے ہیں - ایک سپید سونے کا ہے دوسرا زرد، اور تیسرا سُرخ سونے کا ہے - اگر تم انہیں تلاش نہ کر لاؤ گے، تو میں تمہیں سو سے زیادہ کوڑے لگاؤں گا - ابھی ان کی تلاش میں جاؤ، غروبِ آفتاب کے وقت میں تمہارا انتظار کرونگا - آج صرف سپید سونے کا ٹکڑا تلاش کر لاؤ"۔

اس نے پھر آسمانی بچّہ کی آنکھیں اسی کپڑے کے ٹکڑے سے باندھ لیں، اور دروازہ اُسی انگوٹھی کی مدد سے کھول کر اُسے گلی میں کھڑا کر دیا -

شہر کے دروازہ سے گزر کر وہ جنگل میں داخل ہُوا جنگل میں دلچسپی کے سامان بہت کچھ تھے پرند ترنم ریز نغموں میں محو تھے، پھولوں میں بھینی بھینی خوشبو تھی، لیکن یہ چیزیں اس کی دلچسپی کا سامان نہ ہو سکیں، وہ جس جانب بڑھتا تھا، کانٹے دامن تھام لیتے تھے - اس کے لئے قدم قدم پر رکاوٹ تھی - غرض اس کا عجیب حال تھا +

صبح سے دوپہر ہوئی اور دوپہر سے شام ہونے کو آئی، مگر وہ سونے کے ٹکڑے نہ ملے - غروبِ آفتاب کے وقت آسمانی بچہ شہر کی جانب منہ کر کے جی بھر کے رویا، کیونکہ اُسے اپنا حشر یاد آرہا تھا، کہ وہاں جا کر کیا ہونے والا ہے -

ابھی جنگل کے کنارے ہی تک آیا تھا کہ اُسے ایک دردناک سی چیخ سُنائی دی، وہ کچھ دیر کے لئے اپنا غم بھول گیا اور اس جانب بڑھا - اس نے دیکھا کہ ایک خرگوش دام میں پھنسا ہُوا ہے - اِس پر رحم کھا کر اس نے اُسے آزاد کر دیا، اور کہا "بذاتِ خود میں ایک غلام ہوں، لیکن تجھے آزاد کئے دیتا ہوں"

خرگوش نے کہا "تم نے مجھے رہا کیا ہے، اس احسان کا کیا صلہ دوں ؟"

"صلہ . . . . . یہ ہے ! کہ تم سپید سونے کی تلاش میں میرا ہاتھ بٹاؤ . . . . . اگر میں اُسے ڈھونڈھ کر نہ لے گیا، تو میرا مالک مجھے نہایت ہی سخت سزا دیگا"

"اچھا ! تم میرے پیچھے آؤ - میں تم کو وہاں لے چلوں گا - میں جانتا ہوں کہ وہ سپید سونے کا ٹکڑا کہاں ہے ؟ اور کس کام آئیگا"

آسمانی بچّہ خرگوش کے ساتھ ہو لیا -

شاہ بلوط کے درخت کے نیچے وہ ٹکڑا مل گیا، آسمانی بچّہ خوشی سے پھولا نہ سمایا، سونے کا

ٹکڑا اُٹھا کر اس نے خرگوش سے کہا "تم نے میری ناچیز خدمت کا بہترین صلہ دیا ہے۔ میرے احسان سے یہ احسان کہیں بڑھ کر ہے"

خرگوش نے اتنا کہا "نہیں بھئی یہ بھی کوئی احسان ہے" پھر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

شہر کے دروازہ پر ایک کوڑھی بیٹھا تھا، جس کی آنکھیں سُرخ مرجان کی طرح درخشاں تھیں۔ جب اُس نے آسمانی بچّہ کو آتے دیکھا، تو کھڑے ہو کر اپنی گھنٹی بجائی اور اُسے بلا کر کہا "میں بھوکا ہوں، کچھ دو، ان لوگوں نے مجھے شہر سے باہر کر دیا ہے، یہاں کوئی نہیں کہ مجھ پر رحم کھائے"

آسمانی بچّہ نے افسوس سے کہا "میری واسکٹ میں صرف ایک سکّہ ہے، جسے میں مالک تک نہ لے گیا تو یقیناً مجھے سخت سزا دی جائیگی"

لیکن کوڑھی نے اس لجاجت سے درخواست کی، کہ آسمانی بچّہ کو رحم آ ہی گیا۔ اس نے وہ سپید سونے کا ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا۔

جب آسمانی بچّہ ساحر کے گھر پہنچا، تو ساحر نے دروازہ کھول کر اُسے اندر کر دیا، اور کہا "کیا سپید سونے کا ٹکڑا لائے ہو؟"

"نہیں جناب"

یہ سُنتے ہی ساحر نے آسمانی بچّہ کی خوب مرمت کی، پھر خالی جام پینے کے لئے رکھکر اُسے اُسی کلبۂ احزاں میں محبوس کر دیا۔

صبح ساحر پھر آیا۔ اور بولا "آج تُو زرد سونے کا ٹکڑا نہ لایا تو تیرے تین سو کوڑے لگینگے"

دوسری مرتبہ وہ پھر جنگل کو گیا، دن بھر زرد سونے کی تلاش کی، غروبِ آفتاب کے وقت وہ تھک کر بیٹھ گیا، اور رونے لگا۔

خرگوش نے پھر ظاہر ہو کر اس سے پوچھا "کیوں روتے ہو؟ جنگل میں کس کی تلاش ہے"

"زرد سونے کا ٹکڑا ڈھونڈھنے آیا ہوں، نہ ملا تو میرا جو حشر ہو گا نہ پوچھو!

خرگوش نے کہا کہ میرے پیچھے آؤ۔ پھر وہ دوڑ کر ایک پانی کے گڑھے کے قریب پہنچے۔ جسکی تہ میں وہ زرد سونے کا ٹکڑا مل گیا۔

"میں تمہاری اس مہربانی کا شکریہ ادا کروں تو کیوں کر؟"

"نہیں پہلے آپ نے احسان کیا تھا" یہ کہکر خرگوش غائب ہوگیا۔
زرد سونے کا ٹکڑا وہ اپنی جیب میں ڈال کر جلدی سے شہر کی جانب بڑھا، پھر وہی کوڑھی اسے آن ملا۔ اور ملتے ہی گھٹنے ٹیک کر اس نے التجا کی کہ کھانے کو کچھ دو، ورنہ بھوک سے جان دیتا ہوں"
آسمانی بچّہ نے اپنی مجبوریوں کا اعادہ کیا، لیکن کوڑھی نے کچھ اس طور سے التجا کی کہ آسمانی بچّے نے زرد سونے کا ٹکڑا اُسے دے ہی دیا۔ ساحر دروازہ پر ملا، اندر جا کر اس نے پوچھا "کیا آج زرد سونے کا ٹکڑا تلاش کر لائے ہو؟"
"نہیں جناب"
یہ سُنتے ہی ساحر نے پھر اُسے اُسی کلبۂ احزان میں پابجولاں کر دیا۔
صبح ساحر پھر آیا اور کہنے لگا کہ "آج کے دن سُرخ سونے کا ٹکڑا لے کر آؤ، تو تمہیں آزاد کر دونگا، ورنہ جان سے مار دونگا"
دن بھر آسمانی بچّہ جنگل میں سرخ سونے کا ٹکڑا تلاش کرتا رہا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ شام کو رونے لگا، ابھی وہ رو ہی رہا تھا کہ وہی خرگوش پھر نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی اس سے رونے کا سبب دریافت کیا۔
جواب دیا گیا کہ سُرخ سونے کے ٹکڑے کی تلاش ہے۔
"ہاں سرخ سونے کا ٹکڑا پیچھے کے گڑھے میں ہے"
ٹکڑا تلاش کر کے آسمانی بچّہ نے کہا۔ "آج مجھ پر تو نے جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں؟"
"نہیں، تم نے پہلے ہی مجھ پر احسان کیا تھا" خرگوش نے اتنا کہا اور جنگل میں گم ہوگیا، شہر کی جانب بڑھا، حسب معمول وہی کوڑھی سامنے آیا۔ گڑگڑا کر التجا کی کہ کچھ کھانے کو دو، ورنہ بھوک سے جان دیتا ہوں"
اس نے پھر رحم کھا کر وہ سرخ سونے کا ٹکڑا اسکے حوالے کر دیا۔ اور کہا "یقیناً تمہاری ضرورت مجھ سے مقدم ہے"
جب وہ شہر کے دروازہ سے گزرا، تو محافظوں نے جھک جھک کر اسے سلام کیا اور کہا کہ ہمارا

بادشاہ کتنا حسین ہے ؟" شہریوں نے پیچھا کر کے کہا "یقیناً اتنا حسین دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا"

یہ سُن کر "آسمانی بچّہ" رو دیا۔ اور کہنے لگا کہ "یہ سب مذاق ہے، جمگھٹا اتنا کثیر تھا کہ وہ اپنے راستہ سے بھٹک گیا۔ آخر وہ ایک ایسے چوک میں جا نکلا، جس میں شاہی محل تھا، محل کے دروازے کھُلے تھے۔ پادری اور حاکمِ اعلیٰ اُسکے ملنے کے لئے بڑھے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا "آپ ہمارے بادشاہ ہیں، آپکی ہمیں ایک مدت سے تلاش تھی"

"میں شہزادہ نہیں، بلکہ ایک فقیرنی کا لڑکا ہوں، تم یہ کیوں کہتے ہو کہ میں حسین ہوں۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ میں بالکل بدصورت ہوں"

وہ محافظ جس کے زرہ بکتر پر ملمع کے پھول تھے، اور جس کی خود پر شیر کی شبیہ تھی، چلّا کر کہنے لگا "آپ حقیقتاً حسین ہیں"

واقعہ یہ ہے کہ "آسمانی بچّہ" کا گزشتہ حسن پھر عود کر آیا تھا، اس میں وہی تاباں و درخشانی تھی، پادری اور حکامِ اعلیٰ جھک کر آداب بجا لائے۔ اور کہنے لگے کہ یہ شاہی عصا، اور تاج ہے، اسے زیب دیجئے گا"

"میں اس قابل نہیں ہوں، کیونکہ میں نے اپنی ماں کا دل توڑا ہے۔ ابھی میرے آرام کے دن نہیں آئے ۔ مجھے اجازت دو کہ میں اپنی مایوس ماں کی دُنیا میں کوئی دن اور تلاش کروں"

اُس نے یہ کہکر مُنہ پھیر لیا اس سڑک کی طرف، جو شہر کے دروازہ تک جاتی تھی۔ سپاہیوں کے مجمع میں اُسے اپنی ماں دکھائی دی جسکے قریب بوڑھا جذامی کھڑا تھا۔ "آسمانی بچّے" کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اس نے دوڑ کر ماں کے قدم لئے۔ سرنگوں ہو کر اتنا رویا کہ قریب تھا کہ اُس کا دل پھوٹ کر باہر نکل آتا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے دل پر قابو پا کر کہا "میں نے اپنے غرور و تبختر سے آپ کا دل توڑ دیا تھا۔ اب میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں آپکی امیدوں کو تباہ کر چکا ہوں، آہ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر شرمسار ہوں"

فقیرنی خاموش رہی۔

پھر اُس نے کوڑھی کی منت سماجت کی اور کہا "تین بار میں نے آپ پر رحم کھایا تھا، میری ماں کو اجازت دیجئے کہ وہ مجھ سے بات کرے"

کوڑھی چپ رہا۔

آسمانی بچہ نے پھر ایک سرد آہ بھری اور کہا:" اماں! پیاری اماں!! اب میرے صبر کی انتہا ہوگئی خدا کے لئے میری خطا معاف کیجئے"

فقیرنی اور کوڑھی نے "آسمانی بچے" کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا:" اُٹھو"

وہ اُٹھا، اور اُٹھ کر دیکھا، تو وہ بادشاہ، اور ملکہ کے لباس میں نظر آئے،

ملکہ نے کہا:" یہ تمہارا باپ ہے، جس کی طرف تم نے التفات کیا تھا"

بادشاہ نے کہا:" یہ تمہاری ماں ہے، جس کے پاؤں تم اپنے گریۂ بے اختیار سے دھو چکے ہو"

اُنہوں نے اُسے چوما، اور پھر اُسے محل میں لائے۔ اور اُسے لباسِ فاخرہ، تاج، اور شاہی عصا دیا۔ شہر کی حکومت اُسکے سپرد کر دی۔"آسمانی بچہ" نے ساحر کو شہر بدر کر دیا۔ لکڑہارے کو انعام واکرام سے مالا مال کیا۔ اور اس کے بچوں کو بڑے بڑے منصب عطا کئے۔

آسمانی بچہ کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اب وہ کائنات سے محبت کرنا سیکھ گیا تھا۔ غریبوں کو روٹی دیتا، اور ننگوں کو کپڑا۔

شہر میں ہر طرح امن وامان تھا۔

(آسکر وائلڈ)

صادق دہروی

ورقِ زرنگار

ہر برگِ زرفشاں چمنِ زرنگار کا
گویا ورق ہے ایک کتابِ بہار کا

نغموں سے گونج اٹھی ہے فضا کوہسار کی
رنگیں نوا ہُوا ہے ربابِ آبشار کا

عالم تمام میکدۂ حسن بن گیا
رُخ بے نقاب دیکھ کے صبحِ بہار کا

تارِ نگاہ جلوۂ صد رنگ میں ہے گم
گویا یہ تار رشتہ ہے پھولوں کے ہار کا

رنگینیاں ہیں خوابِ محبت کی سامنے
یا جلوہ زار ہے شفقِ لالہ کار کا

آغوش میں ہے پیکرِ رنگِ بہارِ حسن
کھٹکا نہیں ہے گردشِ لیل و نہار کا

آئینۂ جمال ہے فردوسِ کائنات
یا بحرِ بیکراں ہے مئے خوشگوار کا

رُکتا ہے گام گام پہ پائے نگاہِ شوق
ق
لغزش میں جس طرح ہو قدم میگسار کا

پھر برقہائے حسن شرر بار ہیں اثرؔ
حافظ ہے اب خدا ہی دلِ بیقرار کا

اثرؔ صہبائی

غزل

جنونِ بیکسیٔ غم کا حاصل دیکھتے جاؤ
ذرا ٹھہرو مری بیتابیٔ دل دیکھتے جاؤ

تڑپ سکتا نہ ہو جو پاسِ آدابِ محبت سے
تم اس بیتاب کی مجبوریٔ دل دیکھتے جاؤ

دلِ مضطر کی ہُوکیں لب تک آ کر لوٹ جاتی ہیں
بیانِ اضطرابِ غم کی مشکل دیکھتے جاؤ

ابھی آیا ہے ساغر دَور میں اَور رند بے خود ہیں
ابھی بدلے گا کیا کیا رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

رہے گا اب نہ اتنا بھی جنونِ آرزو دل میں
کئے دیتی ہے یاس اس کو بھی باطل دیکھتے جاؤ

محمد عبد الحی (علیگ) از لکھنؤ

فلسفہ اور شاعری

مشہور انگریز شاعر ملٹن نے کہا ہے :-

نہ پوچھ اے ہمنشیں! کیا لطف پنہاں فلسفے میں ہے ۔۔۔ نہ ہو حیراں کوئی جاہل گر اس کو بے مزہ جانے
یہ روحانی غذا مرغوب تر ہے من وسلوی سے ۔۔۔ محال اس کو سمجھ لذاتِ ادرک، بوزنہ جانے

(ترجمہ)

لیکن ہم میں سے اکثر خواہ ہم ملٹن کے نغموں کے کیسے ہی مداح کیوں نہ ہوں اُس کی نواسنجیوں کی حقیقی حیثیت سے آشنا نہیں ہیں اور ہم اس خیال سے متحیر رہ جاتے ہیں کہ ایک شاعر فلسفہ کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کرے کہ فلسفہ پر شاعری کا دھوکا ہونے لگے۔ آج کل یہ خیال عام ہے کہ فلسفہ سے محض فلسفیوں ہی کو سروکار ہے۔ اس میں نہ تو شاعری کی جذبہ خیز دلنوازیاں ہیں اور نہ سائنس کی اعتماد انگیز قدرتِ استدلال موجود ہے۔ ہم اسے ایک ایسا کھیل سمجھتے ہیں جس کا کھیلنا فقط چند کھائے کھیلے کھلاڑیوں ہی کا حصہ ہے اور جس کے تماشے سے بجز چند عجیب وغریب مذاق کے لوگوں کے اور کوئی محظوظ نہیں ہوسکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر فنونِ لطیفہ، کھیل نہیں تو فلسفہ بھی یقیناً کھیل نہیں ہے اور اس کے برعکس خیال رکھنے والے لوگوں کو غیر فلسفیوں کے اوہامِ باطلہ نے گمراہ کر رکھا ہے +

اگر ملٹن نے فلسفہ کا ذکر اُسی انداز میں کیا ہے جو غالباً وہ شاعری کے متعلق اختیار کرتا تو اس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے کیونکہ فلسفہ شاعری اور تمام دوسرے "فنونِ لطیفہ" کی طرح "تخلیقی" ہے "تنقیدی" نہیں اور نقاد فلسفی فلسفہ سے اسی طرح ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے جس طرح "فنونِ لطیفہ" کے ماہرین سے اُن کے نقال متمتع ہوتے ہیں ایک "حقیقی" "ماہر فنِ لطیف" کے کارنامے اُسکے انفرادی تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں اور یہی وہ مابہ الامتیاز ہے جو "اہلِ فن" کے نقال طبقہ سے جس کے کارناموں کی بنیاد دوسروں کے تجربوں پر استوار ہوتی ہے اُس کا تفاوت ظاہر کردیتا ہے، لیکن ہم اس حقیقت سے زیادہ آشنا نہیں کہ حقیقی فلسفی بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے ہی ذاتی تجربہ پر رکھتے ہیں اور اُنکے لئے کسی دوسرے شخص کے تجربہ سے اپنے فلسفہ کی تخلیق قطعاً محال ہے۔ اہلِ فن کا کمال اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے انفرادی تجربہ سے

تحریک میں آئے ہوئے جذبات و احساسات کو اس خوبیٔ اظہار سے ہمارے ذہن کی طرف منتقل کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے ہی جذبات و احساسات معلوم ہونے لگتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح وہی فلسفی حقیقی فلسفی ہے جو ہمارے خیالات کو کامیابی کے ساتھ اپنے خیالات کے قالب میں ڈھال سکے۔ ہم سب کے دل میں جذبات کا تموّج ہوتا ہے اور ہم سب خاص خاص خیالات کے معتقد ہیں۔ لیکن جبتک کہ ہمیں فنونِ لطیفہ میں درخور نہ ہو یا ہم فلسفی نہ ہوں، ہم دوسروں پر اُن کا اظہار کر کے اپنے ذخیرۂ دل و دماغ سے بنی نوعِ انسان کے تجربہ میں بحیثیتِ مجموعی کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔

ازبس کہ فلسفہ کی غائتِ حقیقی دوسروں کو اپنے عقائد کا حلقہ بگوش بنانا ہے اسکا پیکر دلیل و برہان کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے اور اگرچہ دوسروں کے خیالات و عقائد پر استدلال کا قصر کھڑا کر دینے سے زیادہ آسان اور کوئی بات نہیں لیکن جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس طریق سے وہ فلسفی بن سکتے ہیں وہ بھی ماہرینِ فنونِ لطیفہ کے نقالوں کی طرح ایک غلط خیال میں مبتلا ہیں۔ ایک حقیقی شاعر محض اس لئے شعر لکھتا ہے کہ کسی اپنی ہی واردات قلب کے زیرِ اثر اسکے جذبات میں ایک ہیجان برپا ہوتا ہے، جس کے اظہار کیلئے وہ بیقرار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک "متشاعر" کی قافیہ پیمائی کی غرض و غائت صرف یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ شاعر "بن" جائے۔ بعینہ ایک حقیقی فلسفی محض اس لئے دلائل سے کام لیتا ہے کہ وہ اپنے ایک خیالِ راسخ کے اظہار کے لئے جو کسی ذاتی واردات کے زیرِ اثر اسکے دل میں پیدا ہو، بیتاب ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اسکے اظہار کیلئے اسکے پاس بجز استدلال کے اور کوئی طریقہ نہیں لیکن یہ امر ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس طرح کوئی شخص قافیہ پیمائی سے شاعر نہیں ہو سکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ محض دلیل آرائی کسی شخص کو فلسفی بنا دے۔ اس میں بھی شک نہیں، کہ جس طرح شعر لکھنے کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا اسی طرح استدلال کی مدد کے بغیر فلسفی بن جانا بھی بے معنی ہے لیکن یہ امر ناگزیر ہے کہ ہر دو حالتوں میں یعنی فلسفے اور فنونِ لطیفہ میں یکساں، ایک خاص جذبہ جو کسی ذاتی واردات سے تحریک میں آئے اپنے اظہار کے لئے کار فرما ہو۔

یہ جذبہ ہماری خواہش کے مطابق محض دلیل و برہان کو کام میں لانے یا شعر لکھنے سے تحریک میں نہیں آسکتا، اگرچہ اس امر میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہی دو چیزیں اس جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں فلسفی یا شاعر کے دل و دماغ پر بیرونی دنیا کے تعلقات کے سلسلہ میں کوئی خاص واردات اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو معرض

اظہار میں لانا اُسکی قوتِ استدلال کا کام ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ قوتِ استدلال کا یہ فعل فلسفہ اور شاعری میں یکساں اُس خاص واردات کا سبب نہیں ـــ نتیجہ ہے۔ دونوں حالتوں میں اس واردات پر اسرار کا ایک گہرا پردہ پڑا رہتا ہے لیکن دونوں ہی حالتوں میں اس کا نقش ایک تحیّر زا حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملٹن نے فلسفہ کی تعریف میں انہیں الفاظ سے کام لیا ہے جو وہ شاعری کے لئے استعمال کرتا کیونکہ شاعر ہونیکی حیثیت سے اُسکے قلب پر بسا اوقات گزر چکی تھی اس نے فلسفہ کی شاہراہ پر بھی اسی کے دلفریب نقشِ پا کی جلوہ گری دیکھی۔

شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ فلسفہ کے متعلق یہ نظریہ اُسکی عظمتِ شان کے منافی ہے کیونکہ اس کے مطابق فلسفہ دلیل و برہان کی عقلی پابندیوں سے آزاد ہو کر رہ جاتا ہے لیکن یہ حقیقت مدِ نظر رکھنی چاہیئے کہ فلسفہ صرف اسی لئے عقل کے مطابق نہیں ہوتا، کہ اس کی تخلیق استدلال عمل میں لاتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ استدلال کی تسکین ہی صرف اُسکے ذریعہ سے ہوسکتی ہے، دلائل کا کام نئے نئے خیالات کی تخلیق نہیں بلکہ اُن کی آزمائش ہے۔ یہ وہ نقّادانہ حربہ ہے جسے فلسفی اپنے ہی خیالات کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ تنقید کی اس آزمائش گاہ سے گزرے بغیر کسی شخص کے خیالات کامل طور پر قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتے فلسفی اور شاعر کے فرائض دوگانہ ہیں اور وہ اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتے جبتک کہ ایک کا عمل دوسرے کی تسکین سے عہدہ برا نہ ہو جائے جس طرح شاعر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس سے وہ خود متاثر ہو اُسی طرح فلسفی اپنے خیالات کے اثبات کے لئے وہی اسلوب اختیار کرتا ہے جس سے اسکی اپنی تشفّی ہوسکے۔ بصورتِ دیگر اس کے لئے خاموشی اور گفتگو ہم معنی ہیں۔ کیونکہ جذبات کا پہلا جوش وخروش گزر جانے کے بعد اسے خود اپنے ایسے اقوال جن میں صحیح طریقِ استدلال اختیار نہ کیا گیا ہو بے جان اور بے مغز نظر آئینگے وہ اپنے اقوال کو اسی صورت میں جاندار بنا سکتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو دلیل و برہان سے کام لیکر اس طرح اُن کی حقانیت کا قائل کرے گویا وہ کسی دوسرے شخص پر اپنا نظریہ ثابت کر رہا ہے۔ اسی طریق سے اس کے خیالات اُس کے انفرادی تجربہ سے گزر کر فلسفے کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور دُنیا بھر کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ فلسفی کو چاہیئے کہ وہ اپنے انفرادی خیالات کی خاص طور پر کوئی پاسداری نہ کرے۔ اسے اپنا کوئی خیال جرح و نقد کی کسوٹی پر سختی سے پرکھے بغیر پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جرح ونقد کی ہر فرو گزاشت اس کے خیالات کا عنصر بن جائیگی، اور اپنے خیالات کے متعلق وہ جس قدر سریع الاعتقادی سے

کام لیگا، اُسی قدر دوسروں کو معتقد کرنے میں ناکام رہیگا۔ لیکن یہ حقیقت ہر حال میں یکساں قابلِ تسلیم ہے کہ کسی انفرادی وارداتِ قلب کے بغیر ناممکن ہے کہ کوئی شخص دنیا کے لئے کوئی اہم نظریہ پیش کر سکے یا محض دوسروں کے اقوال پر تنقید کر کے خواہ وہ کتنی ہی دقیق کیوں نہ ہو فلسفی بن جائے۔

ہمیں فلسفے سے کیوں دلچسپی پیدا نہیں ہوتی؟ صرف اسی لئے کہ ہم اس قسم کی تنقید اور فلسفے میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فلسفہ قصرِ خیال کی شکست و ریخت میں تو مشغول رہتا ہے، لیکن تعمیر سے اسے کوئی سروکار نہیں، فلسفہ ہمیں یہ تو بتاتا ہے کہ انسان کس قدر غلط اندیش واقع ہُوا ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت سے بے خبر رکھتا ہے کہ حقیقت آگاہی کے لئے اُس کو کس قدر لامتناہی قوت ودیعت کی گئی ہے پھر ہم اس خیال میں مبتلا ہیں کہ اس کا ایک بڑا حصہ صرف ایسی باتوں کی تردید کے لئے وقف ہے جن کو آج تک کسی جیتے جاگتے انسان نے تسلیم نہیں کیا گویا حقیقت رسی کا بجز اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ انسان دنیا بھر کی شدنی اور ناشدنی غلط خیالیوں اور کوتاہ اندیشیوں کی آزمائش اور تردید میں مصروف رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے صداقت کو پایا ہے وہ کبھی اس کے لئے اس طریق سے مصروفِ جستجو نہیں ہُوئے۔ انہیں نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے سروکار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں صرف اُسی بات کا قائل کرنا چاہتے ہیں جسے وہ خود صحیح سمجھتے ہوں، وہ ہمیں ایسی باتوں کا یقین نہیں دلاتے جن کی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجایش ہو۔

(ترجمہ)

حامد علی خاں

حسن ایک اتفاقی اور عارضی وصف ہے۔ (رچرڈسن)

یہ ایک ازلی قانون ہے کہ جو حسن میں اول ہو وہ طاقت میں کسی سے کم نہ ہو۔ (کیٹس)

حسن ایک آسمانی شعاع ہے جو انسانی عقل کو خیرہ کر دیتی ہے۔ (کیمبل)

ص۔ ا

دولتِ لازوال

اُن رقص و سرود کے جلسوں میں جبکہ پیرس کی تمام انسانی خوبصورتی جمع ہوتی تھی۔ شرکاء کے لباس اس قدر قیمتی ہوتے جیسے دنیا کی مجموعی دولت انہیں پر صرف کر دی گئی ہے۔ وہ تمام جواہرات جن کا ایک دریا بہتا ہُوا نظر آتا تھا مجھے تیرے ہی جسم کی زینت معلوم ہوتے تھے۔

"وہ بڑا جلسہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جس کے متعلق بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ ایسا جلسہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا اور نوجوان سمجھتے تھے کہ ایسا جلسہ انکے دیکھنے میں کبھی نہ آئیگا اور شاید اسی لئے ہر متنفس چاہتا تھا کہ اس موقع پر اپنی خوشی کے جام مدت العمر کیلئے لبریز کرلے"

تو نے ایک شاہزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "رچرڈ دیکھو۔ اس نے کس قدر جواہرات پہن رکھے ہیں" میں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ میرے خیال میں تیری ہی ہستی سے ان تمام جواہرات کی زینت تھی، اور اگر تو انکے درمیان موجود نہ ہوتی تو میں ان شیشے کے ٹکڑوں کو کبھی جواہرات تسلیم نہ کرتا"

"گھر پہنچ کر تجھے ایک عجیب بات سوجھی۔ تو ان تمام جواہرات کی قیمت کا اندازہ کرنا چاہتی تھی جو اس جلسہ میں عورتوں نے پہن رکھے تھے۔ اس حساب میں تو بار بار بھول جاتی۔ تو نے کہا "رچرڈ ذرا اس حساب میں مجھے مدد تو دینا" میں نے کہا حساب تو مختصر ہے۔ میرے پاس ان تمام جواہرات کی مجموعی قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمتی ایک ہی جواہر ہے۔ جین اگر اُن کی قیمت اسکے پاسنگ بھی ہوجاتی تو میں ضرور انکی تحقیر ثابت کرنیکے لئے حساب کرتا" . . . تو نے میرے منہ کو اپنے ہاتھ سے بند کر دیا"

"موسم بہار میں جب مانٹی کارلو بہشت کا نمونہ بن جاتا ہے وہاں یوروپ کے عیش طلب لوگوں کا اک سیل ہر طرف سے اس طرح کھینچا ہُوا چلا آتا ہے جیسے دریاؤں کا پانی سمندر کی طرف۔ اس وقت میں اور تو دونوں وہاں موجود تھے۔ اُس رشکِ ارم باغ کا نقشہ ابھی تک میری آنکھوں میں موجود ہے جس میں ہم دونوں محوِ گلگشت تھے۔ جس طرف بھی ہم ٹہلتے ہُوئے چلے جاتے معلوم ہوتا کہ پھول بھی اُسی طرف کھلتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں تو نے کہا "میں اب وطن واپس جانا چاہتی ہوں۔ میری طبیعت اُکتا گئی ہے" مجھے سن کر حیرانی سی ہُوئی۔ لیکن تیرا خیال صحیح تھا۔ کیونکہ مانٹی کارلو کی خوبصورتی۔ بہار کی خوبصورتی۔ باغ کی خوبصورتی۔ اور

پھولوں کی خوبصورتی صرف تیری خوبصورتی کی وجہ سے تھی۔ اور ان کا لطف صرف میں ہی اُٹھا سکتا تھا۔ ہر وہ مسرور چہرے والا شخص جو میرے پاس سے گذر جاتا میری ہی خوشیوں پر شاداں نظر آتا تھا۔ یا شاید مسرتوں کا طوفان میرے اندر نہ سما سکنے کے باعث دوسرے ذریعوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا،،

،،میں چاہتا تھا کہ تیرے لئے بھی ایک جین ہو۔ جس کی وجہ سے تو بھی ان چیزوں کا لطف اُٹھا سکے اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ مجسمِ خواہش بن کر یہ کہتا سُنائی دیتا کہ کاش اس جین کا نام رچرڈ ہو،،

،،میں نے سوچا کہ اگر ان تمام دلچسپیوں میں جین موجود نہ ہو تو کیا ماؤنٹی کارلو ویران نہ ہو جائے؟ بہار خزاں میں تبدیل نہ ہو جائے؟ اور یہی پھول مجھے کانٹوں کی طرح نہ چبھیں؟ تیرا اُکتا جانا بجا تھا،،

"ہماری آخری ملاقات لنڈن میں ہوئی تھی۔ جبکہ ہم دونوں شیرؤڈ کے جنگل میں سیر کرنے گئے تھے۔ تو نے کہا" کس قدر سنسان اور ویران جگہ ہے۔ اور اسکی خاموشی کیسی بھیانک معلوم ہوتی ہے،، میں نے تیری طرف غور سے دیکھا اور تو نے پلکیں جھکا لیں،

،،میں گھنٹوں اس بات پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی اس جگہ کو ویرانہ کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تو میرے ساتھ موجود ہو؟ میں تو اس ویرانی پر لاکھوں آبادیاں قربان کرنیکو تیار ہوں۔ اور کروڑوں نغمے اس خاموشی پر نثار کرنا چاہتا تھا جہاں تیری آواز کی موسیقی گونج رہی تھی،،

،،لیکن تیرے لئے وہ سماں ایسا ہی تھا جیسا تو نے ظاہر کر دیا،،

،،لوگ کہتے ہیں جب سے جین مر گئی رچرڈ کو قبرستان سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ جبکہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز ہی وہاں تبدیل ہو گیا ہے،،

،،کوئی کہتا ہے ایک رقاصہ کے لئے رچرڈ نے اپنی تمام دولت برباد کر دی اور کوئی کہتا ہے ایک رقاصہ نے رچرڈ کی تمام دولت برباد کر کے اسے نقیر بنا دیا،،

،،جین یہ سب جھوٹے ہیں۔ برباد ہو جانے والی شے کو دولت سمجھتے ہیں۔ کیا ان کوتاہ بینوں کو وہ لازوال خزانہ نظر نہیں آتا جو تو میرے سینے میں دفن کر گئی؟،،

مظفّر

نواہائے راز

ذرّہ میں پنہاں کہہ وہ دل، جو ذرّہ ہو صحرا ترا — قطرہ میں پیدا کر وہ جاں، جو قطرہ ہو دریا ترا
بلبل کی ہو کر ہمنوا، غنچہ سے کہتی ہے صبا — ناحق نہ داغِ دل چھپا، ہوتا ہے راز افشا ترا
پیدا دلِ پروانہ کر، پھر شمع کی پروا نہ کر — رازِ دروں رسوا نہ کر، ہے شوق بے پروا ترا
ذرّہ کو تیری جستجو، خورشید تیرا راز جو — ہر دل میں تیری آرزو، ہر سر میں ہے سودا ترا
ہوتا ہے میرا ہم زباں، ہو کر وہ تیرا نغمہ خواں — دشمن ہے وہ میرا کہاں، جو ہو گیا شیدا ترا
شکوہ سے کیوں برہم ہے تو، ہو لاکھ تو بیگانہ خُو — اس سر سے اب اے حیلہ جُو، جاتا نہیں سودا ترا

باقی نہیں وہ انجمن، اے گُل اُڑا رنگِ چمن
افسردہ ہیں سرو و سمن، اب خندہ ہے بیجا ترا

خوں روئے جا اے چشمِ تر، کیوں خشک ہو دریا مرا — روشن چراغِ لالہ کر، افسردہ ہے صحرا مرا
وہ دن کہاں اے رازداں، جب درد تھا دل میں نہاں — آخر یہ رازِ خونچکاں، ہونے لگا افشا مرا
دل میں نہیں وہ موجِ خوں، جس میں نہ ہو شورِ جنوں — جاں خوں بہائے نازدوں، قاتل پہ ہو دعویٰ مرا
وہ وہمِ ننگ و نام ہاں، وہ کاوشِ سود و زیاں — حائل نہیں اب درمیاں، دل ہے اب اے لیلیٰ مرا
شوخی تری تصویر میں، ہو قید سو زنجیر میں — مانی ہے کس تدبیر میں، کام اس سے کیا ہو گا مرا
جب تو نہ تھا میں بھی نہ تھا، گر تو نہ ہو تو کیا رہا؟ — اے دل یونہی جاں کھوئے جا، یہ عقدہ ہو اب وا مرا

حامد اگر میری سُنے، پیشہ گدائی کا کرے
اے دل زکوٰۃِ حسن سے، کاسہ ہو بھر آسا مرا

حامد علی خاں

زمرّد کی نیکلس

"مگر جناب یہ کام پولیس کے سپرد کیا جائے تو مناسب ہے۔ میری رائے ناقص میں اگر آپ شہر کے تھانہ دار صاحب کو لکھ بھیجیں۔ تو وہ دو ایک سپاہی بھیجدیں گے اس میں آپکا خرچ بھی کم آئیگا۔ البتہ آپ انعام کے طور پر ان کو کچھ دے سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں میری خدمات آپ کو بہت مہنگی پڑینگی"

"خانصاحب عمر بھر کے تجربہ نے میرے دل سے پولیس کا اعتبار بالکل کھو دیا ہے"

"جناب نواب صاحب یہ آپکی غلط فہمی ہے سب کی سب پولیس ایسی نہیں ہے جیسا کہ آپکا خیال ہے"

"مگر خانصاحب اس کام کے لئے بھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ؟"

"کیوں نہیں۔ یہ تو ایک ایسا کام ہے جس کو پولیس یقیناً بوجہ احسن سرانجام دیگی۔ میں تو یہ کہونگا کہ اس معاملہ میں آپکا اعتراض بالکل بے جا ہے"

"تو اس کو میری غلط فہمی ہی سمجھئے۔ آپکی فیس کیا ہوگی ؟"

سراغ رساں نے جواب دیا "معمولی باتوں کے لئے تھوڑی ہی رقم کافی ہوتی، مگر اس کام کے لئے میں ایک سو روپے سے کم نہ لونگا"

"آپ راضی ہو جائیں تو میں دو سو دینے کو تیار ہوں"

"آپ مُصر ہیں تو اچھا مگر میں یہ کہے بغیر نہ رہونگا کہ آپ فضول روپیہ ضائع کر رہے ہیں"

نواب صاحب اس سودے پر مطمئن معلوم ہوتے تھے انہوں نے دو سو دس روپے کا چک لکھا اور سراغرساں کے حوالے کیا۔

اس نے بے اعتنائی سے لیتے ہوئے کہا کہ "یہ روپیہ میں نے عمر بھر میں سب سے زیادہ آسانی سے کمایا ہے"

نواب صاحب بولے "عمر بھر میں یہ روپیہ میں نے نہایت خوشی سے دیا ہے۔ کیونکہ میں نے اس سے آپ جیسے لایق آدمی کی خدمات اور اطمینان قلب حاصل کیا ہے"

جواب ملا "اگر آپ خوش ہیں، تو میں بھی راضی ہوں"

وہ کونسا ایسا کام تھا جس کے لئے دو سو روپے فیس مقرر کیگئی اور شہر کا مشہور سراغرساں نثار علیخاں

مامور کیا گیا ؛ صرف یہ کہ نواب سیف اللہ خاں سفیر کابل کی دخترِ نیک اختر کی شادی کے روز دوستوں کے تحائف اور جہیز کے زیورات کی نگہبانی کی جائے ۔ یہ زیورات بہت قیمتی تھے اور امپیریل بنک میں بطورِ امانت رکھے تھے ۔ شادی کے دن کی صبح کو نواب سیف اللہ خاں کی کوٹھی میں ہندوستانی طریق کے مطابق مہمانوں کے دیکھنے کے لئے جہیز کے ساتھ ان زیورات کی نمائش ہونے والی تھی اور برات کی رخصت کے بعد یہ چیزیں پھر بنک میں واپس پہنچائی جانی تھیں ۔ شادی کی تاریخ میں آٹھ دن باقی تھے ۔ نواب صاحب کی کوٹھی امپرس روڈ پر واقع تھی ؛

چک لیکر سراغ رساں نے جیب میں ڈال لیا اور نواب صاحب دستانے پہنتے ہوئے بولے " اتنی عمر سے میں ایک ایسے ملک میں رہتا ہوں جہاں دلی جذبات کا اظہار نہیں کیا جاتا ۔ میں ایسے آدمی سے مل کر بہت خوش ہوتا ہوں جو ہر ایک بات صاف صاف کہدے ۔ آپ نے معمولی سی بات پر اتنے روپے دینے کو میری کمزوری سمجھا ہے اور اس بات کو آپ نے چھپایا نہیں میں اس سے بہت خوش ہوا ہوں تاہم آپ جانتے ہیں کہ ہر ایک شخص کے کام کرنے کا طریقہ اپنا ہی ہوتا ہے "

سراغ رساں نے کہا " جناب میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اگر آپ بخوشی روپیہ دے رہے ہیں تو مجھے بھی لینے میں کوئی عذر نہیں ۔ مگر میں پھر بھی کہونگا کہ آپ پانچ یا دس روپے کی جگہ دوسو روپے خرچ کر رہے ہیں ، اور وہ بھی پیشگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" معاف فرمائیے گا لین دین کے معاملے میں میں ایسا کچا نہیں جیسا کہ آپکا خیال ہے اگر آپ چک دیکھینگے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کس تاریخ کے لئے واجب الادا ہے میں آپکو پیشگی نہیں دے رہا ہوں "

اس کے بعد ملاقات ختم ہوئی اور نواب صاحب نے بڑے تپاک سے مصافحہ کرکے سراغرساں کو رخصت کر دیا !

نثار علی خاں گھر کو روانہ ہوا مگر اس کے دل میں یونہیں سے توہمات آنے شروع ہوئے کہ ایک گرگِ باراں دیدہ اتنا فضول خرچ نہیں ہو سکتا کچھ دال میں کالا ہے ۔

نواب سیف اللہ خاں کوئی گمنام آدمی نہ تھا تیس سال کابل میں رہ چکا تھا ۔ اور اب کابل میں سفارت کے جلیل القدر عہدہ پر ممتاز تھا ۔ کابل کے تین امیر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا اپنا زمانہ گزار چکے تھے ۔ یہ اس کی اکلوتی لڑکی کی شادی ہی کا معاملہ تھا جس نے اتنی مصروفیتوں کے باوجود اسے لاہور آنے پر

مجبور کیا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ جس قدر جلد ہو سکے شادی کا انتظام کر کے واپس چلا جائے یہ ایسی باتیں تھیں جو ہر اخبار بین شخص کو معلوم تھیں۔ اس لئے نثار علی بھی یہ تمام واقعات خوب جانتا تھا۔

شادی سے ایک روز پہلے تک نثار علی کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ اس دن اُسے خیال آیا کہ بنک میں جا کر دریافت تو کرنا چاہیئے کہ چیزوں کے لے جانے اور واپس لانے کے لئے انہوں نے کیا انتظام کیا ہے۔ مینیجر سے ملا جس نے بتایا کہ چیزیں ایک موٹر میں پولیس کے پہرے کے ساتھ جائینگی اور اسی طرح واپس لائی جائینگی۔ "یہ انکی فہرست ہے لیجئے آپ دیکھ لیجئے اور ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ آپکے حوالے کرنے پر ایک رسید تمام چیزوں کی آپ سے لے لی جائے" نثار علی نے پوچھا "کیا وہ بہت ہی قیمتی ہیں" جواب ملا "آپ خود دیکھ لیجئے"

نثار علی نے فہرست پر ایک نظر ڈالی اور اسے ایسا معلوم ہُوا گویا وہ کسی جوہری کی دوکان کی فہرست پڑھ رہا ہے۔ جواہرات کے جڑاؤ جھومر۔ جھومر گنگا جمنی۔ جھومر سُرخ۔ نکلس موتی کی۔ نکلس سادہ۔ نکلس زمرّد کی۔ نکلس پلاٹی نم ہیرے والی۔ ہار۔ چوڑیاں جڑاؤ۔ بالی جوڑے۔ انگوٹھیاں۔ چھلے۔ چاندی کا ڈنر سٹ۔ سونے کا ٹی سٹ۔ وغیرہ وغیرہ پورے تین ورق کی فہرست۔

جب سب پڑھ چکا تو حیرانی سے بولا "ایسا جہیز تو آجتک کبھی کسی کے دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ لاکھوں کا مال ہے۔ نواب صاحب کی صاحبزادی نہایت خوش قسمت ہے۔ نواب صاحب خود بھی تو دولت و ثروت میں شہرۂ آفاق ہیں"

مینیجر نے کہا "ان سب میں زمرد کی نیکلس چوٹی کا زیور ہے اس کے درمیان ستارے کی شکل میں کٹا ہُوا جو زمرّد لگا ہے وہ بے بہا ہے۔ پہلے امیر صاحب نے کسی کام سے خوش ہو کر یہ نوابصاحب کو انعام میں دیا تھا۔ اور نواب صاحب نے وصیّت کی ہے کہ نسلاً بعد نسلٍ اُن کے خاندان میں رہے۔ یہ بنک میں رکھا رہیگا۔ اور جس کے حق میں اس کے لئے وصیّت ہو گی اسکو کبھی کبھی پہننے کے لئے مل سکیگا۔ اب لڑکی اس کی مالک ہو چکی ہے۔ اگلے دن بڑے مزے کی بات ہوئی۔ نواب صاحب خود جب اسے ہمارے حوالے کر گئے اور کاغذات وغیرہ لکھے جا چکے تو کچھ دن کے بعد کسی کو دکھانے کے لئے لینے آئے۔ ہم نے صاف انکار کر دیا۔ کہ اب آپکا اس پر کوئی حق نہیں ہے"

نثار علی نے ہنس کر کہا "کیسی عجیب بات ہے"

مینجر نے جواب دیا "باضابطہ کارروائی کرنے کے لئے ہم مجبور تھے۔ لیکن ہمارے اس طرزِ عمل سے بجائے اس کے کہ وہ خفا ہوتے بہت خوش ہوئے۔

نواب صاحب کی چند خاص عادتیں ہیں وہ دستخط کرنے سے بہت گھبراتے ہیں۔ جہانتک ہوسکے لکھنے پڑھنے کے بغیر ہی کام چلایا کرتے ہیں۔ اپنے بل ہمیں بھیج دیا کرتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں ادا کردو ہم کردیتے ہیں"

نثار علی نے کہا "ایشیائی امیروں میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے اگرچہ آجکل کے زمانے میں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اچھا تو کل کس وقت آپکے آدمی وہاں پہنچیں گے؟

مینجر نے جواب دیا "کل پورے آٹھ بجے موٹر وہاں پہنچے گی"

سلام سلام کے بعد نثار علی رخصت ہوا اور دوسرے دن ساڑھے سات بجے صبح نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الطاف علی خاں بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے کہ اچھا ہوا آپ آگئے ہیں۔ نواب صاحب کو پرسوں ایک اشد ضروری کام کے لئے شملہ سے تار کا بلاوا آگیا۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ نثار علی خاں صاحب کے سپرد سب کام کیا جا چکا ہے وہ سب کچھ کرینگے آیئے آپکو مہمانوں کا کمرہ دکھادوں تاکہ آپ اندازہ کرلیں کہ سب کام تسلی بخش ہے یا نہیں۔ نثار علی خاں نے دیکھ کر کہا کہ سب درست۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف لمبی میزیں لگادی گئی تھیں اور چھ فٹ اونچا کٹہرا انکو کمرہ سے علیحدہ کرتا تھا۔ اس جگہ زیور سجائے جانے تھے۔ اور مہمان ایک ایک کرکے ایک سرے سے داخل ہوکر دوسرے سرے سے باہر جا سکتے تھے۔ سامنے کی طرف ایک اونچی کرسی رکھی گئی تھی۔ جس پر نثار علی خاں کو بیٹھنا تھا۔ تاکہ وہ ہر وقت ایک نظر میں سب کچھ دیکھ سکے۔ میز اور کٹہرے میں صرف اتنی جگہ چھوڑی گئی تھی کہ قطاریں ہوکر لوگ گذریں اور زیادہ بھیڑ نہ ہو۔

الطاف علی خاں نے کہا "ایسے انتظام اور آپکی حفاظت میں جہانتک میرا خیال ہے چوری ناممکن ہے"

اتنے میں ہال کے باہر موٹر کی آواز آئی اور الطاف علیخاں بول اُٹھے "لیجئے زیور آگئے رکھوا لیجئے"

اس کے بعد کا آدھ گھنٹہ نثار علیخاں نے چیزوں کے لینے اور سجانے میں صرف کیا جب

سب چیزیں رکھی جا چکیں تو فہرست سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہُوا کہ زمرّد کی نیکلس ابھی نہیں دی گئی۔ بنک سے انگریز اسسٹنٹ ساتھ آیا تھا اُس نے کہا "وہ میری جیب میں ہے پہلے لڑکی کو دی جائیگی اور پھر آپ لے سکتے ہیں"۔

برابر والے کمرہ میں پردہ ڈال کر لڑکی کو بلایا گیا۔ نواب صاحب کے بھائی ترجمان ہوئے اور نیکلس کی کہانی سُنائی گئی۔ نواب صاحب کے بھائی نے لڑکی کی طرف سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انکے والد کے ارشاد کے مطابق اور چیزوں میں سجادی جائے +

سب چیزیں پوری کر کے نثار علی نے رسید دیدی اور بنک والے رخصت ہوئے +

دو بجے برات آنے کا وقت تھا۔ اِدھر اُدھر کے کام میں ایک بج گیا۔ مگر صبح سے اس وقت تک نثار علی نے کمرے سے باہر قدم نہ رکھا اور نہ کسی کو اس طرف آنے جانے دیا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ یہ دو سو روپیہ کمانا اتنا سہل نہ ہوگا جس قدر اس نے پہلے سمجھا تھا۔ اتنے میں ایک موٹر آئی دروازہ کھٹکھٹایا گیا نثار علی نے کھولا تو نواب صاحب موجود تھے۔ انکے اچانک آنے سے سب کو حیرانی ہوئی مگر نواب نے بتایا کہ بڑی مشکل سے شام تک مہلت ملی ہے۔ انتظام دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اِدھر اُدھر پھرتے رہے پھر نثار علی خاں سے مخاطب ہوئے کہ "برات کے آنے پر آپکو بہت مشکل ہوگی۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے حفاظت میرے سپرد کیجئے اور کھانا کھا لیجئے" مگر اُس نے ایک نہ مانی اور یہی کہتا رہا کہ کھانا میری جیب میں ہے۔ میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہوسکتا۔ نواب صاحب نے بہت مجبور کیا تو کھانا وہیں منگا لیا گیا، مگر واہ رے نثار علی کرسی سے اترنا قسم ہوگیا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک ایک رکابی ہاتھ میں لیکر کھاتا رہا اور نظر زیوروں میں رکھی۔ نواب صاحب کبھی زیوروں کو دیکھتے کبھی باہر جاتے کبھی اندر آتے نثار علی خاں نے دیکھا کہ وہ کچھ گھبرائے ہوئے ضرور ہیں۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ پھر اسی طرح دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر بیٹھ گیا۔

نواب صاحب نے زیور دیکھتے دیکھتے زمرّد کی نیکلس کو ہاتھ میں لیکر دیکھنا چاہا۔ لیکن آنکھ اُٹھائی تو نظر نثار علی سے دوچار ہوئی جو انکی طرف پستول کا نشانہ کئے ہوئے تھا۔ نواب صاحب بگڑے "یہ کیا بیہودہ مذاق ہے اگر پستول چل جاتا تو؟"

نثار علی نے ہنس کر جواب دیا "شاید کسی کے گولی لگ جاتی خفا نہ ہوجئے۔ یہ میرا فرض ہے"؛
نواب صاحب نے کہا "اگر میں کوئی چیز اُٹھاتا تو کیا سچ مچ تم چلا دیتے ؟"
نثار علی نے جواب دیا "ممکن ہے چلانا پڑتا اسی لئے تو جیب سے نکالا تھا" اور ساتھ ہی زور سے ہنس دیا۔

گھڑی کی چھوٹی سوئی دو پر تھی کہ مہمان آکر برابر والے ڈرائنگ روم میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ خاطر تواضع شروع ہوئی۔ نکاح ہُوا۔ چائے کا وقت ہو گیا۔ مہمان کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ عجیب رونق تھی مگر نثار علی صاحب کمرہ بند کر کے قلعہ بنائے بیٹھے رہے۔ نواب صاحب لوگوں کی مبارک باد کے تار خود لیتے تھے مگر جواب کے لئے چھوٹے بھائی کو دے دیتے تھے اور بعض باتوں میں مشورہ نثار علی سے ضروری ہوتا تھا۔ اس لئے وہ بھی اس عرصے میں بیکار نہ تھا۔ نواب صاحب کے لئے دروازہ کھولنے کو بار بار اُٹھنا پڑتا جب نثار علی اکیلا تھا ایک دو دفعہ کمرے ہی میں ٹیلیفون استعمال کرنا پڑا جو اس موقع کے لئے اس کی کرسی کے پاس ہی لگوا دیا گیا تھا۔

چائے پینے کے بعد مہمان تحائف دیکھنے کو آنے شروع ہُوئے یہ وقت نثار علی کے لئے نہایت نازک تھا۔ جب کوئی کسی چیز کو ہاتھ لگانے لگتا۔ وہ بہ آوازِ بلند پکار دیتا کہ براہِ مہربانی ہاتھ نہ لگایئے، اور وہ ہاتھ کھینچ لیا جاتا مگر یہ اسکو بار بار کرنا پڑتا تھا اور اس ڈیڑھ گھنٹے کے عرصے میں چلا چلا کر اس کی آواز بیٹھ گئی۔ نواب صاحب مہمانوں کی ہر ایک نئی قطار کے ساتھ آتے اور نیکلس والے زمرّد کی کہانی سُناتے۔ لوگوں کی اتنا قیمتی زیور دیکھ کر حیرانی سے آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتی تھیں۔ اور ہر طرف سے واہ واہ ہو رہی تھی۔

پانچ بجے تک یہی سلسلہ رہا جب ایک ایک کر کے سب مہمان رخصت ہو چکے۔ تو ساڑھے پانچ بجے بنک کی موٹر آن موجود ہوئی۔ نواب صاحب نے انگریز اسسٹنٹ کے ہاتھ میں ایک خط دیا جو کہ لڑکی کی طرف سے لکھا گیا تھا کہ زمرّد کی نیکلس انکے والد صاحب کو دیدی جائے۔ وہ رخصت ہونے کے وقت ان سے لے لیں گی۔

تمام زیور جب بنک والوں کو دیا جا چکا تو نثار علی خاں نے اپنی دی ہُوئی رسید واپس لے لی۔ بنک

والا انگریز نواب صاحب سے مخاطب ہُوا اور نیکلس کی ڈبیا ان کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے بولا آپکی صاحبزادی کے رقعہ کے مطابق یہ آپ کو دی جاتی ہے۔ آج سے بنک اس کا ذمہ دار نہیں جبتک دو بارہ ہمیں نہ دی جائے۔ نواب صاحب نے شکریہ کے ساتھ لے لی اور کہا کہ میں ابھی جاکر لوہے کی الماری میں بند کر دونگا اور وہاں یہ محفوظ رہیگی۔ آپ صاحبوں نے آج بڑی جانفشانی سے اپنا فرض ادا کیا ہے اور خصوصاً نثار علیخاں نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ اچھا تو خدا حافظ" یہ کہتے ہوئے نواب صاحب نے ہاتھ نثار علی خاں کی طرف بڑھایا۔ اس نے مصافحہ کیا لیکن ہاتھ کو چھوڑا نہیں۔

ایک سیٹی بجائی گئی چار سپاہی جو تمام دن دروازہ پر پہرہ دیتے رہے تھے اندر آئے اور نواب صاحب کو ہتکڑی لگائی گئی۔

بنک والے اور نواب صاحب کے بھائی گھبرا کر چلائے" نثار علی یہ تم کیا کر رہے ہو" نثار علی نے نہایت نرمی سے جواب دیا" گھبرائیے نہیں نواب صاحب شملہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ تو ہمارا پرانا دوست سیر گل ہے" یہ کہتے ہُوئے اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ کوتوالی چلو میں آتا ہوں۔

سب نے یکزباں ہو کر پوچھا بتائیے تو سہی یہ کیا معاملہ ہے۔ جواب ملا معاملہ کچھ بھی نہیں صرف زمرّد کی نیکلس نواب صاحب کے آنے تک بنک میں رہیگی یا لڑکی رکھیگی اور ایک بدمعاش کیفر کردار کو پہنچیگا۔

"مگر آپ نے کِس طرح معلوم کیا؟"

"جناب یہ باتیں سب تجربے سے آتی ہیں۔ مگر آدمی ہے پورا عیار"

"تو آپ نے اسکو پہلے ہی کیوں نہ گرفتار کر لیا؟"

"کیا شادی کے وقت بدمزگی پھیلاتا؟"

ضیأ الرحمٰن

ضرورت ہے

۱۔ اک ایسے سیاسی رہنما کی جو سچ بولنا چاہے اور بولے ۔

۲۔ اک ایسے ایڈیٹر کی جو ایڈیٹر بنتے ہی انشا پردازی کا ملکہ نہ کھو بیٹھے ۔

۳۔ اک ایسے پٹواری کی جو اپنی تنخواہ پر گذر اوقات کرے ۔

۴۔ اک ایسی مشرقی بیوی کی جو خاوند کو خدا نہ سمجھے ۔

۵۔ اک ایسی مغربی بیوی کی جو خاوند کو خاک پا نہ سمجھے ۔

۶۔ اک ایسے مشرقی شوہر کی جو بیوی کو دیکھ کر مجسم دقار نہ بن جائے ۔

۷۔ اک ایسے مغربی شوہر کی جو بیوی کو تاک کر مجسم انکسار نہ ہو جائے ۔

۸۔ اک ایسے ہندوستانی کسان کی جو قسمت کا قائل نہ ہو ۔

۹۔ اک ایسے متقی مسلمان کی جو زبانی انشاء اللہ کا دل سے عامل ہو ۔

۱۰۔ اک ایسے متمدن گھرانے کی جہاں گفتگو کا نام بحث نہ ہو ۔

۱۱۔ اک ایسے جگر کی جو ڈاکٹروں اور شاعروں سے تعلق نہ رکھتا ہو ۔

۱۲۔ اک ایسی ناقص آنکھ کی جو دشمن کو دوست سمجھ بیٹھے ۔

۱۳۔ اک ایسے مؤرخ کی جو واقعات کو اپنے خیالات کے سانچے میں نہ ڈھال دے ۔

۱۴۔ اک ایسے شاعر کی جو کوئی کنیت نہ رکھتا ہو نہ اُسے کوئی لقب یا خطاب دیا گیا ہو ۔

۱۵۔ اک ایسی قوم کی جو بے رنگ بے مذہب اور بے زبان ہو ۔

۱۶۔ اک ایسے دوست کی جو سب عزیزوں دوستوں سے تنگ آچکا ہو

۱۷۔ اک ایسے ولی کی جو سمجھداری کو پرہیزگاری کا درجہ دے ۔

۱۸۔ اک ایسے خدا کی جو سمجھ میں آسکے ۔

۱۹۔ اک ایسی متانت کی جس کی بنیاد ظرافت ہو ۔

۲۰۔ اک ایسی گمنامی کی جس سے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ مل جائے ۔

”ضرورت مند“

۲۱۔ [illegible]

[illegible]

۲۲۔ ایک ایسے مذہبی رہنما کی جو تعصب سے پاک ہو ۔

سرگوشیاں

خوشی - ہم اکثر خوشی کے پیچھے دوڑتے ہیں لیکن خوشی اس بھاگ دوڑ سے حاصل نہیں ہوتی۔ پھر ہم مایوس و شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور دوسروں سے رحم و ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں کہ دیکھیئے ہم نے اپنی سی بہت کوشش کی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اسی طرح کبھی ہم سخت جد و جہد کا شکار بنے رہتے ہیں اور کبھی کاہلی و نامرادی کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ لیکن قدرت گاہے گاہے ضرور ہماری مدد کو آتی ہے۔ جب ہم تھک کر چور ہو جاتے ہیں یا جب ہم سستی سے بھی اُکتا جاتے ہیں اور اٹھ کر خاموشی کے ساتھ کام میں لگجاتے ہیں تو خوشی کی دوشیزہ قدرت کے کہنے پر دبے پاؤں آتی ہے اور ہمارے دل میں گُدگُدی کرتی ہے۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں کون چھیڑ رہا ہے۔ بارے ہم چپکے چپکے لُطف اٹھاتے ہیں اور جی ہی جی میں جان لیتے ہیں کہ یہی زندگی ہے!

بڑے آدمی - بڑے آدمیوں کی صحبت بُرے آدمیوں کی صحبت سے تو شاید اچھی ہے لیکن مجھے بہت کم موقعے یاد ہیں جب میں کسی بڑے آدمی کے پاس سے بیزار ہو کر نہ اُٹھا ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑا آدمی مشغول ہوتا ہے وہ بیچارا ہم سے چند سہی باتیں کر کے آدابِ مجلس کا خراج ادا کرتا ہے، اُس کی انسانیت انگڑائیوں میں اور ہماری کم فہمی ششں و پنج میں ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی وہ اپنا کوئی کارنامہ بیان کرتا ہے تو باوجود انتہائی انکسار کے وہ بمشکل کامیاب ہوتا ہے کہ ہماری نظروں سے نہ گر جائے۔ کبھی وہ عام آدمیوں کی باتیں کرتا ہے تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ اُسکی بڑائی کا ظاہر نہ ہونا ہماری حماقت ہے یا فی الحقیقت بڑائی اک عام ناقابلِ توجہ وصف ہے۔ کبھی وہ عمداً خاموش رہتا ہے اور ہمیں اس زبردستی کی خاموشی میں کچھ نہیں سُوجھتا کہ کیا کریں۔ غرض بڑے آدمی کی صحبت اک ناقابلِ برداشت آفت ہے!

دوست - کا لفظ اس قدر ذلیل ہو گیا ہے کہ اس سے دشمن کا ایک ایک حرف زیادہ خود دار ہے۔ جو کوئی ہمیں کسی جلسے یا دعوت میں مل جائے وہ ہمارا دوست ہے۔ آئندہ اُس کا ہمیں سلام کرنا ہمارا اُسے آداب کہنا ضروریاتِ زندگی میں شمار ہونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی ہم آنکھ بچا کر اُسکے پاس سے گذر جائیں تو خیر لیکن عموماً اس قسم کی مسرت ہماری قسمت میں نہیں ہوتی، اُدھر اس کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ وہ اکثر پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں اس رستے سے کیوں آیا۔ دُور ہی سے دیکھ کر بعض دفعہ مڑ جانا چاہتا ہے لیکن اک ملزم کی طرح اسکے دل میں کھٹک جاتا ہے کہ

ضرور ہم اُسے تاک چُکے ہیں مجبوراً ہمارے پاس سے ہوکر گذرتا ہے اور اک بچی کھچی مسکراہٹ ہماری نذر کرتا ہے کبھی کوئی شخص سفر میں ہمارا ساتھی ہوتا ہے تو ہم اُس پر دوستی کا دعوے کرنے لگتے ہیں۔ وہی باتیں جو دس ہزار دفعہ ہم دُہرا چکے ہیں وہی باتیں جو اتنی ہی بار وہ سُنا چکا ہے دُنیا سُنتی ہے اور چُپ رہتی ہے لیکن ہم ہیں کہ ذرا شرمندہ نہیں ہوتے اور اسی طرح یہ ملاقاتیں ہمارے دل و دماغ کو پامال کئے جاتی ہیں۔ کبھی کسی انسان کا ہمارے پایہ کا لباس پہنے ہونا ہی کافی ہے کہ ہم اُس سے دوستی پیدا کرنا چاہیں۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ کیا معاملہ ہے پھر سمجھتا ہے کہ ضرور مجھ میں کوئی خوبی ہوگی جس نے اس راہگیر پر اتنا اثر کر دیا۔ اور مرد و عورت کا امتیاز تو بجائے خود خواہش ملاقات کے دروازے کے لئے داخلے کا مفت ٹکٹ ہے۔ انسان کا خیال ہے کہ مرد عورت اور عورت مرد کے لئے ہے۔ پھر جہاں ذرا سا مطلب بھی ہو وہاں دوستی دلوں میں فوراً گھر کر لیتی ہے۔ کچھ تعجب نہیں، کیونکہ سچ پوچھئے تو دوستی کے معنی ہی مطلب براری کے ہیں۔

آہیں ۔ آہیں آہیں بھرنے والوں کی طرح قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ مذہبی آہیں عموماً عادتاً بھری جاتی ہیں لیکن بہت سی حالتوں میں وہ جانے بوجھے خدا پر اُسکے بندوں کے ذریعے سے اثر ڈالنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔

وضعداروں کی آہیں صرف تھکن کی علامتیں ہوتی ہیں۔

عشاق کی آہیں مشکل وقت کاٹنے کا اک عمدہ طریقہ ہیں۔

حسینوں کی آہیں حسن پرور ہیں اور صحت آور۔ بعض نازک مزاج لڑکیاں علاماتِ وقف کا کام چھوٹی چھوٹی آہوں سے لیتی ہیں۔

آہوں کا اک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس سے پھیپھڑے اچھی طرح پھیلتے ہیں اور اگر دل پر بُرا اثر پڑے بھی تو جسم نشوونما پاتا ہے۔ میں اک سمجھدار شخص کو جانتا ہوں کہ جس روز اُس پر کوئی مصیبت نہ پڑے تو باغ کی تازہ ہوا میں جاکر علی الصباح لمبی لمبی آہیں بھرتا ہے۔

جان بوجھ کر نیکی نہ کرو کچھ کرو لیکن برائے خدا جان بوجھ کر نیکی نہ کرو۔ خدا کے ہاں اس سے سرخروئی نہیں اور دنیا تو صدیوں سے اس سے بیزار رہے یہی نیکی کی اک شکل ہے جس سے سمجھدار ریاکاروں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ تم فقط اپنا کام کئے جاؤ جہاں جہاں نیکی ہوتی جائے خوب ہے۔ دُنیا پر اسکا اثر عقبیٰ میں اس کا پھل اور تم سبکدوش!

نیکی کرنے گھر سے نہ نکلو۔ پہلے گھر والوں کی خبر تو لو اور اُن سے بھی پہلے اپنے آپ کو تباہی سے بچاؤ۔ جتنا تم نیکی پر لیکچر دو گے اتنا ہی تم نیکی سے دُور ہوتے جاؤ گے اور خاموشی کے ساتھ بے جانے بوجھے نیکی کر سکنے کے ناقابل ہو جاؤ گے۔

اس فکر میں نہ رہو کہ نیکوں میں تمہارا بھی شمار ہو۔ کاموں میں اسطرح مصروف رہو کہ سچے انسانوں میں ایک اور انسان کا اضافہ ہو جائے۔

"باغبان"

رعنائیٔ فطرت

دُنیا ایک پیکرِ حسن ہے۔ خداوند عالم نے فطرتِ انسانی میں حسن سے متاثر ہونیکی قابلیت اور مادہ ودیعت فرمایا ہے۔ اُس حسن سے جو ہر ذرہ کائنات میں پوشیدہ ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو محض ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکا وجود انسانی دل و دماغ کی تفریح کے لئے ہے۔ اور جو انسان کے غور و تفکر کے لئے ذریعہ ہیں۔ دنیا ایک حسنِ دلاویز سے لبریز ہے۔ تخلیقِ عالم کے وقت اور انسان کے وجود سے پہلے دنیا مناظرِ دلفریب سے معرا تھی۔ کیونکہ اس وقت تک کوئی حقیقت شناس آنکھ ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے وا نہیں ہوئی تھی۔ مناظرِ فطرت ہمیشہ دائمی تر و تازگی کے ساتھ ہماری پر شوق آنکھوں کے لئے سامانِ نزہت ہیں۔ دنیا میں ہر روز طرح طرح کے انقلابات آتے رہتے ہیں مگر فطرت کے مناظر اور اسکی دلکشی میں فرق نہیں آتا۔ اسکی شاعری کبھی ختم نہیں ہوتی۔ شبنم آلودہ صبح کا پُر کیف منظر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ نے آج ہی اپنے جدت طراز ہاتھ سے تخلیق کیا ہے تاکہ انسان کی روح ضیائے انبساط سے منور ہو جائے۔ ہمکو ایک زندہ دل اور پُر ذوق آنکھوں کے ساتھ دنیا کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم مناظرِ فطرت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تو معلوم ہوا کہ ہماری روح آلودہ ہے اور ہماری زندگی قابلِ رحم اس نعمت سے محروم ہونا زندگی کی تمام نعمتوں سے محروم ہونا ہے۔ ہر جگہ مناظرِ فطرت کی رعنائی قلوبِ انسانی کو اپنی طرف کھینچتی ہے کیونکہ انسان ہی اسکا عارف اور پرستار ہے۔ انسانی جذبات اور احساسات مناظرِ فطرت کے اثرات ہیں۔ فطرت اپنے خزانے انسان کے روبرو کھول دیتی ہے۔ آسمان۔ سمندر۔ صحرا اور پہاڑ سب اسکے لئے سامانِ تفریح اور اسبابِ معرفت ایزدی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ ایک ایسی ہستی ہے جو کائناتِ عالم کی ہر شئے کے معانی سمجھنے اور اسکی طاقتوں کو اپنے استعمال میں لانیکی اہلیت رکھتی ہے مناظرِ فطرت محض جنتِ نظر ہی نہیں بلکہ فردوسِ روح بھی ہیں۔ انسانی توجہ کو مائل کرنیکے لئے شاہدِ فطرت اپنے تمام جواہرات اور رعنائیوں کے ساتھ ہمیشہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس نے انسان کی روح کو مسخر کرنیکے لئے ہزاروں عشوے اور ادائیں اختیار کر رکھی ہیں۔ مناظرِ فطرت کی ہر شئے میں۔ رنگ میں۔ روشنی میں۔ سایہ میں۔ آوازمیں۔ سکوت میں۔ اک حسنِ تناسب ہے۔ کاش انسان کی آنکھوں پر ترغیبات کے فریب اور افکارِ عالم کی ظلمت کا پردہ نہ پڑا ہوتا!

محمد عبدالحیٔ (علیگ)

محفلِ ادب

جرعات

ہنگامہ ہائے رونقِ دنیا کو کیا کروں! میں آبدیدہ رنگِ تماشا کو کیا کروں؟
کم کر سکے نہ کچھ بھی اگر کاہشِ فراق اِس گلستانِ گنبدِ مینا کو کیا کروں!
پھر اضطرابِ کشمکشِ موت و زیست ہے حسنِ طلسمِ وعدۂ فردا کو کیا کروں!
اب خاک ہو کے بھی ہیں وہی بیقراریاں اے حسنِ دوست تیری تمنّا کو کیا کروں!
اندوہِ زندگی کا مداوا اگر نہیں آبِ حیات و دستِ مسیحا کو کیا کروں!
پیشِ نظر نہیں ہے وہ سرمایۂ نشاط آغوشِ جام و گردنِ مینا کو کیا کروں!

سیلابِ اضطراب ہے رگ رگ میں اے اخترؔ
اس دل کے شعلہ زارِ تمنّا کو کیا کروں!

اخترِ صہبائی — ہزلد داستان

محرکاتِ ادب - یہ کہنا کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ کہنا ہے کہ ادب کے مخارج یا دیگر الفاظ میں وہ محرکات جنکے سبب سے ادب کا وجود ہوتا ہے۔ زندگی ہی میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ادبیات کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے لئے کیا معنی اپنے اندر نہاں رکھتے ہیں۔ تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ جس شئے کو ادب کی مختلف شکلیں کہتے ہیں اُنکا ترجمہ زندگی کی اصطلاحات میں کریں۔

عملی مقاصد کی غرض سے میرے خیال میں محرکاتِ ادب چار سرخیوں میں صحت کے ساتھ تقسیم کئے جا سکتے ہیں (۱) ہماری خواہشِ اظہار (۲) عامۃ الناس اور اُنکے افعال سے ہماری دلچسپی (۳) دنیائے حقیقت اور دنیائے تخیل سے ہماری دلچسپی (۴) حسن اور وضع سے ہماری محبت یعنی جو کچھ ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں اس کو بیان کرنے کی خواہش ہم میں زبردست ہوتی ہے۔ اس لئے اس ادب میں جو ہمارے خیالات

ومحسوسات کا اظہار کرتا ہے، ہمیں مردوں اور عورتوں اُن کے سوانح اُنکے افعال و اقوال و تعلقات سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور جس میں انسانی زندگی اور اس کی مصروفیتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ہم اُسے دوسروں کو سُنانے کے لئے مشتاق ہوتے ہیں اس لئے خود ادب کا وجود ہنر کی حیثیت رکھتا ہے +

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ اس لئے وہ فطری طور پر کوئی تجربہ کوئی مشاہدہ، نظریہ، جذبہ، یا تخیل اپنے دل میں رکھنے پر قادر نہیں ہے۔ اس لئے ادب کی مختلف شکلیں گویا وہ مختلف ذرائع ہیں۔ جنہیں اُس نے اپنے خیالات کو خوبصورت طور پر ظاہر کرنیکے لئے وضع کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ محرکات نہ صرف ادب کے ارتقا کا بلکہ اپنے اندر ہماری دلچسپی کا بھی اظہار کرتے ہیں یعنی جس طرح ہم دوسروں کو اپنے خیالات ومحسوسات وتجربات ومشاہدات اور تصورات کا رازدار بنانے پر مجبور ہیں اسی طرح ہم دوسروں سے بھی وہ باتیں سُننے میں مسرت حاصل کرتے ہیں خصوصاً اس وقت جب ہمیں ان کی زندگی کے تجربات کی حد، نظر کی گہرائی، قوتِ بیان یا اس امر کا علم ہو کہ یہ سب مل کر اُنکے بیان کو غیر معمولی دلچسپی اور قدر کے لایق بنا دینگے +

مگر ان چار محرکات میں سے اخیر محرک تمام اقسامِ ادب میں مشترک ہے اس لئے فی الحال اس کو نظر انداز کئے دیتے ہیں۔ اس طرح ادب کی تقسیم کے مقصد کے لئے صرف تین ہی شمار میں آتے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ ہرسہ محرکات زندگی میں ہمیشہ ملے ہُوئے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی دیکھی ہوئی یا خیالی چیز کا حال بیان کر رہے ہیں۔ تو یہ تقریباً یقینی ہے کہ ہم اپنے محسوسات کو بھی اس میں شامل کر دیتے ہیں۔ اور بیان کرتے وقت کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے۔ اور چونکہ یہ زندگی میں مشترک ہیں اس لئے لازم ہے کہ ادب میں بھی مشترک ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف اقسامِ ادب بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں ہیں البتہ ہم ایک دوسرے کو اسی طرح شناخت کر سکتے ہیں جس طرح ایک انسان کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ مثلاً نغمہ کو رزمیہ سے، ڈرامہ کو ایک بیانیہ مضمون سے اور اس طرح گویا ہم نے ادب کی تقسیم کا ایک بنیادی اصول دریافت کر لیا ہے +

نگار

مناکحت ۔ نٹشے کا دعوے ہے کہ آجکل شادی کے معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی کی طرف سے دو افرادِ انسانی کو عیش کرنے اور خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے اور بس، اگرچہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ شادی سے معاشری نظم ونسق اور بقائے نسل مقصود ہے لیکن اس کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ اس کے بالکل منافی

ہے، آجکل مناکحت کی بنیاد "اتفاق" پر قائم ہے اور اس لئے طرفین کے دل محبت اور الفت سے زیادہ تر خالی رہتے ہیں، نٹشے کا خیال ہے کہ انسان کو جب تک اپنی تندرستی اور شرافت نسبی کا یقین نہ ہو شادی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وہ اس کے ذریعہ سے ایک نئی ہستی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے اور اس کی خصوصیات متعدد نسلوں تک منتقل ہوتی رہینگی، ہر امیدوارِ نکاح کو اپنے نفس سے یہ سوال کرنا چاہیئے "کیا فلاں عورت کے ساتھ تم اپنا وقت مرتے دم تک خوشی سے گذار سکتے ہو یا نہیں" نکاح کی بنیاد رفاقت والفت پر قائم ہونی چاہیئے، نٹشے اس سلسلہ میں لکھتا ہے :-

"آیندہ مناکحت صرف روحانی رفاقت کی خاطر ہونی چاہیئے جس کی غرض و غایت یہ ہو کہ ایک ایسی نسل کی بنیاد پڑے جو موجودہ نسل سے بہتر ہو، جو لوگ ہوس پرستی کو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کو "داشتہ" پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کی جسمانی صحت وتندرستی کی بنا پر اپنے تئیں اس کی خواہشات پر قربان کر دیا تو پھر شادی کا اصل مقصد فوت ہوگیا، بے شبہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوگا مگر وہ اتفاقیہ نسل کے سدھارنے اور سنوارنے کا خیال کبھی ذہن میں نہ آئیگا"

"معارف"

ایک پُر لطف تجربہ - ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دارالعلوم کولمبیا میں ایک عجیب پُر لطف تجربہ کیا گیا۔ ۵۲ ننھے بچوں کو اُن کی ہم عمر بچیوں کے ساتھ ایک چھوٹے احاطہ میں جمع کیا گیا ہر بچی کو کھلونے دیئے گئے ایک ایک بچہ اور ایک ایک بچی الگ الگ چھوڑ دئے گئے۔ اس کے بعد تجسس شروع کیا گیا۔ ان بچوں کو اتنی کافی دیر کے لئے چھوڑ دیا گیا جس میں اس لُوٹ اور چھین جھپٹ کی عادت کو جو مردوں میں فرض کی گئی ہے ظاہر ہونے کا کافی موقع مل سکتا تھا۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ ۵۲ بچوں میں سے صرف ایک نے اپنی ساتھ والی بچی کا کھلونا چھینا۔

عصمت

فولادی اعصاب - ہوائی جہاز چلانا یا اس پر سوار ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے لئے نہایت قوی اعصاب کا انسان ہونا چاہیئے جو بلندی پر جانے کے بعد زمین کی طرف دیکھ کر کانپ نہ جائے ورنہ اسکے اعصاب بیکار ہو جائیں۔ چنانچہ اکثر ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں کہ بلندی پر چڑھ کر نیچے دیکھنے والے

از خود زمین پر گر پڑے اور مر گئے لیکن بعض انسان ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اپنے اعصاب کے لحاظ سے یقیناً انسان سے بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں۔

اگر آپ نے ہوائی جہاز دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے دو لانبے بازو بھی ہوتے ہیں جو مل کر ایک لمبی سی چھت کا کام دیتے ہیں۔ اچھا فرض کیجئے کہ ایک جہاز ...۳ فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا ہے تو کیا آپکے نزدیک ممکن ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں جہاز کے بازو پر بغیر کسی سہارے یا آڑ کے کھڑا ہو جائے یقیناً ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن آپ سُن کر حیرت کرینگے کہ حال ہی میں دو شخصوں نے بازوؤں کی چھت پر جا کر جب کہ جہاز ...۳ فٹ بلند اُڑ رہا تھا دیر تک ٹینس کھیلا اور وہ اس کی چھت پر ایسی ہی آزادی سے دوڑتے رہے جیسا کہ معمولاً ایک انسان زمین پر بیباکانہ دوڑ سکتا ہے۔

(نگار)

کمسنی کی شادی کے ہیبتناک نتائج ہندوستان میں۔ لیڈی وِلسن اہلیہ محترمہ گورنر بمبئی فرماتی ہیں:-

اکثر دس بارہ سال کی عمر ہی میں لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے۔ اور وہ بہت جلد بچہ کی ماں بن جاتی ہے حالانکہ ۱۲ سال سے ۱۸ سال تک کا زمانہ ہے۔ مگر ہندوستانی لڑکیاں کمسنی کی شادی کے باعث اس واقفیت سے محروم رہ جاتی ہیں اور بغیر کسی تجربہ کے ان پر بہت جلدی بیوی اور ماں کا بوجھ آ پڑتا ہے حفظانِ صحت اور دیگر ضروری امور کا اُنہیں مطلق علم نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ بچوں کی صحیح طور سے پرورش کرنے کے ناقابل ہوتی ہیں۔

کم سنی کی شادی کی رسم کو جلد بند کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہی رسم سالانہ ۲۰ لاکھ بچوں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ اگر اہلِ ملک نے اس امر پر توجہ نہ کی۔ تو اس کا اثر ہندوستان کی ہر قسم کی ترقی پر پڑیگا۔ متحدہ کوشش کی ضرورت ہے تاکہ یہ بد رسم جلد سے جلد ہندوستان سے موقوف ہو جائے۔

نور جہاں

جستجو

مجھ کو ازل سے ہے سرِ سودائے جستجو
یکسر ہوں میں ہلاکِ ستم ہائے جستجو
ہر ذرّہ کائناتِ کا گرمِ تلاش ہے
دیکھی ہے کس نے وسعتِ صحرائے جستجو؟

کیوں ہو فروغِ نورِ دلِ آفتاب میں
گر ہو نہ اُس میں داغِ دل آرائے جستجو
چندھیا رہی ہے اُس کی نگہ اور ابھی نہاں
سو پردہ میں ہے شاہدِ زیبائے جستجو

گردش میں ہے قمر اسے کس کی تلاش ہے
آنکھوں میں کاٹتا ہے یہ شب ہائے جستجو
اِس جستجو میں جاں سے گزر کر ہزار بار
پاتا ہے داغِ حسرتِ لیلائے جستجو

شبنم کو شب کو گرتی ہے چشمِ ستارہ سے
پاتی ہوئی سراغِ گہر ہائے جستجو
دوشِ صبا پہ ہوتی ہے پھر صبح دم سوار
تازہ کئے جنونِ تمنائے جستجو

کھوئے گئے ہیں بیخودیٔ جستجو میں سب
کیا جانے کتنی مست ہے صہبائے جستجو
اہلِ نظر کو ہے سبق آموز یہ روش
بے صرفہ کوششوں پہ بھی کیجائے جستجو

طے کر چکا ہے عرصۂ عالم مرا جنوں
اب بھی وہی ہے جوشِ تمنائے جستجو
پیہم مرے لئے افقِ مُدعا ہے دُور
سو بار پاؤں سرحدِ صحرائے جستجو

جو آگہی ہے بے خبری کا سراغ ہے
اور جستجو ہے حاصلِ سودائے جستجو

حامد علی خاں

تبصرہ

دی اسلامک البم - "اسلامک لٹریچر کمپنی" نے ہمیں اسلامی تصاویر کا ایک نفیس البم ریویو کے لئے بھیجا ہے اس میں چوبیس کے قریب نہایت صاف اور دلکش ہاف ٹون عکسی تصاویر ہیں جن میں سے بعض تو قدیم و جدید عظیم الشان اسلامی شخصیتوں سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض عمارات وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ البم کا سائز "ہمایوں" کے برابر ہے تصاویر کے عنوان حسب ذیل ہیں:-

(۱) مصطفیٰ کمال پاشا (۲) انور پاشا (۳) خالدہ ادیب خانم (۴) امیر امان اللہ خان (۵) رضا خاں شاہ ایران۔ (۶) زاغلول پاشا (۷) سلطان الاطرش (۸) غازی عبدالکریم (۹) سلطان صلاح الدین اعظم (۱۰) اورنگ زیب۔ (۱۱) سعدی (۱۲) خواجہ حافظ (۱۳) عمر خیام (۱۴) سر سید احمد خاں (۱۵) علامہ اقبال (۱۶) مکہ معظمہ (۱۷) مدینہ منورہ (۱۸) مقوقس مصر کے نام رسول کریم کے مکتوب کا عکس (۱۹) الحمرا (۲۰) غلطہ کا پل قسطنطنیا (۲۱) تاج محل (۲۲) مسجد پیرس (۲۳) دمشق کا درویش خانہ (۲۴) مجاہدین دروز۔

یہ البم اپنی وضع کی بالکل ایک نئی چیز ہے اور ہمارے خیال میں ہر مسلمان کو اس سے ضرور دلچسپی ہوگی۔ ظاہری صورت اور سرورق وغیرہ بھی نہایت اچھا ہے۔ اس کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ مینجر دی اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور سے طلب فرمایئے۔

نور جہاں - پینتالیس صفحہ کی ایک مختصر سی کتاب ہے اور جناب سید احمد صاحب کاظمی ایڈیٹر انگلش علیگڑھ میگزین کی محنت کا نتیجہ ہے اس کتاب میں نور جہاں کے مستند حالات نہایت سلیس اور سادہ انداز میں درج کئے گئے ہیں۔ بعض باتوں میں مصنف نے خاصی تحقیق سے کام لیا ہے کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے قیمت ۸/ مصنف سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پتے سے طلب فرمایئے۔

نیرنگِ خیال کا عید نمبر - نیرنگ خیال کے سرگرم ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب نے عید الفطر کے موقع پر نیرنگ خیال کا یہ نمبر شائع کیا تھا حکیم صاحب نے اسکو مفید اور دلچسپ بنانے میں بہت کاوش سے

جستجو

مجھ کو ازل سے ہے سرِ سودائے جستجو
یکسر ہوں میں ہلاکِ ستم ہائے جستجو

ہر ذرّہ کائنات کا گرمِ تلاش ہے
دیکھی ہے کس نے وسعتِ صحرائے جستجو؟

کیوں ہو فروغِ نورِ دلِ آفتاب میں
گر ہو نہ اُس میں داغِ دل آرائے جستجو

چندھیا رہی ہے اُس کی نگہ اور ابھی نہاں
سو پردہ میں ہے شاہدِ زیبائے جستجو

گردش میں ہے قمر اسے کس کی تلاش ہے
آنکھوں میں کاٹتا ہے یہ شب ہائے جستجو

اِس جستجو میں جاں سے گزر کر ہزار بار
پاتا ہے داغِ حسرتِ لیلائے جستجو

شبنم کہ شب کو گرتی ہے چشمِ ستارہ سے
پاتی ہوئی سراغِ گہر ہائے جستجو

دوشِ صبا پہ ہوتی ہے پھر صبح دم سوار
تازہ کئے جنونِ تمنائے جستجو

کھوئے گئے ہیں بیخودیٔ جستجو میں سب
کیا جانے کتنی مست ہے صہبائے جستجو

اہلِ نظر کو ہے سبق آموز یہ روش
بے صرفہ کوششوں پہ بھی کیجائے جستجو

طے کر چکا ہے عرصۂ عالم مرا جنوں
اب بھی وہی ہے جوشِ تمنائے جستجو

پیہم مرے لئے افقِ مُدعا ہے دُور
سو بار پاؤں سرحدِ صحرائے جستجو

جو آگہی ہے بے خبری کا سراغ ہے
اور جستجو ہے حاصلِ سودائے جستجو

حامد علی خاں

تبصرہ

دی اسلامک البم ۔ "اسلامک لٹریچر کمپنی" نے ہمیں اسلامی تصاویر کا ایک نفیس البم ریویو کے لئے بھیجا ہے اس میں چوبیس کے قریب نہایت صاف اور دلکش ہاف ٹون عکسی تصاویر ہیں جن میں سے بعض تو قدیم و جدید عظیم الشان اسلامی شخصیتوں سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض عمارات وغیرہ کی تصویریں ہیں، البم کا سائز "ہمایوں" کے برابر ہے تصاویر کے عنوان حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مصطفیٰ کمال پاشا (۲) انور پاشا (۳) خالدہ ادیب خانم (۴) امیر امان اللہ خاں (۵) رضا خاں شاہ ایران۔ (۶) زاغلول پاشا (۷) سلطان الاطرش (۸)۔ غازی عبدالکریم (۹) سلطان صلاح الدین اعظم (۱۰) اورنگ زیب۔ (۱۱) سعدی (۱۲) خواجہ حافظ (۱۳) عمر خیام (۱۴) سرسید احمد خاں (۱۵) علامہ اقبال (۱۶) مکہ معظمہ (۱۷) مدینہ منورہ (۱۸) مقوقس مصر کے نام رسول کریم کے مکتوب کا عکس (۱۹) الحمرا (۲۰) غلطہ کا پُل قسطنطنیا (۲۱) تاج محل ۔ (۲۲) مسجد پیرس (۲۳) دمشق کا درویش خانہ (۲۴) مجاہدین دروز ۔

یہ البم اپنی وضع کی بالکل ایک نئی چیز ہے اور ہمارے خیال میں ہر مسلمان کو اس سے ضرور دلچسپی ہوگی۔ ظاہری صورت اور سرورق وغیرہ بھی نہایت اچھا ہے۔ اسکی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ مینجر دی اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس عـ۱۳۱ـ لاہور سے طلب فرمایئے ۔

نورجہاں ۔ پینتالیس صفحہ کی ایک مختصر سی کتاب ہے اور جناب سید احمد صاحب کاظمی اڈیٹر انگلش علیگڑھ میگزین کی محنت کا نتیجہ ہے اس کتاب میں نورجہاں کے مستند حالات نہایت سلیس اور سادہ انداز میں درج کئے گئے ہیں۔ بعض باتوں میں مصنف نے خاصی تحقیق سے کام لیا ہے کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے قیمت عہ ر مصنف۔ سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پتے سے طلب فرمایئے ۔

نیرنگ خیال کا عید نمبر ۔ نیرنگ خیال کے سرگرم اڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب نے عید الفطر کے موقع پر نیرنگ خیال کا یہ نمبر شائع کیا تھا حکیم صاحب نے اسکو مفید اور دلچسپ بنانے میں بہت کاوش سے

کام لیا ہے اسکا حجم ایکسو چھتیس صفحے کے قریب ہے اس پرچہ کی اہم ترین خصوصیت اسکی تصویریں ہیں ایک رنگین تصویر اور متعدد ہاف ٹون تصویریں رسالہ کو زینت دے رہی ہیں اہلِ ذوق کو حکیم صاحب کی جانفشانی کی داد دینی چاہیئے قیمت فی پرچہ ۱۲ر دفتر نیرنگ خیال لاہور سے طلب فرمائیے ؀

دی پرافٹ اینڈ ہز سے انگز " (رسولکریم اور انکی احادیث) اس کتاب میں رسولکریم کے حالات مختصر مگر جامع طور پر انگریزی زبان میں لکھے گئے ہیں کتاب کے آخر میں رسولکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سو احادیث کا انگریزی ترجمہ مختلف عنوانات کے ماتحت درج کیا گیا ہے اور مصنف کتاب جناب مولوی مرتضیٰ خانصاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ مفید کام بوجہ احسن سرانجام دیا ہے۔ کتاب میں چند عکسی تصاویر بھی ہیں کاغذ اور طباعت عمدہ ہے حجم ۱۲۵ صفحات قیمت عہ مینجر صاحب دائرۃ المعارف لاہور سے مل سکتی ہے ؀

خطبات نبوی۔ اس کتاب میں جناب مولانا محمد عبداللہ خانصاحب سابق پروفیسر مہندر کالج پٹیالہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام وہ خطبات نہایت جانفشانی سے جمع کئے ہیں جو آنحضرت نے مدت العمر میں مختلف موقعوں پر ارشاد فرمائے۔ ہر خطبہ کے ساتھ اس کا سلیس اور سادہ اردو زبان میں ترجمہ اور اسکے متعلق ضروری حالات بھی نہایت قابلیت سے درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے جنہیں رسول کریم کے حالات سے دلچسپی ہے یکساں مفید اور بکار آمد ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے قیمت ۱۲عہ یہ کتاب بھی مینجر صاحب دائرۃ المعارف لاہور سے طلب فرمائیے ؀

نغمہ " انجمن اتحاد کلیہ جامعۂ عثمانیہ" نے اپنے مشاعروں کی بعض نظمیں اور غزلیں منتخب کرکے " نغمہ " کے نام سے شائع کی ہیں بعض نظمیں واقعی اچھی ہیں اور طلبہ میں ذوق ادب پیدا کرنے کے لئے انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مفید کوششوں کی شاہد ہیں۔ بعض نظموں کا انتخاب چالیس صفحے میں سمایا ہے باقی سولہ صفحے منتخب غزلوں کے ہیں۔ نظموں کا موضوع بھی " نغمہ " ہی ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی اچھی ہے قیمت ۸ر جو کچھ زیادہ نہیں انجمنِ اتحاد کلیہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے ؀

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصف اول میں شائع ہوا کریگا۔

۲- علمی و ادبی۔ تمدنی و تاریخی۔ اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج رسالہ کئے جائیں گے۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہونگے۔

۴- جواب طلب خطوط کے لئے ار کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵- کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائیگا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶- سالانہ قیمت پانچ روپے ۵ ششماہی تین روپے علاوہ محصولڈاک نمونہ کا پرچہ ۸ر

۷- ہمایوں کی ضخامت چونسٹھ ۶۴ صفحہ ماہوار اور ۷۶۸ صفحات سالانہ ہوگی۔

۸- خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیے

۹- ناپسندیدہ مضمون ار کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۱۰- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۵ تاریخ کے بعد اور ۲۲ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اسکے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۱۱- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۳۰ مزنگ روڈ۔ لاہور

(باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپ کر شائع کیا)